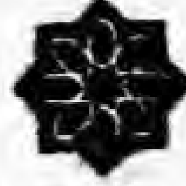

روشنی کے مینار
ضیا تسنیم بلگرامی

اسلام کے خاموش مبلغوں کے پاکیزہ واقعات

روشنی کے مینار

ضیاء تسنیم بلگرامی

کتابیات پبلی کیشنز [illegible] ۲۳ کراچی





باراوّل	1981
بارِدوم	2004
قیمت	225 روپے
ناشر	عنبرین اعجاز
مطبوعہ	ابن حسن آفسٹ پریس ہاکی اسٹیڈیم۔ کراچی





اردو کمپوزنگ

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ
(اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

ناشر

کتابیات پبلی کیشنز

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
پوسٹ بکس 23 رمضان چیمبرز بلموریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200

رابطہ کے لئے C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی 75500

فہرست

صوفیائے کرام بیرون پاک و ہند

صوفیائے کرام پاک و ہند

یہ تیرے پُراسرار بندے

انسان نے وجود میں آتے ہی تجسس سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ کیا، کون اور کیوں، سے اس کے شوقِ تجسس کا آغاز ہوا اور حیرت اور خوف نے اسے دو مختلف راہوں پر ڈال دیا۔ حیرت سے فلسفے نے جنم لیا اور خوف سے مذہب نے، فلسفے نے بہت سارے علوم کو جنم دیا اور انسان نے مادی امور خارجی دنیا میں دریافت اور ایجادات سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ انسان نے آگ دریافت کی اور پہیہ ایجاد کیا اور ان دونوں نے دنیا کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ از آدم تا ایں دم رزم اور بزم میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس کے پیچھے انسانی تجسس اور اس کا علمی اور ذہنی ارتقا کار فرما ہے۔ دنیا میں ایک طرف تو حیرت کے نتیجے میں بہت کچھ رونما ہو رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف خوف نے انسان کو باطنی دنیا میں اتار دیا ہے اور اس نے ایک ایسی شاہراہ پر سفر شروع کر دیا جو بہت دشوار اور مبہم تھی۔ یہاں کوئی قطب نما نہیں تھی جو اسے سمت کا پتہ دیتی۔ انسان نے اپنے اندر جھانکا تو اس کو دنیا اور کائنات اکبر نظر آئے اور انسان اصغر انسان نے دیکھا کہ آدمی میں تقریباً وہ ساری چیزیں موجود ہیں جو کائنات میں دوسری شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔

یہ اپنی ذات اور باطن میں سفر کرنے والے لوگ صوفی کہلائے۔ انہوں نے دنیا اور علائق دنیا کو ٹھوکر مار دی اور وہ روش اختیار کی جس میں حرص اور ہوس اور ھل من مزید کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی۔ ریاضت اور نفس کشی کا شیوہ اختیار کیا۔ یہ بڑے حوصلہ مند، تابع اور دلیر لوگ ہوتے ہیں۔ سیدھے سچے اور بہادر جو دنیا کو لات مار چکا ہو اسے کون خوف زدہ کر سکتا ہے جس نے اپنے نفس کو غلام بنا لیا ہو وہ کسی کا غلام کس طرح ہو سکتا ہے صحیح معنوں میں مردانِ حر یہی لوگ ہوتے ہیں۔

ماضی میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں محدود پیشے ہوتے تھے۔ انسانوں کی اکثریت

یا تو زراعت پیشہ ہوتی تھی یا فوجی۔ سب سے زیادہ معزز پیشہ سپاہ گری کا تھا۔ یہ لوگ درباروں پر بری طرح اثر انداز ہوتے تھے۔ جہاں یہ لوگ شہروں اور ملکوں کو فتح کرتے تھے۔ وہیں یہ کبھی کبھی اپنے ہی ملک میں بادشاہ گری کے شعبدے بھی دکھاتے تھے۔ آسودگی بھی انہی کے حصے میں آتی تھی۔ لیکن وہ لوگ جو نہ تو زمینوں کے مالک ہوتے تھے اور نہ ہی سپاہ گری میں کوئی مقام رکھتے تھے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے کاروبار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ امراء اور بادشاہوں کو ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ صوفیائے کرام کو ان کی بڑی فکر ہوتی تھی۔ یہ ان کے لیے دونوں وقت کے کھانے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ جسے ان کی اصطلاح میں لنگر کہا جاتا تھا۔ بیکسوں اور مجبوروں کی دست گیری کرتے تھے۔ زخموں پر مرہم رکھتے تھے۔ ٹوٹے دلوں کو جوڑتے تھے۔ دین کی تبلیغ اور اشاعت کا کام کرتے تھے۔ اپنے دور کے ظالموں اور جابروں کے درباروں میں اعلائے کلمۂ حق کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ خود روکھا سوکھا کھاتے تھے یا فاقے کرتے تھے مگر دوسروں کو شکم سیر دیا کرتے تھے۔

کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ جب صوفیاء میں باہمی عقائدی اور مسلکی اختلافات پایا جاتا ہے تو ہم دنیادار لوگ کس کی پیروی کریں اور کس کو حق پر سمجھیں، تو اس کا ایک ہی جواب ہے۔ ہمیں صوفیا کے عقائد اور مسلک کی گہرائی اور گیرائی میں نہیں جانا چاہیئے۔ ہم ان کی چند باتوں پر توجہ دیں اور ہو سکے تو انہیں اپنائیں۔ کیوں کہ ان کی یہ چند باتیں سب میں پائی جاتی ہیں۔

سادہ اور حلال غذا، سادہ زندگی اور دردمندی اور غمگساری، علائقِ دنیا سے کنارہ کشی اور اپنی ذات میں گم رہ کر دوسروں کے عیوب سے بے خبری۔

تمام صوفیائے کرام میں یہ اقدار مشترک تھیں۔ یہ آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں تھے۔ ان میں احترام انسانیت پائی جاتی تھی۔ یہ دوسروں کی نفی کر کے آگے نہیں بڑھتے تھے۔

یہ کتاب "روشنی کے مینار" جلال و جمال کے انہی پیکروں کی برگزیدہ زندگی پر لکھی گئی ہے۔ اس میں فلسفے کا تحیر بھی ہے اور مذہب کا خوف بھی۔ جس طرح سائنسی ایجادات اور انکشافات دیکھنے کے باوجود محیر العقول ہوتے ہیں۔ اسی طرح صوفیاء کے واقعات ان کے تجربات اور مشاہدات بھی محیر العقول ہوتے ہیں۔ ان کی بہت ساری باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ ان کی سچائی پر شبہ کریں۔ کیوں کہ جو چیز کسی کی سمجھ میں نہ آئے اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے عقل کی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

صوفیائے کرام کا کام ابھی اپنی انتہا کو نہیں پہنچا۔ یہ سفر جاری ہے۔ سائنس نے اس پر وقتی مگر کاری ضرب لگائی ہے لیکن ان کا سفر جاری ہے اور میرا ذاتی خیال ہے۔ کہ مستقبل میں انسان اپنی حیرت انگیز باطنی اور مخفی صلاحیتوں کا پتہ لگا لے گا اور پھر ان سے اس طرح کام لے گا جس طرح آج سائنسی ایجادات اور انکشافات سے کام لے رہا ہے۔ شاید اس وقت مستقبل کا انسان ہم پر خوب ہنسے کہ سب کچھ تو انسان کے اندر ہی موجود تھا مگر یہ اسے خارجی دنیا میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا۔

"روشنی کے مینار" آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھیے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جائیے جو ہماری دنیا سے یکسر مختلف اور حیرت انگیز ہے۔ مشہور مصنف "مینا تسنیم بلگرامی" کے سحر نگار قلم نے اسے جدید اسلوب میں لکھا ہے۔ اس اسلوب میں سحر ہے، دلکشی ہے اثر آفرینی ہے، فنی مہارت اور زبان و بیان کی چاشنی ہے پڑھیئے اور مزے لیجیے۔

الیاس سیتا پوری

حضرت ابو داؤد طائی رح

کوئی گویا بازار میں گا گا کر لوگوں کو محظوظ کر رہا تھا اُسے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ان میں نوجوان داؤد طائی بھی موجود تھے ۔ گویئے نے یہ شعر پڑھا۔

بائی خدیک تبدی البلا ویای عینک ماذا سالا

کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی

اس شعر میں معلوم نہیں کیا جادو تھا یا کون سی کہربائی قوت تھی کہ داؤد طائی کی حالت غیر ہو گئی وہ بے ہوش ہو کر گر گئے لوگوں میں ہلچل مچ گئی اور داؤد طائی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے جانے لگے بمشکل جب انہیں ہوش آیا تو ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنے آپ سے چل سکتے لوگوں نے پوچھا "تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

داؤد طائی نے کمزور آواز میں جواب دیا "میرا نام داؤد ہے اور قبیلہ بنی طے سے تعلق رکھتا ہوں"

ایک تماشائی نے پوچھا "تمہیں ہو کیا گیا؟ تم بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟"

داؤد نے جواب دیا "لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب تک میں بے ہوش تھا لوگ مجھے ہوش مند سمجھتے رہے اور اب جبکہ میں ہوش میں آچکا ہوں لوگ مجھے بے ہوش کہہ رہے ہیں"

لوگوں نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں ایک نے کہا "زمین پر بے اختیار گرنے سے دماغ پر چوٹ آگئی ہے جس سے اس کا دماغی توازن جاتا رہا ہے"

دوسرے نے کہا "نہیں جناب یہ صرع (مرگی) کا مریض معلوم ہوتا ہے اور شاید کچھ کچھ دماغی حالت بھی خراب ہے"

آپ نے آہستہ سے کہا "لوگو! نہ تو میں مرگی کا مریض ہوں اور نہ ہی میرا دماغی توازن بگڑا ہے میں اچھا بھلا ہوں۔ ہاں تم لوگ یہ ضرور کہہ سکتے ہو کہ اب میں دنیا کے کام کا نہیں رہا"

ایک نے پوچھا "جناب آپ کی حالت اس لائق نہیں ہے کہ اپنے پیروں سے چل کر

گھر تک جا سکیں، اس لئے ہمیں اپنے گھر کا پتہ بتا دیجئے تاکہ ہم پہنچا دیں۔"
داؤد طائی نے پوچھا: "کیا تمہیں امام ابوحنیفہ کا پتہ معلوم ہے؟"
کئی نے ایک ساتھ جواب دیا: "ہاں ہاں، کیوں نہیں اور ان کا پتہ کون نہیں جانتا۔"
آپ نے کہا: "مجھے ان کے پاس پہنچا دو، یہی میرا پتہ ہے۔"
لوگوں نے سوال جواب تو کیے بند اور آپ کو گاڑی میں بٹھا کر امام ابوحنیفہ کے گھر پہنچا دیا۔ امام صاحب نے داؤد طائی کو غور سے دیکھا اور دریافت کیا: "نوجوان! میں نے تمہیں پہچانا نہیں ہے؟"
داؤد نے جواب دیا: "ہاں، آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"
امام صاحب نے پوچھا: "مجھ سے کوئی کام؟"
داؤد نے جواب دیا: "ابھی ابھی بازار میں میں نے ایک گویّے سے یہ شعر سنا 'کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی'، بس اس شعر نے میری حالت ہی غیر کر دی، میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے ہوش میں آ چکا ہوں اور میں پہلے واقعی بے ہوش تھا۔"
امام صاحب نے کہا: "گویا اب تجھے عرفان ذات ہو رہا ہے۔"
داؤد نے جواب دیا: "شاید۔"
امام صاحب نے پوچھا: "تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"
داؤد نے جواب دیا: "یہ معلوم کرنے کہ اب میں کیا کروں؟"
امام صاحب نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے داؤد کی طرف دیکھا، کہا: "اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ ہاں میں یہ مشورہ دوں گا کہ تم گوشہ نشینی اختیار کر لو۔ فقر کی پہلی سیڑھی ترک دنیا ہے جب تم اس میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میں کچھ اور بتاؤں گا۔"
داؤد طائی نے درخواست کی: "حضرت! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن ایک درخواست کروں گا۔"
امام صاحب نے جواب دیا: "کرو درخواست۔"
داؤد نے عرض کیا: "میں آپ کا تلمذ چاہتا ہوں آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے

بیٹھئے ۔"

امام صاحب نے جواب دیا "میں نے تجھے اپنی شاگردی میں لے لیا، تو میری ہم نشینی اختیار کر سکتا ہے ۔"

داؤد طائی سراپا "تشکر و امتنان" بن گئے بولے "حضرت! آپ نے میری ہر درخواست بے چون و چرا مان لی، آخر کیوں؟"

امام صاحب نے جواب دیا "تو حاتم سخی کا ہم نسب ہے اور عدی میرے ہی خاندان کا ایک بزرگ فرد تھا، میں قبیلہ بنی طے کی عزت کرتا ہوں کیوں کہ حاتم اور عدی بن حاتم بھی اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔"

داؤد طائی نے دنیا چھوڑ دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی یہ بیس سال تک امام ابوحنیفہ کے شاگرد رہے ۔



ایک عرصہ تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے انہوں نے امام صاحب سے دریافت کیا "حضرت! ابھی کتنے عرصے اور گوشہ نشینی میں رہنا ہے ۔"

امام صاحب نے جواب دیا "تم گوشہ نشینی ختم کر دو اور لوگوں سے رابطہ قائم کرو لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود میں ضبط و تحمل پیدا کر لو ۔"

داؤد طائی نے نرمی سے عرض کیا "حضرت میں نے ایک عرصے کی گوشہ نشینی میں اپنے نفس کو اذیتیں پہنچائی ہیں اس لئے اب مجھ میں اتنا زیادہ ضبط و تحمل پیدا ہو چکا ہے کہ لوگ مجھے پریشان نہیں کر سکتے ۔"

امام صاحب نے فرمایا "اگر تم یہ سمجھتے ہو تو لوگوں سے ربط و ضبط بڑھاؤ ۔"

داؤد نے لوگوں سے ربط و ضبط بڑھانا شروع کر دیا ۔ اس عالم میں امام ابوحنیفہ نے آپ کو مشورہ دیا ۔ کہ مشہور صوفی حبیب راعی سے بیعت کر لو چنانچہ یہ حبیب راعی کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے اب آپ کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی سُن تو ضرور لیتے تھے لیکن خود بہت کم بولتے تھے ۔

آپ کو ورثے میں بیس دینار ملے آپ نے انہیں احتیاط سے رکھ لیا کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور طنزاً کہا "جناب! آپ نے دینار محفوظ کر لئے ہیں حالانکہ فقر کی شان یہ ہے کہ انہیں خرچ کر کے بے نیازی اختیار کی جائے ۔"

آپ نے جواب دیا "لیکن میں انہیں نہیں خرچ کروں گا، کیوں کہ میں نے حساب لگا کر جو

دیکھا تو معلوم ہوا یہ بیس دینار مجھے زندگی بھر کے لئے کافی ہیں اور پھر ان دینار کی موجودگی سے میں ایک قسم کی طمانیت محسوس کرتا رہتا ہوں اسی لیئے میں انہیں زندگی بھر خرچ نہیں کروں گا۔"

معترض خاموش ہو گئے۔

آپ کی قناعت اور استغنا کا یہ حال تھا کہ آپ ہمیشہ روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے تھے ایک دن دوسرے ہم عصر صوفی ابوبکر آپ سے ملنے پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ داؤد طائی اپنے ایک ہاتھ سے روٹی پکڑے زارو قطار رو رہے ہیں۔

ابوبکر نے پوچھا "حضرت! کیا بات ہوئی؟ یہ روٹی پکڑے آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

آپ نے بدستور روتے ہوئے جواب دیا "ابوبکر! میں اس لئے رو رہا ہوں کہ اگر روٹیاں کھانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہ وقت بھی عبادت ہی میں صرف ہوتا۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ کاش میرے اور خدا کے درمیان پیٹ نہ ہوتا۔"

ابوبکر نے دیکھا، داؤد کے پانی کا گھڑا دھوپ میں رکھا ہوا ہے انہوں نے کہا۔

"داؤد! یہ گھڑا دھوپ میں کیوں رکھ چھوڑا ہے؟"

داؤد نے جواب دیا "جب میں نے یہ گھڑا یہاں رکھا تھا، دھوپ نہیں تھی، اب دھوپ آگئی ہے میں نے سوچا اگر میں اسے دھوپ سے سایہ میں رکھوں گا تو محض اپنی ذات کیلئے کچھ وقت ضائع کروں گا اس لیئے میں خاموش بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہا۔"

ابوبکر نے کہا "سبحان اللہ! اور ایک میں ہوں کہ ادھر ادھر ملاقاتوں میں اپنا وقت ضائع کرتا پھرتا ہوں۔"

• آپ نے امام صاحب کی اجازت کے باوجود لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی آپ کو لوگ مختلف مجلسوں میں لے جانا چاہتے مگر آپ ان سے عذر کرتے۔ آپ کی یہ بات لوگوں کو گراں گزرتی۔ آپ کی اس عادت کا سبھی کو علم تھا۔ ایک دن آپ کے پاس چند آدمی آئے بولے۔ "حضرت! کیا بات ہے؟ آپ خدا سے تو محبت کرتے ہیں مگر اس کی مخلوق سے دور رہتے ہیں حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ ایک عاشق کو اپنے محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوتی ہے اس لئے اگر آپ کو خالق سے محبت ہے تو اس کی مخلوق سے بھی پیار ہونا چاہیئے۔"

آپ نے جواب دیا "میں مخلوق سے نفرت تھوڑی کرتا ہوں۔ مجھے اس کی مخلوق سے پیار ہے لیکن میں خالق کی یاد میں وقت دیتا ہوں ابھی میں خالق کی جنت کے مزے لے رہا تھا

اور اتنی فرصت کہاں کہ اس کی مخلوق کی طرف دیکھوں "

ایک شخص نے کہا "آپ اگر اپنے سے کم عمر لوگوں میں بیٹھیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کم عمر لوگوں کی باتیں آپ کے معیار سے کم ہوں گی اس لیئے آپ انھیں حقیر اور کم تر سمجھ کر ان کا اثر نہیں قبول کریں گے "

آپ نے جواب دیا "یہ بات نہیں ہے بلکہ میں ان کی محبت سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ وہ مجھے کچھ دے نہیں سکیں گے اور جن سے میں کچھ حاصل نہ کر سکوں ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا وقت کا زیاں سمجھتا ہوں "

اس شخص نے کہا "چھوٹوں سے اگر کچھ حاصل نہ ہوگا تو کوئی نقصان بھی نہ ہوگا "

آپ نے جواب دیا "نقصان تو ہوگا اور نقصان یہ ہوگا کہ وہ میرا احترام کریں گے اور اس احترام میں وہ مجھے کچھ سکھا نہیں پائیں گے "

اس شخص نے کہا "تب پھر آپ عمر رسیدہ لوگوں کی صحبت اختیار کریں "

آپ نے جواب دیا "وہ مجھے میرے عیوب سے آگاہ نہ کر سکیں گے اس لئے ان کی صحبت بھی میرے لئے بے کار ہے "

کسی اور شخص نے کہا "لیکن آپ کی باتیں ہیں بڑی عجیب - آپ نے اب تک شادی بھی نہیں کی ، معلوم نہیں کیوں ؟"

آپ نے جواب دیا " میں کیا شادی کروں ، میری مالی حالت تو لوگوں کو معلوم ہی ہے اور یہ بات بھی سب پر ظاہر ہے کہ میرا ذریعہ معاش بھی کچھ نہیں پھر میں کسی عورت سے شادی کر کے اپنی ہی جیسی سخت حالت میں کیوں مبتلا کروں اور جس حالت کو میں بخوشی گوارا کئے ہوئے ہوں اسے ایک عام عورت پر کیوں مسلط کر دوں "

ایک اور شخص نے کہا "جناب! آپ جس شکل زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں کوئی اور نہیں اختیار کر سکتا "

آپ نے جواب دیا "میری زندگی میرے لئے اور دوسروں کی زندگی اُن کے اپنے لئے"

کسی اور شخص نے کہا "کمال تو یہ ہے کہ آپ اپنی داڑھی میں کنگھی بھی نہیں کرتے ، ہمیشہ بال اُلجھے اُلجھے رہتے ہیں "

آپ نے جواب دیا "بھائی یہ ساری باتیں فرصت کی ہیں اور میں یار والوں سے

فرصت ہی نہیں پاتا۔ پھر میں داڑھی میں کنگھی کس طرح اور کب کیا کروں؟

ایک عرصہ بعد آپ کی نظر آسمان کی طرف اُٹھ گئی اُس وقت آپ چھت پر کھڑے تھے چودھویں کا چاند مشرق سے اُبھر رہا تھا اور اس کی کرنوں سے چاندنی سیاہی میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی تھی گویا چاند تاریکی میں غوطہ لگا کر نمودار ہو رہا تھا آپ اس دلکش منظر میں کھو گئے چاند کے اوپر ہر طرف تاروں کی محفل سجی ہوئی تھی اور وہ اس طرح چمک رہے تھے گویا داؤد طائی کی طرف اشارے کر کر کے کہہ رہے ہوں کہ اس صوفی کو تو دیکھو، زہے نصیب جو اس نے ہماری طرف نظریں تو اٹھائیں، ہمیں دیکھا تو۔ اے داؤد طائی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔

داؤد طائی نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اے چاند! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو نے یہ نور کہاں سے حاصل کیا ہے؟ کیا تو انسانوں کے لیے یہ پیغام لے کر نہیں آیا کہ اس خاکی کو بھی نورانی ذات کا قرب اور اتصال حاصل کر کے نور بن جانا چاہیئے۔

آپ پر جذب و مدہوشی طاری تھی، اور آپ اس کیفیت میں اپنی چھت پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگے آپ کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات جاری تھے " اے آسمان کے دلکش ستارو! تم مجھے دیکھ دیکھ کر پلکیں کیوں جھپکا رہے ہو؟ کیا تم مجھ پر ہنس رہے ہو؟ کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کیا تم بھی مجھے دیکھ رہے ہو؟ میں تو تمہیں دیکھ دیکھ کر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا وہ خالق جس نے تمہیں پیدا کیا ہے جس نے تمہیں پلکیں جھپکانے اور سیماب وش کی کیفیت عطا کی ہے وہ کتنا عظیم اور اعلیٰ ہے۔ اے کاش میں تم میں سے ہوتا کہ خاموش وہی کچھ کر رہا ہوتا جس پر میرے رب نے مجھے مامور کیا ہوتا لیکن مجھے انسان بنا دیا اور انسان کے پیچھے لتنے بہت سارے آزار لگا دیے گئے کہ یہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے اے کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اے کاش اگر میں پیدا ہوا تھا تو مجھے پیدائشی طور پر یہ توفیق ملی ہوتی کہ میں اپنے رب کے سوا کسی اور کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھاتا۔"

آپ پر وارفتگی طاری ہو گئی اور اسی وارفتگی میں آپ بے ہوش ہو کر پڑوسی کی چھت پر جا گرے۔ گرنے کے دھماکے سے پڑوسی یہ سمجھا کہ اس کی چھت پر شاید کوئی چور پھاندا ہے اس نے تلوار نیام سے نکال لی اور آہستہ آہستہ چھت پر چڑھنے لگا اس کو چھت پر کچھ بھی نظر نہ آیا۔ آخر وہ چھت پر پہنچ گیا اور کسی کو منہ کے بل پڑا ہوا دیکھا۔ وہ سمجھا یہ کوئی

پڑوسی نے جو اسے دیکھ کر بن کے پڑ رہا ہے ۔ وہ داؤد طائی کے سر پر جا کھڑا ہوا ، کڑک کر بولا "اے شریر! اٹھ اور دیکھ کہ موت تیرے سر پر کھڑی تیری گردن کا انتظار کر رہی ہے"

لیکن آپ پر تو بے ہوشی طاری تھی ، آپ نے کوئی جواب نہ دیا ۔

اس شخص نے آپ کو ٹھوکر لگائی اور غصے میں کہا "بن کے پڑے رہنے سے تجھے معاف تھوڑی کر دوں گا ، اٹھ اور بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا اور تو کہاں سے آیا ہے ؟

لیکن آپ پر اس کی ٹھوکر کا بھی اثر نہ ہوا آپ اسی طرح پڑے رہے ۔ پڑوسی نے آپ کے سر پر ایک شدید ٹھوکر لگائی ۔ بولا "میں کہتا ہوں اب بننے کی ضرورت نہیں ہے اٹھ اور بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا اور تو کہاں سے آیا ہے ؟"

لیکن آپ بدستور پڑے رہے پڑوسی نے چاندنی میں آپ کے سر سے خون بہتے دیکھا تو فوراً چونکا ، کیونکہ کسی آدمی میں کتنی ہی قوت برداشت کیوں نہ ہو ، سر میں اتنی شدید چوٹ کھا کر اُف یا سی سوں تو کرتا ہی ہے مگر یہ کیسا چور ہے کہ سر سے خون بہہ رہا ہے مگر خاموش پڑا ہے اس نے ایک ہاتھ سے آپ کو سیدھا کیا اور صورت دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا ۔ حیرت سے بولا "ارے یہ آپ! داؤد یہ آپ ہیں ؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ؟ خیریت تو ہے ؟ میری چھت پر کیسے ؟"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا ۔ پڑوسی نیچے گیا ۔ پانی لے کر پھر چھت پر پہنچ گیا اور آپ کے منہ پر چھینٹے دئیے کچھ دیر بعد آپ میں حرکت پیدا ہوئی اور آپ نے آنکھیں کھول دیں ۔ پڑوسی نے خوش ہو کر پوچھا "داؤد طائی! یہ آپ میری چھت پر کس طرح آ گئے ؟ خیریت تو ہے ؟"

آپ نے آہستہ سے جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ تمہاری چھت پر کس طرح آ گیا ؟ لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں چاند ستاروں کے نظاروں میں کھویا ہوا تھا اور اس میں کچھ اتنا وارفتہ ہو گیا کہ تمہاری چھت پر بے ہوش ہو کر گر گیا ۔ اب تم جو چاہو سزا دے لو ، میں تمہارا مجرم یا گناہ گار ہوں ۔"

پڑوسی نے شرمندگی سے کہا "حضرت! میں تو اس پر شرمندہ ہوں کہ لاعلمی میں میں نے نہ صرف یہ کہ آپ کو برا بھلا کہا بلکہ آپ کے ٹھوکریں بھی لگائیں اور آپ کو لہولہان کر دیا ۔ خدا کے لیے آپ مجھے معاف کر دیجئے ۔"

آپ نے کہا "وہ معافی تو تجھے مانگنی چاہیئے کیوں کہ میں تیری چھت پر آگیا ہوں اور تیری اجازت کے بغیر، میں اس کوتاہی اور غلطی پر نادم ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔"

پڑوسی رونے لگا، بولا "میں اس وقت تک آپ کو جانے نہیں دوں گا، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گے"

آپ نے جواب دیا "اچھا چلو ہم دونوں ایک دوسرے کو معاف کر دیں"

چنانچہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کیا اور پڑوسی نے آپ کو نہایت احترام سے آپ کے گھر تک پہنچایا۔



آپ کے پاس ایک ہی چادر تھی، آپ اس چادر کو اوڑھ کر باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے بغداد کے لوگ آپ کو بعض وجوہ سے ناپسند کرتے تھے، انہیں آپ کے توکل اور نامانوس باتوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی جب آپ نماز پڑھنے جاتے تو لوگ آپ پر ہنستے۔ آپ ان پر کوئی توجہ دیئے بغیر نماز باجماعت ادا کرنے مسجد چلے جاتے اور نماز ادا کر کے فوراً ہی واپس آجاتے۔

ایک دن ظہر کی نماز پڑھ کر آپ واپس آنے ہی والے تھے کہ چند لوگوں نے آپ کو روک لیا بولے "حضرت! آپ سے ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں براہِ کرم ہمیں بات چیت کا موقع دیجئے"

آپ نے جواب دیا "میں تم لوگوں کو بات چیت کا بہت تھوڑا وقت دے سکتا ہوں۔ بولو، کیا بات کرنا چاہتے ہو"

ایک نے دریافت کیا "آخر آپ کو جلدی کس بات کی ہے کیا آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں یا کسی دربار سے وابستہ ہیں جہاں تاخیر سے پہنچنے پر آپ کو جوابدہ ہونا پڑے گا"

آپ نے جواب دیا "بھائی! میں نے سب سے بڑے دربار کی ملازمت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں مجھے جواب دہ نہیں ہونا پڑے گا مگر پھر بھی میں اس سے اس لئے خوف زدہ رہتا ہوں کہ اگر وہ میری کسی بات پر ناراض ہو گیا تو وہاں کسی کی سفارش بھی کام نہ آئے گی اور وہاں میری کوتاہیوں یا خامیوں کی تلافی کا ازالہ بھی ناممکن ہوگا"

وہ ہنسنے لگے۔ دوسرے نے کہا "حضرت! کیا بات ہے جو آپ نے دنیا کو دیکھنا ہی ترک کر دیا اور معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتے ہیں کیا آپ تارکِ دنیا ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ پوری دنیا غلط راہ پر جا رہی ہے اور صرف آپ نے صحیح راہ اختیار کر رکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں بھائی! میں ایسا بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں کون غلط ہے اور کون درست؟ اس کا فیصلہ کرنا ہمارا تمہارا کام نہیں ہے میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسے میں اپنے لیے بہتر سمجھتا ہوں کیوں کہ میرے دل میں جیسی خشیت پائی جاتی ہے اگر تم میں سے کسی کے دل میں پیدا ہو جائے تو تمہاری بھوک پیاس اڑ جائے اور تم پر تمہاری نیندیں حرام ہو جائیں۔

کسی نے طنزاً ہنس کر کہا "بھائی ہماری بھوک پیاس اور نیند تو آپ کو دیکھ کر اڑی ہوئی ہے ایک چادر، ٹوٹا پھوٹا مکان، سڑا گلا پانی کا گھڑا۔ گھر میں مستقل قحط سالی واللہ ہم جب بھی آپ کی بات سوچتے ہیں غم گین ہو جاتے ہیں"

آپ نے بڑے افسوس سے کہا "افسوس کہ تم لوگ جس قسم کی باتیں کر رہے ہو اس میں وقت کی بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں، کیا تم لوگ مجھے معذور نہیں سمجھو گے؟"

لوگوں نے ہنس کر جواب دیا "ہم لوگ آپ کا وقت نہیں ضائع کر رہے ہیں بلکہ ان سوال و جواب سے ہم کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیا آپ بخیل بنے رہیں گے اور ہمیں کچھ بھی نہ دیں گے؟"

آپ نے کہا "میں جانتا ہوں تم لوگ مجھ سے کچھ بھی نہیں حاصل کر سکو گے بلکہ مجھے ٹٹول کی غرض سے روک رکھا ہے"

ایک نے زوردار قہقہہ لگایا "خوب! خوب! یار تم تو بہت ہوشیار نکلے ہیں تو تمہیں غبی سمجھ رہا تھا، اچھا بتاؤ، تم اور کیا سمجھے؟"

دوسرے نے بھی قہقہہ لگایا "یار یہ دنیا کو چھوڑ دینے والے غبی نہیں ہوتے ذرا کم ہمت ضرور ہوتے ہیں اور دنیا کا مقابلہ کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ انہی میں یہ داؤد بھی شامل ہیں"

داؤد نے جواب دیا "بھائی! اب میں تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں، ورنہ تم خود سوچو کہ یہ دنیا، جہاں قدم قدم پر ترغیب و تحریص کے جال بچھے ہوئے ہیں اور اگر اس سے

ایک قدم پیچھے ہٹاؤ تو یہ دس قدم آگے بڑھ کر پکڑ لیتی ہے اس سے پیچھا چھڑانا بڑے حوصلے کی بات ہے یہ تعجب کی بات ہے کہ تم لوگ ترک دنیا کو کم ہمتی پر محمول کر رہے ہو"

ایک نے اور زور کا قہقہہ لگایا بولا میں تو پہلے ہی داؤد کی عقل کا قائل تھا دیکھو تو کیسی عقل کی باتیں کر رہا ہے۔ اے کاش یہ شخص ہم میں شامل ہو جاتا اور ہم اس سے عقل کی باتیں کرنا سیکھ سکتے ۔

داؤد نے اپنی راہ لی بولے ۔ لوگو! خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو تم نے مجھے کس خرافات میں لگا دیا ۔

سب نے ملکر قہقہہ لگایا اور سیٹیاں بجائیں، بولے یہ میاں! اس صوفی کو یوں ہی روز روک لیا کرو اور مختلف مسائل پر باتیں کیا کرو، واقعی مزہ آگیا اس سے باتیں کر کے ۔ کسی نے آپ کی چادر پکڑ کر کھینچ لی۔ آپ روہانسے ہو گئے تیز تیز قدم اٹھاتے گھر آئے اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا، سجدے میں گر کر گڑگڑانا شروع کیا۔ خدایا یہ تو مجھے کس بات کی سزا دے رہا ہے میں تو تیرے لیئے زیادہ سے زیادہ وقت وقف کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ دنیا والے شیطان کا کردار ادا کر رہے ہیں مجھے چھیڑتے ہیں ستاتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔ اور انہیں کس طرح منع کروں۔ اب تو ان لوگوں نے میرے خلاف ایسا منصوبہ بنا لیا کہ مجھے مسجد جاتے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے میں مسجد میں باجماعت نماز کے لئے جاتا ہوں لیکن چند لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ مجھے ستائیں اگر ان حالات میں، میں مسجد میں جانا بند کر دوں تو اسے گناہ میں تو نہیں شمار کیا جائے گا؟ میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں، میں تیری منشا کس طرح معلوم کروں اگر تجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہو کہ میں مسجد نہ جاؤں تو تو میری چادر چوری کرا دے ۔ کیوں کہ نہ یہ چادر ہوگی اور نہ میں عریاں مسجد جانے کی ہمت کروں گا اور اس طرح میں تیری مشیت سے بھی آگاہ ہو سکوں گا ۔

آپ عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آئے اور بیت الخلاء چلے گئے ۔ پیٹ میں قراقر ہو رہی تھی جب وہاں سے فارغ ہو کر نکلے تو سردی سی محسوس ہونے لگی، چادر اتار کر بستر پر ڈال گئے تھے لیکن واپس آکر چادر اوڑھنے کے لئے جو تلاش کی تو وہ غائب تھی اسے کوئی چرا لے گیا تھا سردی میں چادر کا گم ہو جانا آپ کے لیئے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا لیکن پھر فوراً

ہی یہ خیال آیا کہ اس طرح انہیں حیرت انگیز طور پر خدا کی مشیت معلوم ہو چکی ہے آپ نے دوسرے ہی دن سے مسجد جانا بند کر دیا اور اپنے گوشے ہی میں نماز پڑھنا شروع کر دی، اب وہ زیادہ خشوع وخضوع سے عبادت کرنے لگے تھے۔

باہر بڑی سخت دھوپ پڑ رہی تھی آپ دھوپ میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو بڑا قلق ہوا وہ آپ کو ٹوکنا چاہتے تھے لیکن ٹوکنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ اس طرح اندیشہ تھا کہ آپ کی عبادت میں خلل پڑے گا پسینے نے آپ کو شرابور کر دیا تھا کپڑا بھیگ کر چپک رہا تھا اور پیشانی سے بہتے ہوئے پسینے کے قطرات گالوں تک آ چکے تھے آپ کے ایک انتہائی محبت کرنے والے مرید نے بلند آواز میں کہا "حضرت! سائے میں آ جائیے۔ کیا گرمی آپ کو نہیں پریشان کر رہی؟"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے پھر کہا "جناب! کیا میری آواز آپ نے نہیں سُنی؟ میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ خود پر رحم کیجئے۔ کہیں آپ کو کچھ ہو نہ جائے سائے میں آ جائیے۔"

آپ نے جواب دیا "اے شخص! مجھے پریشان نہ کر، میری مشغولیت میں مخل نہ ہو۔"

مرید نے عرض کیا "میں آپ کی مشغولیت میں مخل ہونے کی جرأت نہ کرتا لیکن میں آپ کو گرمی کی مصیبت میں مبتلا دیکھ رہا ہوں اس لیئے آپ کو اس اذیت میں دیکھ کر اپنے دل میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں، اگر آپ وہاں سے نہیں ہٹیں گے تو ہم سب بھی بے چین رہیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم سب بھی دھوپ ہی میں آ جائیں اور آپ جیسی اذیتوں میں خود کو بھی مبتلا کر لیں۔"

آپ نے جواب دیا "نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے سائے میں آنے سے گریز کر رہا ہوں تم لوگ یہاں دھوپ میں ہرگز نہ آنا کیونکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں نفس کشی سے زیادہ رضائے الٰہی کو دخل ہے شاید میرا خدا اسی طرح میری عبادت کو شرف قبولیت عطا فرما دے۔"

لوگ خوشامد کرتے رہے مگر آپ نے ان کی ایک نہ سنی آخر وہ اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے گئے۔

آپ ہر وقت اُداس اور غمگین رہا کرتے تھے دیکھنے والے یہ محسوس کرتے گویا داؤد

طاری کسی بڑے سانحے سے گزر چکے ہیں۔

ایک دن آپ کے مریدوں نے سوچا کہ ان سے بحث و مباحثہ کر کے کوشش کریں گے کہ وہ خوش رہنے لگیں، آخر اس اُداسی میں رکھا ہی کیا ہے چنانچہ انہوں نے ایک دن صبح ہی صبح آپ سے اس مسئلے پر بات چیت شروع کر دی۔ پوچھا: "حضرت! آج ہم آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں امید ہے کہ آپ اُن کے صحیح صحیح جواب مرحمت فرمائیں گے۔"

آپ نے جواب دیا: "پوچھو، بہرحال تم یقین کرو کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

ایک مرید نے پوچھا: "کیا آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا: "ہاں میرے ایک بہت ہی قریبی عزیز کا انتقال ہو چکا ہے تم نے میرے حالات سے صحیح اندازہ لگایا۔"

مرید نے پوچھا: "کس عزیز کا؟"

آپ نے جواب دیا: "میرے نفس کا جسے میں نے خود ہی ہلاک کر دیا ہے۔"

مرید نے عرض کیا: "جب آپ نے اپنے نفس کو خود ہی ہلاک کر دیا ہے تو اس کامیابی سے آپ کو بہت خوش ہونا چاہیئے لیکن ہم لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ آپ اپنے نفس کی ہلاکت سے خوش نہیں ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "نہیں یہ بات نہیں ہے میں اپنے نفس کو ہلاک کر کے بہت خوش ہوا تھا مگر کچھ عرصے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ نفس انسانی بہت ہی سخت جان ہوتا ہے اور اس کا ہمیشہ امکان باقی رہتا ہے کہ یہ دوبارہ پیدا ہو جائے اور اس دوبارہ پیدائش کے دھڑکے نے مجھے ہمیشہ کیلئے ملول کر دیا ہے۔"

دوسرے مرید نے پوچھا: "میرا خیال یہ ہے کہ آپ پر کوئی بڑی مصیبت پڑی ہے جس نے آپ سے آپ کی خوشیاں چھین لی ہیں۔"

آپ نے جواب دیا: "تیرا اندازہ بھی درست ہے اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ مجھے جس نے پیدا کیا ہے میں اس کا پوری طرح شکر نہیں ادا کر پا رہا ہوں دوسری بات یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے ایک زمانہ ناراض ہے میں یہ سوچ سوچ کر کڑھتا رہتا ہوں کہ جب میں ایک زمانے کو خوش نہیں رکھ سکا تو وہ ذات جس کی وجہ سے میں نے

ایک زمانے کو ناراض کیا ہے اگر مجھ سے ناراض رہی اور میں خوش نہ کر سکا تو میرا کیا حشر ہوگا اب تم خود ہی سوچو کہ جس پر آتنی بڑی مصیبت آپڑی ہو وہ کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔

تیسرے مرید نے پوچھا "مجھے تو آپ بیمار بیمار سے لگتے ہیں"۔

آپ نے جواب دیا "ہاں میں بیمار بھی ہوں اور یہ بیماری عصیاں کی ہے تائب ہونے سے پہلے میں نے نہ معلوم کیسے کیسے گناہ کئے ہیں معلوم نہیں خدا انہیں معاف بھی کرے گا یا نہیں اور اس وسوسے نے مجھے بیمار بنا رکھا ہے"۔

مرید نے مزید کہا "اور حضرت! صاف بات تو یہ ہے کہ آپ رجائی نہیں ہیں قنوطی ہیں آپ ہر چیز سے مایوس ہی نظر آتے ہیں اگر آپ رجائی انداز فکر اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے چہرے پر مستقلاً بشاشت نظر آنے لگے"۔

آپ نے جواب دیا "تجھے جو بات کہنی تھی، کہہ چکا اب اپنی زبان بند کر لے کیونکہ یہ تو نہیں بول رہا ہے بلکہ یہاں مجھ سے وہ شخص ہمکلام ہے جس کے قبضہ و اختیار میں بہت کچھ ہے اور خدا نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے کیا تجھ میں شیطان نے حلول نہیں کیا ہے اور تیرے سارے سوال اس کے مرتب کئے ہوئے ہیں"۔

آپ کے سارے مرید شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

لیکن ایک دن آپ کو لوگوں نے اس حال میں دیکھا کہ آپ مسکرا رہے ہیں یہ مسکراہٹ ایسی تھی جیسے گرہن کی مصیبت میں مبتلا چاند اپنے پورے آب و تاب سے دنیا کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر ایک درویش نے کہا "جناب! آج کیا بات ہے کہ میں آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ رہا ہوں"۔

آپ نے کیف و سرمستی میں جواب دیا "ہاں! مجھے خدا نے شراب محبت پلادی ہے آج میں اس کا غیر معمولی سرور محسوس کر رہا ہوں اور اسی خمار نے مجھے مسرور کر رکھا ہے"۔

ایک دن آپ اپنے حجرے سے نکلے اور بازار کا رخ کیا، لیکن ابھی وہ بازار میں چند لمحے ہی رکے ہوں گے کہ وحشت زدہ ہو کر ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے وہ اپنے حجرے کی جانب بھاگ رہے تھے کسی نے آپ کو روکنے کی کوشش کی پوچھا "یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے آپ بھاگ کیوں رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ارے کیا تیری بینائی تجھ سے چھین لی گئی؟ وہ سامنے دیکھ

وہ کون آرہا ہے؟"

اُس شخص نے سامنے دیکھا لیکن اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا بولا "جنابِ عالی تو کچھ بھی نہیں۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "بس جناب! چل گیا پتہ۔ نہ تو تو کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ سن سکتا ہے دیکھ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھ، وہ سامنے دیکھ، مُردوں کا لشکر ہماری طرف بڑھا چلا آرہا ہے"

یہ کہتے ہوئے آپ اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ جب یہ بات جنید بغدادی کے روبرو دھرائی گئی تو انہوں نے کہا "داؤد جھوٹ نہیں بول سکتا میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ اس نے مُردوں کا لشکر ضرور دیکھا ہوگا"

اس کے کچھ عرصہ بعد شہر میں وبا چلی اور اس میں آبادی کا بڑا حصہ ہلاک ہو گیا۔



ایک دن اُس عہد کے مشہور بزرگ ابو ربیع آپ کے پاس ملنے آئے اور بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کہا "حضرت! میں آپ کے پاس سے خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا"

آپ نے جواب دیا "ابو ربیع! میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ ایک چادر تھی وہ بھی کوئی چرا لے گیا"

ابو ربیع نے کہا "میں کچھ نہیں جانتا، میں تو آپ سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی چلوں گا"

آپ نے کہا "یہ کچھ مانگ کر تو بھی شرمندہ ہوگا اور نہ دے کر میں بھی ندامت محسوس کروں گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم خاموش رہو اور ملاقات کا وقت پورا کر کے اپنی راہ لے"

ابو ربیع بھی بڑے ضدی تھے بولے "آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں نے جو بات کہہ دی ہے اس پر عمل کروں گا اور آپ کے پاس سے خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا"

آپ نے عاجز آ کر کہا "بھائی ابو ربیع! تم معلوم نہیں ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو، خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو"

ابو ربیع نے عرض کیا " حضرت! میں نے آپ سے جو بات کہی ہے آپ کو اس کا اہل سمجھ کر کہی ہے آپ کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے اپنے مطلب کی چیز مانگ لوں گا "

آپ نے عاجز آ کر کہا " اچھا بھائی! اگر یہ بات ہے اور وہ چیز میرے پاس موجود ہے جو تم مانگنا چاہتے ہو ضرور مانگو موجود ہو گی تو میں انکار بھی نہیں کروں گا

ابو ربیع نے عرض کیا " حضرت میں آپ کے پاس سے ایک آدھ نصیحت لے کر جاؤں گا اور وہ نصیحت بھی ایسی ویسی نہیں ہونا چاہیئے "

آپ نے مسکرا کر پوچھا " ابو ربیع! تم روزہ رکھتے ہو یا نہیں؟"

ابو ربیع نے جواب دیا " ہاں میں روزے رکھتا ہوں "

آپ نے نصیحت کی " ابو ربیع! اب تم دنیا سے روزہ رکھو اور اس کی افطار آخرت سے کرنا "

ابو ربیع جھوم گئے بولے " حضرت! ایک نصیحت اور؟"

آپ نے جواب دیا " ابو ربیع میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ تم بدگوئی سے پرہیز کرو، مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کرو ---------- دین کو دنیا پر ترجیح دو اور ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ مخلوق کا خیال تک دل سے محو ہو جائے " ابو ربیع نے عرض کیا " کوئی اور نصیحت؟"

آپ نے بڑے جوش میں کہا " ابو ربیع! کیا تمہیں معلوم ہے کہ مردے تمہارا انتظار کر رہے ہیں یعنی تمہیں بھی مرنا ہے اس لئے آخرت کا سامان کرو " ابو ربیع مارے خوشی کے رونے لگے، بولے " حضرت اور کچھ؟"

آپ نے جواب دیا " ابو ربیع! ترک دنیا سے بندہ خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے "

ابو ربیع نے عرض کیا " حضرت! آپ نے یہ فرمایا تھا کہ آپ تہی دست ہیں اور یہ کہ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں لیکن میں جانتا تھا کہ آپ دولت مند ہیں اور آپ کے پاس گراں مایہ خزانہ موجود ہے میں اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کروں گا چنانچہ میں نے اس میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا ہے اور اب خوشی خوشی آپ کے پاس سے رخصت ہو رہا ہوں "

ابو ربیع چلے گئے، آپ نے بڑے دکھ سے خود کو مخاطب کیا " داؤد! تو دنیا کو تو نصیحتوں کے خزانے دے رہا ہے لیکن ذرا یہ تو بتا کہ تو خود اس پر کس حد تک عمل پیرا ہے؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ خدا تجھ پر رحم کرے "

❊❊❊

حضرت ابراہیم بن ادہم کے مرشد فضیل بن عیاض آپ سے ملنے گئے آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے دونوں دین کی باتیں کرتے رہے دوران گفتگو فضیل بن عیاض نے کہا " داؤد میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگر آپ اس چھت کے نیچے عبادت کرتے رہے تو یہ کمزور چھت کسی بھی دن آپ کے اوپر ڈھے جائے گی "

آپ نے جواب دیا "ابن عیاض! تم پر رحمت ہو کہ تم نے پہلی ملاقات ہی میں میری چھت کی بوسیدگی کا اندازہ لگا لیا حالانکہ میں اس چھت کے نیچے برس ہا برس سے بیٹھا ذکر و فکر میں لگا ہوا ہوں اور میں نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر اس چھت کی طرف نہیں دیکھا۔"

فضیل بن عیاض نے عرض کیا "حضرت! میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ چھت کی طرف نہ دیکھیئے، آپ ہر اس طرف ضرور دیکھیئے جدھر آپ کی نظر جا سکتی ہے۔"

آپ نے جواب دیا "واہ ابن عیاض یہ مجھے کیا مشورہ دے رہے ہو تم؟"

فضیل بن عیاض نے کہا "جناب والا! آپ کو مسلسل غلط فہمی ہوئی ہے اب میں آپ سے کیا بات کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، خدا نے آپ کو وہ مرتبہ عطا کیا ہے کہ ہم لوگ آپ پر رشک ہی کرتے رہیں گے میرے لیئے کوئی نصیحت؟"

آپ نے جواب دیا "فضیل! دنیا سے کنارہ کشی، دنیا سے حذر، دنیا سے پرہیز، دنیا سے گریز۔"

فضیل رونے لگے بولے "داؤد! آپ کی باتوں میں کتنا سوز ہے بخدا آپ نے میرے سینے کی آگ اور تیز کر دی ہے خدا آپ کو جزائے خیر دے۔"

داؤد نے کہا "فضیل! تم مستجاب الدعوات ہو خدا سے دعا کرو وہ میرا انجام بخیر کرے۔"

فضیل نے جواب دیا "آپ میرے لئے دعا کیجئے میں آپ کے لیئے کروں۔"

داؤد اس پر راضی ہو گئے اور ان دونوں نے ایک دوسرے کیلئے دعائے آخرت بخیر کی۔

اس عہد کے ایک دوسرے بزرگ معروف کرخی نے آپ کی بابت یہ خیال ظاہر کیا کہ میں نے داؤد طائی سے زیادہ دنیا سے نفرت کرنے والا کوئی اور انسان نہیں دیکھا۔

آپ کے بال بہت بڑھ گئے تھے آپ حجام کے پاس چلے گئے اور اس سے کہا "میری حجامت بنا دے۔"

اس نے دوسروں کی حجامت روک کر آپ کی حجامت بنانا شروع کر دی وہ بولتا رہا آپ خاموش رہے آخر اس کی بک بک سے تنگ آکر آپ نے کہا "اے شخص! تو اپنا کام کر، زبان کو ذرا آرام کرنے دے۔"

حجام شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔ آخر میں آپ نے اسے ایک دینار دے دیا۔ حجام کو اس اجرت پر حیرت ہوئی وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے انہوں نے آپ کو روک لیا۔ بولے

"جناب! آپ سچ سچ بتلائیے آپ اپنے ہوش میں تو ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں میں اپنے ہوش میں ہوں، کیوں، میں نے کون سی بے ہوشی کی بات کی ہے؟"

کسی شخص نے کہا "آپ نے حجام کو ایک دینار دیکر بہت زیادہ اجرت دے دی ہے"

آپ نے جواب دیا "اگر میں نے ایک دینار دیا ہے تو اس پر تو کیوں اعتراض کر رہا ہے؟"

اس شخص نے کہا "میرے خیال میں یہ اسراف بے جا ہے"

آپ نے جواب دیا "میں اسے اسراف میں شمار نہیں کرتا کیونکہ دین میں مروت ضروری ہے اور اسے میں نے مروت سمجھ کر دیا ہے بے جا اسراف سمجھ کر نہیں دیا"

وہ شخص خاموش رہا۔

امام ابو حنیفہ کے دو شاگرد امام ابو یوسف اور امام ابو محمد کا ایک زمانہ احترام کرتا تھا خلیفہ ہارون رشید نے ان دونوں کو قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا امام ابو محمد نے اپنے استاد امام ابو حنیفہ کی پیروی میں یہ منصب قبول نہیں کیا لیکن ابو یوسف نے قبول کر لیا آپ کو ابو محمد سے عقیدت ہو گئی لیکن امام ابو یوسف کی قدر و منزلت دل سے نکل گئی

امام ابو یوسف نے آپ سے پوچھا "حضرت! میں نے سنا ہے کہ آپ ابو محمد کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں، کیا یہ درست ہے"

آپ نے جواب دیا "ہاں یہ درست ہے"

امام ابو یوسف نے کہا "آپ مجھے کیوں ناپسند فرماتے ہیں؟"

آپ نے دو ٹوک جواب دیا "صرف اس لئے کہ جب آپ کے استاد امام ابو حنیفہ کو خلافت کی طرف سے یہ منصب پیش کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اور اس انکار کی انہیں سزا بھی دی گئی تھی اور تم نے اسی منصب کو قبول کر لیا ہے پھر میں تم کو کس طرح پسند کر سکتا ہوں مجھے امام ابو محمد زیادہ پسند ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے استاد کی پیروی میں یہ منصب نہیں قبول کیا"

امام ابو یوسف نے جواب دیا "لیکن میں اس منصب کے ذریعے لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں"

آپ نے طنزیہ کہا "ہاں ایک طرف خلیفہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے دوسری طرف تم کر رہے

ہو اور تم دونوں لوگوں کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہو میں آج یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"
امام ابو یوسف خاموش ہو گئے۔

ایک دن امام ابو یوسف آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "حضرت! امیر المومنین ہارون رشید آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں جب فرمائیں لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔"

آپ نے صاف انکار کر دیا بولے "نہ نہ اسے میرے پاس ہرگز نہ لانا وہ میرے پاس کیوں آنا چاہتا ہے؟ میں اس سے نہیں ملوں گا، ہرگز نہیں ملوں گا۔"

امام ابو یوسف نے التجا کی "حضرت! میں نے امیر المومنین سے وعدہ کر لیا ہے کہ آپ سے ان کی ملاقات ضرور کرا دوں گا۔"

آپ نے جواب دیا "مجھ سے ملے بغیر تو نے ہارون رشید سے وعدہ کیوں کر لیا؟"

امام ابو یوسف نے کہا "اس لئے کہ میں جانتا ہوں آپ ایک خوش اخلاق انسان ہیں۔ میری بات ضرور مان لیں گے۔"

آپ نے جواب دیا "تو نے سخت غلطی کی میں دنیادار ظالموں سے سخت نفرت کرتا ہوں اور ہارون رشید ان ہی ظالموں میں سے ایک ہے اسی لئے میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔"

امام ابو یوسف مایوس ہو کر چلے گئے جب ہارون رشید کو اس بات کا علم ہوا کہ داؤد نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بہت سٹ پٹایا، بولا "اب کیا ہوگا؟ اور میں ان سے ہر قیمت پر ملوں گا۔"

آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ ہارون رشید اپنی ماں خیرزان کو آپ کے پاس بھیجے گا اور وہ خوشامد در آمد سے آپ کو ہارون کی ملاقات پر آمادہ کر لیں گی۔

خیرزان کوئی معمولی عورت نہیں تھی چنانچہ اس نے آپ کو ملاقات پر آمادہ کر لیا آپ نے سمجھایا کہا "خیرزان! ہارون تیرا بیٹا ہے کیا تو اپنی آخرت کی طرف سے فکرمند نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں تو سوچ سوچ کر قدم اٹھاتی ہوں اسی لیئے میں شرمندگی سے محفوظ رہتی ہوں۔"

آپ نے فرمایا "اچھا اپنے بیٹے کے پاس جا اور اسے اس شرط پر میرے پاس بھیج دے کہ وہ مجھے کچھ دینے کی کوشش ہرگز نہ کرے، کیونکہ میں بادشاہوں کو ظالم اور جابر سمجھتا ہوں اور اسی لیئے میں بادشاہ سے کچھ لینا بالکل پسند نہیں کرتا۔"

خیزران اپنے بیٹے ہارون رشید کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ان دونوں کے ساتھ امام ابو یوسف بھی تھے۔ ہارون رشید بڑے احترام سے پیش آیا۔

آپ نے کہا "ہارون! تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے پھر وہ کیا چیز تھی جو تجھے میرے پاس لائی؟"

ہارون نے جواب دیا "آپ کی بے نیازی، آپ کا استغنا۔ واللہ میں جو چاہوں، خرید لوں، جسے چاہوں ملازم رکھ لوں لیکن آپ کے سامنے میری کوئی حیثیت ہی نہیں اور اس وقت تو مجھے اپنی اس کمزوری اور بے بضاعتی کا بہت زیادہ احساس ہوا جب میں نے آپ کی خدمت میں امام ابو یوسف کو بھیجا اور آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ مجھ سے نہیں مل سکتے۔"

آپ نے جواب دیا "ہاں ہارون! میں بادشاہوں اور حکمرانوں کو جابر اور ظالم سمجھتا ہوں تم لوگ عوام کی امانت کو اپنے آپ پر خرچ کرتے ہو اپنی خواہشات میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے چنانچہ روز قیامت جتنا بڑا محاسبہ تم لوگوں کا ہو گا کسی اور کا عشر عشیر بھی نہیں ہو گا۔"

ہارون کچھ دیر آپ کی خدمت میں رکا رہا اس کے بعد کہا "حضرت مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔"

آپ نے جواب دیا "میں تجھے نصیحت نہیں، تجھ سے خواہش کروں گا۔"

ہارون نے پوچھا "وہ کیا؟"

آپ نے جواب دیا "اب آئندہ تو مجھے یا میرے جیسے کسی اور کو ملاقات کی زحمت سے محفوظ رکھے گا۔"

ہارون نے کہا "میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں آپ کو کچھ پیش کروں۔"

آپ نے جواب دیا "خواہش کو مار، نفس کشی کر کیوں کہ یہ وہ موذی ہیں جو انسان کو زندگی بھر سانپ کی طرح ڈستے رہتے ہیں۔"

ہارون کے ہاتھ میں ایک دینار تھا اسے آپ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "آپ زیادہ نہیں تو ایک دینار تو قبول ہی فرما لیں۔"

آپ نے ہارون کی ماں خیزران کی طرف دیکھا اور کہا "کیا میں نے ملاقات سے پہلے ہی یہ شرط نہیں رکھ دی تھی کہ میں ملاقات اس شرط پر کروں گا کہ بادشاہ سے کچھ قبول نہ کروں گا؟"

خیزران نے جواب دیا "ہاں یہ شرط آپ نے رکھی ضرور تھی لیکن میرے بیٹے کی یہ معمولی

خواہش اگر آپ پوری کر دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔

آپ نے کہا: "میرے پاس اپنے خرچ کے لئے جائز رقم موجود ہے اس لئے بادشاہ سے کچھ لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ہارون نے کہا: "آپ یہ دینار رکھ لیجئے کیوں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، جب آپ کے پاس اپنی رقم خرچ ہو جائے گی اس وقت یہ میرا دینار آپ کے کام آجائے گا۔"

آپ نے جواب دیا: "اول تو یہ ہے کہ میرے پاس جتنی رقم موجود ہے وہ زندگی بھر کے لیئے کافی ہے لیکن اگر یہ رقم ناکافی بھی ہو گی تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ میری اسی دن موت واقع ہو جائے جب یہ میری رقم میرے پاس ختم ہو جائے۔"

امام ابو یوسف نے ہارون رشید کو منع کیا "امیر المومنین! آپ داؤد کو مجبور نہ کیجئے انہوں نے اگر ایک بار کچھ لینے سے منع کر دیا ہے تو یہ ہمارے لاکھ اصرار اور خوشامد کے باوجود کچھ بھی نہ لیں گے۔"

مجبوراً ہارون رشید کو یوں ہی واپس آجانا پڑا۔

آپ جس مکان میں رہتے تھے وہ آپ کا آبائی تھا اور خاصا بڑا مکان تھا ایک مدت سے دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ مکان جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا آپ کے مریدوں نے آپ کو منع کیا کہ وہاں سے ہٹ جائیے ورنہ یہ کسی دن سر پر آرہے گا لیکن آپ نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور عبادت و ریاضت میں مشغول رہے آپ کے ایک مرید نے کہا، "حضرت آپ توجہ نہیں دے رہے ہیں اور مجھے بڑا خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں مکان کا یہ حصہ آپ پر نہ گر جائے۔"

آپ نے جواب دیا: "لیکن میں خوف نہیں محسوس کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اگر یہ گرا بھی تو مجھ پر ہرگز نہ گرے گا۔"

مرید نے کہا "یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں یہ بوسیدہ عمارت ہر اس شخص پر گر سکتی ہے جو اس کے نیچے موجود ہو گا۔"

آپ نے کہا: "اگر میرا رب یہی چاہتا ہے کہ میں اس کا ذکر کرتے کرتے دیوار تلے دب کر اس کے پاس پہنچ جاؤں تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔"

جب مریدوں نے یہ دیکھا کہ آپ پر نصیحتیں کارگر نہیں ہو رہی ہیں تو خاموشی اختیار کر لی۔

مگر خود احتیاط کرنے لگے وہ آپ کے پاس جاتے، آپ سے باتیں کرتے لیکن بوسیدہ دیوار سے دور رہتے کیونکہ وہ اس یقین کی دولت سے محروم تھے جو داؤد طائی کو حاصل تھی۔

ایک دن فجر کی نماز سے فارغ ہو کر آپ جیسے ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے دیوار ہلنے لگی اور اس سے گرد و غبار جھڑنے لگا۔ مریدوں نے شور کیا "حضرت بچئے، دیوار لرز رہی ہے"

آپ نے دیوار کی طرف دیکھا اور فرمایا "اے دیوار! میں نے تجھ سے اپنی پشت ہی تو ٹکائی تھی۔ تجھ پر اپنا پورا بوجھ تو نہیں ڈالا تھا، پھر تو کیوں کانپ رہی ہے؟"

لوگوں نے دیکھا دیوار نے ہلنا بند کر دیا تھا، آپ اس سے پشت ٹکا کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

آپ نے اپنے مریدوں سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "لوگو! اگر انسان خود کو اللہ کے حوالے کر دے تو اللہ کی مخلوق اسے گزند نہیں پہنچا سکتی، ہاں اگر اللہ ہی نہ چاہے تو دوسری بات ہے"

ایک مرید نے کہا "حضرت! آپ کی بات میری سمجھ میں اس لئے نہیں آتی کہ چیزیں کسی کے لئے اپنا خواص کس طرح بدل سکتی ہیں؟ آگ کی گرمی، برف کی ٹھنڈک یہ تو قائم ہی رہیں گی"

"ہاں، بے شک ان کے خواص میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہو گی"

مرید نے عرض کیا "پھر جب یہ طے ہو گیا۔ کہ چیزیں اپنے خواص نہیں بدلتیں تب پھر یہ شکستہ دیوار اپنی عمر پوری کر کے کس طرح کھڑی رہ سکتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا "چیزوں کے خواص اللہ کے حکم سے ہی تو قائم ہیں ان خواص میں اللہ کے حکم ہی سے رد و بدل بھی ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح خدا کے حکم سے حضرت خلیل اللہ کے لئے آگ گلزار بن گئی تھی"

آپ باتوں میں مشغول ہی تھے کہ دیوار لرزی اور لرز کر دوسری طرف گر گئی آپ بالکل محفوظ رہے آپ نے گری ہوئی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھ خدا نے شکستگی میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی (بس) اس کے گرنے کا رخ بدل دیا اور اس طرح اس نے اپنے بندے کو بچا لیا"

مریدوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی بولے "بے شک خدا چاہے تو آگ گلزار بن سکتی ہے"
آپ نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور دوسری دیوار کے سائے میں جا بیٹھے۔

آپ کا پورا مکان ہی شکستہ و بوسیدہ ہو چکا تھا، جس دوسری دیوار کے سائے میں آپ جا کر بیٹھے تھے، وہ بھی بہت کمزور تھی، مریدوں نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ آپ یہاں سے بھی ہٹ جائیں۔

آپ نے جواب دیا "میں اس دیوار کے سائے سے ہٹ کر کہیں تو جاؤں گا ہی اور یہ پورا مکان بوسیدہ و خستہ ہو رہا ہے تم لوگ پورے مکان میں گھوم پھر کر وہ جگہ تو بتاؤ جو نسبتہً زیادہ اچھی اور مضبوط ہو میں وہیں منتقل ہو جاؤں گا۔"

مریدوں نے مکان کا ہر حصہ خوب غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی ہر جگہ ہر حصہ غیر محفوظ اور بوسیدہ ہے مجبوراً خاموشی اختیار کی اور آپ جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھا رہنے دیا۔

ایک دن ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عرض کیا "حضرت! مجھے آپ کے پاس امام ابو یوسف نے بھیجا ہے۔"

آپ نے پوچھا "کس لیے؟ کوئی کام؟"

آدمی نے جواب دیا "کام تو کوئی بتایا نہیں، بس یہ پوچھا ہے کہ آپ کے پاس اس وقت کتنی رقم موجود ہے؟"

آپ نے کہا "اگر میں تیرے سوال کا جواب دے بھی دوں تو اس سے اُس کو یا مجھ کو کیا حاصل ہو گا؟"

آدمی نے کہا "میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے آپ دونوں میں سے کس کو کیا حاصل ہو گا؟ لیکن انہوں نے مجھے بھیجا اس لئے کہ میں ان کے اس سوال کا جواب آپ سے لے کر ان تک پہنچا دوں۔"

آپ مسکرائے، بولے "امام ابو یوسف سے کہہ دینا کہ جس امام ابو حنیفہ کے تم شاگرد ہو اس کا بیس سال تک میں بھی شاگرد رہا ہوں، تم فقیہہ ہو تو میں غریب درویش ہوں جو بات تمہارے دل میں ہے خدا نے اس کا کشف میرے دل پر کر دیا ہے تم امام ابو یوسف سے کہہ دینا کہ میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ اس کے سہارے کسی کا احسان لئے بغیر اپنی بقیہ زندگی گزار دوں۔"

امام ابو یوسف کے آدمی نے کہا "حضرت! مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے یہ سوال کیوں کیا ہے اور اگر آپ پر یہ بات کشف سے منکشف ہو چکی ہے تو میں جواب

لے جانے کا پھر بھی پابند رہتا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا "امام ابو یوسف سے کہہ دینا ابھی میرے پاس چاندی کے دس درہم باقی ہیں۔"

وہ آدمی یہ جواب لے کر چلا گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر واپس آیا اور کہا "حضرت اب وہ یہ دریافت فرما رہے ہیں کہ چاندی کا ایک درہم آپ کو کتنے دنوں کے لئے کافی ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "تقریباً دو ماہ کے لئے۔"

جب یہ شخص آپ کا جواب لے کر چلا گیا تو آپ نے اپنے مریدوں سے دریافت فرمایا "تم لوگوں نے کچھ محسوس کیا کہ ابو یوسف مجھ سے کیا معلوم کر رہے تھے؟"

لوگوں نے جواب دیا "ہمیں نہیں معلوم، کچھ آپ ہی وضاحت فرمائیں۔"

آپ نے کہا "میں نے ایک بار ابو یوسف سے یہ کہا تھا کہ میرے پاس جو رقم موجود ہے وہ پوری زندگی کے لئے کافی ہے اس طرح وہ یہ پوچھ کر کہ میرے پاس کتنی رقم باقی رہ گئی ہے اور چاندی کا ایک درہم مجھے کتنے دنوں کے لئے کافی ہوتا ہے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ابھی کتنے دن اور جیوں گا۔"

مریدوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا، اس حساب سے آپ کو بیس ماہ اور زندہ رہنا تھا۔

جیسے جیسے رات پوری ہو رہی تھی لوگوں کی فکر و تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ جس دیوار کے سائے میں بیٹھے تھے وہ پہلی دیوار سے زیادہ کمزور تھی اور ہوا کے جھونکوں سے ہلنے لگتی تھی لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ اگر داؤد سابقہ گری ہوئی دیوار سے بچ گئے تھے تو اس دیوار تلے دبنے سے نہیں بچیں گے انہوں نے آپ کو ایک بار پھر منع کیا "حضرت! یہ دیوار پچھلی دیوار سے زیادہ کمزور ہے خدا کے لئے یہاں سے ہٹ جائیے۔"

آپ نے جواب دیا "لوگو! جس خدا نے مجھے پہلے بچایا تھا وہی اس وقت بھی میرا محافظ ہے۔"

ایک مرید نے کہا "ہمیں تو اس لئے زیادہ فکر ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا جو حساب

بتایا تھا اس کے اعتبار سے یہ دیوار بڑی خطرناک محسوس ہو رہی ہے۔

آپ نے جواب دیا "تم جس خطرے کا اظہار کر رہے ہو، ہو سکتا ہے وہ اسی طرح رونما ہو جائے لیکن میں تقدیرِ الٰہی سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں۔"

مرید نے عرض کیا "آپ میرے گھر تشریف لے چلیں، میں آپ کی خدمت بھی کروں گا اور رہنے کے لئے ایک اچھا سا کمرہ بھی دوں گا آپ کے لئے کیا کمی ہے؟"

"افسوس کہ میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا پھر ان آخری لمحوں میں کسی کا کیا احسان لوں گا"

مرید نے کہا "میں جو کچھ کروں گا وہ احسان کب ہوگا؟ آپ نے مجھے صراطِ مستقیم پر ڈالا ہے میں جو کچھ بھی کروں گا عقیدتہً کروں گا، آپ میرا دل نہ توڑیئے"

آپ نے جواب دیا "میں تیرا دل نہیں توڑ رہا ہوں بلکہ وہی کر رہا ہوں جس کا میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے"

مرید کو بڑا قلق ہو رہا تھا، کمزور دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "خدا کے لئے اس ہلتی ہوئی دیوار سے ڈریئے"

آپ نے جواب دیا "میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں اور کسی سے نہیں"

مرید نے عرض کیا "ظاہر ہے میں آپ سے درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں" لیکن آپ نے مرید کی بات نہیں مانی۔

آپ دیوار کے سائے میں بیٹھے وعظ فرما رہے تھے "لوگو! لمحے ساعتوں میں ساعتیں گھڑیوں میں اور گھڑیاں پہروں میں، پہر دنوں میں اور دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں بدلتے جا رہے ہیں جو آیا ہے اُسے جانا بھی ہے جس نے زندگی کا مزہ چکھا ہے اُسے موت کا مزہ بھی چکھنا ہے، لوگو! میں ان پر حیران ہوں جو ہنستے ہیں اور اُن سے زیادہ اُن پر حیران ہوں جو قہقہے لگاتے ہیں واللہ اگر عرفانِ ذات اور عرفانِ کائنات حاصل ہو جائے تو وہ مسکرانا اور قہقہے لگانا بھول جائیں گے"

ایک مرید نے پوچھا "ہمیں زندہ رہنے کے لئے سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے اس لیے یہ بتلایئے کہ ہم صاف ستھری زندگی کس طرح بسر کریں؟"

آپ نے جواب دیا "اگر تم یہ سمجھ لو کہ تم پل صراط عبور کر رہے ہو تو تم زندگی اور دنیا میں صحیح زندگی گزار سکو گے کیونکہ پل صراط پر چلنے والا نہ تو ہنس سکتا ہے اور نہ ہی

قہقہے لگا سکتا ہے۔

اس وقت دیوار نے ہلنا اور گرنا شروع کر دیا۔ مرید بھاگ کر اِدھر اُدھر ہو گئے اور دیوار گرتے گرتے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اس کا ایک حصہ بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف گرا لیکن جہاں آپ بیٹھے تھے وہ جگہ محفوظ رہی آپ نے اپنا سامان سمیٹا اور صدر دروازے والے حصے پر منتقل ہو گئے یہاں چھت پڑی تھی مگر یہ بھی بہت زیادہ بوسیدہ تھی آپ کے مریدوں نے عاجز آ کر عرض کیا "حضرت! آخر آپ ہماری بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آپ ہم میں سے جس کے گھر میں بھی رہنا چاہیں چل کر رہیں اور اس بوسیدہ مکان کو چھوڑ دیں۔"

آپ نے جواب دیا: "افسوس کہ جیسا میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اپنا آبائی مکان نہیں چھوڑ سکتا۔"

ایک مرید نے کہا "تب پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس حصے کی چھت نئی ڈلوا دوں کیوں کہ یہ بہت بوسیدہ ہے اور اگر گری تو یہ آپ کے اوپر ہی گرے گی۔"

آپ نے جواب دیا "اب میری زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے جو میں نئی چھت کی فکر کروں۔"

ایک دن آپ کو ان کے مریدوں نے دیکھا کہ دھوپ میں بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ انہیں خوشی ہوئی کہ چلئے آپ نے مخدوش چھت سے کنارہ کشی تو اختیار کی لیکن آپ کے بعض مریدوں کو اس پر بہت قلق ہوا کہ آپ دھوپ میں بہت پریشان ہو رہے ہیں ایک مرید نے درخواست کی "حضرت! آپ سائے میں تلاوت فرمائیں اس ضعیفی میں دھوپ آپ کی صحت بگاڑ دے گی۔"

آپ نے جواب دیا "میں نے زندگی بھر اپنے نفس کا کہا نہیں کیا۔ اس وقت بھی میرے نفس کی یہی خواہش ہے کہ میں سائے میں چلا جاؤں، لیکن میں زندگی کے ان آخری لمحوں میں نفس کی بات مان کر پوری زندگی کے اعمال برباد نہیں کروں گا۔"

آپ نے اپنے مریدوں سے کہا "دیکھو جب میں مر جاؤں تو مجھے میرے اس مکان کی دیوار تلے دفن کر دینا۔"

مریدوں نے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنا شروع کر دیں۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے "کیا آپ رحلت فرمانے والے ہیں؟"

"شاید باتوں سے تو یہی معلوم ہو رہا ہے۔"

"لیکن کب؟ کیا دو چار دن میں، یا دو چار ہفتوں میں۔"

"کچھ پتہ نہیں لیکن شاید ایک آدھ ماہ میں۔"

اس دن آپ کے مرید آپ کے پاس نصف رات تک موجود رہے۔

اس رات ایک مرید نے خواب میں دیکھا کہ آپ فضا میں پرواز کر رہے ہیں، جاگنے کے بعد اس نے سوچا کہ خدا نے آپکا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے وہ علی الصباح اپنا خواب بتانے آپ کے پاس پہنچا، وہاں بہت سے مرید جمع تھے اور بوسیدہ چھت کے نیچے لوبان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے، ایک مرید نے اعلان کیا "حضرت وصال فرما چکے ہیں۔"

خواب دیکھنے والے مرید نے دوسرے مریدوں کو اپنا خواب سنایا اور با آواز بلند بتایا کہ "مجھے میرے خواب کی تعبیر مل چکی ہے میں نے رات آپ کو پرواز کرتے دیکھا تھا چنانچہ آپ نے عالم بالا کا سفر اختیار کیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔"

آپ کے مریدوں نے آپ کو وصیت کے مطابق ان کے آبائی مکان ہی کی ایک دیوار کے نیچے دفن کر دیا۔

کہتے ہیں وہ بوسیدہ چھت بھی اسی دن زمین بوس ہو گئی۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

سکینۃ الاولیاء شہزادہ دارا شکوہ	تذکرۃ الاولیا شیخ فرید الدین عطار	طبقات الکبریٰ علامہ شعرانی	خزینۃ الاصفیا۔ مفتی غلام سرور لاہوری	تذکرہ اولیائے کرام ریکمل محمد جعفری

حضرت فضیل بن عیاض رح

ٹاٹ کا لباس جسم پر تھا اور اونی ٹوپی سر پر، وہ مصلے پر بیٹھے تسبیح پڑھنے میں مشغول تھے نورانی چہرے کی معصومیت ایسی نہ تھی کہ دیکھنے والے اس سے متاثر نہ ہوتے۔ ان کے چاروں طرف جنگل کی تنہائی تھی، سناٹا تھا کسی کسی لمحے چڑیوں کی چہکار سے سکوت و سکون تہہ و بالا ہو جاتا۔ قافلوں کے لئے یہ جنگل بہت مخدوش اور خطرناک تھا۔ جنگل کے بیچوں بیچ قافلوں کی گزرگاہ کی جو ایک پٹی سی پائی جاتی تھی اسے لوگ موت کی شاہراہ کہتے تھے کیونکہ اس شاہراہ کے آس پاس کہیں جنگل میں مشہور راہ زن فضیل بن عیاض اور ان کے ساتھیوں کا مسکن تھا اور اس راہ سے بہت کم قافلے صحیح سلامت بچ کے نکل سکتے تھے جنہیں اپنا تحفظ عزیز ہوتا اور حد درجہ احتیاط پسند ہوتے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیئے طول طویل راہیں اختیار کرتے اور اس قریب کی راہ سے گریز کرتے لیکن بعض کے لیئے تو یہ جنگل کی راہ ناگزیر تھی اور وہ ہر حال میں اس موت کی شاہراہ پہ چلنے کے لئے مجبور ہوتے۔ ایک ایسا ہی قافلہ خچروں اور اونٹوں پر سامان تجارت لادے ہوئے جنگل میں داخل ہو گیا اونٹوں کے گلوں کی گھنٹیاں اتار لی گئی تھیں اور قافلے والوں نے از راہِ احتیاط اپنے اپنے ہتھیاروں کو ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ کیوں کہ انہیں صبح طلوع ہونے والے سورج کی ابدی حقیقت کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ فضیل بن عیاض اور اس کے ساتھی اہل قافلہ پر حملہ آور ہوں گے اور ان سے اپنی جان اور مال کی حفاظت کے لئے باقاعدہ جنگ ناگزیر ہو گی اس قافلے میں ایک عمر رسیدہ بزرگ ضرورت سے زیادہ ہوشیار اور پیش بین تھے انہوں نے سوچا کہ حملہ آور بہت زیادہ چالاک لوگ ہیں اور ان کی چالاکیوں اور جنگجویانہ مہارتوں پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا اہل قافلہ نے سمجھ رکھا ہے انہوں نے جنگل میں داخل ہوتے ہی ایک نورانی شکل صورت کے بزرگ کو مصلے پر نماز اور تسبیح پڑھتے جو دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور ان بزرگ کی اس شانِ بے اعتنائی اور بے نیازی نے ان تاجروں کو بہت

زیادہ مرعوب اور متاثر کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ جو شخص اتنی ہمت بے باکی اور بے خوفی سے اس جنگل میں تنہا رہ رہا ہے وہ یقیناً کوئی چیز ہوگا اس تاجر نے اپنی قیمتی چیزیں اور اشرفیاں ایک بڑی چادر میں باندھ لیں اور انہیں لئے ہوئے ان صاحب کے روبرو پہنچ گئے یہ صاحب کچھ دیر چپ چاپ کھڑے ہو کے ان بزرگ کی شکل دیکھتے رہے پھر جب انہوں نے سلام پھیرا تو یہ صاحب ان بزرگ کے سامنے پہنچ گئے اور خوشامدانہ عرض کیا "حضرت! میں ایک مسافر ہوں اور میرے پاس کافی مقدار میں سامان اور اشرفیاں موجود ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دیندار انسان ہو اس لئے میری مدد کرو۔ میں تمہیں زندگی بھر دعائیں دیتا رہوں گا۔"

ان بزرگ نے تسبیح کا وظیفہ ختم کر کے اس تاجر بوڑھے کو غور سے دیکھا اور سوال کیا "تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے جانتے ہو؟"

تاجر نے جواب دیا "ہاں، میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور میں کیا تمہیں جو شخص دیکھے گا پہچان لے گا تمہارے چہرے پر جو نورانی تقدس پایا جاتا ہے وہ ہر ایک کو صید کر سکتا ہے۔"

ان بزرگ نے پھر اپنے مخاطب تاجر کو کنکھیوں سے دیکھ کر منہ پھیر لیا اور آہستہ سے کہا "تم میرے پاس جس مقصد سے آئے ہو میں جانتا ہوں بولو تم کیا چاہتے ہو؟"

تاجر نے جواب دیا "میں اپنا قیمتی سامان اور اشرفیاں تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں کیونکہ جنگل کے قزاق ہم پر حملہ آور ہوں گے تو وہ تم جیسے قلندر اور مست و بے نیاز انسان سے کچھ پوچھنا بھی گوارا نہ کریں گے اور میرا مال اور نقدی محفوظ رہ جائیں گے حالات کے سدھرتے ہی میں اپنی امانت تم سے حاصل کر کے اپنے گھر کی راہ لوں گا۔"

ان بزرگ نے کہا "میں تمہاری درخواست ماننے پر مجبور ہوں تم اپنا قیمتی سامان اور اشرفیاں میرے حوالے کر جاؤ میں اپنی جان کی طرح ان کی حفاظت کروں گا، تم بے فکر رہو۔"

تاجر نے اپنا ضروری سامان اور اشرفیوں کی تھیلیاں اس بھولی بھالی شکل والے بزرگ کے حوالے کر دیں اور خود بھاگ کے قافلہ میں شامل ہو گیا۔

سورج نکلنے سے ذرا پہلے قافلہ جنگل کی درمیانی راہ پر آہستہ آہستہ چوروں کی طرح رواں دواں تھا۔ لوگ نہایت ہوشیاری کے ساتھ، ڈاکوؤں سے بچ کر نکل جانا چاہتے تھے لیکن عین اس جگہ جہاں املی اور برگد کے بڑے بڑے گھنیرے درختوں کی بہتات تھی سرسراہٹ اور کھڑکھڑاہٹ کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی قافلے والوں کے کان کھڑے ہو گئے پھر یکایک

ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے آدمیوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا ہے ۔ درختوں کی آڑ سے آدمی اس طرح نمودار ہونے شروع ہو گئے گویا انہیں درخت جنم دے رہے ہوں یہ ہاتھوں میں ننگی تلواریں اور نیزے لیئے قافلے والوں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے انہوں نے آتے ہی قافلے والوں کو لرزانا سہمانا شروع کر دیا۔ پہلے تو قافلے والوں نے اُن کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن ڈاکوؤں کی ہیبت اُن پر غالب آگئی اور جب قافلے کے چند آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے تو تاجروں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے چیخ چیخ کر ڈاکوؤں کو مطلع کیا کہ تم لوگ ہم سے ہمارا سب کچھ لے لو لیکن ہماری جانیں مت لو ۔

کسی ڈاکو نے حکم دیا۔ ”تم سب لوگ اپنے مال اسباب کے پاس سے ہٹ کر دور چلے جاؤ اور اپنی اپنی پشت ادھر کر کے کھڑے ہو جاؤ اور پھر جب حکم دیں تو واپس آ کے اپنا بچا کھچا سامان لے کر فوراً رفوچکر ہو جاؤ “

ڈرے سہمے قافلے والوں نے یہی کیا اور اپنے سامان کے پاس سے دور چلے گئے انہوں نے ڈاکوؤں کی طرف اپنی پشتیں کر لیں ۔ اور ڈاکوؤں نے اُن کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا کچھ ڈاکوؤں نے قافلے والوں کو گھیرے میں لے کر ان کے ہتھیار چھین لئے اور ان کی جامہ تلاشی شروع کر دی اور ان کے نقد رقوم چھین لیں کافی دیر بعد انہیں حکم ملا کہ وہ اپنے بچے کھچے سامان کو لے کر اس جنگل سے فوراً نکل جائیں، لٹے ہوئے قافلے والے اپنے سامان کے پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ ستو اور کھجور کے کچھ تھیلے چھوڑ دیئے گئے ہیں ۔ ڈاکو ان کی بار برداری کے جانور تک لے گئے تھے ان افسردہ اور غمزدہ قافلے والوں کو کسی ڈاکو نے باآواز بلند حکم دیا ” بزدلو! ستو اور کھجور کے تھیلے اس لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ تم آبادیوں میں داخلے تک بھوکے پیاسے نہ رہو اور ہمیں یقین ہے کہ تم لوگ کتنے ہی ناشکرے کیوں نہ ہو، ہمارے اس احسان کو زندگی بھر نہ بھولو گے “

اس کے بعد ڈاکو سارا سامان لے کر جنگل کی گہرائیوں میں گم ہو گئے اور قافلے والے شکستہ و افسردہ اپنا بچا کھچا سامان لے کر چلنے کی فکر کرنے لگے ۔ جس تاجر نے ڈاکوؤں کے ڈر سے اپنا سامان اور اشرفیاں پہلے ہی ایک متقی پرہیزگار کے پاس امانتاً رکھوا دیا تھا وہ اب بھی مطمئن تھا اس نے قافلے والوں سے کہا ” بھائیو ! تم لوگ تھوڑی دیر میرا انتظار کر لو میں ابھی آتا ہوں “

کسی دل جلے قافلے والے نے کہا ” کیوں؟ کیا اس جنگل میں مزید ٹھہر کر ہم سب کو جان

سے مروا دینا چاہتے ہو ؟"

تاجر نے جواب دیا "نہیں، مجھے اس جنگل میں ایک صاحب سے ملاقات کرنی ہے اور اُن سے ملے بغیر میں نہیں جا سکتا"

ایک دوسرے تاجر نے کہا "اس جنگل میں تیرا کون دوست ہے؟ تو کیسی پُراسرار باتیں کر رہا ہے اپنی سمجھ میں تو تیری یہ بات آتی نہیں"

تاجر نے سوچا کہ جب وہ اپنی امانت والی چیزیں لے کر قافلے میں واپس آئے گا تو لوگ اس کے بارے میں معلوم نہیں کیسی کیسی چہ میگوئیاں کریں اور وہ اس کی صفائی پیش کرتے کرتے پریشان ہو جائے، اس لیئے اس نے سب کچھ صاف صاف بتا کے قافلے والوں سے کہا "اب ڈاکو جا چکے ہیں اس لئے میں اپنی چیزیں اور اشرفیاں ان بزرگ سے لے کر واپس آتا ہوں"

انتہائی سوگوار ہونے کے باوجود چند آدمی اپنی ہنسی نہ روک سکے، زور زور سے ہنسنے لگے ایک نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کہا "بھائی! تم اتنے احمق ہو! کمال ہے۔ یعنی کیا تم واقعی یہ یقین رکھتے ہو کہ وہ پرہیزگار بہروپیا تمہاری چیزیں تمہیں واپس کر دے گا ارے بھائی تمہاری سمجھ میں اتنی سی بات نہ آئی کہ اس جنگل میں، جہاں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہو کوئی کس طرح رہ سکتا ہے اور پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ چلو کوئی تارک دُنیا دنیا کو چھوڑ چھاڑ واقعی اس جنگل میں آن بسا ہے تو تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ جس شخص نے دنیا سے بیزار ہو کر اسے ٹھوکر مار دی ہو، وہ اس مردُود دنیا کی آزمائشی اور سختی چیزیں امانتاً اپنے پاس رکھ کر خواہ مخواہ کی فکر کیوں مول لے گا"

تاجر غریب ڈر گیا ساری باتیں اب اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھیں اس کے ہوش و حواس اڑ گئے وہ فوراً بھاگا ہوا اس متقی کے پاس پہنچا لیکن اب تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا، جس جگہ ایک پرہیزگار اور متقی انسان ٹاٹ کا لباس اور اُونی بالوں کی ٹوپی پہنے تسبیح پڑھنے میں مشغول تھا اب وہاں لٹیروں کا ہجوم تھا اُن کے سامنے لوٹا ہوا سامان ڈھیر تھا اور ڈاکوؤں کا سردار اسے اپنے ساتھیوں میں مساویانہ تقسیم کا کام انجام دے رہا تھا اس نے آنکھیں مل مل کے کئی بار ڈاکوؤں کے سردار کو دیکھا اور جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو وہی شخص تھا جسے اس نے اپنی چیزیں امانتاً رکھنے کو دی تھیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پریشانی اور مایوسی نے اختلاج کی سی کیفیت پیدا کر دی

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے اسے سکتہ سا لگ گیا تھا جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اب وہ نہ تو آگے بڑھ کر اپنی چیزیں مانگ سکتا تھا اور نہ ہی ملامت شرم و ندامت کے اپنے قافلے میں واپس جا سکتا تھا وہ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔ کسی ڈاکو نے اس عجیب و غریب آدمی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر مذاق کیا، پوچھا "بھائی! تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ خیریت تو ہے؟

کسی دوسرے ڈاکو نے مذاق کیا "اسے ہمارا پیشہ پسند آ گیا ہے شاید یہ بھی ہمارے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے"

ان چہ میگوئیوں پر ڈاکوؤں کے سردار نے بھی اس شخص کی طرف دیکھا اور اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، وہ ہنسنے لگا، پوچھا "کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے میرے پاس تو آؤ"

تاجر، ڈاکوؤں کے سردار کے پاس چلا گیا اور چپ چاپ اس کی صورت دیکھنے لگا۔ سردار نے پوچھا "کیا بات ہے؟ تم میری صورت کیوں تک رہے ہو؟"

تاجر نے افسوس کے ساتھ جواب دیا "میں سوچ رہا ہوں کہ میں بھی کتنا احمق انسان ہوں کہ صورت شکل اور وضع قطع دیکھ کر دھوکا کھا گیا اور اپنی دولت اپنے ہی ہاتھوں ایک قزاق کے حوالے کر دی"

قزاق نے ترشی سے کہا "جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے یا اور کچھ بھی کہنا ہے؟"

تاجر نے جواب دیا "مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ یہ دھوکا میں نے اللہ کے نام پر کھایا ہے اس لیئے میں زیادہ افسوس بھی نہیں کروں گا کیونکہ میرے پاس جو کچھ بھی تھا اللہ کا دیا ہوا تھا اور شکر ہے کہ گیا بھی تو اسی کے نام پر"

قزاق نے حیرت اور ندامت کے ملے جلے تاثر کے ساتھ تاجر کی طرف دیکھا اور کسی فکر میں ڈوب گئے۔ لٹیرے ان کی شکل اور اندرونی کشمکش کو شدت سے محسوس کر رہے تھے تاجر نے سردار سے کہا "سردار! اب میں واپس جا رہا ہوں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں جس کا جو پیشہ ہے وہ اس پر کاربند ہے اور جب خدا نے خود ہی یہ فرما دیا ہے کہ اس سے جو شخص جس طرح بھی روزی طلب کرے گا خدا اسی طرح دیگا تم خدا سے حرام کی روزی طلب کرتے ہو خدا تمہیں حرام کی روزی دے رہا ہے۔"

سردار نے کہا "بہت بکواس کر چکے۔ تم اپنی جتنی چیزیں امانتاً رکھوا گئے تھے وہ ساری سامنے درخت کی آڑ میں رکھی ہیں، انہیں اٹھا لو اور رفو چکر ہو جاؤ"

تاجر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور وہ تذبذب اور شک کی نظروں سے سردار کی صورت دیکھنے لگا۔ سردار نے سختی سے کہا "کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟ میں کہتا ہوں تم اپنی چیزیں سنبھالو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

تاجر اس درخت کے پیچھے گیا تو وہاں واقعی اس کا سارا سامان جوں کا توں رکھا ہوا تھا اس نے اپنا سامان سنبھالا اور اسے لے کر اپنے قافلے میں واپس چلا گیا۔ قافلے والوں کو اس واقعے پر یقین نہیں آیا۔ قزاق اور اتنا بڑا امین، لٹیرا اور اپنے قول و قرار کا اتنا زیادہ پابند، ڈاکو اور اخلاقی عہد و پیمان کا اتنا سچا۔

دوسری طرف اپنے سردار کے رویئے پر ڈاکو بھی کچھ کم حیران نہیں تھے انہوں نے سردار سے پوچھا "سردار! یہ کیا بات تھی؟ آپ نے اس شخص کا سامان الگ کیوں رکھ چھوڑا تھا اور اسے واپس کیوں کر دیا؟ کیا اس میں ہم سب کا حصہ نہیں تھا؟"

سردار نے جواب دیا "کیا تم نے اس تاجر کی باتیں نہیں سنیں، اس نے مجھے جو کچھ دیا تھا، خدا کے اعتماد پر دیا تھا پھر کیا یہ بات مجھے زیب دیتی تھی کہ میں اس کے اتنے بڑے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا؟"

ڈاکوؤں نے کہا "سردار! ہم سب اور تو کچھ جانتے نہیں، ہاں یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس جنگل میں مقدر نے جس پیشے سے ہمیں وابستہ کر رکھا ہے اس پر پوری دیانت اور مستعدی سے ڈٹے رہیں، آپ کو وہ سامان اس تاجر کو نہیں واپس کرنا چاہیئے تھا۔"

سردار نے غصے میں کہا "تم لوگ میرے ماتحت ہو اس لئے کسی بھی معاملے میں آخری فیصلہ میرا ہی ہوگا اور اسے تم سب کو ماننا پڑے گا۔"

ڈاکو چپ ہو گئے لیکن سردار کی حالت کچھ متغیر ہوتی رہی سردار کے ایک عورت سے عشقیہ تعلقات تھے یہ اپنے حصے کا سامان اور نقدی لے کر اس عورت کے پاس پہنچ گئے اس کی خدمت میں بہت کچھ پیش کرتے ہوئے نہایت کرب سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح سکون حاصل کروں؟ میں بہت پریشان ہوں۔"

عورت نے پوچھا "آخر ہوا کیا؟ کچھ تفصیل سے بتاؤ تو شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں۔"

سردار نے عورت کو پورا واقعہ سنا دیا اور آنکھیں بند کر کے کسی فکر میں گم ہو گیا۔ عورت نے ٹھنک کر کہا "تم بھی عجیب آدمی ہو آخر اس میں کونسی ایسی بات تھی جس نے تمہیں اتنا پریشان کر دیا

ہے حالانکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے موجودہ پیشے اور زندگی میں ایسے بے شمار واقعات پیش آتے رہتے ہوں گے کہ تم ان پر اس واقعے سے زیادہ ماتم کر سکتے ہو، لیکن تم ان پر شاید کبھی غور بھی نہ کرتے ہو گے "

سردار نے جواب دیا " ہاں تم جو کچھ کہہ رہی ہو اس سے میں بھی واقف ہوں لیکن معلوم نہیں کیوں، اس واقعے نے میرے پورے وجود کو ہلا کے رکھ دیا ہے "

عورت نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا " اگر تم کو یہ ذرا سا واقعہ اتنا پریشان اور خوفزدہ کر سکتا ہے تو مجھے ڈر ہے کہ کسی دن کسی بات پر تم مجھ سے بھی متنفر ہو سکتے ہو "

" ہاں " سردار نے کہا " میرا دل اندر سے لرز رہا ہے اور یہ خوف کسی دن بھی میری دنیا کو بدل کے رکھ دے گا - بتاؤ میں کیا کروں ؟ "

عورت نے ہنس کر کہا " دُنیا کڑھنے جلنے کی جگہ نہیں ہے خوش و خرم رہو اور غموں کو پاس نہ پھٹکنے دو، بس یہی کامیاب زندگی گزارنے کا راز ہے "

سردار کافی دیر بیٹھا آنسو بہاتا رہا اور عورت اسے تسلی دلاسے دیتی رہی۔

اس جنگل سے ایک قافلہ گزرا اور اسے بھی لوٹ لیا گیا لٹے پٹے اہل قافلہ میں سے کسی نے ڈاکوؤں سے پوچھا " تمہارا سردار کہاں ہے ؟ "

کسی ڈاکو نے کہا " سردار سے کیا کام ہے ؟ "

قافلے والے نے کہا " میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں "

ڈاکو زور زور سے ہنسنے لگا، بولا " ہمارا سردار تو ذرا اللہ والا ہو گیا ہے "

" کیا مطلب ؟ " قافلے کے تاجر نے پوچھا۔

ڈاکو نے کہا " وہ اس ڈاکے میں شریک نہیں تھا وہ ہمارا سردار تو ضرور ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے اس میں بڑا فرق آگیا ہے چنانچہ ہم لوگ تو یہاں ڈاکہ مار رہے ہیں وہ دریا کے کنارے نماز پڑھ رہا ہو گا "

" نماز پڑھ رہا ہو گا " قافلے کے تاجر نے حیرت سے پوچھا " کیا وہ نماز بھی پڑھتا ہے ؟ "

" ہاں نماز بھی پڑھتا ہے اور روزے بھی رکھتا ہے چنانچہ وہ اس وقت بھی روزے سے ہے "

"لیکن یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے"

"ہاں یہ بھی صحیح ہے لیکن وہ عموماً روزے سے رہتا ہے"

"کمال ہے اگر کوئی اس سے ملنا چاہے تو ملاقات کس طرح کی جا سکتی ہے؟"

ڈاکو نے جواب دیا۔ "ان سے مل کر تم بات کیا کرو گے؟"

تاجر نے کہا۔ "یہ تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو، تم لوگ قافلے کو تو لوٹ ہی چکے ہو میں اس سے لوٹا ہوا مال بھی نہیں مانگوں گا بلکہ میں اس عجیب و غریب شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تب پھر تم میرے ساتھ آؤ" ڈاکو نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے سردار کے پاس لئے چلتا ہوں لیکن خبردار جو تم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات کی۔"

ڈاکو اسے ساتھ لے کر دریا کے کنارے پہنچ گیا، ڈاکوؤں کا سردار نماز پڑھ کر اسی وقت فارغ ہوا تھا، ڈاکو نے تاجر کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا بولا۔ "سردار! آج جو قافلہ لوٹا گیا تھا یہ اس قافلے کا ایک تاجر ہے اور معلوم نہیں کیوں یہ شخص اس بات پر مصر ہے کہ اسے آپ سے ملوایا جائے، میں مجبور ہو کر اسے آپ کے پاس لایا ہوں۔"

سردار نے تاجر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

تاجر اس عبادت گزار قزاق کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھتا رہا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔

سردار نے اکتاہٹ سے کہا۔ "تم بتاتے کیوں نہیں کہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

تاجر نے پوچھا۔ "کیا تم واقعی نماز روزے کے پابند ہو؟"

سردار نے جواب دیا۔ "بحمداللہ۔ لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

تاجر نے کہا۔ "حیرت ہے کہ قزاقی اور تقوے نے ایک ہی دل میں کیونکر گھر کر لیا ہے"

سردار نے کہا۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ پھر پوچھا۔ "کیا تم قرآن پاک پڑھ سکتے ہو؟"

تاجر نے جواب دیا۔ "ہاں میں قرآن پاک پڑھ سکتا ہوں لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

سردار نے کہا۔ "ذرا اس آیت کا مطلب تو سمجھانا" اس کے بعد آیت پڑھی۔

تاجر نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ دوسروں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے عمل صالح کو اس کے ساتھ خلط ملط کر دیا"

سردار نے کہا "ہاں اور اس لئے میں اپنے عمل صالح (نماز روزے) کو اپنے گناہوں سے الگ تھلگ رکھنے لگا ہوں"

تاجر نے افسوس سے کہا "سردار میری خدا سے دعا ہے کہ تم اس وقت جو کچھ نظر آ رہے ہو ہر جگہ یہی نظر آؤ"

تاجر تو یہ کہہ کر چلتا بنا لیکن سردار نے اس کے بعد اپنے ساتھیوں کو حکم دیدیا کہ آج سے لوٹ مار میں ایک احتیاط بھی روا رکھی جائے گی، اور کچھ نئے اصول بھی داخل رہزنی سمجھے جائیں گے"

لٹیرے اپنے سردار کی تبدیلی سے خوش نہیں تھے، پوچھا "کونسی احتیاط؟ کیسے نئے اصول؟"

سردار نے کہا "اب تک تو یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جب کوئی قافلہ لوٹا جاتا تھا تو قافلے کا ہر فرد لوٹا جاتا تھا لیکن اب قافلے کی عورتوں کو نہیں لوٹا جائے گا اور قافلے کے ہر فرد کو اس طرح لوٹا جائے گا کہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ رہنے ضرور دیا جائے گا!"

سردار کے حکم کے خلاف کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن سردار کا یہ حکم ٹھگوں نے خوشدلی سے نہیں سنا ان کی سمجھ میں راہزنی کی یہ اخلاقیات بالکل نہیں آ رہی تھیں اور اس کے بعد واقعی اس اصول پر سختی سے عمل کیا گیا قافلے کی عورتوں کو لوٹنا ترک کر دیا گیا اور کسی بھی قافلے کو پوری طرح نہیں لوٹا جاتا تھا جب قزاقوں کے اس اخلاقی عمل کا لوگوں میں زیادہ چرچا ہوا تو انہوں نے اپنے قافلوں میں عورتوں کی بڑی تعداد کو شامل کرنا شروع کر دیا اور تجارت کا زیادہ سے زیادہ مال ان عورتوں ہی کے سپرد کر دیا جاتا جو لٹیروں کی لوٹ مار سے صاف بچ جاتا۔

ایک دن علی الصباح کسی مخبر نے سردار کو خبر دی کہ ایک بہت بڑا قافلہ شام تک وہاں پہنچنے والا ہے۔

سردار نے پوچھا "اس میں عورتیں کتنی ہیں؟"

مخبر نے جواب دیا "شاید ایک بھی نہیں"

"اس کے مال تجارت کتنا ہے؟"

مخبر نے کہا "شاید اتنا زیادہ کہ آج تک کسی قافلے میں اتنا سامان نہ رہا ہوگا"

سردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ "دوستو! اپنے اسلحہ تیز کرلو اور گھوڑوں کو خوب اچھی طرح کھلا پلا کے شام تک کے لئے آرام کی خاطر چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سب یہیں جنگل میں اِدھر اُدھر روپوش ہو جائیں گے اور وہ قافلہ جیسے ہی یہاں پڑاؤ کرے گا ہم سب اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر اس کا محاصرہ کرلیں گے اگر قافلے والوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی تو ہم اُن کے مال کا کچھ حصہ ان کے حوالے کردیں گے لیکن اگر انہوں نے ہمارا مقابلہ کیا تو ہم انہیں بے دریغ قتل کر کے ان کا مال اسباب لوٹ لیں گے"

ساتھیوں نے خوشی میں ناچنا گانا شروع کر دیا اور سردار اپنے گھوڑے کو اڑاتا ہوا دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے وضو کیا اور نفلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ شام سے ذرا پہلے سردار اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو وہاں یہ دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہو گئی کہ ڈاکوؤں نے اپنے گھوڑوں کو بھی اِدھر اُدھر چھپا دیا تھا اور خود بھی ادھر ادھر درختوں پر چھپے بیٹھے تھے۔

سردار نے اپنے ساتھیوں کی گھات کا جائزہ لے کر کھلی جگہ میں مصلیٰ بچھایا اور نفلیں پڑھنے لگا مغرب سے ذرا پہلے سامنے کے میدان سے گرد و غبار اٹھنا شروع ہوا جس سے سردار نے یہ اندازہ لگایا کہ کچھ دیر بعد قافلہ ان کے قریب آنے والا ہی ہے چند لمحوں کے بعد گرد و غبار کے بادل میں سے آدمیوں اور جانوروں کا مجمع نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ ان کے قریب آنے لگا۔ پھر یہ لوگ اس متقی اور پرہیزگار لٹیرے کے پاس آکر خیمے نصب کرنے لگے انہیں اس بے خوف عبادت گزار کی موجودگی سے بڑی ڈھارس ملی تھی۔

قافلے کے ایک ذمے دار فرد نے سردار کے قریب جا کر اس بات کا انتظار کیا کہ جب وہ سلام پھیرے تو اس سے کچھ باتیں کرے۔ کچھ دیر بعد سردار نے سلام پھیرا تو قافلے کے امیر نے قزاق سردار سے پوچھا "بھائی! کیا تم یہیں کہیں رہتے ہو یا پھر ہم سب کی طرح تم بھی کسی قافلے سے تعلق رکھتے ہو؟"

قزاق سردار نے جواب دیا "میں بھی تمہاری طرح ایک تجارتی قافلے سے تعلق رکھتا تھا لیکن چونکہ اب وہ قافلہ یہاں سے جا چکا ہے اور میں اس سے بچھڑ چکا ہوں اس لئے میں

مجبوراً اس انتظار میں یہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ادھر سے کوئی اور قافلہ گزرے تو میں اس کے ساتھ ہو لوں اور کسی آبادی میں پہنچ کر کوئی منصوبہ بناؤں۔

قافلے کے امیر نے پوچھا۔ "تم کب سے یہاں پڑے ہوئے ہو؟"

قزاق سردار نے جواب دیا۔ "چار دن سے۔"

"چار دن سے!" قافلے کے امیر نے تعجب سے کہا۔ "کیا تمہیں یہاں ڈر نہیں لگا؟"

"ڈر کس بات کا؟" قزاق سردار نے کہا۔ "مجھے تو یہاں کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہوا۔"

قافلے کے سردار نے کہا۔ "میں نے یہ سنا ہے کہ اس راہ میں کہیں فضیل نامی قزاق اور اس کا گروہ رہتا ہے اور ہر گزرنے والے قافلے کو لوٹ لیا کرتا ہے کیا تمہیں وہ قزاقوں کا گروہ کہیں بھی نظر نہیں آیا؟"

قزاق سردار نے کہا۔ "مجھے تو یہاں ایک شخص بھی نہیں دکھائی دیا میں فضیل قزاق کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہاں یہ بات تم خود سوچ سکتے ہو کہ اگر اس جنگل میں فضیل اور اس کا گروہ واقعی موجود ہوتا تو میں اتنے بہت سارے قیمتی سامان کے ساتھ تنہا نہ رہ جاتا۔"

قافلے کے امیر نے اطمینان کی سانس لی بولا۔ "خدا کا شکر ہے کہ یہاں کہیں فضیل نہیں ہے ورنہ ہم سب کی جانیں خطرے میں ہوتیں۔"

قزاق سردار نے کہا۔ "اگر تم چاہو تو میری بتائی ہوئی جگہ پر پڑاؤ ڈالو کیا مجال جو فضیل یا اس کا کوئی ساتھی تمہیں ستانے آئے میں بالکل پسند نہیں کرتا کہ آدمی ضرورت سے زیادہ محتاط اور ہوشیار ہو جائے اور جب آدمی اپنے خدا کے سوا اپنی عقل، تدابیر اور فکروں پر بھروسہ کرنے لگتا ہے خدا اسے وہیں شرمسار اور نادم کر دیتا ہے اس لیئے میں تم لوگوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ کسی انسان یا کسی انسانی گروہ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اسی طرح اپنے خدا سے تمہیں جو کچھ کہنا ہو سجدے میں گر جاؤ اور رو رو کر اس سے گریہ وزاری کرو کہ وہ تمہیں فکروں اور الجھنوں سے نجات دے۔ یہی میں بھی کرتا ہوں یہی تم بھی کرو، اللہ نے چاہا تو سکون ہی سکون میسر آ جائے گا۔ اور تم انسان سے ڈرنا چھوڑ دو گے۔"

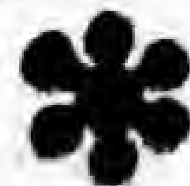
قافلے کے امیر پر ان نصیحتوں نے بڑا اثر کیا اور اس نے قزاق سردار کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ لوگ پڑاؤ ڈال کے اطمینان سے آرام کرنے لگے اور قزاق سردار اپنے ساتھیوں میں جا کے انہیں لوٹ مار کی ہدایات دینے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "میں

نے قافلے کے امیر پر خاصا اعتبار قائم کر لیا ہے اسی لئے میں اس کے پاس جا رہا ہوں اور میں اسے باتوں میں لگا کے جیسے ہی ایک زور دار سیٹی بجاؤں تم سب یکبارگی اس پر ٹوٹ پڑنا۔ اور قافلے کو جتنی جلدی لوٹ سکنا، لوٹ لینا اور ہاں ایک بات اور یاد رکھنا، اس قافلے کے کسی بھی فرد کو معاف نہیں کرنا ہے۔

ڈاکو اپنی اپنی جگہوں پر مستعد ہو کے جا بیٹھے اور ان کا سردار ایک بار پھر امیر قافلہ کے پاس جا پہنچا۔ اس وقت امیر قافلہ قرآن پاک پڑھ رہا تھا یہ اس کے قریب جا بیٹھا اور قرآن پاک سننے لگا تھوڑی دیر بعد امیر قافلہ نے یہ آیت پڑھی۔ (اہل ایمان کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب اللہ کے ذکر سے خوفزدہ ہو جائیں)۔

قزاق سردار کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں نشتر اتار دیا گیا ہو۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا اور کئی بار اس آیت کو زیر لب دھراتا رہا۔ پھر خیمے سے باہر نکل گیا اور خود سے مخاطب ہو کر کہا "فضیل! یہ غارت گری اور لوٹ مار کا کھیل تو کب تک کھیلتا رہے گا۔ کیا تیرے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو اس سے باز آجا اور توبہ کر کے اللہ سے رجوع ہو جا"۔

اس کا دل بھر آیا اور وہ اپنے گھوڑے کے پاس جا کے ہچکیاں لے لے کر روتا رہا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے ملے بغیر اس جنگل سے نکل گیا اور کسی صحرا میں چلا گیا لٹیرے رات بھر اپنے سردار کی سیٹی کا انتظار کرتے رہے اور جب صبح تک سیٹی کی آواز نہ سنائی دی تو وہ خوفزدہ ہو کے ادھر اُدھر روپوش ہو گئے اور قافلہ صحیح سلامت اس جنگل سے نکل گیا۔



جس صحرا میں یہ سردار پہنچا تھا وہاں بھی ایک تجارتی قافلہ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا قزاق سردار نے ایک خیمے سے آواز سنی، کوئی شخص کہہ رہا تھا "لوگو! سننے میں آیا ہے کہ اس راہ میں فضیل ڈاکو اور اس کا گروہ ڈاکے مارتا رہتا ہے ہمیں چاہیئے کہ اپنا راستہ بدل دیں"۔

قزاق سردار نے بآواز بلند خیمے والوں کو مخاطب کیا "خیمے والو! مجھے اندر

بلالو، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔"

ایک شخص خیمے سے باہر نکلا اور قزاق سردار سے پوچھا "تم کون ہو اور کس سے باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

قزاق سردار نے کہا "میں خیمے کے اس شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں جس نے ابھی ابھی فضیل ڈاکو سے پناہ مانگی تھی میں اس کے لئے ایک خاص خوشخبری لایا ہوں۔"

وہ شخص دوبارہ خیمے میں چلا گیا اور ذرا دیر بعد واپس آ کے کہا "چلو، خیمے کے اندر چلو، امیر قافلہ نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔"

قزاق سردار نے خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی حاضرین سے کہا "لوگو! فضیل ڈاکو کے ڈر سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ سننے میں آیا ہے کہ اس نے راہ زنی سے توبہ کر لی ہے اور اب وہ کسی کو بھی نہیں لوٹتا۔"

امیر قافلہ نے فکر و تشویش سے قزاق سردار سے پوچھا "تمہیں یہ خبر کس نے پہنچائی اور تم خود کون ہو؟"

قزاق سردار نے جواب دیا "مجھے یہ بات خود فضیل نے بتائی ہے کیونکہ فضیل میں خود ہوں۔"!

امیرِ قافلہ اچھل پڑا اور حاضرینِ خیمہ نے حیرت اور گھبراہٹ سے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

فضیل نے روتے ہوئے کہا "لوگو! تم میری بات کا یقین کرو میں نے لوٹ مار سے توبہ کر لی ہے اور اب میں ایک ڈرا ہوا خوفزدہ انسان ہوں اللہ کی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔"

فضیل اپنے فضیل ہونے کا انہیں یقین دلاتے رہے اور قافلے والے دیر تک ان کے فضیل ہونے پر شک و شبہے کا اظہار کرتے رہے اور انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر یقین آیا۔

فضیل قافلے کے ساتھ ہی بغداد پہنچ گئے اور وہاں کے قاضی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ قاضی لوگوں کے مقدمات نمٹانے میں مشغول تھا۔ یہ دیر تک ایک کونے میں بیٹھے رہے کافی دیر بعد جب قاضی کو کچھ فرصت ملی تو اس نے فضیل سے دریافت کیا "تم کون ہو؟"

اور تمہارا مدعا علیہ کہاں ہے ؟"

فضیل نے جواب دیا "میں خود ہی مدعی ہوں اور خود ہی اپنا مدعا علیہ "

قاضی نے حیرت سے فضیل کو گھورا اور دریافت کیا " اے شخص! تو کیسی واہی تباہی بک رہا ہے تو خود ہی اپنا مدعی ہے اور خود ہی مدعا علیہ بھی - آخر تو ہے کون اور کہنا کیا چاہتا ہے ؟"

فضیل نے جواب دیا " قاضی صاحب! میں فضیل ڈاکو ہوں وہ فضیل جس نے سینکڑوں قافلے لوٹے ہیں اور قافلوں کی گزرگاہوں کو برسوں مخدوش اور پُرخطر بنائے رکھا جس نے سینکڑوں انسانوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا اور ہزاروں کو خون کے آنسو رلا دیا "

قاضی جی چونک پڑے - فضیل کی شخصیت ایسی نہیں تھی جس سے قاضی ناواقف ہوتا اور بغداد کے قرب و جوار میں دُور دور تک فضیل کا نام خوف و دہشت کی علامت بنا ہوا تھا قاضی جی کو یقین نہیں آیا کہ اتنا نامی گرامی ڈاکو خود کو اس طرح قانون کے حوالے کر دے گا قاضی نے کہا " بھائی! میں کس طرح یقین کر لوں کہ مشہور زمانہ فضیل قزاق تم ہو اور پھر اگر فضیل واقعی تم ہی ہو تو پھر یہ خود کو قانون کے حوالے کرنا کیا معنی رکھتا ہے "

فضیل نے جواب دیا " میں نے اپنے پیشے سے توبہ کر لی ہے اور چاہتا ہوں کہ تم مجھے میرے اعمال کی سزا دو "

قاضی ان کی حالت زار سے مرعوب ہو گیا اس نے کہا " جب تک وہ لوگ مدعی نہ بنیں جنھیں تم نے لوٹا اور ستایا ہے میں اپنے طور پر تمہارے مقدمے کی کس طرح سماعت کر سکتا ہوں "

فضیل نے بے چینی سے کہا " میں جو کہہ رہا ہوں کیا میں اپنے بارے میں اتنے مذموم اور گندے اعمال کا غلط مدعی ہو سکتا ہوں میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا ہے، شدت انفعال سے میرا دل پگھلا جا رہا ہے "

قاضی نے جواب دیا " وہ سب کچھ صحیح لیکن میں بھی مجبور ہوں" کیونکہ تمہیں دوہری سزا دینے کا مجھے اختیار نہیں دیا گیا "

فضیل نے پوچھا - دوہری سزا کیسی ؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ؟"

قاضی نے جواب دیا " خدا نے تمہیں جس انفعالی عذاب میں مبتلا کر دیا ہے یہ ایک بدترین عذاب ہے جو تمہیں مل سکتی ہے اور میں اس سے بڑی سزا تمہیں نہیں دے سکتا۔

فضیل کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی بولے " قاضی! اگر تم واقعی مجھے سزا نہ دے سکے تو میں ہمیشہ ایک ایسے کرب میں مبتلا رہوں گا کہ میرا جینا حرام ہو جائے گا میرا سونا جاگنا کھانا پینا بے مزہ ہو جائے گا "

قاضی نے جواب دیا " اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کی ایک ترکیب ہے، لیکن وہ دشوار بہت زیادہ ہے "!

فضیل کی جان میں جان آئی جلدی سے پوچھا " کون سی ترکیب ؟ مجھے جلدی بتاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس اذیت ناک صورتحال سے میں بہر قیمت نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا "

قاضی نے کہا " تم نے اب تک جن لوگوں کو ستایا ہے یا لوٹا ہے ان کی ایک فہرست تیار کرو اور پھر ان کے گھروں پر جاؤ اور ان سے مل کر معافی مانگو اگر وہ تمہیں معاف کر دیں گے تو تم اس کرب اور اذیت سے نجات حاصل کر لو گے "

فضیل نے فکر مند لہجے میں کچھ سوچتے ہوئے کہا " کام تو بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس پر عمل کروں "

قاضی نے احترام کی نظروں سے فضیل کو دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں کہا " فضیل! جاؤ اور اس ترکیب پر عمل کرو۔ مجھے یقین ہے کہ جس خدا نے تمہیں اس بہترین کیفیت سے دوچار کیا ہے وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا "

فضیل شکستہ و درماندہ قاضی کے پاس سے چلے آئے اور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر تک پہنچے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دی اور کراہتے ہوئے بیوی کو آواز دی " بیوی دروازہ کھولو "

بیوی کو خیال گزرا شاید ان کا شوہر زخمی ہو کر آیا ہے اس نے فوراً دروازہ کھول دیا اور فضیل کے اندر داخل ہوتے ہی بے چینی سے سوال کیا " آپ کے کہاں زخم آیا ہے! لائیے زخم دکھائیے تاکہ میں مرہم پٹی کر دوں "

فضیل نے آہستہ سے جواب دیا " بیوی زخم جسم پر نہیں دل پر لگا اگر کر سکو تو اس

کی مرہم پٹی کر دو۔"

بیوی نے شوہر کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان کے دماغی توازن پر شبہ کر رہی ہو۔ پوچھا "دل پر زخم آیا ہے! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، میں اس زخم کی کس طرح مرہم پٹی کر سکتی ہوں۔"

فضیل نے کہا "تب پھر تم خدا سے دُعا کرو کہ مجھے اس اندرونی سوزش اور تکلیف سے نجات دے جس نے میرے پورے وجود کو درہم برہم کر رکھا ہے۔"

بیوی نے کہا "میں دُعا کر رہی ہوں، کاش خدا میری دُعا سُن لے۔"

فضیل نے کہا "ہاں اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کی ہے لیکن وہ بہت دشوار ہے لیکن میں یہ دوسری کوشش بھی کروں گا۔"

بیوی نے حیرت سے پوچھا "لیکن یہ بات کیا ہوئی جس نے تمہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

فضیل نے سارا واقعہ بیوی کو سنا دیا اور قاضی تک کی باتیں بتا کے کہا "اب تم ہی بتاؤ میں ان ستائے ہوئے آدمیوں کو کہاں کہاں تلاش کروں؟ اور پھر یہ بھی کیسے معلوم ہو کہ وہ مجھے معاف بھی کریں گے یا نہیں۔ اس کوشش میں یہ امکان بھی موجود ہے کہ کوئی دل جلا مجھے قتل ہی کر ڈالے۔"

بیوی نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔ بولی "قاضی نے جو ترکیب بتائی ہے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی اور تم اس ترکیب کے علاوہ کسی دُوسرے طریقے سے اس درد کا درماں نہیں حاصل کر سکتے۔"

فضیل نے اجازت طلب نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا "میرا یہ سفر شاید طویل ہوگا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کب تک واپس آؤں اور یہ بھی کسے معلوم کہ واپس بھی آؤں گا یا نہیں، تم ان تمام امکانات کو ذہن میں رکھ کر یہ فیصلہ کرو کہ تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی یا یہیں رہ جاؤ گی۔"

بیوی نے کہا "جی تو یہی چاہتا ہے کہ میں بھی ساتھ ہی چلوں لیکن یہ بھی تمہاری مرضی اور پسند پر منحصر ہے کیا تم مجھے اپنے ہمراہ لے جانا پسند کرو گے؟"

فضیل نے جواب دیا "نہیں، تم یہیں گھر میں رہو اور میری واپسی کا انتظار کرو۔"

بیوی نے پوچھا۔ "انتظار کروں؟ کب تک؟"

فضیل نے جواب دیا۔ "تم انکم چار سال تک کیونکہ میں اس عرصے میں اپنا کام انجام دے لوں گا۔"

بیوی نے بھرائی آواز میں کہا۔ "تم چار سال کہتے ہو میں تمہارا دس سال تک انتظار کروں گی۔"

فضیل نے حیرت سے پوچھا۔ "اس کے بعد کیا کرو گی؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "دس سال انتظار کروں گی اس کے بعد زندگی بھر تمہارا ماتم کروں گی۔"

فضیل نے فرطِ خوشی میں کہا۔ "تم ایک بہترین شوہر پرست بیوی ہو، میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔"

اس کے بعد فضیل نے اپنے حافظے اور یادداشت کے بھروسے سے ان لوگوں کی فہرست تیار کرنا شروع کر دی جن کو فضیل نے لوٹا تھا یا ستایا تھا کام بہت دشوار تھا لیکن پھر بھی انجام دیا گیا۔ اس کے بعد وہ گھر سے نکل گئے اور شہروں اور قصبوں کی خاک چھاننے لگے پر جس شخص کے پاس پہنچے اسے فضیل کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ کیونکہ وہ لوگ فضیل کو پہچانتے نہیں تھے انہوں نے یہی سمجھا کہ یہ کوئی خبطی انسان ہے جو ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا ہے ان میں سے بیشتر نے اس خبطی سے پیچھا چھڑانے کی خاطر معاف کر دیا لیکن انہی میں چند ایسے بھی نکل آئے جو فضیل کو پہچانتے تھے انہیں ایک ایسے دبدبے اور خوفناک حرکات کے مرتکب انسان کو بے بسی کی حالت میں دیکھ کر رحم سا آ گیا اور انہوں نے بھی معاف کر دیا لیکن ان میں سے ایک ایسا یہودی بھی تھا جو انہیں کسی طرح بھی معاف کرنے پر آمادہ نہ تھا فضیل جب بھی اس سے معافی چاہتے وہ یہی کہتا کہ تم نے میرا بہت دل دکھایا ہے میں تمہیں اس وقت معاف کروں گا جب تم میری لوٹی ہوئی رقم اور سارا سامان واپس کر دو گے۔

فضیل نے کہا: "میں بالکل ننگا بھوکا انسان ہوں، میں نے جو کچھ بھی لوٹا تھا اسے اپنے ساتھیوں میں مساوی تقسیم کر دیا تھا اور میرے حصے میں جو کچھ آیا تھا وہ بھی خرچ ہو گیا اب تم ہی بتاؤ میں وہ ساری چیزیں کہاں سے لاؤں؟ میں دوبارہ ڈاکے مارنے سے رہا۔ ان مجبوریوں کے پیش نظر اگر تم مجھے معاف کر دو گے تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا اور خدا سے تمہارے لیے دعا کروں گا ورنہ میں یہیں تمہارے در پر پڑے پڑے اپنی جان دے دوں گا اور اس وقت تک نہ اٹھوں گا جب تک تم مجھے معاف نہ کر دو گے۔"

یہودی نے کہا "واہ بھئی واہ، یہ بھی خوب رہی تم نے جو کچھ لوٹا تھا اسے میں نے اپنے کھاتے میں تمہارے نام قرض کے طور اندراج کر لیا تھا، اپنا یہ قرض بے باق کرو معافی وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

فضیل نے مجبوری سے کہا "کیا تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آرہا؟ اگر میرے پاس تمہاری چیزیں اور رقم موجود ہوتی تو میں انہیں فوراً پیش کر دیتا۔"

یہودی نے کہا "میں اپنے قرضداروں کی مجبوریاں اور عذر داریاں سنتے سنتے عاجز آگیا ہوں اور اب میری سماعت اور دل کا یہ حال ہے کہ ان پر کسی کی خوشامد کا کوئی اثر نہیں ہوتا تم جب تک چاہو، بیٹھے جاؤ اور جتنے عرصے تک چاہو میرے در پر پڑے ایڑیاں رگڑتے رہو تم زندگی بھر اپنی خوشامدوں اور التجاؤں کا ایک ہی جواب سنو گے میرا سامان واپس کر دو اور رقم بے باک کر دو میں تمہیں معاف کر دوں گا اس کے علاوہ معافی حاصل کرنے کا کوئی صورت نہیں۔ میں نے بھی یہ قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک تم میری رقم واپس نہیں کرو گے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

فضیل یہودی کے دروازے پر بیٹھ گئے اور بولے "میں بھی مجبور ہوں، میں تمہاری ہر ممکنہ شرط پوری کرنے پر آمادہ ہوں لیکن رقم کی ادائیگی سے معذور ہوں۔"

یہودی نے بے نیازی سے کہا "پھر پڑے رہو، میں بھی مجبور ہوں۔"

فضیل اس کے در پر رہنے لگے۔

یہودی کچھ دنوں تک تو اس صورت حال کو برداشت کر گیا لیکن پھر اس کا چرچا ہونے لگا اور جب محلے کے لوگوں کو واقعات کی تفصیل معلوم ہوئی تو انہوں نے یہودی پر ملامتیں بھیجنا شروع کر دیں اور اسے ہر طرف سے طعنے ملنے لگے۔

یہودی پریشان ہو گیا وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتا، فضیل کو دیکھ کر واپس ہو جاتا پھر اسے ہول سا اٹھنے لگا۔ فضیل بے نیازانہ پڑے رہتے اور اس سے آنکھیں تک نہ ملاتے رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ لوگ اس یہودی پر آوازے کسنے لگے وہ جدھر سے گزرتا۔ کوئی نہ کوئی پکار کے کہتا "اے او ظالم! اب تو خدا کے اس نیک بندے کو معاف کر دے ورنہ آسمانوں پر شاید خدا بھی نہ ستائے۔"

کوئی دوسرا کہتا "سود خور انسان! کچھ اس دنیا کے لیے بھی کرلے

سارا مال اسباب یہیں اسی دنیا میں دھرا رہ جائے گا دنیا ہی کی تجارت میں پھنسے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے۔"

یہودی جھنجلا کے کہتا "یہ معاملہ میرا ہے اس میں کوئی دوسرا کیوں دخل دے یہ قرضدار میرا ہے میں اسے معاف کروں یا نہ کروں۔ کوئی دوسرا کیوں دخل دے۔"

فضیل اپنا سارا وقت نماز روزے میں صرف کرنے لگے پھر اس واقعے نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ دُور دُور سے لوگ تماشا دیکھنے آنے لگے یہودی جدھر سے بھی گزرتا لوگ اس کی طرف اشارہ کرکے اس کا مذاق اُڑاتے۔ آخر اس صورتحال سے یہودی بھی عاجز آگیا اور اس نے فضیل سے تلخ لہجے میں دریافت کیا: "آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

فضیل نے جواب دیا "یا تو تم مجھے یوں ہی معاف کر دو یا پھر تم مجھ سے کوئی ایسا کام لے لو کہ اس کے معاوضے میں اپنا حساب محسوب کر لو۔"

یہودی نے کہا "کچھ بھی ہو میں تمہیں یوں نہیں معاف کر دوں گا تم اپنے آپ کو کتنا ہی عقلمند کیوں نہ سمجھو لیکن میں بھی کوئی بیوقوف انسان نہیں۔ میں تمہیں کسی بھی کام میں اس بُری طرح الجھا سکتا ہوں کہ تم ایک ایک عمر گنوا کے بھی اسے پُورا نہ کر سکو گے، بولو تم کیا چاہتے ہو؟ کسی دُوسرے طریقے سے اپنا حساب بے باق کر دینا یا کسی ایسے کام میں پھنس جانا جو تمہاری زندگی میں روگ کی طرح لگ جائے؟"

فضیل نے جواب دیا "میرے پاس رقم تو ہے نہیں کہ تمہارا حساب بے باق کر دوں اس لیئے پہلی صورت نامنظور رہی، رہی دوسری صورت تو میں اس کے لیئے پوری طرح آمادہ ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بڑے سے بڑا کام لے سکتے ہو میں اسے انجام دینے کی کوشش کروں گا اس کا معاوضہ تم سمجھتے رہنا اور جب تمہارا حساب بے باق ہو جائے تو مجھے مطلع کر دینا۔"

یہودی کچھ سوچنے لگا اور تھوڑی دیر بعد بولا "اچھا اگر یہ بات ہے تو تم کل میرے ساتھ ایک جگہ چلنا۔ میں تمہیں کام بتا دوں گا۔ جس دن وہ کام ختم ہو جائے گا، میرا حساب کتاب بھی چکتا ہو جائے گا۔"

فضیل کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی بولے ۔ میں آمادہ ہوں کام کتنا ہی دشوار اور اور محنت کا کیوں نہ ہو، میں اسے انجام دوں گا ۔

یہودی نے لوگوں سے کہا ۔ اب تم لوگ میرا مذاق مت اڑاؤ میں اس شخص کے واجبات کل تک معاف کر دوں گا ۔

لوگ ہنسنے لگے ، بولے ۔ تم معاف کرو گے ! خوب ! جب فضیل تمہارے در پر نظر نہیں آئیں گے ہم اس وقت یہ یقین کریں گے کہ تم نے انہیں معاف کر دیا ہے ۔

دوسرے دن علی الصباح یہودی ، فضیل کو اپنے ساتھ لے کر ایک صحرا میں نکل گیا ۔ وہاں جگہ جگہ ریت کے تودے پھیلے ہوئے تھے بالکل کوہستانی سلسلہ تھا یہودی نے فضیل کو ایک بہت بڑے تودے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا اس تودے کے سامنے ایک وسیع میدان تھا یہودی نے اس تودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ تم اس تودے کی ریت اٹھا اٹھا کے اس میدان میں منتقل کر دو جس دن یہ ٹیلہ اُدھر سے اِدھر منتقل ہو جائے گا ہم دونوں کا حساب کتاب بھی بیباق ہو جائے گا ۔

فضیل بہت پریشان ہو گئے کیونکہ یہ اتنا بڑا ٹیلہ تھا کہ اسے ادھر سے ادھر کرنے میں سالوں کا عمل درکار تھا انہوں نے پریشان ہو کر دریافت کیا ۔ تمہارا حساب تو سب بے باق کرنا ہی ہے لیکن اس میں میرے لیئے ایک بات ذرا پریشانی کی ہے ۔

یہودی نے دریافت کیا ۔ کونسی بات ؟

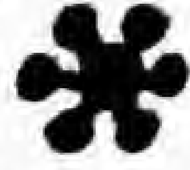
فضیل نے کہا ۔ اگر میں دن رات یہیں موجود رہ کر یہ کام انجام دوں گا تو میرے کھانے پینے کی فکر کون کرے گا ؟

یہودی ہنس دیا ۔ بولا ۔ جس اللہ پر تم بھروسہ کئے ہوئے ہو وہی تمہارے کھانے پینے کا انتظام کرے گا ۔

فضیل کو اس سوال اور اس کے جواب سے بڑا دکھ پہنچا کیونکہ اس میں خدا کے خلاف عدم اعتمادی پائی جاتی تھی انہوں نے خدا کے رازق ہونے پر شبہ کیا تھا روتے ہوئے یہودی سے کہا ۔ میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں آج سے میں تمہارے اس کام کا آغاز کرتا ہوں ، کھانے پینے کا معاملہ میں اپنے خدا پر چھوڑتا ہوں ۔

یہودی نے ہنستے ہوئے کہا ۔ میں وقتاً فوقتاً تمہاری خیر خبر لینے آتا رہوں گا ۔

فضیل نے یہودی سے پھاوڑا منگایا اور تودے کی ریت برابر کے میدان میں منتقل کرنے لگے۔ یہودی نے سوچا کر چلو اس ضدی جن کو ایک ایسے کام سے لگا دیا ہے کہ اب شاید یہ یہاں سے مر کر ہی پیچھا چھڑا سکے۔ وہ فضیل کو کام میں لگا ہوا دیکھ کر وہاں سے چلا آیا۔



فضیل ہر پھاوڑے پر خدا سے یہی التجا کرتے کہ اللہ العالمین! تیرا یہ گناہ گار بندہ ہر قیمت پر اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ دھبّوں کو دھو ڈالنے کا تہیہ کر چکا ہے میں اس معاملے میں تیری ہی اعانت کا طالب اور امیدوار ہوں تو نے مجھے دنیا میں جتنا بھی ذلیل کرنا چاہے کر لے لیکن آخرت کی ذلت سے محفوظ رکھ۔"

یہ کام اتنا دشوار اور تو اتر طلب تھا کہ فضیل کی عبادت و ریاضت میں بھی فرق آنے لگا انہیں اس کا بڑا قلق تھا، رات کو عشا کی نماز پڑھی اور دعا مانگتے ہوئے عرض کیا " اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں تیری بارگاہ میں پابندی سے حاضری دینے سے کیوں معذور ہو گیا ہوں۔ میرا دل ترک صلوٰۃ پر کڑھتا ہے لیکن یہ بھی تیرا ہی حکم ہے کہ جس کا جو بھی واجب الادا ہو اسے ادا کیا جائے اور قرض کی ادائیگی کے بغیر حج و نماز میں وہ مزہ نہیں رہتا جس کا تیرا کوئی عاجز اور مخلص بندہ امیدوار ہوتا ہے تو مجھے اس سلسلے میں معاف فرما دے کیونکہ تو سب سے بڑا معاف کرنے والا ہے "

کافی رات گئے تک وہ ٹیلے کی ریت میدان میں منتقل کرتے رہے لیکن رات کے پچھلے پہر یہ کام انجام دینا مشکل ہو گیا کیونکہ مشرق سے ایک ایسا ہوائی طوفان اٹھا کہ فضیل کو اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا وہ زمین پر لیٹ گئے اور ہوا کے تند و تیز جھونکے ان کے اوپر سے گزر گزر کر مغرب میں تباہ کاریاں مچانے لگا فضیل زمین سے چمٹے ہوئے اس طوفان کے تھم جانے کی دعا کر رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی دعاؤں کا اثر الٹا ہو رہا ہے اور طوفان میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

صبح ہوتے ہوتے طوفان تھما تو فضیل نے سوچا دو گھڑی آرام کر لیا جائے لیکن آرام پر عبادت کو ترجیح دی اور وہ خدا کی بارگاہ میں جھک گئے صبح طلوع آفتاب کے بعد یہودی اُن کے پاس پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شرط والا ٹیلا ہوا سے اُڑ کر مقابل کے میدان میں منتقل ہو چکا ہے فضیل خدا کی اس مہربانی پر بار بار نماز شکرانہ ادا

کر رہے تھے یہودی کے آجانے پر انہوں نے سلام پھیرا اور اس سے کہا "میرے خدا نے میری مشکل آسان کردی ہے اور ریت کا تودہ تمہاری مقرر کردہ جگہ پر منتقل ہو چکا ہے اس لیئے اب تم بھی اپنا حساب کتاب بیباق سمجھ کر مجھے معاف کردو "

یہودی کھسیایا ہوا تھا، بولا "واہ، ریت کا تودہ کوئی تم نے تو اِدھر سے اِدھر کیا نہیں ہے پھر میں تمہیں معاف کیوں کردوں، ہاں میں اتنی مہربانی ضرور کروں گا کہ اس شرط کے پورا ہونے کو لوٹے جانے والے مال و اسباب کے عوض قبول کروں۔ لیکن نقد رقم کا مسئلہ اب بھی باقی رہتا ہے تم وہ رقم مجھے دیدو، میں تمہیں بالکل معاف کردوں گا۔"

فضیل نے بے بسی سے کہا "نقد رقم تو میرے پاس ہے نہیں اس لیئے اس کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "

یہودی نے جل کر جواب دیا "اگر اس کی ادائیگی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تو پھر میری طرف سے معاف کردینے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تم بھی مجبور ہو میں بھی مجبور ہوں "

فضیل نے روہانسے ہو کر کہا "بندۂ خدا! اب مجھے زیادہ نہ ستاؤ میں بہت پریشان ہوں "

یہودی نے کہا "میں بھی بہت پریشان ہوں، کیا کروں، میری رقم ادا کردو میں تمہیں معاف کردوں گا "

فضیل نے کہا "تب پھر مجھے ایک بار تمہارے دروازے پر بیٹھ جانا پڑیگا "

یہودی کو اس تنبیہہ سے وحشت ہوئی۔ بولا "نہیں، میں تمہیں اپنے دروازے پر ہرگز نہ بیٹھنے دوں گا "

لیکن یہودی کے منع کرنے پر فضیل نہیں مانے، وہ ایک بار پھر یہودی کے دروازے پر بیٹھ گئے اور لوگوں نے ایک بار پھر یہودی کے خلاف چرچا شروع کردیا اس بار یہودی بہت جلد عاجز ہو گیا۔ بولا "فضیل! تم خدا کے لیئے میرا پیچھا چھوڑ دو جاؤ اندر جاؤ وہاں ایک طاق میں اشرفیوں کی تھیلی رکھی ہوئی ہے اسے اٹھا لاؤ اور میرے حوالے کردو اس طرح میری یہ قسم پوری ہو جائے گی کہ جب تک تم میرا حساب نہیں چکاؤ گے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا میں اپنی اشرفیوں کی تھیلی کو تم سے وصول شدہ رقم کے کھاتے میں لکھ لوں گا اور تمہیں یہاں سے چلے جانے کی اجازت دیدوں گا "

فضیل ہنسی خوشی یہودی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے اور وہاں کی طاق سے اشرفی کی تھیلی اٹھائے اُسے یہودی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے میری خاطر یہ سب کچھ کیا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اتنے بڑے احسان کا بدلہ چکایا نہیں جا سکتا۔"

یہودی نے تھیلی کا منہ کھولا تو اس میں سے اشرفیاں اُبل پڑیں یہودی نے جلدی جلدی انہیں سمیٹا جب وہ ساری اشرفیاں اپنے دامن میں بھر چکا تو فضیل نے درخواست کی "تو اب تم مجھے معاف کر دو!"

یہودی نے کہا "میں تمہیں اب بھی معاف نہیں کروں گا، اب ایک شرط اور ہے اسے پورا کر دو تب معاف کروں گا۔"

فضیل کو غصہ تو بہت آیا لیکن انہیں اپنے خطاکار ہونے کا شدید احساس تھا اس لیئے صبر و ضبط سے کام لیا۔ نہایت نرمی سے کہا۔ "اپنی نئی شرط سے آگاہ کرو تاکہ اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کروں۔"

یہودی نے کہا "نئی شرط یہ ہے کہ پہلے تم مجھے مسلمان کر لو، اس کے بعد میں تمہیں معاف کروں گا۔"

فضیل نے گھبرا کے پوچھا "کیا مطلب؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

یہودی نے کہا "میرا مطلب واضح اور صاف ہے، پہلے تم مجھے مسلمان کر لو اس کے بعد میں تمہیں معاف کروں گا۔"

فضیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "لیکن یہ مسلمان ہو جانے کا خیال اچانک تمہارے دل میں کس طرح آیا؟"

یہودی نے جواب دیا "دو غیر معمولی واقعوں کے پیش آنے سے۔ پہلا واقعہ تو تودے کے اُدھر سے اِدھر آ جانے کا تھا اور دوسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ میں نے تھیلی میں ریت بھر کر رکھی تھی لیکن جب اسے اُلٹا تو اس میں سے اشرفیاں نکلیں، میں حیران ہوں کہ آخر ایسا ہوا کیونکر۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے توریت میں کسی جگہ یہ پڑھا تھا، کہ اگر کوئی صدق دل سے ریت میں ہاتھ لگا دے تو وہ سونا بن جائے آج اس کا عملی تجربہ ہو گیا تم نے اس ریت کی تھیلی کو ہاتھ لگا کے سونا کر دیا۔ کیا اس واقعے سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ تم

حق پر ہے اور اسلام سچا مذہب ہے تو میں مسلمان کیوں نہ ہو جاؤں "

یہودی، فضیل کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا، اور فضیل کو معاف کر دیا۔



ادھر سے نجات حاصل کرتے ہی یہ سیدھے بیوی کے پاس پہنچے اور اُن سے کہا۔

" بیوی! میں خانہ کعبہ جانا چاہتا ہوں۔ سفر بڑا پر خطر اور دشوار ہے راستے میں معلوم نہیں کیسی کیسی صعوبتیں پیش آئیں اس لیئے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ان صعوبتوں سے بچاؤں اور اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں طلاق دیدوں "

بیوی کو رونا آ گیا۔ بولیں " میں نے آپ کی رفاقت میں ایک عرصہ گزارا ہے پھر میں اب کس طرح آپ کا ساتھ چھوڑ دوں گی، میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلوں گی "

فضیل نے کہا " تمہاری مرضی "

اس کے بعد یہ دونوں مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔

مکہ معظمہ میں آپ نے کعبے کی مجاورت اختیار کی۔ وہیں آپ نے امام اعظم ابو حنیفہ کی خدمت میں رہ کر علوم روحانی اور ظاہری حاصل کئے۔ یہاں آپ کا شہرہ ہونے لگا اور لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہونے لگے آپ انہیں مواعظ حسنہ سے مستفیض فرماتے جب آپ کا شہرہ دُور دور پھیل گیا تو خاندان کے کچھ لوگ ملاقات کی غرض سے کعبۃ اللہ پہنچ گئے آپ نے ان سے گریز اختیار کیا اور منہ چھپائے پھرتے رہے لیکن رشتہ داروں نے ان کا ہر جگہ پیچھا کیا، آخر آپ کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے انہیں مخاطب فرمایا۔ کہا " لوگو! کیا تمہاری عقلوں نے تمہیں لاوارث چھوڑ دیا ہے جو ایک فضول مقصد کے لیئے اپنا وقت ضائع کرتے پھر رہے ہو، فضیل کیا ہے ایک گناہگار اور خطا کار انسان، پھر تم اس سے ملاقات کیوں کرنا چاہتے ہو؟ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور کسی معقول کام میں مصروف ہو جاؤ۔ خدا تمہیں عقل سلیم عطا فرمائے!"

انہی دنوں ہارون رشید نے فضل برمکی سے کہا " فضل! میں شان و شوکت سے اکتا گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی درویش سے ملاقات کروں کیا تم مجھے کسی اہل دل کے پاس لے چلو گے؟

فضل برمکی نے جواب دیا "ابھی اسی وقت، میں آپ کو سفیان عینیہ کے پاس لئے چلتا ہوں "

یہ دونوں اسی وقت سفیان عینیہ کے دروازے پر پہنچ گئے فضل برمکی نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے سفیان عینیہ نے دریافت کیا "کون ہے؟"

فضل برمکی نے جواب دیا " امیر المومنین "!

سفیان نے کہا "افسوس کہ اگر مجھے امیر المومنین کا علم پہلے ہی حاصل ہوتا تو میں ان کے استقبال کو حاضر ہوتا "

ہارون رشید کو سفیان کی یہ بات بہت ناگوار گزری اس نے فضل سے کہا "میں ایسے درویش سے نہیں ملنا چاہتا تھا کیونکہ اس میں کسی اور ہی شئے کے آداب پائے جلتے ہیں "

فضل برمکی نے ذرا حافظے پر زور دیکر کہا " میں امیر المومنین کو ایک دوسرے درویش کے پاس لئے چلتا ہوں امید ہے کہ امیر المومنین اسے ضرور پسند فرمائیں گے "

ہارون رشید نے سفیان عینیہ سے پوچھا " آپ کے ذمے کسی کا قرض تو واجب الادا نہیں ہے؟

سفیان نے جوابدیا " ہاں امیر المومنین! میں واقعی مقروض ہوں!"

ہارون رشید نے کہا " یہ رقوم کس کس کو دینا ہیں مجھے بتاؤ تاکہ میں اسے ادا کر دوں "

سفیان نے ان لوگوں کے نام بتا دیئے اور ہارون رشید نے اسی وقت اس کی ادائیگی کا حکم صادر کر دیا اس نے ایک بار پھر یہی بات کہی "فضل! بات کچھ زیادہ ہی بڑھ چکی ہے اب مجھے تم کسی اور کے پاس لے چلو "

فضل نے کچھ دیر حافظے پر زور دیا، اس کے بعد کہا " اچھا اب میں آپ کو فضیل بن عیاض کے پاس لئے چلتا ہوں "

ہارون رشید نے پوچھا " یہ کون بزرگ ہیں؟"

فضل برمکی نے جواب دیا " یہ صاحب پہلے رہزن تھے لیکن اب توبہ کر کے درویشی اختیار کر چکے ہیں "

ہارون رشید نے بے دلی سے کہا " ان کے پاس جانے کو طبیعت تو نہیں چاہتی لیکن تم کہتے ہو تو چلا چلتا ہوں "

جب یہ دونوں فضیل کے دروازے پر پہنچے اس وقت آپ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے یہ دونوں دروازے سے کان لگائے کھڑے ہو گئے اندر سے آواز آ رہی تھی،

(کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے برے کام کئے، ہم ان کو نیک کام کرنے والوں کے برابر کر دیں گے)

ہارون رشید نے فضل برمکی سے سرگوشی میں کہا "فضل! اس سے بڑی اور کونسی نصیحت ہو سکتی ہے؟"

اس کے بعد دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ "کون؟"

فضل نے جواب دیا "امیر المومنین ہارون رشید"۔

اندر سے کہا گیا "ان کا میرے پاس کیا کام اور مجھے اُن سے کیا واسطہ؟ اس لئے آپ لوگ میری مشغولیت میں حائل نہ ہوں"

فضل برمکی نے کہا "از رُوئے قرآن پاک امیر کی اطاعت آپ پر فرض ہے"

فضیل نے اندر سے کہا "تم لوگ مجھے اذیت نہ دو"

فضل برمکی نے کہا "ہم دونوں آپ کی اجازت لے کر اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن اگر آپ نے اجازت نہ دی تو ہم اجازت کے بغیر ہی اندر داخل ہو جائیں گے"

اندر سے جواب ملا "میں اجازت تو نہیں دوں گا بلا اجازت داخلے میں تم مختار ہو"

یہ رات کا وقت تھا دونوں جیسے ہی اندر داخل ہوئے فضیل نے چراغ بجھا دیا وہ ہارون رشید کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے ہارون رشید کا ہاتھ فضیل کے ہاتھ سے ٹکرا گیا آپ نے کہا "کتنا نرم ہاتھ ہے اے کاش یہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہے"

اس کے بعد آپ نماز میں مشغول ہو گئے۔ ہارون رشید ان کی اس بے نیازی کی دل ہی دل میں داد دیتا رہا، جب یہ نماز پڑھ چکے تو ہارون رشید نے کہا "حضرت! کوئی نصیحت فرمائیے"

آپ نے کہا "تمہارے جد امجد حضرت عباسؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے ایک بار انہوں نے حضور سے درخواست کی تھی کہ انہیں کسی علاقے میں امیر بنا دیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا تھا کہ میں تمہیں تمہارے نفس کا امیر بناتا ہوں کیونکہ دنیا کی حکومت

قیامت کے دن ندامت کا سبب بن جائے گی۔"

ہارون رشید نے کہا "کچھ اور ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے جواب دیا "پوری مملکت اسلامیہ کے باشندوں کو اپنی اولاد تصور کرو۔ بزرگوں پر مہربانی کرو اور چھوٹوں سے بھائیوں اور اولادوں کی طرح پیش آؤ۔" پھر فرمایا "ہارون! مجھے ڈر ہے کہ تمہاری حسین و جمیل شکل کہیں جہنم کا ایندھن نہ بن جائے کیونکہ محشر میں بہت سی حسین صورتیں جہنم کا نوالہ بن جائیں گی بہت سے امیر اسیر ہو جائیں گے اللہ سے خوفزدہ رہو اور محشر کی جوابدہی کے لئے ہر وقت آمادہ ہو۔ وہاں تم سے ایک ایک مسلمان کی بازپرس ہوگی اگر تمہاری حکومت میں ایک بھوکی عورت بھی سوئی ہوگی تو اس کا تم سے جواب طلب کیا جائے گا اور وہ عورت تمہارا گریبان پکڑے گی۔"

ہارون رشید پر ان نصیحتوں کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ مدہوش سا ہونے لگا فضل برمکی نے کہا "جناب آپ نے تو امیرالمومنین کو نیم مردہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

فضیل نے ترشی سے کہا "ہامان! تو خاموش رہ، میں نے نہیں بلکہ تو نے اور تیرے ہی جیسے تیرے دوسرے ساتھیوں نے ہارون کو زندہ درگور کر دیا ہے۔"

اس نوک جھونک نے ہارون رشید کو اور زیادہ مضمحل کر دیا اور اس پر رقت طاری ہو گئی اس نے فضل برمکی کو ڈانٹا اور کہا "فضل! تم خاموش ہو جاؤ کیونکہ ہامان کہہ کے مخاطب کرنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ مجھے فرعون تصور کر رہے ہیں" پھر فضیل سے پوچھا "حضرت! آپ کو کسی کا کوئی قرض تو نہیں دینا ہے؟"

فضیل نے جواب دیا "ہاں میں قرض دار ہوں کیا تم اس قرض کو اتار سکو گے؟"

ہارون رشید نے کہا "آپ حکم دیں، پھر دیکھیں کہ وہ قرض اترتا ہے یا نہیں"

فضیل نے جواب دیا "میں اللہ تعالیٰ کا مقروض ہوں اور یہ قرض اطاعت و بندگی ہی سے اتر سکتا ہے، اسے تم کس طرح اتار سکتے ہو؟"

ہارون رشید نے آہستہ سے کہا "میرا مقصد دنیاوی قرض سے تھا۔"

آپ نے کہا "میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں پیش آئی"

ہارون رشید نے ایک ہزار دینار کی ایک تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کی اور عرض کیا۔

"یہ معمولی سا نذرانہ قبول فرما کر شکر گزار فرمائیں" اس کے بعد کہا "یہ رقم مجھے اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی تھی اس لئے حلال ہے اور اسے قبول فرمانے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے"۔

آپ نے افسوس سے کہا "ہارون! مجھے افسوس ہے کہ تم پر میری نصیحتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ میری ساری نصیحتیں برباد گئیں۔ ذرا سوچو تو کہ میں تو تمہیں دعوت نجات دے رہا ہوں اور تم مجھے ہلاکت میں ڈبو دینا چاہتے ہو"

ہارون نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا۔ "جو مال مستحقین کو ملنا چاہیئے اسے تم غیر مستحقین میں تقسیم کر دینا چاہتے ہو"

ہارون رشید لاجواب ہو کر فضل برمکی کے ساتھ باہر نکلا اور اس سے کہا کہ "ان کا تو کوئی جواب ہی نہیں، اس وقت میں بہت خوش ہوں کہ خدا کے ایک نہایت برگزیدہ بندے سے ملاقات ہو گئی"۔



میدان عرفات میں آپ نے لوگوں کو گریہ و زاری کرتے دیکھا تو آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "اللہ العالمین! اتنی گریہ و زاری کے ساتھ اگر لوگ کسی بخیل سے کچھ طلب کریں تو وہ بھی انکار نہ کر سکے اس لیئے اے اللہ! تو ان سب کو اس گریہ و زاری کے طفیل معاف فرما دے"۔

آپ بھیڑ بھاڑ سے نفرت کرتے تھے اور دعا مانگا کرتے تھے کہ وہ بیمار پڑ جائیں کسی نے اس دعا کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا "اگر میں بیمار پڑ جاؤں گا تو میں باجماعت نماز کی ادائیگی سے بچ جاؤں گا۔ نہ میں باجماعت نماز پڑھوں گا اور نہ بہت سارے انسانوں کی شکلیں دیکھوں گا"۔

ایک بار کسی نے آپ سے پوچھا "دنیا اور آخرت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اس سلسلے میں میں مختصر سا جواب دوں گا۔ اس دنیا میں بعض لوگ قہقہہ مار کر ہنستے ہیں حالانکہ غریب نہیں جانتے کہ دنیا ہنسنے کی جگہ نہیں ہے بالکل آخرت کی طرح کہ وہاں رونا حرام ہوگا"۔

فضیل کے ایک بچے کا پیشاب بند ہو گیا تھا اس کا نہایت تن دہی سے علاج کرایا گیا

لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ آخر میں فضیل نے دعا کی کہ "اے اللہ! اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ فضیل کے دل میں تیری لگن پائی جاتی ہے تو میرے بچے کا مرض دفع فرما دے۔"

یہ بچہ کچھ ہی دنوں بعد حیرت انگیز طور پر صحت یاب ہو گیا۔

کوئی قاری نہایت خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا آپ نے فرمایا۔ "اسے میرے بچے کے قریب جا کر پڑھو۔"

قاری نے پوچھا "کوئی خاص بات ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں، وہ اس سے لذت و سرور حاصل کرے گا" پھر قاری کو نصیحت کی "اور ہاں تم اس کے روبرو القارعہ ہرگز نہ پڑھنا۔"

قاری نے لڑکے کے قریب جا کے القارعہ ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ لڑکے نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ قاری ڈر گیا۔ پوچھا "یہ بے ہوش ہو کر گر کس طرح گیا؟"

آپ نے جواب دیا "اس کے دل میں اللہ کا خوف پہلے ہی سے جاگزین ہے اس لئے وہ اس آیت کو برداشت نہیں کر سکا۔"

اس کے بعد آپ مسکرانے لگے لوگوں نے آپ کو نہایت حیرت سے دیکھا اس کے بعد آپ بچے کی تجہیز و تکفین میں لگ گئے جب ادھر سے فارغ ہو گئے تو کسی نے دریافت کیا "جناب آپ کا تو بچہ ہلاک ہو گیا اور آپ اس پر ہنس رہے تھے، آخر یہ کیوں؟"

آپ نے کہا "موت اللہ کی مرضی سے واقع ہوئی تھی اس وقت میں اللہ کی رضا پر غور کر رہا تھا یکایک مجھے خیال آیا کہ میرے بچے کی موت میں خدا کی مرضی شامل ہے تو میں بھی خوش ہو گیا اور بچے کی موت پر مسکرانے لگا کیونکہ جس کام سے خدا خوش ہے۔ مجھے بھی خوش ہونا چاہیئے۔"

کسی نے دریافت کیا "حضرت! دین کی بنیاد کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "عقل۔"

اس نے پوچھا "عقل کی بنیاد کیا ہے؟"

جواب دیا "حلم!"

اس نے پھر سوال کیا "اور حلم کی بنیاد؟"

فرمایا "صبر!" پھر قدرے سکوت کے بعد فرمایا "تمام دنیا کی برائیوں

کر ایک جگہ جمع کر کے اس کی کنجی دنیا کی دوستی کو بنا دیا جائے "۔

اس شخص نے کہا "حضرت ! دنیا، حلم اور صبر کے بارے میں تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ کیا ہیں اب یہ بتایئے کہ توکل کیا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا "توکل کا مطلب ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے کسی قسم کی بھی اُمید نہ رکھے اور متوکل اسے کہتے ہیں کہ انسان ظاہر و باطن میں راضی بہ رضائے الٰہی رہے "۔

آخر عمر میں جب انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اب ان کا آخری وقت آگیا ہے تو انہوں نے اپنے آس پاس جمع ہونیوالوں کو بڑی نصیحتیں کیں ان ہی میں ان کے باکمال مرید سلطان ابراھیم بن ادھم، شیخ محمد بن یزید الشیرازی، خواجہ لبشر حالی، حضرت شیخ ابی رجاالعطاؒ اور خواجہ عبداللہ سیاری بھی موجود تھے آپ نے پند و نصائح کے دوران فرمایا "لوگو مجھے پیغمبروں پر ذرا بھی رشک نہیں آتا کیونکہ ان کے لئے بھی قبر و قیامت اور جہنم و پلصراط کا مرحلہ ہے اور انہیں بھی نفس نفس کی منزل سے گزرنا پڑے گا اسی طرح مجھے فرشتوں پر بھی رشک نہیں آتا کیونکہ وہ انسانوں سے زیادہ خوفزدہ رہتے ہیں "۔

کسی مُرید نے پوچھا "پھر آپ کو رشک کس پر آتا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا "ان پر، جنہوں نے شکم مادر سے جنم ہی نہیں لیا "

بالکل آخری ایام میں انہوں نے بیوی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے مغموم بیٹھی تھیں فضیل نے پوچھا "بیوی ! تم اُداس اور غمزدہ کیوں ہو ؟"

بیوی نے جواب دیا "میں سوچتی ہوں کہ آپ کے بعد، ان دونوں بچیوں کا کیا ہو گا جو نخلستان کے کھجور کی طرح اپنی نشو و نما کی خاص عمر میں داخل ہو گئی ہیں ؟"

انہوں نے کہا "ان کی فکر تمہیں کیوں ہے ؟"

بیوی نے کہا "پھر ان کی فکر کون کرے گا ؟"

آپ نے جواب دیا "انہیں خدا کی مشیت پر چھوڑ دو "

بیوی نے خاموشی اختیار کی۔ آپ نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کئے رکھی اور بیوی کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر جب بیوی کی حالت زار نہیں دیکھی گئی تو کہا "اچھا تو میرے بعد تم ان دونوں لڑکیوں کو کوہ ابوقبیس پر لے جانا اور وہاں آسمان کی طرف منہ

اُٹھا کے خدا سے کہا کہ جب تک فضیل زندہ رہا، ان کی پرورش کرتا رہا لیکن وہ اب قبر میں منہ چھپا چکا ہے اور ان دونوں کو تیرے سپرد کر گیا ہے اب یہ دونوں لڑکیاں ہیں اور تو ہے ان سے جیسا سلوک چاہے کر۔"

تین ربیع الاوّل ۱۸۷ھ کو آپ کا وصال ہوگیا انکی تجہیز و تکفین کے کئی دن بعد بیوی نے دونوں لڑکیوں کا ہاتھ پکڑا اور کوہ ابوقبیس پر پہنچ گئیں اور انہیں اپنے آگے کھڑا کرکے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں ۔ دونوں لڑکیاں حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھیں ابوقبیس پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور سر پر نیلا آسمان حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا انہوں نے دونوں ہاتھ دُعائیہ انداز میں اُٹھا دیئے اور خدا سے عرض کیا " خداوندا! تیرا بندہ اور میرا شوہر فضیل اپنی زندگی کی سانسیں پوری کرکے تیرے پاس جا چکا ہے جب تک وہ زندہ رہا تو اُس کے ذریعے اس کی دونوں بیٹیوں کی پرورش کرتا رہا لیکن اب اس کے بعد، اس کی وصیت کے مطابق میں دونوں لڑکیوں کو یہاں لے کر آ گئی ہوں اب تو ہی ان کا پالن ہار اور نگران ہے میں نہیں جانتی ان کے لیئے کیا بہتر ہے اور کیا بہتر نہیں ہے تو ان کے حق میں جو بہتر سمجھے کر میں کچھ نہیں جانتی ۔"

ابھی یہ مناجات میں مصروف ہی تھیں کہ گھوڑوں کے ہنہنانے اور اونٹوں کے بلبلانے کی صدائیں آنے لگیں، اُنہوں نے گھبرا کے پیچھے جو دیکھا تو ایک قافلہ ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا کچھ سوار گھوڑے دوڑاتے اُن کے قریب آ گئے اور گھوڑوں کو نیچے چھوڑ کر اوپر پہنچے اور پوچھا " اے عورت! تو کون ہے ؟ اور کیا چیز چاہتی ہے ؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ لیکن ایک شخص نے ان کے قریب جاکر کہا " اے عورت! یہ سُلطان یمن کا قافلہ ہے اور ہم لوگ اپنے سُلطان کے حکم پر ہی تمہارے پاس آئے ہیں وہ تمہیں بلا رہے ہیں "

وہ اپنی دونوں لڑکیوں کو لے کر سلطان یمن کے پاس پہنچ گئیں، سُلطان نے ان کا حال سُن کے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور کچھ دنوں بعد دونوں لڑکیوں کی شادیاں اپنے بیٹوں سے کر دیں ۔ خانہ کعبہ میں بیت الحرام کے قریب جنت معلیٰ میں، جہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مزارِ اقدس ہے وہیں قریب ہی فضیل بن عیاض بھی ابدی نیند سو رہے ہیں اور مکہ معظمہ میں داخل ہونیوالے جہاں اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے ہیں وہیں اس مزار پر بھی حاضری سکون قلب حاصل کرتے ہیں ۔

حضرت ابوبکر شبلی رح

خلافت عباسیہ نے ضرورت محسوس کی کہ بغداد کے قریب اور دور علاقوں کے عاملوں اور سرداروں کو طلب کیا جائے، خلیفہ کو ان میں سے بعض کی شکایات موصول ہوئی تھیں اور بعض کے حسن انتظام نے اسے متاثر کیا تھا۔ خلیفہ ان میں سے ایک کی سرزنش اور دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا۔ فرمان جاری ہو گیا اور عاملوں اور سرداروں کی جانب بغداد روانگی عمل میں آگئی، بغداد میں داخل ہونے والی شاہراہیں آباد ہو گئیں، گھوڑوں پر سوار عامل اور سردار اپنے سپاہیوں اور دوسرے منصب داروں سے باتیں اور ہنسی مذاق کرتے بغداد سے قریب ہوتے جا رہے تھے ان خدام کے پیچھے اونٹوں اور مستورات محملوں میں سوار ہچکولے کھاتی اور محمل کے پردوں سے جھانکتی ہوئی مناظر فطرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ان کے بھی پیچھے بار بردار اونٹ اور خچر تھے جنہیں اُجڈ اور درشت مزاج غلاموں نے کچھ اس طرح اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا گویا ان پر ڈاکا ہی توڑنے والا ہے اور یہ اجڈ اور درشت مزاج اور خونخوار غلام ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کیلئے ہر وقت تیار اور مستعد ہیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے قصر خلافت سے ذرا فاصلے کے میدانوں میں خیموں کی فصل سی اُگ آئی چاروں طرف مختلف جسامت اور رنگوں کے خیمے اس طرح لہلہانے لگے گویا دامن کہسار میں رنگوں کی بہار آگئی ہو۔

خلیفہ بھی محل سے باہر آگیا اور اپنے غیر معمولی طویل و عریض خیمے میں عاملوں اور سرداروں کو طلب کیا۔ خلیفہ ان سب کو فرداً فرداً اپنے قریب بلاتا رہا اور ان سے طرح طرح کے سوالات اور محاسبہ کرتا رہا۔ کسی کو ڈانٹ دیا کسی کو خوش ہو کر دست بوسی کی سعادت سے نواز دیا۔ یہ کاروبار کئی دن جاری رہا۔ آخر ایک دن خلیفہ نے ان سب کی دعوت کی اور یہ سب امیرالمومنین کے ساتھ ہم طعامی کی عزت سے نوازے گئے۔ یہ امرا اور عمال ان خلعتوں کو زیب بدن کئے ہوئے تھے جو دو دن پہلے انہیں عطا ہوئی تھیں ان میں سے ایک امیر کو بغداد کا موسم راس نہیں آیا تھا اور زکام نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا امیرالمومنین کی موجودگی نے اسے کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا تھا اندر کوئی چیز مسلسل سر سرا رہی تھی اور وہ بدقت تمام چھینک روکے ہوئے تھا آخر بات قابو سے باہر ہو گئی اور پے در پے کئی چھینکیں اس طرح آئیں کہ پوری محفل اس امیر کی طرف متوجہ ہو گئی، ان چھینکوں نے نتھنوں کا پرنالا جاری کیا

کردیا اور یہ دوسری مشکل تھی جس نے اس امیر کو اور زیادہ پریشان کر دیا ۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے رومال کا کام شاہی خلعت کی آستین سے لیا ، اس نے یہ کام اپنی دانست میں دوسروں کی نظروں سے بچا کے انجام دیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت عباسی خلیفہ کی نظریں بھی امیر کا یہ عمل دیکھ رہی تھیں ۔ ابرے خلافت پر شکنیں پڑ گئیں اور اس نے اپنے حاجب (سکریٹری) کو حکم دیا ۔

"اس جاہل گستاخ امیر نے خلعت شاہی کی توہین کی ہے اور یہ ہماری خلعت فاخرہ کا ہرگز مستحق نہیں ، اسے اتار لیا جائے ۔"

حاجب دو قدآور آدمیوں کو لے کر آگے بڑھا ایک نے امیر کو شانوں سے پکڑ لیا دوسرے نے شاہی خلعت اتار لی ، حاضرین دربار امیر کی بے عزتی پر خوف زدہ ہوتے رہے اور درس عبرت لیتے رہے ۔

جب یہ امرا اور عمال اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے لگے تو نہاوند کا سردار قصر خلافت میں داخل ہوا اور امیر المومنین سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ اس معزز سردار کو خلیفہ کی اجازت پر اس کے روبرو پیش کر دیا گیا ۔ سردار نے رسماً السلام علیکم کہا اور دوسری شاہی رسوم کی بجا آوری سے محترز رہا ۔ خلیفہ کو یہ بات ناگوار گزری ، اس نے حاجب سے کہا " اس سردار سے معلوم کیا جائے کہ یہ شاہی رسوم کی بجا آوری سے احتراز کیوں برت رہا ہے "

نہاوند کے سردار نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا " امیر المومنین ! مجھ سے براہ راست گفتگو کیوں نہیں کرتے ، براہ کرم درمیان سے حاجب کو ہٹا دیا جائے کیونکہ میں اس وقت امیر المومنین سے جس قسم کی باتیں کرنا چاہتا ہوں اس میں حاجب کی شخصیت خواہ مخواہ باتوں کو طول دے دے گی "

خلیفہ اس سرمست و جری سردار سے کچھ مرعوب سا ہو گیا سردار کے انداز بے نیازی اور روش ہم کلامی میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے دوسرے سرداروں سے الگ کرتی تھی ۔ خلیفہ نے حاجب کو حکم دیا " تم خاموش رہو ، ہم خود گفتگو کریں گے "

حاجب نے خاموشی اختیار کی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا ۔

خلیفہ نے کہا " ہاں اب تم بتاؤ ہم سے کس قسم کی گفتگو کرنا چاہتے ہو ؟ "

نہاوند کے سردار نے پوچھا " جس امیر کی چھینکوں نے مزاج خلافت میں انقباض پیدا کر دیا تھا ، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ اپنی چھینکوں کے معاملے میں واقعی صاحب اختیار تھا ؟ "

خلیفہ نے تیوریوں پر بل ڈال کے جواب دیا " تم نہاوند کے ایک معمولی سردار ہم سے اس قسم کا معمولی سوال کس طرح کر سکتے ہو ؟ اس سوال میں محاسبے کی بو پائی جاتی ہے کوئی اور بات ؟ "

سردار نے دوسرا سوال کیا وہ اُس سردار کو بھرے دربار میں جس طرح رسوا اور ذلیل کیا گیا ہے کیا وہ واقعی اس کا مستحق تھا ؟"

خلیفہ نے ذرا ترش لہجہ اختیار کیا بولا "کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو ؟ تمہیں ہم سے اس نوع کے سوالات کا حق کس نے دیا ، تم نہاوند واپس جاؤ اور ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ آئندہ ایسی جسارتیں سرزد نہ ہوں "

سردار نے پشیمانی اور ندامت کے انداز میں گردن جھکالی اور آنسو بہانے لگا اس نے رُک رُک کے رندھی ہوئی آواز میں کہا -

"امیرالمومنین ! میں نہاوند واپس نہیں جارہا - آپ وہاں کی سرداری کسی اور کے حوالے کر دیجئے"

خلیفہ نے حیران ہو کے سوال کیا "یہ کیوں ؟ آخر کیوں ؟ یہ تم رو کیوں رہے ہو ؟"

سردار نے جواب دیا "امیرالمومنین ! آپ کی تادیبی کارروائی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور میرے دل کی دنیا میں آپ کے حکم نے جو انقلاب برپا کر دیا ہے اس کا تو آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے"

خلیفہ اس عجیب و غریب سردار کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا کہ اسے یہ کیا ہو گیا ہے ؟ یہ کیا کہہ رہا ہے ؟

سردار نے یکایک دوسرا طرزِ تخاطب اختیار کیا چہرے پر ایک قسم کی درشتی آگئی اس نے سخت لہجے میں کہا "تو مخلوق ہو کر جب یہ ناپسند کرتا ہے کہ تیری عطا کردہ خلعت کی بے ادبی نہ کی جائے تو خدا اس بات کو کب پسند کرے گا کہ میں اس کی عطا کردہ خلعت کو ذلیل کرتا پھروں - تو ایک معمولی اور ادنیٰ حاکم اپنے اختیار کو کس ظالمانہ انداز میں روبہ عمل لایا ہے ؟ اس پر جتنا غور کرتا ہوں پریشان ہو جاتا ہوں "اس کے بعد شاہی خلعت اُتار کے خلیفہ کی طرف پھینک دی - اور اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا "میں نے نادانی اور غفلت میں اسے پہن لیا تھا لیکن اب میں ہوش میں آچکا ہوں اور اس خلعت کے ادب و احترام کی طرف رجوع ہو رہا ہوں ، جو میرے خدا نے مجھے عطا کی ہے "

خلیفہ ان کی صورت ہی دیکھتا رہ گیا اور یہ وہاں سے چلے آئے اُس عہد کے مشہور صوفی خیر نساج بعض حیثیتوں سے کافی شہرت رکھتے تھے یہ انہی کے پاس پہنچ گئے اور کہا "حضرت : میری طرف دیکھئے اور توجہ دیجئے میں نے نہاوند کی سرداری خلعت اتار پھینکی اور فقر کی خلعت پہن لی ، بتائیے آپ میری کس حد تک رہنمائی کر سکتے ہیں ؟"

خیر نساج نے جواب دیا "میں تمہیں اس راہ پر ڈال دوں گا بقیہ رہنمائی تم جنید بغدادی سے حاصل کرو گے "

انہوں نے کہا "اچھا یہی سہی، جنید بغدادی کو بھی دیکھ لوں گا"۔
خیر نساج نے اس کی تربیت شروع کر دی لیکن کچھ ہی عرصے بعد تند و تیز اور سرکش و بے باک مرید سے پریشان ہو گئے بولے "شبلی! تم نہاوند کے سردار رہ چکے ہو اور ایسا لگتا ہے کہ تمہارے مزاج کی تندی اور تیزی کا میرے جیسا سیدھا اور دنیا سے نابلد انسان نہیں نکال سکتا۔ شاید حکمرانی کی خُو بُو نے ایک قسم کی کجی پیدا کر دی ہے تم جنید بغدادی کے پاس جاؤ، ان کے پاس ایک گوہر نایاب ہے کوشش کرو کہ وہ حاصل ہو جائے خالق کائنات نے جنید بغدادی ہی کو تمہاری تعلیم و تربیت کے لئے مقرر فرمایا ہے اب تم ان کے پاس جاؤ اور اپنا گوہر مقصود حاصل کر لو"۔
یہ اس مجلس سے اٹھ کے جنید بغدادی کی محفل میں پہنچ گئے۔ پہنچتے ہی جنید بغدادی سے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کے پاس ایک گوہر نایاب ہے، میں چاہتا ہوں کہ یا تو آپ اسے قیمتاً دے دیں ورنہ مفت عطا فرما دیں"۔
جنید بغدادی نے اس عجیب و غریب طرز تکلم پر سر اٹھا کے انہیں دیکھا اور مسکرا کر کہا "اچھا تو تم ہو شبلی! خوب کہو یہ سرداری چھوڑ کے تجارت کب سے اختیار کی؟"
انہوں نے جواب دیا "جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ صوفیائے کرام نے بھی دکانیں سجا لی ہیں، میں خریدار بن کر اس بازار میں داخل ہو گیا"۔
جنید بغدادی نے جواب دیا "تم جس گوہر نایاب کی خریداری کی بات کر رہے تھے تم اس کی قیمت نہیں دے سکو گے، ہماری دکانوں میں کھوٹے سکے نہیں چلتے"۔
انہوں نے کہا "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس گوہر نایاب کی قیمت نہیں ادا کر سکوں گا تو پھر وہ دُرِ نایاب مجھے مفت عطا فرما دیں"۔
جنید بغدادی نے جواب دیا "یہ اس سے بھی مشکل سوال ہے اگر میں وہ موتی تمہیں بے قیمت دے دوں تو تم اس کی قدر نہیں کرو گے کیونکہ جو شے مفت مل جاتی ہے ناقدری کا شکار ہو جاتی ہے"۔
شبلی نے بے چینی سے سوال کیا "پھر میں اسے کس طرح حاصل کروں؟"
جنید بغدادی نے جواب دیا "اگر تم اس دُرِ نایاب کی حصولیابی پر بضد ہی ہو تو تمہیں پہلے توحید میں غرق ہو کر فنا ہو جانا پڑے گا۔ کیونکہ ابھی تم پر خدا نے صبر و انتظار کے دروازے نہیں کھولے ہیں پہلے انہیں کھلوا کے کشادہ کرو، جب یہ دروازے کھل جائیں گے اور خدا انہیں کشادہ بھی کر دے گا تو وہ گوہر نایاب تمہیں خود بخود حاصل ہو جائے گا"۔

شبلی نے پوچھا "صبر و انتظار کے دروازے کس طرح کشادہ ہو گئے؟ اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "کسی عذر اور حیلے کے بغیر ایک سال تک گندھک فروخت کرو، اس کے بعد میرے پاس آؤ۔"

شبلی نے نیاز مندی سے سر جھکا دیا اور ذرا دیر رک کے جنید بغدادی کے حکم کی تعمیل میں نکل گئے۔

کہاں نہاوند کی سرداری اور کہاں گندھک کی حقیر سی دکان داری اس کام میں ان کا کیسے کیسے کمتر درجے کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے شبلی کو کتنا حقیر و ذلیل کیا کچھ وہی جانتے تھے ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بھاگ کھڑا ہوتا لیکن وہ خلعت باری کے تحفظ اور اس کے شرف و عزت کی بحالی کی غرض سے اس راہ پر چل پڑے تھے، ایک سال تک سب کچھ برداشت کرتے رہے ایک سال کے بعد وہ دوبارہ جنید بغدادی کے پاس پہنچے اور عرض کیا "جناب! میں ایک سال گندھک کی دکانداری کر کے آ گیا ہوں ہے کر لیئے اور کوئی حکم؟"

جنید بغدادی نے انہیں غور سے دیکھا اور افسوس سے کہا "میں تم پر صبر و انتظار کے دروازے کشادہ کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہاری بے چینی یہ بتا رہی ہے کہ تم نے ایک سال کی مدت بس جیسے تیسے پوری کر کے کسی طرح پیچھا چھڑا لیا ہے اس بے چینی اور مغروری کیفیت کے ساتھ صبر و انتظار کے دروازے پر دستک دینے کی کوشش کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

شبلی بے بسی سے جنید بغدادی کی طرف دیکھا اور کسی دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

جنید بغدادی نے کہا "چپ کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں؟"

شبلی نے جواب دیا "اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو میں گندھک کی دوکانداری کرنے دوبارہ جا رہا ہوں اور یہ کام اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک کہ آپ مجھے خود نہ طلب فرمائیں۔"

جنید بغدادی نے بدستور مایوسی کا تاثر قائم رکھا بولے "لیکن اس عمل سے تمہارے اندر کی اصلاح کس طرح ہو گی؟ میرا خیال ہے اس حالت میں بھی تمہیں جس بات کا انتظار ہو گا وہ یہ ہو گا کہ میں تمہیں واپس کب بلاتا ہوں۔ اس فکر و تردد کی موجودگی میں صبر و انتظار کا دروازہ کس طرح کشادہ ہو گا۔"

شبلی نے عرض کیا "جو حکم آپ دیں گے میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

جنید بغدادی نے نیا ذلت آمیز حکم دیا "تمہیں ایک سال دریوزہ گری کرنی ہو گی۔"

شبلی نے تلملا کے جنید بغدادی کی طرف دیکھا۔ جنید بغدادی نے مسکرا کے پوچھا۔
"سرداری کی انا ابھی زندہ ہے نفس امّارہ کا افعی پھن اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے،
ہے نا یہی بات؟"

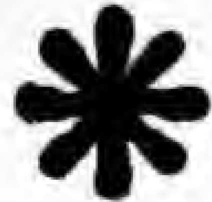
شبلی رحم طلب نظروں سے جنید بغدادی کو دیکھنے لگے جنید بغدادی نے سر جھکا لیا
بولے "دریوزہ گری، ایک سال تک بھیک مانگو اور وہ بھی اس طرح کہ تمہیں ہر روز میرے
پاس آنا ہوگا اور یہ بتانا ہوگا کہ تمہیں بھیک سے کیا حاصل ہوا، سرداری کا طنطنہ اور نفس امّارہ کا موذی
سانپ اسی طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں، کوئی متبادل راستہ نہیں۔"

شبلی بدستور خاموش جنید بغدادی کا چہرہ دیکھ رہے تھے جنید بغدادی نے کنکھیوں سے
انہیں دیکھا اور درشتی سے کہا "تامل اور پس و پیش کس لئے؟ کیا تم وہیں واپس جانا چاہتے
ہو جسے چھوڑ کے یہاں آئے تھے؟ اگر ایسا ہے تو اسی وقت واپس چلے جاؤ اور بلاوجہ اپنا وقت
ذبرباد کرو یہاں تامّل اور پس و پیش کرنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

شبلی نے جواب دیا "میں تامّل اور پس و پیش کا شکار نہیں ہوں، میں ہر وہ کام کروں گا
جس کا آپ حکم دیں گے اور بالکل اسی طرح انجام دوں گا جس طرح آپ چاہیں گے کیا میں اسی وقت چلا جاؤں؟"

"ہاں اسی وقت ابھی اور پس و پیش کے بغیر۔ خدا حافظ۔ رات گئے ملنا اور بھیک سے جو کچھ
ملے وہ ہمارے حوالے کر دینا کیونکہ اس کے خرچ کا اختیار تمہیں نہیں دیا جا رہا ہے۔"

شبلی نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی، اسی وقت مرشد کے حکم کی تعمیل میں نکل گئے۔



نہاوند کا سردار بغداد کے گلی کوچوں اور بازاروں میں بھیک مانگنے لگا جو اسے جانتے تھے
انہیں عبرت ہوتی تھی اور شبلی کو کچھ دینے کے بجائے ان سے حذر کرتے تھے وہ جس دروازے پر گئے
انہیں کچھ دیے بغیر بھگا دیا گیا جس دکان پر دست سوال دراز کیا دھتکار دیا گیا لوگ انہیں دیکھ کر مذاق
اڑاتے نہاوند کا سردار بغداد کے عوام و خواص کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھر رہا تھا اور لوگ انہیں کچھ نہ دیکر
اپنے حسد و شماتت کا اظہار کر رہے تھے، شبلی ہر شب کو جب جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچتے اور یہ
بتلاتے کہ دن بھر کی مشقت میں کچھ بھی نہیں ملا تو جنید بغدادی مسکرا دیتے جب مہینوں یہ کیفیت برقرار رہی
تو شبلی کو جنید بغدادی کی خدمت میں جاتے ہوئے ندامت محسوس ہونے لگی۔ جنید بغدادی نے
ان کی خجالت محسوس کر لی کہا "شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں، کام جاری رکھو!"

شبلی کی ہمت بلندی اور اسی تندہی اور چستی سے دریوزہ گری شروع کر دی، سال کے ختم ہوتے ہوتے انہیں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ بغداد کے لوگ یا تو مفلس ہو چکے ہیں یا بخیل، اس بار شبلی نے شب و روز کی گنتی نہیں کی تھی انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ان کی دریوزہ گری کا سال کب ختم ہو رہا ہے ایک رات جب وہ دن بھر کی دریوزہ گری کے بعد تھکے ہارے جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے تو خلاف معمول جنید بغدادی نے سوال کیا "آج کیا ملا"؟

شبلی نے مایوسی سے جواب دیا "کچھ بھی نہیں، بغداد کے لوگ شاید میرے معاملے میں بے حس اور بخیل ہو گئے ہیں۔"

جنید بغدادی نے کہا "تم نہاوند کے سردار تھے لوگ تمہاری مصاحبت اور دربارداری میں شب و روز خوشامدیں کرتے رہتے تھے اس سے تم نے اپنا جو مرتبہ کر رکھا تھا سال بھر کی دریوزہ گری نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ تمہاری اپنی ذاتی حیثیت کا بھرم کھل چکا ہے تمہاری اپنی کوئی قیمت نہیں۔"

شبلی اس نئے انکشاف اور اپنی حیثیت کی صحیح قدر و قیمت سن کر پریشان ہو گئے بولے "بے شک، ابھی تک میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ میں نہاوند کا سردار رہ چکا ہوں اور بغداد کے واقف حال حضرات مجھے دیکھ کر یقیناً میری عزت و تکریم کریں گے اور اگر عزت و تکریم نہیں کریں گے تو سابقہ حیثیت کے پیش نظر رحم کھا کے کچھ نہ کچھ دے مریں گے لیکن نتیجہ خلاف امید نکلا۔"

جنید بغدادی نے مایوسی سے کہا "ابھی مزید اصلاح کی ضرورت باقی ہے تمہارے اندر کے میل کچیل کو نکال پھینکنے کے لئے کچھ اور رگڑائی کی ضرورت ہے۔"

شبلی معصومیت سے جنید بغدادی کو تکنے لگے۔

جنید بغدادی نے کہا "تم نے اپنی سرداری کے زمانے میں کتنوں ہی کا دل دکھایا ہو گا۔"

شبلی نے جواب دیا "ہاں ایسا بھی ہوا ہے۔"

جنید بغدادی نے کہا "اچھا پھر تم اپنی یادداشت اور حافظے کی مدد سے ان لوگوں کی فہرست تیار کرو جن سے تم زیادتی کے مرتکب ہوتے رہے ہو۔"

شبلی نے کس مندی سے کہا "یہ بہت مشکل کام ہے۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا "لیکن تمہیں ہر مشکل پر قابو پانا ہے۔"

شبلی نے کہا "اچھا میں فہرست تیار کرنے کی کوشش تو کرتا ہوں لیکن اگر کوئی نام یادداشت یا حافظے سے نکل چکا ہو تو اس کا کیا ہو گا"؟

جنید بغدادی نے جواب دیا "اس کی فکر مت کرو فہرست کی تیاری کے بعد بھی حافظے پر زور دیتے رہو اور بھولے ہوئے نام جیسے جیسے یاد آتے رہیں انہیں لکھتے رہو"۔

شبلی نے اس فہرست کی تیاری میں کئی دن لگا دیئے اور جب یہ تیار ہو گئی تو جنید بغدادی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنید بغدادی نے فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور حکم دیا "تم نہاوند واپس جاؤ اور فہرست کے ہر آدمی سے مل کر معافی مانگو"۔

شبلی کو ایک دھکا سا لگا۔ اپنی سرداری کے علاقے میں جا کے سابقہ رعایا سے معافی مانگنا کتنی بے عزتی کی بات ہے شاید بغداد کی دریوزہ گری سے بھی زیادہ۔ وہ جنید بغدادی سے الجھنا تو گھبرا رہے تھے کیونکہ ان کی آنکھوں کا پس و پیش اور تامل ایک بار پھر جنید بغدادی پر ظاہر ہو جاتا۔

جنید بغدادی نے پوچھا "کیا سوچنے لگے؟"

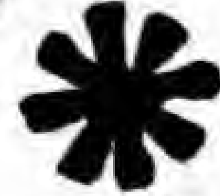
شبلی نے کہا "اس فہرست کے کتنے ہی لوگ وہاں موجود نہ ہوں گے ان کا کیا ہوگا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "ان کا پتہ لگانا ہوگا اور وہ جہاں بھی ہوں وہیں پہنچ کے ان سے معافی مانگنی ہوگی"۔

شبلی نے محسوس کیا۔ مفر کی کوئی راہ باقی نہیں رہی بولے "میں نہاوند کب چلا جاؤں؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "بابا یہ تمہاری درویشی کا نصاب ہے اس میں دن اور وقت کا تعین نہیں ہوتا، تم جتنی جلدی اس نصاب کو پورا کر لو گے کامیابی حاصل کر لو گے یہاں سستی اور کاہلی کے لئے کوئی جگہ نہیں"۔

شبلی نے کسی رخت سفر اور سامان کے بغیر نہاوند کی راہ اختیار کی۔



جیسے جیسے نہاوند قریب آ رہا تھا شبلی کے دل کی عجیب سی حالت ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ دل کی کیفیت پر ہر طرح قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بے سرو سامان نہاوند کا سابق حکمران جیسے ہی اپنے علاقے میں داخل ہوا چاروں طرف اس کا چرچا ہونے لگا لیکن اب یہ چرچا قدر و منزلت اور تعریف و توصیف کا چرچا نہ تھا بلکہ طنز و استہزا، طعن و تشنیع اور مذاق اڑانے کا چرچا تھا درویشی پر نہاوند کی سرداری قربان کر دینا کہاں کی عقل مندی تھی اور لوگ شبلی کی اس کم عقلی کا مذاق اڑا رہے تھے اور شبلی ان سب کی باتیں سن سن کر صبر و تحمل سے کام لے رہے تھے ہنسی مذاق اڑانے والوں کی ایک جمعیت ان سے ملنے پہنچی اور سوال کیا "حضرت! نہاوند کی سرداری پر اپنے علاوہ کسی اور کو فائز

دیکھو کر آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہے؟"

شبلی نے جواب دیا "میں نہاوند کی عارضی سرداری کا درویشی کی مستقل سرداری سے سودا کر لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی معمولی سودا نہیں "

لوگ اس پُرجوش، درویشی کی راہ پر گامزن نئے رہرو کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیے۔

شبلی اپنی فہرست کے ایک ایک آدمی کے در پر گئے اور ان سے معافیاں مانگنی شروع کر دیں لیکن ان میں بعض ایسے نکلے جو کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے شبلی نے ان کی خدمتیں کیں، خوشامدیں کیں، آہ وزاریاں کیں تب کہیں ان کے دل پسیجے اور انہوں نے معاف کیا۔ ان میں کئی ایسے تھے جو نہاوند میں موجود نہیں تھے شبلی کو ان کی تلاش میں کئی دور دراز مقامات پر بھی جانا پڑا اور وہاں بھی یہی مشکلات پیش آئیں کہ وہ لوگ ملے بھی تو انہیں کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے شبلی کا بہت زیادہ وقت خوشامد درآمد اور خدمت و آہ زاری میں صرف ہو گیا اور بمشکل معافی حاصل کر کے ہی دم لیا لیکن سب کے آخر میں ایک شخص باقی رہ گیا جس کا صحیح پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں چلا گیا اور کس جگہ مقیم ہے؟ یہ تھک ہار کے نہاوند واپس پہنچے وہاں ان کی جائداد تھی عزیز رشتے دار تھے جو اس خیال سے شبلی سے دور دور رہتے تھے کہ کہیں وہ اپنی جائداد اور دولت پر دوبارہ قبضہ کر لیں۔ شبلی جس شخص سے معافی نہیں مانگ سکے تھے اس کے لیے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی دولت میں سے ایک لاکھ درہم لے کر خیرات کر دیں جو شاید اس معافی کا بدل ثابت ہو انہوں نے ایسا ہی کیا اور بغداد روانہ ہو گئے، راستے بھر ایک لاکھ درہم اور معافی نہ حاصل کر سکنے کا احساس ستاتا رہا، ان کا ضمیر بار بار ان سے پوچھتا کیا یہ ایک لاکھ درہم خیرات میں دے دینے سے معافی کی تلافی ہو گئی؟ کبھی دل کہتا کہ ہاں ہو گئی اور کبھی کسی گوشے سے آواز ابھرتی، نہیں ہوئی۔ یہ دل میں ایک کانٹا سا لیے ہوئے بغداد میں داخل ہو گئے اور حضرت جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچ گئے مرشد نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور پوچھا "دو کیا تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آئے ہو؟"

شبلی نے مذبذب لہجے میں جواب دیا "کچھ کہہ نہیں سکتا، اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے"

جنید بغدادی نے کہا "سفر کی تفصیل بیان کرو"

شبلی نے بے کم و کاست پوری تفصیل عرض کر دی اور آخر میں سوال کیا "اب یہ فیصلہ آپ خود فرمائیں گے کہ جس شخص سے معافی نہیں مانگ سکا، اس کی تلافی میں، میں نے ایک لاکھ درہم خیرات کر دیے ہیں تو خدا کی نظر میں میرا یہ عمل کیسا ہو گا؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا "یہ ایک لاکھ درہم کی خیرات تمہارے نامۂ اعمال کی نیکی میں تو لکھی جاسکتی ہے لیکن اس سے وہ گناہ معاف نہیں کئے جاسکتے جو ایک بندے کی دل آزاری کی وجہ سے تمہارے نامۂ اعمال میں لکھے جاچکے ہیں شبلی! یہ معاملہ حقوق العباد کا ہے اس میں اللہ کیوں دخل دے گا؟ تمہیں کھو ورت، بہر قیمت اس شخص کو تلاش کر کے معافی مانگنا ہے اسی وقت واپس جاؤ اور اسے تلاش کر کے معافی مانگو"

شبلی نے کہا "میں اسے کئی جگہ تلاش کر آیا لیکن وہ نہیں ملا، اب میں کہاں جاؤں"

جنید بغدادی نے نفرت سے کہا "تمہارے مزاج میں ابھی تک نہاوند کی سرداری کی خُو بُو باقی ہے تمہیں اپنی جائداد اور دولت کا اب بھی احساس ہے اب بھی گھمنڈ اور گمان ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کبھی بھی ایک لاکھ درہم خیرات کر دینے کی طرف مائل نہ ہوتے، جاؤ اس گھمنڈ اور گمان کو نکال کے واپس آؤ"

شبلی نے کہا "حضرت! جو شخص مجھے بعد تلاشِ بسیار بھی نہیں مل سکا اس کے لئے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاید وہ زندہ نہیں ہے اور اگر وہ واقعی مر چکا ہے تو میں اس سے کس طرح معافی حاصل کروں گا"

جنید بغدادی نے زرتح ہو کے کہا "اچھا چلو یہی سہی پھر بھی تمہارے دل و دماغ کے کسی گوشے میں بیٹھی ہوئی سرداری کی خوبو تو نکالنی ہی پڑے گی" پھر ذرا سکوت اختیار کیا اور حکم دیا "ایک سال کی دریوزہ گری اور؟"

شبلی اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے بولے "بہتر ہے جیسا حکم مرشد!"

یہ کہا اور باہر نکل گئے جنید بغدادی کھلے ہوئے دروازے پر نظریں جمائے کچھ سوچتے رہے پھر خود سے مخاطب ہوئے۔

"دل کا میل کچیل ابھی اچھی طرح تو نکلا نہیں اس زنگ کی موجودگی میں دل پر جلاکاری کس طرح ممکن ہے"

لیکن اس مرتبہ لوگوں نے شبلی کو کچھ نہ کچھ دینا بھی شروع کر دیا۔ دن بھر کی بھیک سے جو کچھ حاصل ہوتا، جنید بغدادی اسے لے کر خیرات کر دیتے اور اس میں ایک پائی بھی خود پر یا شبلی پر نہ خرچ کرتے شبلی کو پیٹ بھر غذا بھی نہ دی جاتی، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور شبلی کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا، جنید بغدادی کو ان کے کھانے پینے کی تو فکر تھی نہ پروا۔ شبلی اپنے مرشد کے اس رویے کی شکایت بھی نہ کر سکتے تھے، انہیں تو صبر و انتظار کی راہ پر چل کر اس کے دروازے کشادہ کرنے تھے۔

لوگ انہیں دھتکارتے۔ جھڑکیاں دیتے اور سخت سُست کہتے لیکن یہ پیکر تسلیم ورضا بنے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ دن بھر کے تھکے ہارے جب یہ مرشد کی خدمت میں پہنچتے تو وہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیتے اور کہتے "یہ خوئے سرداری اور انا کا میل کچیل صاف ہو رہا ہے، آئینے کا زنگ کھرچا جا رہا ہے جلاکاری کا الف مقام بنا چکا ہے اور جلاکا بی الف ایک ایک دن بھیل کے پورے دل کو مجلا کر دے گا۔"

شبلی نے صبر و تحمل سے پورا سال دریوزہ گری میں گزار دیا۔ اس بار انہوں نے نہ تو کسی قسم کا شکوہ کیا اور کوئی عذر، ایک دن جنید بغدادی نے انہیں خود ہی اس کام سے منع کر دیا، کہا "شبلی! بس کرو تم اپنا نصاب پورا کر چکے، اب تم میری صحبت میں رہ سکتے ہو۔"

شبلی جس کیفیت میں مبتلا ہو چکے تھے اس میں اب شکوے یا شکریے کے لئے کوئی لفظ بھی موجود نہیں تھا۔ اعلیٰ ظرفی سے مرشد کی بات سنی اور ان کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ جنید بغدادی نے ان کے ذمے یہ خدمت کر دی کہ آنے جانے والے درویشوں کی خدمت کیا کریں، شبلی نے یہ کام بھی پورے ایک سال انجام دیا۔ ایک دن حضرت جنید بغدادی نے انہیں طلب فرمایا اور پوچھا "شبلی! اب تم خود کو خلائق میں کیسا سمجھتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا "تمام مخلوق میں کمتر۔"

جنید بغدادی نے خوش ہو کے بشارت دی "اب تمہارے ایمان کی تکمیل ہو چکی ہے۔"

رفتہ رفتہ ان کا یہ حال ہو گیا کہ لوگوں کے لئے شمشیر بے نیام ہو گئے۔ ان کے جلال و جمال سے لوگ ڈرنے لگے وہ لوگوں کو ترغیب دیتے کہ "میرے سامنے تم لوگ بار بار خدا کا نام لو، میں تمہیں اپنی مقدرت کے مطابق کچھ عطا کروں گا۔"

لوگ نفع اندوزی کے خیال سے انہیں دیکھتے ہی اللہ اللہ کہنا شروع کر دیتے اور یہ خوش ہو کے انہیں اشرفیوں سے نواز دیتے، یہ اشرفیاں ان کے پاس کہاں سے آتی تھیں کسی کو پتہ نہ تھا بغداد کے بچوں کو جب اس مشغلے کا علم ہوا تو وہ ہجوم کی شکل میں آپ کے پاس آتے اور اللہ اللہ کا ورد شروع کر دیتے۔ شبلی ان میں شیرینی تقسیم کرنے لگے۔ ان کا یہ عمل ایک مدت تک جاری رہا، خلاف معمول ایک دن جب بچے اور بڑے اللہ اللہ کا ورد کرتے حاضر ہوئے تو دیکھا، شبلی برہنہ شمشیر لیے ان کے قتل پر آمادہ ہیں لوگ انہیں اس حال میں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ شناسا شبلی کے قریب پہنچے اور پوچھا "شبلی! یہ کیا بات ہے؟"

شبلی نے جواب دیا "ربِ کعبہ کی قسم، میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اگر کسی نے

میرے سامنے خدا کا نام لیا تو میں اسے قتل کر دوں گا "

شناسا نے عرض کیا " لیکن جناب کل تک تو آپ اللہ اللہ کے ورد پر انہیں اشرفیوں اور شیرینی سے سرفراز فرمایا کرتے تھے "

شبلی نے جواب دیا " ہاں میں یہی کرتا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ لوگ خدا کا نام اس کی محبت میں ڈوب کر لیا کرتے ہیں لیکن اب مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ لوگ خدا کا نام یا تو عادتاً لیتے ہیں یا پھر سوداگری میں، اور میں اسے ناجائز بلکہ حرام سمجھتا ہوں "

ایک دن لوگوں نے دیکھا، شبلی ہاتھوں میں آگ لیے ایک طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں کسی نے انہیں روک لیا اور پوچھا " شبلی! کہاں کا قصد ہے ؟"

جواب دیا " خانہ کعبہ جا رہا ہوں!"

اس شخص نے سوال کیا " اس آگ کا کیا کرو گے ؟"

جواب دیا " اس سے خانہ کعبہ کو پھونک دوں گا "

سوال کرنے والا لرز گیا " سہم کر بولا " شبلی! تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو ؟"

آپ نے جواب دیا " افسوس کہ جو خود اپنے ہوش و حواس میں نہیں وہ میرے ہوش و حواس پر شبہ کر رہے ہیں "

اس شخص نے کہا " آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ نے اس پر بھی کچھ غور کیا ؟"

شبلی نے جوش میں جواب دیا " میں ہوشمندی کی باتیں کر رہا ہوں لیکن تمہاری عقل و حواس پر غفلت کے پردے پڑ چکے ہیں اس لئے تم میری بات نہیں سمجھ سکتے "

اس شخص نے پھر سوال کیا " یہ آگ آپ کہاں لئے جا رہے ہیں ؟

شبلی نے اسی بے باکی سے جواب دیا " خانہ کعبہ لیے جا رہا ہوں اور اس آگ سے اسے پھونک دینا چاہتا ہوں "

اس شخص نے سوال کیا " آخر کیوں ؟ کیا رب کعبہ اپنے گھر کی حفاظت نہیں کرے گا ؟"

" نہیں کرے گا " شبلی نے جواب دیا " کیونکہ میں اس کے گھر کو اس لیے پھونک دینا چاہتا ہوں کہ لوگ خانہ کعبہ کے بجائے کعبے والے کی طرف رجوع ہو جائیں "



عید کا دن تھا لوگ زرق برق، رنگ برنگے اور صاف ستھرے لباس میں ملبوس ادھر

اُدھر عید ملتے پھر رہے تھے لیکن اس دن شبلی نے بطور خاص سیاہ کپڑے پہن لیے، دیکھنے والوں نے ان کا مذاق اڑایا کہا "کیا ہوش و حواس سے بالکل ہی عاری ہو گئے ہو؟"

شبلی نے اللہ کا نعرہ مارا اور جواب دیا "میں اس کی ذات میں گم ہو گیا ہوں۔"

کسی نے ہنس کر کہا "لیکن اتنا ہوش باقی رہا کہ عید کے دن قصداً سیاہ کپڑے پہن لیے۔"

آپ نے جواب دیا "لوگو! میری باتیں سمجھنے کی کوشش کرو، میں نے یہ لباس تم سب کے ماتم میں پہن لیا ہے۔"

ایک شخص غصے میں کھڑا ہو گیا، بولا "ہم زندوں کے ماتم کا مطلب؟"

آپ نے جواب دیا "تم نے اپنے معبود حقیقی کو بھلا دیا اور ماسوا میں غرق ہو گئے پھر تم زندہ کہاں رہے ہو؟"

بچوں نے آپ کا مذاق اڑایا اور انہوں نے شور بلند کیا "یہ شخص ہمیں تو اللہ کا نام لینے سے منع کرتا ہے اور خود بار بار ایک نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔"

شبلی نے غصے میں انہیں دیکھا، بچوں نے ان پر پتھروں کی بارش کر دی "یہ دیوانہ ہے!"

شبلی نے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کی، پتھروں کی مار سہتے رہے اور کہتے رہے "تم ابھی بچے ہو، نادان ناسمجھ، تمہیں کوئی سزا کس طرح دی جا سکتی ہے" پھر انہیں بطور خاص مخاطب کیا "میرے بچو! اِدھر آؤ! ذرا میرے قریب آؤ، میں تمہیں ماروں گا نہیں، میں تم سے بدلا نہیں لوں گا، دیکھو تم نے میرا جسم لہولہان کر دیا ہے اور ایسا تم نے خود نہیں کیا، اس میں خدا کا حکم بھی شامل تھا پھر میں تمہیں مورد الزام کس طرح ٹھہرا سکتا ہوں؟"

بچے خوف زدہ ہو کے دور ہی کھڑے رہے، اب انہوں نے سنگ باری موقوف کر دی تھی۔

لہولہان شبلی آہستہ آہستہ چل کے خود ہی ان کے پاس پہنچ گئے تھے، بوڑھے اور جوان بھی تصویر حیرت بنے یہ منظر دیکھ رہے تھے شبلی نے کہا "کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میں اس کا نام لے رہا ہوں یہ تو خود معبود حقیقی ہے جو اپنے نام کا ورد کر رہا ہے، ذرا میرے قریب آ کے بہتے ہوئے خون کی زبان سنو، دیکھو ہر قطرۂ خون کیا کہہ رہا ہے؟"

چند آدمیوں نے ہمت کی اور جھک کے کان بہتے ہوئے لہو کے قریب کر دیے وہاں سے پُر اسرار آوازیں آ رہی تھیں "اللہ، اللہ، اللہ!"

ان کے چہرے سفید پڑ گئے اور ذرا سی دیر میں شبلی وہاں تنہا رہ گئے۔

شبلی کی عبادت و ریاضت میں اتنا اضافہ ہوا کہ راتوں کی نیند اڑا دی اللہ ان کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا اور وہ اس سے ایک لمحے غافل رہنے کو بھی گناہ سمجھتے تھے انہوں نے بہت سارا نمک پیس کے حجرے میں رکھ لیا اور جب بھی نیند ستاتی ایک چٹکی آنکھوں میں بھر لیتے۔ جب لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوا تو انہوں نے شبلی کو ڈرایا کہا "یہ تم کیا غضب کرتے ہو؟ اس طرح تو بینائی جاتی رہے گی"

شبلی نے جواب دیا "میں نے اپنی چشم باطن روشن کر لی ہے اس لئے چشم ظاہر کی بینائی کی میں پروا نہیں کرتا"

ایک دن جنید بغدادی کو کسی نے بتایا کہ شبلی لوگوں کو جمع کر کے وعظ کہنے لگے ہیں اور اس میں ایسی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جن پر کفر کا فتویٰ علانیہ لگایا جا سکتا ہے۔

جنید بغدادی نے کہا "اچھا اب جس دن وہ کہیں وعظ کہہ رہے ہوں مجھے مطلع کیا جائے میں ان کی تقریر خود سننا چاہتا ہوں تاکہ اس کے مطابق انہیں تنبیہہ کی جائے"۔

ایک دن لوگوں نے انہیں رصافہ بازار میں تقریر کرتے دیکھا فوراً جنید بغدادی کو مطلع کیا گیا، وہ بھاگے بھاگے رصافہ بازار پہنچے وہاں شبلی محو گفتار تھے وہ کہہ رہے تھے "لوگو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ خدا کے گھر کا طواف تمہیں جہنم سے بچالے گا تم خدا کے گھر کو پھونک کر خدا کی طرف راغب ہو جاؤ اور یاد رکھو جہنم کی آگ کا خوف تمہاری اطاعت و ریاضت میں شامل نہ ہونے پائے میں نہیں سمجھتا وہ معبود حقیقی جو اپنے بندوں سے ماؤں کی ستر گنا محبت سے زیادہ چاہ رکھتا ہے اسے بندوں کے لئے جہنم کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ خدا معلوم نہیں کیوں اپنے بندوں میں جنت کا لالچ اور جہنم کا خوف پیدا کر کے اپنی طرف راغب کرنا چاہتا ہے کیا ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم خدا کی عبادت بس خدا کے لئے کریں اور قیامت کے دن اس کے دیدار کے علاوہ دوسری کوئی خواہش نہ رکھیں؟"

جنید بغدادی نے با آواز بلند شبلی کو پکارا "شبلی! اپنی تقریر بند کرو"

شبلی خاموش ہو گئے۔ جنید بغدادی نے انہیں قریب بلایا "یہاں آؤ میرے قریب میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں"

شبلی ان کے قریب پہنچ گئے جنید بغدادی نے کہا "تم یہ کیسی تقریر کر رہے تھے؟"

شبلی نے جواب دیا "میری تقریر جب خود آپ نے بھی سن لی ہے تو آپ کا یہ سوال فضول ہے"

جنید بغدادی نے غصے میں کہا "ہم نے جن چیزوں کو مدفون کر رکھا ہے انہیں تم بر سر عام

کیوں بیان کرتے پھر رہے ہو؟"

شبلی نے تلخی سے جواب دیا "جن حقائق کا میں اظہار کرتا ہوں، وہ لوگوں کے ذہنوں سے بالاتر ہیں کیونکہ میری باتیں حق کی جانب سے ہوتی ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور دوران تقریر شبلی کا وجود باقی نہیں رہتا"

جنید بغدادی نے افسوس سے کہا "افسوس ہے کہ تم بھی اسی قسم کی باتیں کر رہے ہو جیسی ابن منصور کرتا ہے۔ مجھے تمہاری باتوں میں خون آلود شمشیر نظر آتی ہے"

شبلی نے جواب دیا "جب درمیان میں شبلی کا وجود باقی ہی نہیں رہا تو پھر شمشیر اور اور خون کا خوف کیا معنی رکھتا ہے"

جنید بغدادی نے عاجز آکے کہا "شبلی! میں تمہارے قول کی تردید نہیں کر رہا لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کے مجمع میں اس قسم کی باتیں کرتے پھرو"

شبلی نے ذرا ناگواری سے کہا "جو لوگ ایک ہی وقت میں دین بھی چاہتے ہیں اور دنیا بھی، ان کے لئے ہماری مجلس نشینی حرام ہے"

جنید بغدادی نے افسوس سے کہا "جب تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری باتیں حق کی طرف سے ہوتی ہیں اور اسی کی طرف واپس جاتی ہیں تو اس کا ایک نہ ایک دن یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ یہی سامعین تمہیں پاگل اور دیوانہ قرار دے دیں گے"

شبلی نے جواب دیا "پاگل ہوش مندی کی کیفیت سے واقف ہی کب ہوتے ہیں؟ یہ خود پاگل ہیں کسی پاگل کی سندِ دیوانگی کس حد تک معتبر ہو سکتی ہے آپ اچھی طرح واقف ہیں"

جنید بغدادی نے عاجز آکے کہا "تو ضدی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تو وہی کرے گا جس کا تو ارادہ کرلے گا جا میں تجھے تیرے حال پہ چھوڑتا ہوں"

جنید بغدادی یہ کہہ کے گھر واپس آگئے۔

کچھ عرصے بعد انہیں واقعی دیوانہ قرار دے دیا گیا۔ فقیہان شہر اور اطبائے بغداد نے انہیں پاگل قرار دے دیا اور دار المجانین (پاگل خانے) میں داخل کر دیے گئے۔ جنید بغدادی کو اس خبر سے صدمہ پہنچا اور ان کے ساتھ ہی وہ لوگ بھی آزردہ ہو گئے جنہیں شبلی سے محبت تھی اور ان کے مرتبے سے واقف تھے یہ لوگ پاگل خانے میں شبلی سے ملنے گئے۔

 جب انہیں شبلی کے روبرو پیش کیا گیا تو شبلی نے ان سے پوچھا "تم لوگ کون ہو؟ اور

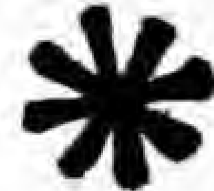
میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

دوستوں نے جواب دیا "ہم سب آپ کے دوست ہیں اور آپ کی مصیبت پر تسلی دلاسا دینے آئے ہیں۔"

شبلی نے بیزاری سے کہا "خوب تم کیسے دوست ہو کہ وہ نہیں چاہتے جو تمہارا دوست اپنے لئے پسند کرتا ہے دوست تو اسے کہتے ہیں جو رضائے دوست میں خوش رہتا ہے۔ مجھے میرے شیخ نے صبر و انتظار کی تلقین کی تھی اور اب میں اس راہ کا ایک مستقل مزاج مسافر ہوں کوئی صعوبت کوئی مصیبت مجھے اس راہ سے بھٹکا نہیں سکتی اور ایک تم ہو، تم لوگ کہ خود کو میرا دوست ظاہر کرتے ہو لیکن میری راہ پر چلتے نہیں، آخر تم لوگ بھی میری مصیبت پر میری ہی طرح صبر کیوں نہیں کرتے؟"

دوست حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے شبلی نے انہیں بھگانے کیلئے فوراً ہی سنگ باری شروع کر دی کہا "او محبت کے جھوٹے دعوے دارو! تم سب اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں پتھر مار مار کے ہلاک کر دوں گا کیونکہ جھوٹ کی میرے ہاں یہی سزا ہے"

دوست احباب خوفزدہ ہو کے اسی وقت بھاگ کھڑے ہوئے۔



پاگل خانے میں ان کی ملاقات کو عباسی وزیر حاضر ہوا اس نے سن رکھا تھا کہ شبلی کہتے ہیں کہ جس صدیق سے معجزے کا اظہار نہ ہو، وہ صدیق نہیں کچھ اور ہو گا نہایت قیمتی لباس اور خدام کے ساتھ جب وزیر ان کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا "تم کس سے ملاقات کرنے آئے ہو"

وزیر نے جواب دیا "تم سے"

شبلی نے پوچھا "کس لئے؟"

وزیر نے جواب دیا "یہ پوچھنے کہ تم تو یہ کہا کرتے تھے کہ جس صدیق کو معجزہ نہ ہو وہ جھوٹا ہے لوگ تمہیں اس عہد کا صدیق کہتے ہیں پھر تم سے کسی معجزے کا ظہور کیوں نہ ہوا؟"

شبلی نے کہا "کیا میں خدا کے اوامر و نواہی میں موافقت نہیں کر رہا ہوں؟ اگر کر رہا ہوں تو یہی میری صدیقیت ہے اور یہی میرا معجزہ، کسی مرید کے لئے توقف، عارف کو تعلق، عاشق کو گلہ، صادق کو دعوا، خائف کو قرار اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ سے فرار کسی حال میں بھی جائز نہیں کیا میں ان میں سے کسی ایک کا بھی تارک ہوں کیا میرے حال میں یہ ساری باتیں موجود نہیں ہیں"

وزیر اس طرز تکلم سے خوفزدہ ہو گیا وہ واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ آپ نے اس کے قیمتی لباس کو حقارت

سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "تم قبر میں ہو اور ایک قبر کا آدمی زندوں سے مخاطب ہو، حیرت ہے"۔

وزیر نے خوف زدہ لہجے میں عرض کیا۔ "حضور والا! میں زندہ ہوں، خدا کے لئے میرا شمار زندوں میں کیجئے"۔

شبلی نے جواب دیا۔ "تم اپنے شاندار لباسوں میں دفن رہتے ہو"۔

وزیر نے جاتے جاتے پاگل خانے کے نگراں کو حکم دیا۔ "انہیں رہا کر دو، ورنہ ڈر ہے کہ ان کی باتیں بغداد کو پھونک کے رکھ دیں"۔

شبلی رہا کر دیئے گئے۔

جب یہ رہا ہو کر جا رہے تھے تو کسی ارادت مند نے انہیں راستے ہی میں روک لیا اور گریہ و زاری کرتے ہوئے کہا۔ "شبلی! خدا کے لئے آپ میرے حق میں کشائش روزی کی دعا کیجئے کیونکہ میری ساری تدبیریں بیکار ہو چکی ہیں"۔

شبلی نے جواب دیا۔ "میں تیرے حق میں دعا ضرور کروں گا لیکن پہلے گھر جا کے تو ایک کام کر آ"۔

اس شخص نے کہا۔ "ارشاد، میں ابھی گھر جانے کو تیار ہوں"۔

شبلی نے کہا۔ "گھر کے جتنے افراد کا رزق تیرے ذمے ہے انہیں فوراً گھر سے نکال دے اور جتنوں کا رزق خدا کے ذمے ہے انہیں گھر ہی میں رہنے دے اس کے بعد میرے پاس آ، میں دعا کروں گا"۔

وہ شخص توبہ کرتا ہوا شبلی سے جدا ہو گیا۔

لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ شبلی پورا کلمہ نہیں پڑھتے بس اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں ایک درویش نے اس کا ذمہ لیا کہ وہ شبلی سے پورا کلمہ پڑھوا کے چھوڑے گا، یہ شبلی کے پاس پہنچا اور سختی سے پوچھا۔ "شبلی! تم ہمیشہ اللہ اللہ کہتے رہتے ہو، آخر تم لا الہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "میں اللہ سے پہلے لا (نہیں) کہہ کے اس کی نفی نہیں کر سکتا کیونکہ اگر لا کہنے کے بعد زندگی نے وفا نہ کی تو میں مقام نفی میں رہ جاؤں گا"۔

نوجوان درویش نے کہا۔ "آپ کا جواب خوب ہے لیکن میں مطمئن نہیں ہوا"۔

شبلی نے کہا۔ "خدا نے قرآن پاک میں اپنے رسول سے کہا "اے رسول! فرما دیجئے کہ میرے لئے بس اللہ ہی کافی ہے اور دوسروں کو لہو و لعب میں مشغول رہنے دیجئے۔ آپ ان سے کوئی سروکار نہ رکھئے"۔ اتنا کہہ کے شبلی نے درویش سے کہا۔ "بس اللہ کہنے کیلئے امر الٰہی صادر

ہو گیا اور میں جدھر اور جہاں دیکھتا ہوں اللہ ہی نظر آتا ہے میں تو غیر اللہ یا ماسوا اللہ کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتا۔ پھر لا، اپنی زبان سے کیوں کہوں؟"

جادو جیسا اثر رکھنے والے کلمات نے نوجوان درویش کا دل پھونک کے رکھ دیا اس کی حالت غیر ہونے لگی اس نے بمشکل تمام رُک رُک کر کہا "شبلی! جزاک اللہ جو کچھ تم نے کہا میرے لئے بہت کافی ہے۔"

اس کے بعد وہ بے حال ہو کے گر گیا لوگ اسے گرتا دیکھ کے اس کے قریب پہنچے اور اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے لاش اس کے رشتے داروں کو پہنچا دی گئی انہوں نے شبلی کے خلاف قتل کا مقدمہ قائم کر دیا۔ قاضی نے یہ مقدمہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مرحوم کے ورثا اس مقدمے کو خلیفہ کے پاس لے گئے خلیفہ نے اسی وقت شبلی کو طلب کر لیا، وارفتہ و سرشار، بے نیاز و مستغنی، شبلی خلیفہ کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔

خلیفہ نے شبلی سے سوال کیا "کیا اس نوجوان درویش کو تم نے ہلاک کر دیا؟"

شبلی نے جواب دیا "نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔"

خلیفہ نے پوچھا "واقعے کی تفصیل بیان کرو اور بتاؤ کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟"

شبلی نے اپنے خاص لب لہجے میں جواب دیا "اس درویش کی روح پہلے ہی سے مشتاق دید تھی میرے سامنے آ کے رونے لگی، فریاد کی، باری تعالیٰ کی طرف سے دعوت آئی، یہ لبیک کہتا ہوا جان بحق ہو گیا برق مشاہدہ جمال نے اس کا کام تمام کر دیا، اس میں میرا کیا قصور؟"

خلیفہ کی حالت غیر ہونے لگی اس کے رگ و پے میں خون کی گردش اتنی تیز ہو گئی اور دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ خلیفہ کو خدشہ محسوس ہوا کہ درویش کی طرح شاید وہ خود بھی جاں بحق ہونے والا ہے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خدام دربار کو حکم دیا "شبلی کو اسی وقت یہاں سے لیجاؤ کیونکہ ان کا کلام مجھ پر ویسی ہی کیفیت طاری کر رہا ہے جیسی درویش پر طاری کر کے اسے ہلاک کر چکا ہے۔"

پھر درویش کے مدعیان خون سے کہا "تم لوگ بہت نادان ہو بخدا! مجھے یقین ہے کہ اگر شبلی فرما فرما تم سب سے مخاطب ہو جائیں تو تم میں سے ہر ایک اسی درویش کے حال کو پہنچ جائے، شبلی میں معلوم نہیں کون گویا ہے، ان کو جاؤ اور مت الجھو۔"

مدعیان خون نے اپنا دعوا واپس لے لیا۔



شبلی کے حاسد اور مخالف ان کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ شبلی باقاعدہ مسجد میں جا کے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ شبلی نے انہیں جواب دیا "لوگو! تم نے مجھے ایسا مت سمجھو، میں اس کی یاد سے ایک پل بھی غافل نہیں رہتا۔"

کسی معترض نے کہا "ہم دنیا دار لوگ تو ظاہر ہی دیکھ کے فیصلہ کریں گے۔"

شبلی نے عاجزی سے کہا "خدا نے مجھے مسجد کے معاملے میں کچھ ایسی الجھن میں ڈال دیا ہے کہ اس سلسلے میں اگر میں اپنی زبان کھولوں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔"

حاسد نے کہا "اس کا ہم پر بھی اظہار ہو جائے تو بڑا کرم ہو گا۔"

شبلی نے مجبوراً جواب دیا "اچھا تب پھر تم میرے ساتھ آؤ اور مسجد تک پہنچنے کے دوران میرے قریب ہی رہو اور اس کیفیت کو خود دیکھ سن لو۔"

وہ شخص آپ کے ساتھ ہو لیا۔ آپ نے وضو کیا اور مسجد روانہ ہو گئے ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ ایک آواز سنائی دی "یہ گستاخانہ وضو کے ساتھ ہمارے گھر آ رہا ہے۔"

اس آواز نے شبلی کے قدم روک دیے اور واپسی کی نیت سے پلٹے تو دوسری آواز سنائی دی۔ "بس کر دیا ارادہ ترک؟ یہ تو سوچ کہ ہمارے گھر سے واپس ہو کے تو اور کہاں جائے گا؟"

شبلی نے حالت وجد میں اللہ کی ضرب لگائی تو دوسری طرف سے جواب ملا "ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے؟"

شبلی خاموش ہو کے مسجد کے ایک کونے میں جا بیٹھے تو کسی نے طنز کیا "تو صبر و ضبط کا بھی دعوے دار ہے؟"

شبلی رونے لگے اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "اللہ! تو یہ جو کچھ میرے ساتھ کر رہا ہے میں تجھی سے اس کی فریاد چاہتا ہوں۔" پھر انہوں نے حاسد سے کہا "اب تم بتاؤ کہ جو شخص ایسی الجھنوں میں مبتلا کر دیا گیا ہو کس طرح مسجد کی حاضری پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟"

حاسد لاجواب ہو کے چپ ہو رہا۔



گلی میں چند بچے آپس میں جھگڑ رہے تھے ادھر سے شبلی گزرے اور انہیں جھگڑتا دیکھ کے پوچھا "تم لوگ آپس میں جھگڑ کیوں رہے ہو؟"

ایک بچے نے جواب دیا "ہمارے پاس چند اخروٹ ہیں انہیں آپس میں تقسیم کرنا چاہتے لیکن مسائی

تقسیم کرنے سے قاصر ہیں ۔"

شبلی نے کہا "لاؤ وہ اخروٹ مجھے دو، میں تقسیم کرتا ہوں ۔"

بچوں نے وہ اخروٹ شبلی کے حوالے کر دیئے شبلی نے اس کے حصے کرنا شروع کر دیے ایک بچے کو بڑی عجلت تھی جیسے ہی اخروٹ ملے انہیں توڑنا شروع کر دیا اور اتفاق کی بات کہ وہ سارے ہی خراب نکلے ۔ بچے نے شور کیا "میں تو دوسرا اخروٹ لوں گا یہ تو سارے ہی خراب ہیں ۔"

شبلی نے پریشان ہو کے کہا "میں ان کے اندر کے حال سے تو واقف نہیں تھا ۔"

کسی بچے نے معصومیت سے کہا "جب تم ان کے اندر سے واقف نہیں تھے تو تم نے یہ تقسیم اپنے ذمے لی کیوں ؟"

شبلی کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بات بچے کے ذریعے خدا کہہ رہا ہے بے اختیار رو دیے اور مست و بے حال ہو کے ایک طرف چل دیے، وہ پریشان اور بے حال چلے جا رہے تھے کہ کسی نے انہیں روک کے پوچھا "شبلی تم پریشان کیوں ہو ؟"

شبلی نے جواب دیا "کوئی ایک بات ہو تو عرض کروں بیسوں ایسی باتیں ہیں جن کی فکر نے مجھے ہلکان کر دیا ہے ۔"

اس شخص نے کہا "تمہاری حالت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو تم خود خدا کے ساتھ نہیں ہو یا پھر یہ ہے کہ خدا تمہارے ساتھ نہیں ہے ورنہ اتنی بے چینی اور پریشانی میں تم نہ مبتلا ہوتے ۔"

شبلی نے جواب دیا "اگر میں خدا کے ساتھ ہوتا تو میری ایک الگ حیثیت بھی ہوتی لیکن میں تو اس ذات میں گم ہو گیا ہوں اور اب ہم دو نہیں ہیں ایک ہیں ۔" پھر قدرے افسوس سے کہا "میں ہمیشہ اس بات سے خوش ہونے کی کوشش کرتا ہوں کہ مجھے خدا کا مشاہدہ اور انس حاصل ہے لیکن جسے تم لوگ خوشی کہتے ہو، ویسی خوشی اپنی ہی جنس سے مل کر حاصل ہوتی ہے ۔"

اسی عالم کیف و مستی میں وہ جنید بغدادی کے پاس پہنچ گئے اس وقت جنید بغدادی کی بیوی کنگھی کر رہی تھیں وہ شبلی کو دیکھتے ہی پردے میں جانے لگیں تو جنید بغدادی نے فرمایا "تم شبلی سے پردہ کرتی ہو حالانکہ یہ جس کیف و مستی کے شکار ہیں اس میں دوزخ و جنت کی بھی پرواہ نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایک عورت کا خیال !"

بیوی رک گئیں ۔ شبلی دیر تک جنید بغدادی کو دیکھتے رہے ۔ آخر وہ رونے لگے انہیں ہچکیاں لیتے دیکھ کر جنید بغدادی نے بیوی سے کہا "اب تم اندر چلی جاؤ کیونکہ اب یہ ہوش میں آ رہے ہیں ۔"

بیوی خوفزدہ سی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

جنید بغدادی نے چھیڑنے کے انداز میں کہا، "شبلی! مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں ذکر الٰہی میں صدق حاصل نہیں ہے اگر میری یہ بات درست ہے تو میں پریشان ہوں کہ تم خدا کو کس طرح یاد کرتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا، "آپ نے درست فرمایا۔ جب میں مجازی اعتبار سے اس کا بے حد ذکر کرتا ہوں تو ایک بار وہ بھی مجھے حقیقت کے ساتھ یاد کر لیتا ہے اور میرے لئے یہ بہت کافی ہے۔"

شبلی کے اس مکالمے نے جنید بغدادی کو اتنا مضطرب کر دیا کہ وہ اللہ کا نعرہ لگا کے مدہوش سے ہو گئے۔

صبح کی خنک اور خوش گوار فضا میں شبلی نے ایک پُر اسرار آواز سنی، "شبلی! تو اسم ذات کے ساتھ کب تک خود کو وابستہ رکھے گا، مسمّی کو کیوں نہیں تلاش کرتا؟"

اس آواز نے تازیانے کا کام کیا، شبلی پریشان تھے کہ مسمّی کو کہاں تلاش کریں؟ یہ اضطراب اتنا بڑھا کہ وارفتہ اور سرشار دریائے دجلہ میں کود گئے لیکن موجوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں دوبارہ کنارے پر پھینک دیا گیا۔ ادھر سے مایوس ہو کے شبلی نے جنگل کا رُخ کیا اور خود کو درندوں کے درمیان کھڑا کر دیا کہ وہ انہیں چیر پھاڑ کے کھا جائیں لیکن درندے انہیں دیکھتے ہی دم دبا کے اِدھر اُدھر منہ چھپانے لگے۔ مایوس ہو کے پھر آبادی میں آ گئے اور آگ کا الاؤ روشن کر کے اس میں داخل ہو گئے لیکن آگ نے انہیں جلانے سے معذوری ظاہر کر دی، شعلے سانپ کی زبانوں کی طرح ان کے جسم کو یوں مس کرتے تھے جیسے شفیق گائے اپنے نومولود بچے کو زبان سے چاٹ چاٹ کے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے عاجز آ کے یہ الاؤ سے باہر نکلے اور زار و قطار رونے لگے اب ان کے سامنے ہلاکت کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور اس پر چھلانگ لگا دی ہوا نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور یہ کسی ہلکے پھلکے پرند کی طرح آہستہ آہستہ نیچے سبزے پر آ گرے ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی مجروح نہ ہوا تھا یہ اٹھے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تو خود ہی یہ کہتا ہے کہ اسم ذات کے بجائے میں مسمّی کو تلاش کروں اور یہ ظاہر ہے کہ تو اپنی مرضی سے جب چاہتا ہے میری ذات میں حلول کر جاتا ہے لیکن اگر میں خود تجھ میں شامل ہونا چاہوں تو اس وقت تک شامل نہیں ہو سکتا جب تک میں اپنے مادی جسم سے روح جدا نہ کر دوں، میں مستقل وصال چاہتا ہوں مستقل اور دائمی اتصال۔"

یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے اور کچھ دیر بعد پھر گویا ہوئے، "اللہ! میں کتنا مایوس

انسان ہوں کہ میں نے تجھ سے اتصال وصال دائمی کی خاطر خود کو دجلہ میں گرا دیا لیکن اس نے میری کوئی مدد نہ کی، میں نے خود کو درندوں کے حوالے کر دیا وہ مجھ سے گریزاں رہے میں نے اپنے تئیں آگ میں ڈال دیا، آگ نے اپنی فطرت بدل دی، میں نے خود کو پہاڑ کی بلندی سے گرا دیا، ہواؤں نے مجھے اپنی گود میں لے کر آہستگی سے سبزے پر لا ڈالا، آہ میں کتنا بے بس اور مجبور انسان ہوں میں، تجھے کس طرح اور کہاں حاصل کروں؟ مستقل وصال اور دائمی اتصال کی خواہش کس طرح پوری کروں"۔

ایک بار پھر وہی پُراسرار آواز سنائی دی "شبلی! جو بندہ مقبول الٰہی ہوتا ہے اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا"۔

شبلی پریشان و درماندہ جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا "خدا کے لئے مجھے زنجیروں سے جکڑ دو، میں اپنے آپ میں نہیں ہوں"۔

جنید بغدادی لمحہ بھر انہیں دیکھتے رہے پھر کہا "تمہیں ہو کیا گیا ہے شبلی؟"

شبلی نے جواب دیا "صبر و انتظار کی راہ بہت کٹھن ہے۔ مجھے زنجیروں سے جکڑ دو، ورنہ میں بکھر جاؤں گا"۔

انہیں ان کی خواہش پر زنجیروں سے جکڑ دیا گیا۔

جنید بغدادی نے افسوس کرتے ہوئے کہا "مَنْ طَلَبَ وَجَدَ" جس نے طلب کیا پالیا"۔

شبلی نے تردید کی "نہیں جس نے پالیا اس نے طلب کیا"۔

جنید بغدادی نے نصیحت کی "شبلی! تم میری ایک بات مانو"۔

شبلی ہانپتے ہوئے پوچھا ——————— "وہ کون سی بات؟"

جنید بغدادی نے کہا "اگر تم اپنے امور خدا کے سپرد کر دو تو تمہیں سکون مل سکتا ہے"۔

شبلی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا "نہیں، ایسا نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر خدا میرے امور مجھ پر ہی چھوڑ دے تو مجھے سکون مل سکتا ہے"۔

جنید بغدادی نے ناراضی کا اظہار کیا بولے "شبلی! تمہاری باتوں میں تلوار جیسی کاٹ ہے اور اس میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں"۔

جب طبیعت اعتدال پر آگئی اور لوگوں سے پرسکون لہجے میں باتیں کرنے کے قابل ہو گئے

تو ایک دن انہوں نے کسی ترنج فروش کی آواز سنی جو باہر آواز لگا رہا تھا "بس ایک پیالہ بچا ہے صرف ایک"
شبلی کی حالت پھر متغیر ہو گئی بمشکل قابو پا کے کہنے لگے "یہ بھی ٹھیک ہی کہتا ہے لوگو! آگاہ ہو جاؤ بس ایک ہی باقی ہے وہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا"

کسی کی میت میں شبلی کو بھی لے جایا گیا اور انہیں اس وقت بڑی مشکل پیش آئی جب ان سے میت کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کہا گیا۔ شبلی نے انکار کیا۔ لیکن لوگ نہیں باز آئے اور شبلی کو نماز پڑھانی ہی پڑی انہوں نے اس میں چار تکبیروں کے بجائے پانچ تکبیریں کہہ دیں نماز ختم ہونے کے بعد لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور پوچھا "یہ کیوں جناب! جب نماز جنازہ میں شریعت نے چار تکبیریں رکھی ہیں تو آپ نے پانچ تکبیریں کیوں کہیں؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے چار تکبیر مرنے والے کے لئے ادا کی تھیں اور ایک تکبیر دنیا اور اہل دنیا کے لئے کہی تھی کیونکہ یہ بھی مر چکے"

لوگ اپنا سا منہ لے کے سامنے سے ہٹ گئے۔

ایک بار آپ سخت بیمار پڑ گئے۔ اطبا نے انہیں گھیر لیا اور دوائیں تجویز کرنے کے بعد جب واپس جانے لگے تو بعض چیزوں کے کھانے سے منع کیا۔ شبلی نے کہا "مجھے معلوم نہیں کہ میں ان چیزوں سے پرہیز کر کے بھی سکون پا سکوں گا یا نہیں؟"

کسی طبیب نے کہا "تمہیں معلوم کیوں نہیں جبکہ ہم تمہیں ان کے کھانے سے منع کر رہے ہیں تو تمہیں ان سے ضرور پرہیز کرنا چاہیے"

شبلی نے مسکرا کر کہا "بے وقوفو! جو رزق میری قسمت میں لکھا جا چکا ہے اس کے کھانے سے مجھے کون منع کر سکتا ہے اور جو رزق قسمت میں نہیں لکھا گیا وہ میں کس طرح کھا سکتا ہوں"

طبیب اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔

شبلی کے زہد و نفس کشی کا چرچا عام تھا لوگ مثال میں ان کا نام لیتے انہیں جہاں کہیں دیکھتے ان کا احترام کرتے لیکن یہ کسی بات کی پروا کئے بغیر اپنی دھن میں مست رہتے۔ جنید بغدادی کی مجلس میں مریدوں اور درویشوں کا ہجوم تھا جنید بغدادی توحید، صدق، شوق اور بلند ہمتی پر وعظ فرما رہے تھے اس وقت شبلی بھی شریک مجلس ہو گئے لوگوں نے انہیں دیکھا تو جذبۂ احترام میں کسی درویش نے کھڑے ہو کر عرض کیا "حضرت! جس صدق و شوق اور بلند ہمتی کا آپ ذکر فرما رہے ہیں اس میں شبلی مثالی حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں ان کا کوئی مثال نہیں"

جنید بغدادی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا غیظ و غضب میں حکم دیا "درویش! تیرا یہ قول درست نہیں ہے تو غلط کہہ رہا ہے شبلی کی حقیقت مجھے معلوم ہے وہ مردود اور خدا سے بہت دور ہے وہ اس لائق بھی نہیں کہ میری مجلس میں جگہ دی جائے اسے اسی وقت میری مجلس سے نکال باہر کرو" جنید بغدادی کے مریدوں نے تامل سے کام لیا۔ انہوں نے پھر حکم دیا۔ "میں کہتا ہوں شبلی کو اسی وقت میری مجلس سے نکال دو"

چند مرید اٹھے اور شبلی کو دھکے دے کے مجلس سے نکال دیا۔ اس کے بعد جنید نے اس درویش کو مخاطب کیا جس نے شبلی کی تعریف کی تھی کہا "نوجوان! تو نے شبلی کے سامنے اس کی تعریف کر کے اسے ہلاک کر دینا چاہا تھا کیا تو نہیں جانتا کہ تیرے تعریفی جملے شبلی کے حق میں تلوار تھے کیونکہ اگر ان کا اس پر معمولی سا اثر بھی ہو جاتا تو اس کے نفس کی سرکشی عود کر آتی اور اس کا تفاخر اور تکبر اسے ہلاک کر دیتا لیکن میرے مجلس سے دھکے دے کر نکلوا دینے کا عمل اس کے حق میں ڈھال بن گیا اور وہ ہلاکت سے بچ گیا"

اسی زمانے میں حسین ابن منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا، شبلی نے جوش میں کہا "میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا" لیکن جب منصور کو شبلی کے ارادے کا علم ہوا تو کہا "شبلی کو یہ الزام اپنے سر نہیں لینا چاہیئے یہ کام دوسرے لوگ انجام دے لیں گے" شبلی نے کہا "ابن منصور کو ایسی باتیں علی الاعلان نہیں کرنا چاہئیں کیا وہ چاہتے ہیں کہ ایک دنیا کو فتنہ و فساد کے حوالے کر دیں؟"

لیکن جس دن ابن منصور کو قتل کیا گیا شبلی نے ابن منصور کے مقتل میں پوری رات عبادت میں گزار دی۔

شبلی فقہ مالکی کے پیرو تھے اور فقہ و اجتہاد میں بھی بے مثل تھے لیکن ان کی وارفتگی اور عشق الٰہی میں دیوانگی نے انہیں دنیا کے ظاہری علوم سے بے نیاز کر دیا تھا۔

انتقال سے پہلے لوگوں سے کہا "مجھے وضو کرا دو"

ارادت مندوں نے انہیں وضو کرایا۔ آپ نے چند اشعار پڑھے۔

كُلُّ بَيْتٍ اَنْتَ سَاكِنُهٗ	اَيْنَ مُحْتَاجٌ اِلَى السِّرَاجِ
جس گھر میں تو قیام پزیر ہو جائے	اسے چراغ کی حاجت نہیں رہتی
وَجْهُكَ الْمَامُولُ حُجَّتُنَا	يَوْمَ تَاتِي النَّاسُ بِالْحُجَجِ
تیرا حسین چہرہ ہی میرے لیے حجت ہے	اس دن کے لیے جب لوگ حجتیں پیش کریں گے

لوگوں کو ان کے انتقال فرمانے کا یقین ہو چکا تھا وہ عیادت کے بجائے نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے جمع ہونے لگے شبلی انہیں دیکھ کر ہنس دیے۔ بولے "لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ زندہ کی نماز پڑھنے چلے آئے ہیں!"

شبلی اس وقت بھی اللہ اللہ کر رہے تھے کسی نے کہا "آپ لا الہ الا اللہ کیوں نہیں کہتے؟"

شبلی نے بے چینی سے جواب دیا "جب غیر موجود ہی نہیں تو میں نفی کس کی کروں؟"

لوگوں نے کہا "یہ شریعت کا حکم ہے"

شبلی نے جواب دیا "میرے کان سن رہے ہیں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میں رشوت قبول نہیں کروں گا"

لیکن کسی ظاہر دار نے پھر اصرار کیا "کلمہ پڑھیے"

شبلی نے ضبط و تحمل سے جواب دیا "خوب مردہ زندہ کو نصیحت کر رہا ہے"

لوگوں نے خاموشی اختیار کی، کچھ دیر کسی نے پوچھا "اب آپ کی کیسی حالت ہے؟"

شبلی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا "ٹھیک ہوں دوست اپنے دوست سے مل گیا"

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد لوگوں نے آپ کو پھر مخاطب کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وصال فرما چکے ہیں۔

انتقال کے ایک عرصے بعد ان کے ایک عقیدت مند نے شبلی کو خواب میں دیکھا، اس نے شبلی سے پوچھا "کیا قبر میں نکیرین نے آپ سے کچھ پوچھا تھا؟"

شبلی نے جواب دیا "ہاں پوچھا تھا کہ تمہارا رب کون ہے؟"

عقیدت مند نے سوال کیا "پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

شبلی نے کہا "میں نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس نے تمہیں اور دوسرے ملائک کو یہ حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس وقت بھی میں آدم کی پشت میں موجود تمہیں سجدہ کرتے دیکھ رہا تھا اس پر نکیرین نے آپس میں کہا "اس شخص نے تو پوری اولاد آدم کی طرف سے جواب دے دیا"، یہ کہا اور واپس چلے گئے"

عقیدت مند نے ایک سوال کیا "آپ نے بازار آخرت کو کیسا پایا؟"

شبلی نے جواب دیا "نہایت پھیکا، بے مزہ بے لطف اور بے کیف"

عقیدت مند نے حیرت سے کہا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

شبلی نے کہا ہے میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں یہاں سوختہ جگر اور شکستہ قلب آتے ہی اور انہیں نادیدہ شے کا جلوہ دکھا کے درست کر دیا جاتا ہے جو چیز ان کو لذت اور کیف بخشتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی۔ یعنی لذتِ آشنائی اور جب لذتِ آشنائی ہی میسر نہ ہو تو رونق، لطف اور کیف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جس دل میں داغِ آرزو پایا جاتا تھا وہ یہاں کہاں؟

علامہ اقبال مرحوم نے اسی کیفیت کی بابت یوں اظہار کیا تھا۔ ایک داغ دار دل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے لئے علامہ نے کہا تھا۔

جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی۔

اور دوسری جگہ لذتِ آشنائی کا اس طرح اظہار کیا تھا۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو　　عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

یہ لذتِ آشنائی تھی جس نے ابن منصور کو دار پر چڑھوا دیا اور وہ ساری اذیتیں ہنسی خوشی جھیل گئے اور یہ بھی لذتِ آشنائی کا ایک کرشمہ تھا جس نے نہاوند کے حاکم کو درویشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور اس راہ کی ساری ذلتیں اور رسوائیاں جھیلنے کے بعد بھی صبر و شکر اور برداشت و تحمل کا پابند اور قانع رکھا۔ یہ بلند مرتبہ جسے ملنا تھا مل گیا ورنہ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟۔



حضرت ابوالقاسم نیشاپوری رح

ابوالقاسم کی خاموشی نے ان کے نیشاپوری ہم وطنوں کو اس پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ آپ کی عزت کریں۔ نیشاپور والوں کو اس کا اعتراف تھا کہ ابوالقاسم کی علمیت کا کوئی جواب نہیں وہ علم حدیث، تاریخ اور بعض دوسرے علوم پر اپنے عہد کے سب سے زیادہ لائق انسان تھے لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے فیض حاصل کرتے لیکن آپ ان سے کم سے کم باتیں کر کے رخصت کر دیتے۔ پھر لوگوں نے یہ تبدیلی محسوس کی کہ آپ مطالعہ میں تو مشغول رہتے ہی تھے مگر آپ نے مطالعہ ترک کر دیا اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے اور عبادت اور ریاضت نے ان پر معلوم نہیں کیا اثر کیا کہ انہوں نے بات چیت بالکل ترک کر دی پھر ایک دن انہوں نے اپنا سامان سفر اکٹھا کیا اور ایک قافلے کے ساتھ بغداد روانہ ہو گئے قافلہ آگے چلا گیا مگر آپ بغداد ہی میں رک گئے۔ ان دنوں بغداد میں مشہور زمانہ صوفیائے کرام جمع تھے، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، حسین بن منصور حلاج اس طرح اور دوسرے نامی گرامی صوفیوں کے وجود سے بغداد اور اس کے گردپیش کی فضا منور تھی۔ یہاں ابوالقاسم کو ابوبکر شبلی سے ارادت ہو گئی اور آپ اُن کی صحبت میں رہنے لگے۔ شبلی، ابن منصور حلاج کی طرح مست اور نڈر انسان تھے۔ ان کا اثر ابوالقاسم میں بھی آ گیا۔ انہیں دوسرے صوفی سمجھاتے کہ دنیا اُن کی صاف گوئی اور سچ کو برداشت نہیں کر سکے گی اس لئے وہ تصوف کی پر اسرار اور ناقابل فہم زبان استعمال کریں۔ پھر انہوں نے ابن منصور حلاج کا حشر بھی اپنی آنکھ سے دیکھ لیا جو انا الحق، کا نعرہ لگا کے دار پر چڑھ چکے تھے۔ لیکن آپ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا آپ جواب میں کہتے یہ ہمارے لئے موت کی کیا حقیقت ہے میں موت سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ میں جسم کو اپنے لئے قید خانہ سمجھتا ہوں اور آدمی جب تک قید میں رہتا ہے پریشان اور اداس رہتا ہے اس طرح میں بھی جب تک جسم کی قید میں ہوں اداس اور پریشان ہی رہوں گا"

شبلی نے لوگوں کو منع کیا کہ ابوالقاسم کو نصیحتیں مت کرو کیونکہ تم ان کے مقام اور مرتبے سے لاعلم ہو، ان کے سامنے تمہاری حیثیت ویسی ہی ہے جیسی کسی عالم کے سامنے جاہلوں کی۔"

لوگوں نے آپ سے بولنا ترک کر دیا۔

ایک دن آپ نے کسی واعظ کی تقریر سنی جو اپنے سامعین کو بتا رہا تھا کہ نیکیاں کرو، عبادت کرو کیونکہ اس کا اجر تمہیں اس دنیا میں ملے یا نہ ملے لیکن دوسری دنیا میں تم مالا مال کر دئیے جاؤ گے۔ اور وہاں ایک ایک کے عوض ستر ستر پاؤ گے۔"

آپ نے واعظ کے پاس جا کر اسے ڈانٹ دیا، کہا۔ "یہ تو انسانوں کو صحیح راہ دکھا رہا ہے یا انہیں تاجر بنا رہا ہے۔" اس کے بعد آپ نے لوگوں سے کہا۔ "لوگو! تم اس کی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ تم نیکیاں کرو۔ اور عبادت کرو، لیکن اپنے دل میں خیال ہرگز نہ لاؤ کہ ان نیکیوں اور عبادت کے عوض تمہیں ایک ایک کی جگہ ستر ستر ملیں گی۔"

واعظ نے غصے میں کہا۔ "تو کون ہے جو انسانوں کو گمراہ کرنے آگیا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میرا نام ابوالقاسم ہے اور میں نصر آباد خراسان کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ابوبکر شبلی کے مریدوں میں داخل ہو گیا ہوں۔"

واعظ نے کہا۔ "تیرا مرشد ابوبکر شبلی بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو ان کی پیروی چھوڑ دے اور اپنے ہوش و حواس میں رہ۔ ورنہ اللہ تجھے وہی سزا دے گا جو اس نے منصور حلاج کو دی ہے۔"

آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ "خوب۔ تو تُو مجھے اس اذیت سے ڈرا رہا ہے جس سے ابن منصور حلاج ہنستے کھیلتے گزر گیا، حالانکہ تجھے اپنی ان باتوں سے ڈرنا چاہئیے کہ تو انسانوں کو جنت اور حوروں کا لالچ دے دے کر خدا سے غافل کر رہا ہے اور میں نے کسی لالچی کو سرسبز و شاداب نہیں دیکھا، نہ وہ اس دنیا میں خوش رہتے ہیں اور نہ اس دنیا میں خوش رہیں گے۔"

واعظ کو غصہ آگیا۔ مجمع سے کہا۔ "تم لوگ خاموش کیوں ہو؟ یہ ایک بے دین ہم میں گھس آیا ہے اسے دھکے دے کر نکال دو۔"

مجمع میں سے چند طاقتور جوش و خروش میں آپ کی طرف بڑھے۔ آپ نے ان کے تیوروں سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے ان سے فرمایا۔

"اگر تم اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ نازیبا سلوک کرو، ورنہ مجھے اس فضول گوئی کرنے والے سے نپٹنے دو، اگر یہ سچا ہے اور میں جھوٹا ہوں تو اس حق کے داعی کو مجھ جھوٹے کے ساتھ زد و کوب میں پہل کرنی چاہیئے۔ تم اس کے آلۂ کار کیوں بن رہے ہو؟"

ان میں سے ایک نے کہا "تو جنابِ واعظ کے وعظ میں خلل ڈالنے والا کون ہوتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "جس خدا نے اسے لوگوں کی اصلاح اور فلاح کے لئے پیدا کیا ہے، اس خدا نے مجھے اس پر مامور کیا ہے کہ میں اس کی غلط بیانی پر اسے ٹوکتا رہوں" یہ واعظ نے چیخ کر کہا "یہ صوفی حضرات دین میں خلل ڈال رہے ہیں۔ اسے اس مجلس سے نکال دو"

لوگوں نے مشتعل ہو کر آپ کو پکڑ کر، مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور پھر آپ کو ہاتھوں پیروں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور باہر سڑک پر پھینک آئے۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور خدا سے شکایتاً کہا "کیا تو خود بھی یہی چاہتا ہے کہ لوگ تیرے بجائے حور اور قصور کی محبت میں مبتلا رہیں؟ آخر تو ان واعظوں کی زبان سے اثر چھین کیوں نہیں لیتا۔"

آپ اپنے پیر و مرشد ابوبکر شبلی کے پاس گئے اور لوگوں کے اس سلوک کا ذکر کیا۔ ابوبکر شبلی نے جواب دیا "ابوالقاسم! یہ تو کوئی بات نہیں، یہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جس سے ابن منصور گزر چکا ہے، جاؤ، ان لوگوں میں واپس جاؤ جہاں ملامتوں کے سوا کچھ بھی نہیں، جب جھوٹا واعظ اپنے جھوٹ پر شرمندہ نہیں ہے تو تم اپنے حق پر کیوں شرمندگی محسوس کر رہے ہو"

ابوالقاسم اپنے پیر و مرشد کی جھڑکی سن کر باہر نکل گئے۔

لوگوں میں آپ کی اس بات کا بڑا شہرہ ہو رہا تھا کہ آپ موقع مصلحت کے بغیر ہی صاف صاف بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن اب آپ نے کسی کی پرواہ کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

حج کا زمانہ قریب تھا۔ لوگ قافلوں کی شکل میں مکہ معظمہ کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے ایسے ہی ایک قافلے میں آپ بھی شامل ہو گئے اور حج کے لئے چل پڑے۔ آپ راستے بھر خاموش رہے اگر کسی نے بولنے کی کوشش بھی کی تو آپ نے اس کی کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ یہاں تک کہ آپ خانۂ کعبہ تک پہنچ گئے آپ نے خانۂ کعبہ میں کچھ لوگوں کو مصروف گفتگو دیکھا۔ یہ

چند آدمی بھی حور و قصور اور جنت دوزخ کی باتوں میں الجھے ہوئے تھے ان میں ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ "ایک حج کر لیا ہے اس طرح اب تک میرے تین حج ہو چکے ہیں اللہ نے چاہا اور زندگی رہی تو پانچ حج ادا کروں گا اور پھر دیکھوں گا کہ خدا میرے گناہوں کو کس طرح نہیں معاف کرتا۔"

دوسرے نے کہا "میں تو حج کے ساتھ ہی خدا کے نام پر دیتا دلاتا رہتا ہوں اور اس طرح میں نے اپنے اعمال نامہ میں اتنی نیکیاں اور اتنے ثواب درج کرا لئے ہیں کہ اب مجھے دوزخ کا دھڑکا ہی نہیں رہا۔ اب میں بڑے اطمینان سے مرسکوں گا۔"

تیسرے صاحب نے بڑے وثوق اور اعتماد سے کہا "میں نے حرم کعبہ میں اب تک پچاس ہزار نوافل اور سو قرآن پڑھے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ خدا مجھے جنت میں کوئی اعلیٰ مقام ضرور دے گا اور حوریں میرے انتظار میں ہوں گی۔"

چوتھے نے عرض کیا "جناب آپ لوگ اپنی اپنی تو کہہ چکے میری بھی تو سنئے خدا گواہ ہے کہ جنت کے تصور میں ہر وہ کام کیا ہے جس سے میں حور و قصور کا مستحق ٹھہروں۔ واہ کیا شئے ہوگی جنت بھی، دودھ کی نہریں، شہد کے حوض اور بے مثال حسن رکھنے والی حوریں کہ اگر ان کا ہماری عورتوں پر پرتو ہی پڑ جائے تو پوری دنیا دیوانی ہو جائے۔"

آپ ان کی باتیں سنتے رہے اور جب ضبط نہیں کر سکے تو ان کو ڈانٹ دیا بولے "او لوگو! کچھ تو شرم کرو، یہ حرم کعبہ ہے اور تم لوگ یہاں کاروباری باتیں کر رہے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم یہاں سے اٹھ کر باہر چلے جاؤ اور یہ باتیں کہیں اور جا کر کرو۔"

ان میں سے ایک نے کہا "تو کون ہے ہماری باتوں میں مخل ہونے والا یہ خدا کا گھر ہے تیرے باپ کا گھر تو نہیں۔"

آپ نے جواب دیا "ارے خدا کے بندو! اگر یہ خدا کا گھر ہے تو یہاں خدا کی باتیں کرو۔ یہ تجارتی منڈی تو نہیں ہے جو کاروباری باتیں کر رہے ہو۔"

دوسرے نے کہا "بیوقوف انسان ابھی خدا کی اتنی عبادت کی ہے اور اتنے حج کئے ہیں کہ تو نے تو اتنی عبادت اور حج کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔"

آپ نے جواب دیا "تم لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہو بیشک میں نے تم لوگوں جتنی نہ تو عبادت کی ہے اور نہ ہی تمہارے جتنے حج کئے ہیں پھر بھی میں نے جو کچھ کیا ہے حور و قصور اور جنت دوزخ کے خیال سے نہیں کیا۔ میں نے خدا کو خدا کے لئے یاد کیا ہے

اور میں اس پر بالکل مطمئن ہوں۔"

چاروں نے مل کر کہا: "اچھا اب تو یہاں سے چلا جا اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

آپ حرم کعبہ سے باہر گئے اور حرم کعبہ سے قریب ہی لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ اب آپ کے پاس بس یہی کام رہ گیا تھا کہ لکڑیوں کا ڈھیر لگاتے رہیں۔ لوگ اس فضول اور بے مقصد کام میں آپ کو مشغول دیکھتے تو ہنستے۔ ان چاروں نے بھی آپ کو لکڑیاں جمع کرتے دیکھا تو آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوب خوب قہقہے لگائے۔ ایک نے دوسروں سے کہا: "ملاحظہ فرمایا آپ نے اس پاگل کو۔ یہ وہی ہے نا جو کل ہماری باتوں میں دخل دے رہا تھا۔"

دوسرے نے کہا: "ہاں یہ وہی ہے اور آج میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ شخص پاگل ہے شاید اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔" آپ نے جواب دیا۔ "میرا دماغی توازن تو بالکل درست ہے لیکن تم لوگوں کا دماغی توازن البتہ درست نہیں ہے چونکہ تم لوگ دیوانے ہو اس لئے ہوش مند لوگ بھی دیوانے لگ رہے ہیں۔"

ایک نے کہا: "اگر تم دیوانے نہیں ہو تو پھر یہ لکڑیاں کیوں جمع کر رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "میں نے تم لوگوں کی باتیں سن سن کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں لکڑیاں جمع کر کے کعبہ کو نذرِ آتش کر دوں کیونکہ نہ یہ ہوگا اور نہ لوگ خدا کو اس کے ذریعہ یاد کریں گے، میں چاہتا ہوں، تم لوگ خدا کو خدا کے لئے یاد کرو۔ یہ کعبہ، حور و قصور، جنت دوزخ۔ انہیں اس کی یاد میں شامل کر کے اپنی عبادت کو رائے گاں کیوں کرتے ہو۔"

لوگ سناٹے میں آ گئے اور آپ سے اپنے طرزِ عمل کی معافی مانگی۔

ایک دن آپ حرم کے اندر تھے کہ تند و تیز ہواؤں کے جھونکوں نے حرم کے پردوں کو اڑانا شروع کر دیا۔ آپ کو یہ منظر بہت ہی اچھا لگا۔ آپ بے خود و بے اختیار دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے پھر ایک دم اٹھے اور پردہ پکڑ لیا۔ بڑے جذبات میں بولے "گفت اے رعنا عروس سرفراز درمیاں تو کہ بنشستہ بناز (اے پردے تو نے جو یہ خود کو دلہن کی طرح آراستہ کر رکھا ہے بتا کہ تیرے اندر کون صاحبِ ناز جلوہ فرما ہے) اس کے بعد آپ نے خدا سے شکایت کی۔

"بارِ الٰہا! کیا تو نہیں جانتا کہ تیری مخلوق شدتِ پیاس اور گرمی کی وجہ سے ببول کے پتوں کی طرح تباہ ہے۔ اے حرم اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ بیتی فرمایا ہے تو سو مرتبہ عبدی بھی کہا ہے۔"

حج کے بعد آپ نیشاپور چلے گئے اور وہاں یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

آپ کی صاف گوئی کا یہاں بھی وہی حال تھا۔ نیشاپور والے بھی آپ کی باتیں برداشت نہیں کر سکے اور آپ کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ آپ لوگوں کو جمع کر کے ایسی باتیں کیا کرتے جو لوگوں کے لئے ذرا عجیب و غریب ہوتیں اور وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر کہتے۔

"یہ ابوالقاسم! کچھ عجیب باتیں کرتے ہیں، اُن کی کچھ باتیں تو سمجھ میں آجاتی ہیں مگر اکثر باتیں نہیں سمجھ میں آتیں کیونکہ اُن کی باتیں دوسروں سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔"

آپ وعظ فرماتے تھے "لوگو! بندہ دو نسبتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے ان میں سے ایک نسبت آدم ہے جس کا تعلق شہوت سے ہے اور یہ نسبت بشریہ ایسی ہے جو محشر میں منقطع ہو جائے گی اور دوسری نسبت، نسبتِ الٰہیہ ہے اور یہ حق تعالیٰ سے منسلک ہو جانے کی صورت میں ظاہر اور قائم ہوتی ہے اور اس نسبت سے انسان کو کشف و ولایت حاصل ہوتی ہے اس کا تعلق عبودیت سے ہے اور یہ نسبت کبھی بھی منقطع نہیں ہوتی کیونکہ جب باری تعالیٰ کسی بندے کی نسبت اپنی جانب مبذول اور منسوب کر لیتا ہے تو پھر بندے پر کسی قسم کا غم اور خوف باقی نہیں رہتا۔"

ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا "آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، عموماً واعظ جس قسم کی باتیں کرتے ہیں آپ ویسی نہیں کرتے کیا ہم اس سے یہ سمجھیں کہ آپ اپنے نفس کو ابھی تک ادب نہیں سکھا سکے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "میں وہی باتیں کرتا ہوں، جو مجھے کرنا چاہئیں لیکن لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ انہیں نہیں کرنا چاہیئے اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ لوگ اپنے نفس کو مؤدب نہ بنا سکے اس کو واقف ادب نہیں کہا جا سکتا۔ لوگو! آدمی کو قلب کے آداب سے آشنا ہونا چاہیئے اور جو نا آشنائے ادبِ قلب ہوا سے واقفِ ادب کہنا جہالت ہے۔"

کسی نے پوچھا "ادب کی کوئی اور قسم؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں ادب کی ایک قسم اور ہوتی ہے اور وہ ہے ادب روح اور جو شخص روح کے ادب سے نابلد ہوگا وہ کبھی قربِ خداوندی نہیں حاصل کر سکتا۔"

اس محفلِ وعظ میں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا، جو رقص و سرود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، اس پر آپ کے وعظ نے ایسا اثر کیا کہ اس کی حالت ہی غیر ہونے لگی، وہ بمشکل

آپ کی مجلس سے اُٹھا اور سیدھا اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی اندر اس کی ماں موجود تھی اس نے پوچھا "کون ہے؟"

اُس شخص نے جواب دیا "میں ہوں آپ کا بیٹا عارف؟"

ماں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ ماں نے اس کی حالت جو غیر دیکھی تو گھبرا کے پوچھا "بیٹے عارف! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا "آج میں اتفاق سے ابوالقاسم نصرآبادی کے وعظ میں پہنچ گیا تھا، اُس شخص نے بڑی دل سوزی سے ایسی ایسی باتیں کیں کہ میرا دل ایک عجیب سی آگ میں جلنے لگا اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا یہ یہ آگ مجھے خاکستر کر کے رہے گی۔"

ماں نے بیٹے کو چارپائی پر لٹا دیا اور کہا "یہ تجھے ہو کیا گیا ہے عارف؟ تُو تو گھر سے اچھا بھلا گیا تھا۔"

بیٹے نے جواب دیا "ہاں میں اچھا بھلا گیا تھا لیکن ابوالقاسم کی باتوں میں معلوم نہیں کیا جادو تھا کہ میرا پورا جسم اور دل اس کی آگ میں سلگ رہا ہے جل رہا ہے۔"

ماں نے کہا "بیٹے! اپنے دل کو قابو میں رکھ۔ اللہ نے چاہا تو حالت جلد ہی قابو میں آجائے گی۔"

بیٹے نے کہا "نہیں ماں، میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا بلکہ مجھے اپنی موت سامنے نظر آرہی ہے اب میں نہیں بچوں گا، شاید جلد ہی مر جاؤں گا۔"

ماں بہت پریشان ہو گئی، گھبرا کے کہا "یہ تو کیا کہہ رہا ہے عارف؟ میں کہتی ہوں اپنے دل کو قابو میں رکھ اور اللہ کی رحمت پر نظر رکھ۔"

بیٹے نے افسوس سے کہا "ماں! آپ نے میرا نام عارف رکھا تھا، اور میں اب یہ سوچتا ہوں کہ میں کیسا عارف ہوں جو آج تک عرفان ذات سے محروم رہا۔ نہ تو مجھے آداب نفس کا علم ہے نہ ہی آداب قلب سے اور رہا آداب روح کا شعور، تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اب تک جیسی زندگی گزاری ہے وہ سرتاپا جہالت اور عدم آگہی کی زندگی تھی، میں نے ابوالقاسم کے وعظ سے کیا حاصل کیا؟ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اتنا علم ضرور حاصل ہو گیا ہے کہ اگر مجھے کچھ بھی معلوم نہیں اور میں ایک جاہل اور بے شعور انسان ہوں تو

مجھے اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ میں سچ کو اپنا کر خود کو پاک صاف کر لوں۔"

ماں کو شبہ ہونے لگا کہ عارف پاگل ہو گیا ہے اس نے کہا "بیٹے! میں طبیب کو بلواتی ہوں، تم آرام کرو، علاج سے تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

بیٹے نے بڑی مایوسی سے کہا "ایسا نہیں ہو گا ماں میں چند ساعتوں بعد مر جاؤں گا، آپ میرا پیراہن تو غسال کے حوالے کر دیجئے گا اور میری قبا ان کو دے دیجئے گا، اور رہا میرا ستار تو اس کا مضراب میری آنکھ پر چسپاں کر دیجئے گا کیونکہ میں اپنے رب کے حضور جب حاضری دوں گا تو اس سے کہہ دوں گا کہ میں نے زندگی رقص و سرود میں گزاری ہے اور میرے اعمال نامے میں کراماً کاتبین نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں میری آنکھ پر چسپاں مضراب اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ میں رقص و سرود کا آدمی ہوں۔"

ماں بیٹے کو تسلیاں ہی دیتی رہی اور وہ چند ساعتوں بعد واقعی چل بسا، ماں نے بین کر کر کے پورے گھر کو سر پر اٹھا لیا وہ اپنے بین میں کہتی رہی کہ میرے بیٹے کو ابوالقاسم کے وعظ نے کھا لیا۔

جب اس کے بین کی خبر ابوالقاسم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا "عارف کو اس کے عرفان نے ہلاک کیا ہے اور میری اس بات کی گواہی خود خدا دے گا۔"

چنانچہ اسی رات ماں نے خواب میں دیکھا اس کا بیٹا عارف کہہ رہا تھا "ماں! آپ نوحہ و بین کیوں کر رہی ہیں؟ کیا اس کام سے خدا اور خدا کے رسولؐ نے منع نہیں فرمایا ہے اور پھر عرفان ذات کا جو فائدہ میں اب یہاں اٹھا رہا ہوں اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

حضرت کو کسی سلسلے میں بوزہ خریدنے کی ضرورت پیش آ گئی لیکن آپ کے پاس رقم نہ تھی۔ آپ نے رقم کے سلسلے میں ایک مالدار یہودی کا انتخاب کیا۔ آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور عرض کیا "بھائی! مجھے چند درہم درکار ہیں، بوزہ خریدنا ہے عنایت فرما دیں شکر گزار رہوں گا۔"

یہودی نے جواب دیا "تو چند دمڑیوں کی بات کر رہا ہے میں ایک درہم نہیں دونگا۔" آپ نے کہا "لیکن میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ کچھ بھی ہو میں یہ درہم تجھی سے لوں گا۔"

یہودی نے اپنے ملازم کو آواز دی "او رے کوئی ہے؟"

یہودی کی آواز پر ایک قد آور ملازم اس کے سامنے آکھڑا ہوا ۔ یہودی نے حکم دیا "اسے نکال باہر کر۔ چند درہم اس طرح مانگ رہا ہے جیسے یہ میرے پاس جمع کرا گیا ہے۔"

ملازم نے آپ کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسی طرح کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ یہودی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دیر تک بڑبڑاتا رہا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح یہودی سود پر رقمیں تقسیم کر رہا تھا، اس قطار میں آپ بھی بیٹھ گئے یہودی آپ کو دیکھ نہیں سکا۔ لوگوں میں درہم و دینار سود پر تقسیم کرتے ہوئے اس کی نظر اچانک آپ پر پڑ گئی، وہ ایک دم مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا بولا "ارے تو پھر آ گیا؟"

آپ نے جواب دیا "مجھے بوزہ خریدنے کے لئے چند درہم درکار ہیں اور یہ درہم میں تجھی سے لوں گا۔"

یہودی نے کہا "جب میں دوں گا تبھی تو تُو لے گا۔"

آپ ہنس پڑے اور کہا "میں بھی دیکھوں گا کہ تُو کب تک اپنی 'نہیں' پر قائم رہتا ہے۔"

یہودی نے ایک بار پھر اپنے ملازم کو آواز دی "ارے کوئی ہے؟"

وہی گرانڈیل ملازم پھر حاضر ہو گیا، یہودی نے حکم دیا "اس مسلمان صوفی کو دھکے دے کر نکال دے۔"

لیکن اس ملازم پر آپ کی بزرگی اور عظمت کا اثر ہو چکا تھا، اس نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں ملازمت تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن اس بزرگ انسان کو دھکے دے کر نہیں نکال سکتا۔"

یہودی اس جواب کے لئے تیار نہیں تھا غصے میں کہا "میں نے تجھے ملازم کس لئے رکھا ہے؟"

ملازم نے جواب دیا "اس لئے ملازم نہیں رکھا ہے کہ میں شریف انسانوں کو دھکے دے کر نکال باہر کیا کروں۔"

یہودی نے عاجز آ کر پھر حکم دیا "کیا تو دیکھ نہیں رہا ہے کہ یہ شخص بُری طرح میرے پیچھے پڑ گیا ہے اور بار بار چند درہم مانگنے چلا آ رہا ہے۔ اسے آج تو نکال

ہی دے یہاں سے تیسری بار میں تجھے یہ حکم نہیں دوں گا۔"

ملازم نے کہا "تیسری بار حکم دینے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ میں تیرا یہ دوسرا حکم نہیں مانوں گا کیونکہ جب تو دوسروں کو قرض دے رہا ہے تو ان بزرگ کو دینے میں کیوں تامل ہے؟"

یہودی نے بڑے بے بسی سے کہا "یہ قرض حسنہ چاہتا ہے جب کہ میں سود پر دیتا ہوں۔"

ملازم نے کہا "جہاں تو سینکڑوں ہزاروں کو سود پر قرض دیتا ہے وہیں سے ان بزرگ کو بے سودی قرض کیوں نہیں دیتا۔"

یہودی نے غصے میں ملازم کو بھی ڈانٹ دیا "تو کون ہوتا ہے مجھے ہدایت دینے والا۔ میں ان کو کس شرط پر قرض دے رہا ہوں تو اس پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈال سکتا۔ اگر تو میرا حکم نہیں مان سکتا تو اسی وقت یہاں سے چلا جا۔"

ملازم نے کوئی جواب دئے بغیر باہر کا رخ کیا اور ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔

آپ نے یہودی سے کہا "تو نے یہ کیا کیا؟"

یہودی نے لال پیلے ہو کر جواب دیا "بس تو چلا جا یہاں سے، کیونکہ میرا یہ ملازم تیری ہی وجہ سے گیا ہے!"

آپ نے کہا "مجھ سے پیچھا چھڑانا تیرے لیئے بہت ہی آسان کام تھا جسے تو نے دشوار بنا رکھا ہے۔"

یہودی نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا "میں بوزہ خریدنے کے لیئے تجھ سے چند درہم چاہتا ہوں اگر تو یہ درہم مجھے دے دیتا تو میں تجھے اس طرح پریشان نہ کرتا۔"

یہودی نے کہا "تو ہے بڑا ضدی۔ قرض کوئی ایسی چیز تو نہیں ہے جسے لوگ جبراً وصول کریں۔"

آپ نے بڑی نرمی سے کہا "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ میں مطلوبہ چند درہم تجھ سے جبراً وصول کروں گا۔"

"تب پھر جب میں نے ایک بار انکار کر دیا ہے تو پھر اس طرح مجھے بار بار تنگ کرنے

آپ نے جواب دیا "جب میں تم سے درہم قرض لوں گا تو ادائیگی کے سلسلے میں وعدہ کرنے میں کیا حرج ہے؟"

یہودی آپ کو اندر لے گیا وہاں اس نے آپ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے آپ کو دس درہم سات دن میں واپس کر دینا تھے۔

جب آپ دس درہم لے چکے تو یہودی نے آپ سے پوچھا "اچھا اب آپ مجھے ایک بات بتا دیجئے۔ یہ تو آپ کو خوب اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آپ کو میں دس درہم دینا نہیں چاہتا تھا۔"

اب یہودی کے لب و لہجے میں ادب اور احترام پیدا ہو گیا تھا، اس کے سوال پر آپ نے کہا "جو بات تو اس وقت کر رہا ہے اگر پہلے ہی کر لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

یہودی نے جواب دیا "میں پہلے ہی کیا کر لیتا؟"

آپ نے کہا "یہی کہ تو مجھے ٹالنے کی کوشش تو کرے گا لیکن میں ٹلنے والا نہیں، لے کر ہی ٹلنے والا انسان ہوں میں اور میری یہ عادت ملاحظہ کر لی تم نے؟"

یہودی نے کہا "ہاں، مگر تم سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں میرا خیال ہے اس کا صحیح صحیح جواب دو گے!"

"پوچھو کیا بات ہے؟" اس وقت آپ کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو چکی تھی۔

یہودی نے پوچھا "جب میں نے تم سے بار بار انکار کیا تھا تو تم ضد کیوں کر رہے تھے؟ حالانکہ تم میرے انکار کرنے سے بہت ذلیل ہو رہے تھے، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ادھر کا دوبارہ رُخ ہی نہ کرتا۔"

آپ نے اپنا سر پکڑ لیا اور یہودی کے سامنے بیٹھ گئے، بولے "دیکھ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سُن۔"

یہودی گوش برآواز ہو کر آپ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

آپ نے کہا "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں ایک مدت سے خدا سے ونگتے ہوئے ہوں اور اس سے معلوم نہیں کیا کیا مانگتا رہتا ہوں جو کچھ میں نے مانگا تھا اس میں سے

کچھ مل گیا، کچھ نہیں ملا، مجھے جو بھی ملا تھا، اسے دوبارہ مانگتے ہوئے میں شرمندگی اور ندامت سی محسوس کرنے لگا، ایک دن میں نے یہ سوچا کہ خدا سے مانگتے ہوئے میرا نفس شرم اور ندامت کیوں محسوس کر رہا ہے، میں نے اپنے نفس کی شیطنت کو کچلنے کے لئے یہ سزا تجویز کی تھی کہ کسی انسان کے آگے ہاتھ پھیلا کر نفس کو ذلیل و خوار کروں، چنانچہ تو نے میرے نفس کو جی بھر کے ذلیل و خوار کر لیا اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ مجھے تنگ نہیں کرے گا۔"

یہودی حیرت سے آپ کی باتیں سنتا رہا، پھر پوچھا "کیا یہ جو کچھ آپ نے کہا درست ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں تجھ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ ذرا تو خود سوچ کر میں ٹھہرا درویش، میں بوزہ (جو کی شراب) خرید کر کیا کروں گا، میں شراب پی تو سکتا نہیں۔ اور رہے تیرے دس درہم تو یہ حاضر ہیں انہیں واپس لے لے، اب میں انہیں لے کر کیا کروں گا۔"

یہودی کو بے حد افسوس ہوا، بولا "ابوالقاسم! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کو کئی بار بہت شرمندہ اور ذلیل کیا۔ میں آپ سے معافی کا طلبگار ہوں۔"

آپ نے جواب دیا "معافی کی کوئی ضرورت نہیں بھائی۔ اگر فقرا ان باتوں سے خوف زدہ ہو جایا کریں تو پھر یہ مدارجِ اعلیٰ حاصل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہیں تم مجھ سے معافی کیوں مانگو، معافی تو میں مانگ رہا ہوں اور میں تم سے اب ایک درخواست کروں گا۔"

یہودی نے کہا "آپ مجھ سے درخواست نہ کیجئے، حکم دیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں اس کی کس طرح تعمیل کرتا ہوں۔"

آپ نے کہا "تم نے میری وجہ سے ملازم کو نکال دیا تھا اسے دوبارہ رکھ لو۔"

"میں اسے آج ہی واپس بلا لوں گا، لیکن آپ کو بھی میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

آپ نے جواب دیا "میں تمہارا ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔"

یہودی نے لجاجت سے عرض کیا "میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، آج سے میں سودی کاروبار ختم کر رہا ہوں اور میرے پاس جو کچھ بھی ہے یہ حاجت مندوں کا ہے میں چاہتا ہوں کہ جو آگ آپ کے سینے میں جل رہی ہے وہی میرے دل میں بھی روشن ہو جائے۔"

آپ نے یہودی کو اسی وقت مسلمان کر لیا اور اس کے حق میں دعا کی۔ اور اس دعا کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ نومسلم یہودی نے اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دیا اور آپ کی خدمت میں رہنے لگا۔

آپ نے بارہا حج کئے ۔ اور شوق کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں اکثر حرم کعبہ میں موجود دیکھا کرتے تھے آپ کے وجدان میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس نے کچھ ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ آپ سے لوگ دُور دور رہنے لگے اس جذب و کیفیت میں آپ کعبے میں تشریف لے گئے وہاں گھنٹوں مؤدب کھڑے رہے اور جب باہر نکلے تو ایک جگہ الاؤ روشن دیکھا ۔ آپ الاؤ کے پاس پہنچے اور کچھ دیر کھڑے اُسے دیکھتے رہے پھر حالت جذب اور وجد میں آگ کا طواف شروع کر دیا ۔ لوگ حیرت زدہ آپ کی یہ حرکت دیکھتے رہے ۔ آخر ایک شخص برداشت نہ کر سکا ۔ اس نے پوچھا " کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس چیز کا طواف فرما رہے ہیں ؟"

آپ نے جواب دیا " ہاں ، میں خوب جانتا ہوں میں تجلی الٰہی کا طواف کر رہا ہوں "
اس شخص نے کہا " حضرت ! یہ تجلی الٰہی نہیں آگ ہے آپ ہوش میں تو آئیں "

آپ نے جواب دیا " اے شخص ! تو نہیں جانتا ۔ میں نے خدا کو کعبے میں برسوں تلاش کیا ، مگر نہ پا سکا ۔ اب میں اس کی طلب اور جستجو میں کوچہ و بازار کی خاک چھان رہا ہوں اور جہاں اس کا پرتو نظر آجاتا ہے طواف شروع کر دیتا ہوں ۔ اس آگ کو بھی تجلی الٰہی سمجھ کر میں یہاں آگیا ہوں کہ شاید وہ یہاں مل جائے ۔ میں نے اپنے رب کی تلاش اور طلب میں اپنے ہوش و حواس گنوا دئیے ہیں اس لئے میں نہیں جانتا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں ، وہ درست ہے یا غلط "

لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے شروع کر دئیے اور آواز بلند کرنا شروع کر دی " یہ گمراہ ہے ، کفر کی باتیں کرتا ہے ، بھگا دو اسے "

آپ زخمی ہو کر وہاں سے ہٹ آئے آپ کے پیچھے پیچھے ایک عجمی بھی بھاگتا ہوا آیا ۔ اور اس نے آپ کو بڑی تسلی دی ، بولا " جناب ! مجھے بہت افسوس ہے کہ لوگوں نے آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ۔ میں آپ کا مرتبہ سمجھ گیا ہوں ، آپ مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہا کروں "

آپ نے جواب دیا " میں اگر اجازت دے بھی دوں گا ، تب بھی تو میری صحبت اور ہم نشینی سے بہت جلد عاجز آ جائے گا "

عجمی نے عرض کیا "وہ ممکن ہے آپ جو کچھ فرما رہے ہیں درست ہو لیکن مجھے اپنی خدمت کا موقع ضرور دیجئے۔"

آپ نے کہا "اگر تو ساتھ رہنے پر مُصر ہی ہے تو میرے ساتھ رہو۔"

وہ عجمی آپ کے ساتھ ہی رہنے لگا، سفر حضر ہر جگہ وہ آپ کا ہم نشین ہو گیا۔ آپ اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جبل رحمت پر پہنچ گئے وہاں آپ کے اُس عجمی دوست نے کہا "حضرت! آپ کی کوئی خواہش؟ آپ کی طبیعت کسی چیز کو چاہتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں ایک چیز کے لئے میں بے تاب ہوں اگر مل جائے تو بہت خوب، ورنہ کوئی شکایت نہیں۔"

عجمی دوست نے دریافت کیا "تو فرمائیے کس چیز کی طرف آپ کی طبیعت راغب ہے؟"۔

آپ نے جواب دیا "ٹھنڈے پانی کی خواہش مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔"

عجمی نے فوراً جواب دیا "اس میں کون سی خاص بات ہے میں ٹھنڈے پانی کی تلاش میں جاتا ہوں اور یہ جہاں بھی ملے گا، آپ کے لئے لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔"

عجمی آپ سے جدا ہو گیا، اور اِدھر اُدھر پانی کی تلاش میں پھرنے لگا، گرمی اپنے شباب پر تھی اُس نے آپ سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے ٹھنڈا پانی ملے گا کہاں؟ اور ٹھنڈا پانی حاصل کئے بغیر اس کا آپ کے پاس جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ آبخورہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور نظریں اِدھر اُدھر پانی کی تلاش اور فکر میں بھٹک رہی تھیں۔ عجمی اپنے دل میں پشیمان تھا کہ اُس نے ٹھنڈے پانی کا ناحق وعدہ کر لیا۔ جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا، اچانک دھوپ غائب ہونے لگی اور فضا بادلوں سے تیرہ و تار ہونے لگی۔ عجمی پناہ کی تلاش میں بھاگا ایک چٹان کے نیچے بیٹھ کر بارش کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد بارش شروع ہو گئی اور پھر یہ بارش اولوں میں تبدیل ہو گئی عجمی نے آبخورے میں اولے بھرنا شروع کر دئے۔ اسے خوشی تھی کہ وہ ٹھنڈا پانی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا جب بارش رُک گئی تو یہ اولوں سے بھرا ہوا پیالہ لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا، اسے حیرت تھی کہ جہاں آپ بیٹھے تھے وہاں بارش نہیں ہوئی تھی۔ عجمی نے اولوں والا پیالہ

آپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "حضرت! خدا نے میری شرم رکھ لی۔ ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے وعدہ تو ٹھنڈے پانی کا کر لیا ہے مگر میں یہ لاؤں گا کہاں سے؟"

آپ نے پوچھا "پھر ٹھنڈا پانی ملا کہاں سے؟"

عجمی نے جواب دیا "اب میں کیا بتاؤں بس میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں اور یہ اولوں کی بارش بھی آپ ہی کی کرامت سے ظہور میں آئی ہے۔"

آپ نے کہا "اب میں کیا کہہ سکتا ہوں" اس کے بعد آپ نے آپ سے کہا "تو نے ٹھنڈے پانی کی خواہش کی خدا نے تیرا خیال کیا اور اولے برسا کر تیری خواہش پوری کر دی، لیکن میرا خیال ہے تو نے اپنے رب کے ساتھ گستاخی کی ہے اور تجھے تو کھولتا ہوا گرم پانی ملنا چاہیئے تھا۔"

آپ نے کئی حج کر رکھے تھے اور لوگوں کو آپ پر رشک آتا تھا کہ آپ کتنے خوش قسمت انسان ہیں جو اتنے سارے حج کر ڈالے ایک بار جو آپ حج کے لئے تشریف لے گئے تو ایک کتے کو بھوک سے نڈھال لڑکھڑاتے گرتے دیکھا آپ کو اس پر بڑا رحم آیا۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ بھی نہ تھا، آپ نے کئی آدمیوں سے کتے کے لئے روٹیاں مانگیں، لیکن لوگ انکار کرتے رہے آپ نے پوچھا۔

"لوگو! کیا اس شہر میں ایک بھی ایسا فارغ البال شخص نہیں، جو اس کتے کا پیٹ بھر سکے"

کسی نے جواب دیا "اس شہر میں روٹیوں کی کوئی کمی نہیں لیکن کتے کے لئے روٹی نہیں ہے ہاں آپ کو اپنے لئے درکار ہو تو روٹی ہی روٹی"

آپ نے کہا "مجھے اپنے لئے نہیں اس کتے کے لئے روٹیاں درکار ہیں"

جواب ملا "افسوس کہ کتے کے لئے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں"

آپ نے اعلان کیا "میں نے اب تک جتنے بھی حج کئے ہیں ان کا ثواب میں اس شخص کو دینے پر تیار ہوں جو اس کتے کا پیٹ بھر دے"

لوگوں نے آپ کا یہ اعلان بڑی حیرت سے سنا اور ایک شخص نے قریب آ کر دریافت کیا "کیا یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے؟"

آپ نے جواب دیا "بالکل سچ ہے"

اس شخص نے کہا "میں اس کتے کا پیٹ بھرنے کیلئے تیار ہوں تم اپنے تمام حجوں

کا ثواب میری نذر کر دو"

آپ نے جواب دیا "تو اس کتے کا پیٹ بھر دے میں اسی وقت اپنے حجوں کا ثواب تیری نذر کر دوں گا"

وہ شخص اپنے گھر سے بہت ساری روٹیاں لایا اور کتے کو کھلانے لگا کتے میں توانائی آ گئی اور وہ اچھلنے کودنے لگا آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ آپ قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر گئے اور گڑگڑا کے خدا سے التجا کی "یا الٰہ العالمین! اس شخص نے میری درخواست پر بھوکے کتے کا پیٹ بھر دیا ہے میں اس کے عوض اپنے جملہ حجوں کا ثواب اس شخص کو نذر کر رہا ہوں، تو میری دعا قبول فرما"

آپ کی اس بات کا بڑا چرچا ہوا، بہتوں نے آپ کا مذاق اُڑایا اور کہا "ابوالقاسم بھی عجیب آدمی ہیں کہ ایک کتے کی خاطر اپنے حجوں کا ثواب ایک گناہگار کو بخش دیا یہ بھی کوئی دانائی کی بات ہوتی"

کسی بزرگ نے جب یہ واقعہ سنا تو آپ سے ملاقات کی اور کہا "ابوالقاسم یہ تم نے کیا کیا؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے وہی کیا جو انسانیت کا تقاضا تھا"

بزرگ نے پوچھا "کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس طرح تم نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا اس سے میری یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ یہ واقعہ مشہور ہو اور لوگوں کی چہ میگوئیوں کا مرکز قرار پائے اور نہ ہی میں اسے کوئی کارنامہ خیال کرتا ہوں"

ان ہی بزرگ نے کہا "ابوالقاسم! جو غلطی تم نے کی ہے اس قسم کی ایک غلطی حضرت آدم بھی کر چکے ہیں"

آپ نے پوچھا "آدم نے کیا غلطی کی تھی؟"

بزرگ نے جواب دیا "آدم نے گیہوں کے عوض اپنی جنت فروخت کر دی تھی"

آپ نے کہا "آدم نے جنت فروخت کر کے شرمندگی اور ندامت محسوس کی تھی اور ایک مدت تک توبہ استغفار کرتے رہے تھے لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر شرمندہ

یا نادم نہیں ہوں اس لئے میں توبہ استغفار بھی نہیں کروں گا۔

آپ کے خلاف شہر بھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا اور لوگوں نے آپ کو شہر بدر کر دیا ان بزرگ نے کہا "ابوالقاسم کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو آدم کے ساتھ ہوا تھا، آدم کو خدا نے ان کی غلطی پر جنت سے نکال دیا تھا، ابوالقاسم کو ان کی غلطی پر لوگوں نے شہر بدر کر دیا

آپ نے کہا "میں خوش ہوں کہ مجھے انسانوں نے شہر بدر کیا ہے خدا نے نہیں، اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے"

مدینے میں جنت البقیع کے سامنے ایک واعظ کہہ رہا تھا "حضور نے فرمایا تھا کہ اس دنیا میں چند ایسے قبرستان بھی ہیں جن کے چاروں کونے فرشتوں کے کاندھوں پر ہوتے ہیں چنانچہ ان میں جو لوگ دفن کئے جائیں گے فرشتے انہیں جنت میں پہنچا دیں گے"

آپ نے جنت البقیع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اے شخص! یہ جنت البقیع انہی میں سے ایک ہے" سامعین مڑ مڑ کر آپ کی طرف دیکھنے لگے واعظ نے تائید کی ہاں ان میں جنت البقیع کا نام سرفہرست ہے"

کئی دن بعد آپ جنت البقیع تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں ایک قبر دیکھی جو کئی دن کی کھدی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور میت کا کہیں پتہ نہ تھا گورکنوں سے پوچھا۔ "وہ میت کہاں ہے جن کے لئے یہ قبر کھودی گئی ہے؟"

کسی گورکن نے جواب دیا "اسے مشہور صوفی ابو عثمان نے اپنے لئے کھدوایا ہے اور ہدایت کی کہ انہیں مرنے کے بعد اس میں دفن کیا جائے"

آپ نے مٹی اٹھا کر سونگھی اور کہا "مجھے اس مٹی سے بوئے رفاقت آرہی ہے اس لئے اس میں ابو عثمان کے دفن ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہ میری جگہ ہے میری آخری آرامگاہ"

آپ تو یہ کہہ کر وہاں سے چلے آئے آپ کی یہ باتیں کسی نے ابو عثمان تک پہنچا دیں، وہ ابوالقاسم کے پاس بھاگے ہوئے گئے اور پوچھا "کیوں ابوالقاسم! کیا تم نے گورکنوں سے اس قسم کی باتیں کی ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں میں نے یہ باتیں کی تھیں"

ابو عثمان نے کہا "لیکن وہ میری جگہ ہے اور وہاں میں دفن ہوں گا۔"

آپ نے جواب دیا "ابو عثمان! افسوس کہ تم اس نکتے سے واقف نہیں ہو کہ اگر جنّت البقیع میں کوئی ایسا شخص دفن ہونا بھی چاہتا ہے جو اس کا مستحق نہیں ہوتا تو جنّت البقیع کے فرشتے اسے وہاں سے نکال پھینکتے ہیں۔"

ابو عثمان نے کہا "ابو القاسم! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔"

آپ نے کہا "ابو عثمان! رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جنّت البقیع کے مردے ہواؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔ میں نے کسی سے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ جو شخص اس جگہ دفن ہونے کا اہل نہیں ہوتا اس کو اگر یہاں دفن کر بھی دیا جاتا ہے تو فرشتے اُسے یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔"

ابو عثمان سہم گئے، پوچھا "تو کیا میں جنّت البقیع کا مستحق نہیں ہوں؟"

ابو القاسم نے جواب دیا "ابو عثمان! تمہاری آخری آرام گاہ نیشاپور کے قریب حیرہ نامی جگہ ہے اور میں جنّت البقیع میں دفن کیا جاؤں گا۔"

ابو عثمان خاموش ہو گئے۔ اُن ہی دنوں نیشاپور میں استاد اسحٰق ایک مخصوص نشست میں موت کی دشواری اور سختی کا حال بیان کر رہے تھے آپ نے کسی سے یہ سُنی تو کہا "اُستاد اسحاق سے جاکر کہدو کہ موت کے بجائے محبّت کی باتیں کیا کریں۔"

اُستاد اسحاق نے جواب میں کہلا بھیجا "ابو القاسم! موت کی سختی اور دشواری محبّت کی سختی اور دشواری سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور اس کا تم اپنے آخری لمحوں میں تجربہ بھی کر لو گے۔"

آپ مستقلاً مدینہ ہی میں قیام فرما ہو گئے۔ ایک دن آپ نے خلوت میں سُنا، کوئی غیبی آواز کہہ رہی تھی "ابو القاسم! تو بہت زیادہ باتیں کرنے لگا ہے ہم تجھ پر اس کا عذاب نازل کریں گے۔"

آپ نے جواب دیا "اگر میں غلط باتیں کرتا ہوں تو مجھ پر اس کا عذاب ضرور نازل ہونا چاہئے لیکن اگر میں اپنی باتوں میں سچا ہوں تو میں انہیں جاری رکھوں گا اور میں جو کچھ کہتا ہوں سوچ سمجھ کر ہی کہتا ہوں۔"

آپ کو جواب ملا "ہمیں تیری یہ بات پسند آئی اس لئے تجھ پر عذاب نہیں کیا جائے گا۔"

ایک دن آپ نے دیکھا، ایک جگہ انسانوں کا ہجوم ہے اور اس ہجوم میں کسی شخص کی پٹائی ہو رہی ہے آپ صورت حال سمجھنے کے لئے اس ہجوم میں تشریف لے گئے دیکھا لوگ ابو عثمان کو مار رہے ہیں - آپ نے لوگوں کو منع کیا کہ خواہ مخواہ ابو عثمان کو کیوں مار رہے ہو ؟

لوگوں نے جواب دیا - ابو عثمان کی باتیں ہمارے لئے ناقابل برداشت ہیں اس لئے ہم انہیں نہیں معاف کریں گے ۔

مجمع میں سے کسی نے کہا " ابو عثمان کو مارنے کے بجائے انہیں مدینے سے نکال دو، یہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ تم لوگ ابو عثمان کو مار مار کر ہلاک کر دو ۔

لوگوں نے یہ مشورہ مان لیا اور ابو عثمان کو اسی وقت مدینے سے نکال دیا ابو القاسم نے ابو عثمان سے ملاقات کی اور پوچھا " ابو عثمان ! اب تم کہاں جاؤ گے ؟

ابو عثمان نے جواب دیا " ابو القاسم ! میں نیشاپور جا رہا ہوں اور زندگی کے بقیہ ایام وہیں گزاروں گا ۔

آپ نے انہیں خدا حافظ کہا - ابو عثمان نے کہا " ابو القاسم ! اب میں شاید مدینے واپس نہیں آسکوں گا اس لیئے جنت البقیع کی قبر، جو میں نے اپنے لئے کھدوائی تھی - اسے تم اپنے لیئے وقف کر لو ۔

ابو عثمان نیشاپور چلے گئے -

ابو القاسم نے چند آدمیوں کو آپس میں اس طرح باتیں کرتے دیکھا کہ ان کے درمیان چند عورتیں بھی تھیں اور یہ لوگ دعویٰ کر رہے تھے کہ ان پر عورتوں کی قربت اور صحبت کا کوئی اثر نہیں ہوتا - آپ نے انہیں ڈانٹا " لوگو ! تم یہ کیسا دعویٰ کر رہے ہو ؟ کیا تم میں نفس موجود نہیں ہے جو اس قسم کا دعویٰ کر رہے ہو ؟"

ان لوگوں نے آپ کا مذاق اڑایا، بولے " ہمیں اپنے آپ پر اعتماد ہے تبھی تو ایسی باتیں کر رہے ہیں ۔

آپ نے لوگوں سے کہا " میں نے جیسا کہ تم سے کہا کہ جب تک تم میں نفس موجود ہے اس قسم کی باتیں مت کرو - اور نفس کی موجودگی میں امر و نواہی سے کسی کو بھی بری الذمہ نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ پھر عورتوں سے کہا " تم خود بھی گمراہی میں پڑو گی ان مردوں

کو بھی اپنے ساتھ گمراہ کرو گی " مرد اور عورتیں آپ کی تسلی کو شرمندہ ہو کر الگ ہو گئے

آپ کا آخری وقت آیا تو جنت البقیع کے قریب ہی رہنے لگے ۔ نیشاپور سے جو لوگ آتے تھے آپ اُن سے اُن کا حال پوچھتے رہتے تھے آپ نے انہی میں سے کسی سے پوچھا " آج کل ابو عثمان وہاں کیا کر رہے ہیں ؟

اس شخص نے جواب دیا " ان کا تو انتقال بھی ہو گیا "

آپ نے دریافت کیا گیا " اُن کا انتقال کہاں ہوا اور وہ کہاں دفن ہوئے ؟"

جواب ملا " انتقال نیشاپور میں ہوا اور دفن حیرہ میں ہوئے "

آپ نے آہستہ سے کہا " خدا ابو عثمان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے ۔ مجھے ان کی آخری آرام گاہ کا علم تھا "

آخری لمحوں میں موت کی سختی اور شدت نے آپ کو بہت پریشان کیا ۔ آپ کے آس پاس ارادت مندوں کا ہجوم تھا ۔ آپ نے ان میں سے ایک نیشاپوری سے کہا " اے شخص ! جب تم نیشاپور جانا تو اُستاد اسحاق سے کہہ دینا کہ وہ موت کی سختی اور شدت کا ذکر کیا کرتے تھے وہ درست تھا ، اب میں اس کی گواہی دے رہا ہوں "

انتقال کے بعد آپ کو جنت البقیع کی اس قبر میں دفن کیا گیا جسے ابو عثمان نے اپنے لئے کھدوایا تھا ۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

طبقات الکبریٰ ،	سکینۃ الاولیا ،	تذکرۃ الاولیا ،	خزینۃ الاصفیا ، انوار الاولیا ،	انوار اصفیا
علامہ شعرانی	شہزادہ دارا شکوہ ،	شیخ فریدالدین عطار ،	مفتی غلام سرور ،	رئیس احمد جعفری ،

حضرت عبداللہ خفیفؒ

لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کہ شیراز کے شاہی خاندان کا ایک فرد عبداللہؒ تکلفات اور تعیشات شاہی سے بے نیاز بلکہ نفور، نفس کشی اور چلّوں میں مشغول رہتا ہے ٹاٹ کا لباس زیب تن کئے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے خاندان کے لوگ آپ کے پاس آتے اور کہتے "عبداللہؒ! یہ تمہیں کیا سوجھی ہے؟ اللہ نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے لیکن تم نے ٹاٹ کا لباس پہن رکھا ہے۔ کیا یہ کفران نعمت نہیں ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا "کفران نعمت یہ نہیں ہے کہ میں نے اپنے جسم کو دیبا وحریر اور زرکار لباسوں سے محروم رکھا ہے بلکہ کفران نعمت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضائے جسمانی کو اپنے معبود کی عبادت اور شکر گزاری سے محروم رکھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسی عقل عطا فرمائی جس سے میں اپنے دنیوی اور اُخروی نفع و نقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔"

انہوں نے اپنے کاموں کے لئے ایک آدمی رکھ لیا تھا جو گھر کے کام کے علاوہ آپ کے کھانے کی خاص فکر رکھتا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ جب دن بھر کے روزے کے بعد افطار کا وقت آئے تو خادم گن کر سات منقے دے دیا کرے ایک عرصے تک اس پر عمل در آمد ہوتا رہا۔ آپ کی صحت گرتی رہی لیکن آہ نیم شبی میں لذت محسوس ہوتی رہی۔ اس لذت نے ان کے دل سے ضعف و نقاہت کا خیال تک نکال دیا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کی بارگاہ میں گرے ہوئے آہ وزاری میں مشغول تھے لیکن آج روز جیسی لذت اور کیفیت سے محروم تھے وہ جب بھی اپنی زبان سے "اللہ" کہتے تو دل میں وہ چمک اور لذت پیدا نہیں ہوتی، جو ہمیشہ کا خاصہ تھا ان کا دل سوز دروں سے محروم ہو چکا تھا۔ عبداللہ بہت پریشان تھے۔ ان کی تو گویا متاع حیات ہی چھن چکی تھی اب ان کا دل اللہ کی یاد میں نہیں بلکہ اس میں مشغول تھا کہ اس ستم کا پتہ

چلایا جائے جس نے ان کی لذت و کیفیت چھین کر انہیں خالی کر دیا ہے انہوں نے رات کے پچھلے پہر اپنے خادم کو طلب کیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آپ کے سامنے آکھڑا ہوا اور ادب سے عرض کیا "خلاف معمول طلبی پر یہ عاجز پریشان اور خوفزدہ ہے اس ناچیز سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی؟"

آپ نے دریافت کیا "میں تجھ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔"

خادم نے عرض کیا "یہ میری مجال کہ میں جھوٹ بولوں اور وہ بھی آپ سے مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ حوصلہ۔"

آپ نے کہا "آج رات معلوم نہیں کیوں، مجھ پر نیند غلبہ کر رہی ہے اور اعصاب آسودگی سی محسوس کر رہے ہیں۔ میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ ان لذتوں اور کیفیتوں کا مزہ چکھوں، جو ہر رات مجھے حاصل رہی ہیں لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود میں ان سے محروم ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے افطار میں مجھے جو منقے دیئے تھے، ان میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا، کوئی تبدیلی؟ کوئی تغیر؟"

خادم سناٹے میں رہ گیا، بڑی بے بسی سے آپ کی صورت دیکھنے لگا، بولا "میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضور کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے اور ضعف و نقاہت سے حضور کی آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہیں اور اوپر کا نصف جسم جھکتا جا رہا ہے۔ میں اس کا اور کوئی علاج تو نہیں کر سکتا تھا، فوری اور قابل عمل جو تدبیر میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں حضور کے منقوں کی تعداد میں نہایت ہوشیاری سے اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منقوں کی تعداد میں ایک معتدبہ اضافہ حضور کی کمزوری اور نقاہت پر غالب آجائے گا۔"

آپ نے غصے میں پوچھا "تو نے آج افطار میں مجھے کتنے منقے دیئے تھے؟"

خادم نے جواب دیا "آٹھ منقے۔ آج میں نے ایک کا اضافہ کیا تھا۔"

آپ کو رونا آگیا، گلوگرفتہ آواز میں بولے "ظالم! تو نے یہ کیا غضب کر دیا؟ تو جانتا ہے اس ایک منقے نے میرے جسم میں کیا فتور کر رکھا ہے۔ میرے اعصاب آرام طلبی میں مبتلا ہیں اور دل و دماغ سو جانے پر مائل ہیں۔ آہ! مجھ سے میری آہ نیم شبی کی لذت اور کیفیت چھن گئی۔ تو نے یہ کیا کر دیا ظالم انسان۔"

خادم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آپ بھی بڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے آخر فرمایا " اب جا، آرام کر۔ میں تجھ سے صبح بات کروں گا۔ لیکن صبح مجھ سے یہ امید ہرگز نہ رکھنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گا۔ تو نے مجھے جسمانی اذیت پہنچایا تو میں تجھے معاف بھی کر دیتا لیکن تو نے میری زندگی بھر کی کمائی چھین لی، میرا سوز چھین لیا میری آہ کی لذت لوٹ لی، پھر میں تجھے کس طرح معاف کر دوں گا "

خادم نے لجاجت سے عرض کیا " میں نے جو کچھ کیا تھا آپ کی بھلائی کے پیش نظر کیا تھا "

آپ نے جواب دیا " وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے نادان دوست کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا ہے تو نے جو کام میری فلاح کے خیال سے کیا تھا اس سے مجھے زبردست نقصان پہنچ گیا۔ کل اسی نوع کا تو کوئی اور کام میری بہبود کی خاطر کرے گا اور اس سے میں بالکل ہی تباہ و برباد ہو گیا تو کیا ہو گا؟ میں نادان دوست کو نہیں برداشت کر سکتا "

خادم خوفزدہ و لرزیدہ سامنے سے ہٹ گیا اور آپ پوری قوتِ ارادی سے خدا سے لو لگاتے رہے لیکن اس وقت ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی لمحے سوزِ دروں کی شمعیں جھلملاتی تھیں اور پھر بجھ جاتیں۔ وہ رونے لگے۔ انہوں نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا " اے الہ العالمین! ایک منقے کی اتنی بڑی سزا نہ دے کہ میں اپنی لذت آہِ نیم شبی ہی سے محروم ہو جاؤں۔ اپنے حبیب کے صدقے میں اس غلطی کو کو نظر انداز فرما دے۔ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی "

صبح آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خادم کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ آپ کو خفیف کہنے لگے۔

توکل اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی سے اپنا کوئی کام نہ کہتے تھے نہ لیتے ہاں دوسروں کا کام البتہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے حج کا ارادہ کیا تو قافلے والوں سے اتنی بے تعلقی اختیار کی کہ صرف پیاس کا خیال رکھا اور کسی چیز کی پرواہ نہ کی۔ سامان سفر میں ایک ڈول اور ایک رسی ساتھ لی اور حج کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے قافلے والوں کی اتباع، پیروی یا پابندی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ کچھ دور تک تو آپ قافلے کے ساتھ رہے اس کے بعد آپ اس سے الگ ہو گئے

 بھوک لگتی تو چند منقے کھا لیتے اور پیاس لگتی تو کسی چشمے سے اپنا ڈول بھر کر

پیاس بجھا لیتے۔

دورانِ سفر ایک ایسا مرحلہ بھی پیش آیا کہ کافی دور تک آپ کو کوئی چشمہ نہ ملا پیاس آپ کو تنگ کرنے لگی آپ چشمے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے تھے آخر آپ نے کافی فاصلے پر ایک ہرن کو زمین کی طرف سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہرن پانی پی رہا ہے۔ آپ بے چینی سے اس طرف چل پڑے۔ جب قریب پہنچے تو ہرن ان کی آہٹ محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو نشیب میں ایک چشمہ رواں تھا پانی کی سطح اتنی بلند تھی کہ ڈول رسّی کی ضرورت ہی نہ تھی اگر سطح نیچی ہوتی تو ہرن اپنی پیاس نہ بجھا سکتا آپ نے دونوں ہاتھوں کو چلّو بنا کے پانی پینا چاہا لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جیسے جیسے وہ ہاتھ پانی کی طرف لے جاتے تھے پانی کی سطح نیچے ہوتی چلی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ پانی کی طرف منہ کے بل کافی جھک گئے اور بڑی کوشش کی کہ پانی پی لیں لیکن پانی تک ان کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے آخر تنگ آکر انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ "میرے مولا! یہ کیا اسرار ہے کہ اسی چشمے سے ہرن نے بھی پانی پیا تھا اور اس وقت اس کی سطح اونچی تھی لیکن جب میں نے پانی پینا چاہا تو اس کی سطح حیرت انگیز طور پر نیچی چلی گئی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟ خفا ہے؟"

یہ خاموش ہو کر رونے لگے۔ ان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے "اے اللہ! میں اپنی گریہ وزاری کا جواب چاہتا ہوں۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ کیا میرا مرتبہ ہرن سے بھی کم ہے؟"

انہیں اپنے قریب ہی سے جواب ملا، کوئی کہہ رہا تھا۔ "عبداللہؒ! ہرن کے پاس ڈول رسی نہیں تھی اس لئے اس کے لئے پانی کی سطح اونچی کر دی گئی تھی۔ لیکن تو نے ڈول رسّی کا سہارا لیا، تو اب رو کیوں رہا ہے؟ گریہ زاری کیوں کر رہا ہے؟ رسّی میں ڈول پھنسا اور بھر لے پانی، ہم سے شکوہ کیوں کر رہا ہے؟"

آپ نے بڑی ندامت محسوس کی اور ڈول رسّی پھینک کر آگے روانہ ہو گئے بولے "میں پیاسا رہ لوں گا لیکن اب ڈول رسّی کا سہارا نہ لوں گا۔"

ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ پھر آواز سنائی دی "عبداللہ! کہاں جاتے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟"

عبداللہ لرز گئے، بولے۔ "اے اللہ! کیا کسی بندے میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے آقا سے ناراض ہو جائے"

آواز آئی "پھر تو پانی پیئے بغیر ہی کیوں چل پڑا۔ جبکہ میں جانتا ہوں کہ تو بہت زیادہ پیاسا ہے"

عبداللہ نے کہا "مجھے میری غیرت اور ندامت نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ میں یہ پانی ہرگز نہ پیوں"

جواب ملا "نہیں چشمے پر واپس جا اور پانی پی لے۔ دراصل اس طرح تیرے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا چشمے پر واپس جا اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھا"

آپ چشمے پر دوبارہ واپس پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا کہ پانی کی سطح اتنی ہی اونچی ہو چکی ہے جتنی ہرن کے پانی پینے کے وقت تھی۔ آپ نے ہاتھ کو چلو بنا کے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پیتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے جب خوب شکم سیر ہو کر پانی پی چکے تو اس پانی سے وضو بھی کیا۔

آپ حج وغیرہ سے فارغ ہو کر جب بغداد واپس آئے تو آپ نے اس عہد کے سب سے بڑے صوفی جنید بغدادیؒ سے ملاقات کی اور ان کے سامنے پانی والا واقعہ دہرایا۔ جنیدؒ نے جواب دیا "عبداللہؒ! اگر تم ذرا سا صبر اور کر لیتے تو چشمہ تمہارے قدموں میں بہنے لگتا"

آپ خاموش ہو گئے، کچھ دیر بعد فرمایا "جنیدؒ! اگر تمہارے جیسا مشیر اور دوست اس وقت مجھے میسر آ جاتا تو آج میں اس سعادت سے بھی ہمکنار ہو چکا ہوتا!"

کچھ دن بغداد رہنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا "عبداللہ! تم کیا مراقبہ کرو گے میں نے مصر میں ایک نوجوان کو ایسا مراقبے میں دیکھا کہ حیران رہ گیا اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں"

آپ نے تڑپ کر پوچھا "کیا تو مجھے اس شخص کا پتہ بتا سکتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "کیوں نہیں"

اس کے بعد اس شخص نے آپ کو اس نوجوان کا پتہ بتا دیا۔ آپ اسی وقت مصر روانہ ہو گئے کافی دنوں بعد سفر کی صعوبتیں اور پریشانیاں جھیل کر جب آپ مصر میں اس

نوجوان کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ اس کے آس پاس لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے مگر اس نوجوان کے خضوع و خشوع، انہماک اور مراقبے میں کوئی فرق نہیں آ رہا۔

عبداللہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور با آواز بلند سلام عرض کیا لیکن اس نوجوان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔

عبداللہ نے اسے پھر سلام کیا اور نوجوان نے اس بار پھر کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار بھی سلام کیا مگر اس بار بھی جواب سے محروم رہے۔

آپ نے چوتھی بار بھی سلام کیا اور ساتھ ہی کہا "اے نوجوان! ایسا بھی انہماک اور مراقبہ کس کام کا؟ کہ میں تو سنت رسولؐ ادا کر رہا ہوں اور تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا ہے"۔

نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ سے جواب دیا "اے خفیف! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بڑا وقت ہے اور تم اپنے اہم کاموں کو انجام دے کر فرصت حاصل کر چکے ہو حالانکہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہئے تھا کہ دنیا بہت قلیل اور عمر بہت مختصر ہے۔ اگر تم چاہو تو اس قلت میں سے کثرت حاصل کر لو لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم نے میرے جیسے بے کار آدمی سے ملنے کی خاطر مصر تک کا سفر کیا اور بار بار سلام کر کے اپنا ہی نہیں بلکہ میرا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہو"۔

اتنا کہہ کر اس نے عبداللہؒ کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

جب یہ اس نوجوان کے پاس پہنچے تھے تو ان کا بھوک سے بہت برا حال تھا لیکن نوجوان کے جواب نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے "اے نوجوان! میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا"۔

آپ اطمینان سے اس کے پاس بیٹھ گئے ظہر سے ذرا پہلے یہ شخص مراقبے سے بیدار ہوا اور آہستہ سے کہا "اے خفیف! آؤ ہم دونوں ظہر کی نماز پڑھ لیں"۔

دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کی۔ آپ نے اس نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور کہا "میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری خواہش

پوری کی اور، دو نمازیں میرے ساتھ ادا کیں۔ اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دے۔"

نوجوان نے پوچھا "کون سی خواہش؟"

آپ نے جواب دیا "میں چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نصیحت کرے۔"

نوجوان نے کہا "خفیف! جو شخص خود ہی گرفتارِ بلا ہو، اس کی زبان اس لائق کہاں کہ کسی کو نصیحت کرے۔ میں تو خود ہی ایک عرصے سے یہ امید لگائے ہوئے ہوں کہ کوئی مجھے نصیحت کرے۔"

عبداللہ نے کہا "اے شخص! میں کوئی نصیحت لئے بغیر واپس نہ جاؤں گا"

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا "خفیف! اس وقت تمہارے اصرار پر میں ایک ہی نصیحت کروں گا، وہ یہ ہے کہ تم ہمیشہ ایسوں کی صحبت اختیار کرو، جن سے خدا کی یاد تازہ رہے اور یہ لوگ ایسے ہوں جو خدا کی یاد کی زبانی تلقین نہ کرتے ہوں بلکہ صحیح معنوں میں عمل کر کے تمہیں اس کا عامل بنا دیں۔"

آپ اس نصیحت پر زار و قطار روئے اور کہا "آہ میں ایسے دوست کہاں پاؤں گا جو اپنے عمل سے مجھے خدا کی یاد پر ڈال دیں جبکہ میں خود ابھی اس راہ کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں۔"

آپ نے واپسی میں ایک جنگل سے گزرتے ہوئے ایک لاش پڑی دیکھی۔ اس لاش کے آس پاس آہستہ آہستہ لوگ آ آ کر جمع ہو رہے تھے آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے اور پوچھا "یہ کس شخص کی لاش ہے؟"

کسی نے جواب دیا "یہ ہمارا راہب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی خدا کی یاد میں گزار دی۔"

آپ نے دریافت کیا "اب اس لاش کا تم کیا کرو گے؟"

جواب ملا "اس راہب نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی تھی۔ ہم لوگ اسی پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔"

آپ نے تعجب سے پوچھا "اس نے کیا وصیت کی تھی؟"

جواب دیا گیا "اس نے کہا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے دفن کرنے کے بجائے جلا دیا جائے اور میری راکھ کو محفوظ کر لیا جائے اور یہ راکھ ان لوگوں کی آنکھوں میں سُرمے کے طور پر لگائی جائے جن کی آنکھیں خراب ہوں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی ہو۔"

آپ نے کہا "لیکن اس عمل کا فائدہ ؟"

کسی نے جواب دیا "اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ خراب آنکھ ٹھیک ہو جائے گی اور کور چشم بینا ہو جائیں گے "

آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا ۔ آپ وہیں کھڑے ہو کر لاش کے جلنے کا منظر دیکھنے لگے لوگوں نے واقعی راہب کی راکھ کو اپنی اپنی شیشیوں میں محفوظ کر لیا ۔ آپ ان کی خوش عقیدگی پر افسوس کرتے رہے ۔ آپ نے پوچھا "کیا تم لوگوں کو واقعی یقین ہے کہ اس راکھ سے خراب آنکھیں درست اور نابینا بینا ہو جائیں گے ؟"

ایک کٹر مسیحی نے طنزاً کہا "تم مسلمان ہو اس لئے تمہیں ہماری باتوں پر یقین نہیں آرہا ۔ لیکن میں تمہیں اس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ کرا دوں "

وہ مسیحی آپ کو اپنے گھر لے گیا اور میزبانی کے فرائض انجام دیئے اس کے بعد اس نے بستی کے ان آدمیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا ۔ جن کی آنکھیں خراب تھیں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی ، بمشکل اس نے چار آدمی تلاش کر لیے ان میں تین کی تو آنکھیں خراب تھیں اور ایک اندھا تھا ۔

اس مسیحی نے ان چاروں کو عبداللہ کے سامنے کھڑا کر دیا ۔ کہا "حضرت ! ان چاروں کی آنکھیں ملاحظہ فرمالیں ۔ ان میں سے تین کی تو آنکھیں خراب ہیں اور ایک نابینا ۔ اب میں اس راکھ کا اثر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں "

آپ دم بخود ، حیرت زدہ یہ تماشا دیکھنے لگے ۔

اس مسیحی نے یکے بعد دیگرے خراب آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیریں ۔ اور انہیں ایک تاریک کمرے میں لے جا کر چھوڑ دیا بولا "جب تک میں بلاؤں نہ تم تینوں اندر ہی رہو گے "

یہ تینوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے ۔ آخر میں اس نے نابینا کی آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیر کر انہیں پٹی سے باندھ دیا اور کہا "تم یوں ہی بیٹھے رہو یہ پٹی میں خود ہی کھولوں گا "

عبداللہ حیرت سے یہ سب دیکھتے رہے ۔ وہ شخص آپ کو لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں ان کی اقامت کا انتظام کر دیا تھا ۔ آپ نے شام تک کا وقت بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزارا ۔ مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن کی سپیدی

کو رات کی چادر نے لپیٹ کر انسانی نظروں سے اوجھل کر دیا - اس رات آسمان پر بارہویں کا چاند چمک رہا تھا اور چاند کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دمک کمزور کر چکے تھے - مسیحی عبداللہ سے باتیں کرتے کرتے اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا "شاید اب وقت آگیا ہے کہ میں ان چاروں کو آپ کے پاس لے آؤں اور راہب کی راکھ کے کرشمے دکھا دوں "

آپ نے پوچھا " کیا تیرا یہ خیال ہے کہ وہ فضول راکھ اپنا کام کر چکی ہوگی ؟"

مسیحی نے کہا " جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی - اگر آپ اس مقدس راکھ کو فضول نہ کہیں "

آپ نے آہستہ سے کہا " اگر میری اس بات نے تیرے دل کو دکھ پہنچایا تو میں معذرت خواہ ہوں "

مسیحی ان تینوں کو کمرے سے باہر لے آیا ان تینوں نے ابھی تک اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں مسیحی نے ایک شخص کو عبداللہ کے قریب کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا " اے شخص! آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول اور ہمیں بتا کہ اس راکھ نے کوئی اثر کیا یا آنکھیں اب بھی خراب ہیں "

اس شخص نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنا شروع کر دیں اور جب اس کی دونوں آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو وہ خوشی سے چیخ اٹھا " آہ، اب میں بالکل ٹھیک ہوں میری آنکھیں بالکل درست ہو چکی ہیں "

آپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا - اس شخص نے کہا " اے شخص! تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے یا اپنے مذہب اور عقائد کی طرفداری میں ایسی بات کر رہا ہے ؟"

اس شخص نے جواب دیا " میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے اور ایسی بات کیوں کر رہا ہے لیکن میں اب مسیح ؑ کی قسم کھا کر تجھے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، تو اس کی صداقت پر شک و شبہ نہ کر "

اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شخص کی آنکھیں بھی کھلوائی گئیں اور ان دونوں نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی پہلا شخص کر چکا تھا - ان تینوں کی آنکھیں درست ہو چکی تھیں -

آپ نے اس مسیحی سے کہا " بھائی میں حیران ہوں اور مجھے ان تینوں کی باتوں پر یقین نہیں آرہا - بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مردے کی راکھ دوا کا کام دے "

مسیحی نے جواب دیا " اے مسلمان درویش! مردے کی راکھ کہہ رہا ہے مقدس

بزرگ کی بے حرمتی نہ کیجئے۔ اگر وہ مقدس نہ ہوتا تو کبھی بھی اس کی راکھ میں یہ اثر نہ ہوتا۔"

آپ نے کہا "اب اس نابینا کی پٹی تو کھول کر دکھاؤ۔ اس اعتبار سے وہ گویا بینا ہو چکا ہوگا۔"

"بے شک" مسیحی نے جواب دیا "مجھے اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں۔"

اس کے بعد وہ مسیحی اس نابینا کو لے آیا اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹانے لگا۔ ایک آنکھ پر سے ذرا سی پٹی ہٹا کر اس نے کہا "اے شخص اپنی آنکھ کے گوشے سے دنیا دیکھنے کی کوشش کر۔ کیا تجھے کچھ نظر آیا؟"

اس شخص نے جواب دیا "ہاں، میں اپنی آنکھ کے کھلے ہوئے گوشے سے بادلوں کا جھنڈ دیکھ رہا ہوں۔ یا پھر ایسا ہے کہ میں کہر آلود فضا میں کھڑا ہوں۔"

مسیحی نے پٹی ذرا سی اور کھسکا دی، پوچھا "اور اب؟"

"بادل بدستور موجود ہے، کہر آلود فضا۔"

اس کے بعد مسیحی نے پوری پٹی ہٹا دی۔ نابینا کی بینائی واپس آچکی تھی۔ عبداللہ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا مسیحی حق پر ہیں؟ کیا ایک راہب اپنی موت کے بعد مخلوق کے لئے اتنا مفید اور فائدہ رساں ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات انہیں پریشان کرتے رہے۔

رات کو جب یہ سو گئے تو خواب میں رسول مقبول کو دیکھا، آپ نے فرمایا "اے خفیف تم الجھنوں کا شکار کیوں ہو گئے ہو؟ اس راہب کی راکھ نے تمہیں اتنا پریشان کیوں کر دیا ہے؟ ان باتوں سے تمہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے، صدق ریاضت سے باطل دین والوں میں بھی یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے اگر دین حق والے بھی صدق و ریاضت سے کام لیں تو ان میں اس راہب سے زیادہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدق و دیانت، ریاضت اور خلوص، یہ کہیں بھی ہوں، ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔"

آپ کے دل کو قرار آ گیا اور کچھ دن اس مسیحی کے مہمان رہ کر شیراز کے لئے روانہ ہو گئے۔

آپ نے ایک بار پھر رسول مقبول کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے عبداللہ سے فرمایا۔ "اے خفیف! اگر راہِ طریقت کا واقف بھی اس راستے پر گامزن نہ ہوگا تو محشر میں یہی شخص عذاب کا سب سے زیادہ مستحق قرار پائے گا۔"

آپ پر اس قول کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ نے اتباعِ سنت میں انگوٹھوں کے بل پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ آپ نے زار و قطار

تے ہوئے عرض کیا " یارسول اللہؐ! میں نے تو بڑی کوشش کی کہ آپؐ کی اتباع میں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز پڑھوں لیکن اس میں ناکام رہا۔ اب آپؐ ہی فرمائیے کہ میں راہِ طریقت پر کس طرح چلوں کہ محشر میں مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے "

آپ نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ صلعم فرما رہے ہیں کہ اے خفیف! انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات میری ذات تک مخصوص تھی تجھے اس معاملے میں میری اتباع نہیں کرنا چاہیئے۔

ایک بار آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم ہے لوگ حیران و سرگرداں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں پل صراط پر لوگوں کا ہجوم ہے اور اس پر سے گذرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس عالم میں آپ نے دیکھا ایک چھوٹا سا بچہ کسی طرف سے نمودار ہوا اور ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا " اباجان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ اِدھر آیئے میرے ساتھ تاکہ میں آپ کو پل صراط کے اُس پار پہنچا دوں "

اس شخص نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکے نے اسے نہایت آسانی سے پل صراط کے اُس پار پہنچا دیا۔ سامنے ہی جنّت تھی، لڑکے نے کہا " اباجان! آیئے میرے ساتھ، میں آپ کو جنّت میں داخل کرا دوں "

چنانچہ اس لڑکے نے اپنے باپ کو جنّت میں پہنچا دیا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔

آپ نے بیدار ہوتے ہی کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ ماہ بعد گھر میں ایک حسین بچہ پیدا ہوا جو چند گھنٹے زندہ رہ کر چل بسا۔ بیوی چیخیں مار مار کر رونے لگی آپ بھی بہت اداس تھے آہستہ آہستہ چل کر بیوی کے پاس پہنچے اور کہا " بی بی! تم ثابت قدم رہو خدا کی مشیت میں کوئی کس طرح دم مار سکتا ہے۔ رضائے الٰہی پر تمہیں اپنا سر جھکا دینا چاہیئے کیونکہ اللہ اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے "

بیوی نے روتے ہوئے پوچھا " کیا آپ میرے پاس اس قسم کی باتیں کر کے دل دکھانے آئے ہیں۔ میں کس طرح صبر کر لوں "

آپ نے جواب دیا " تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے یا میرے کسی بیٹے نے میں

تمہارے لیئے تکلیف اور اذیت کا محرک پایا جاتا تھا۔ میں نے تو تم سے کسی اور ہی مقصد سے شادی کی تھی۔ آج وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لیئے مجھے اجازت دیجئے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں کیونکہ لڑکے کی پیدائش اور اس کی فوری موت نے میرے مسائل حل کر دیئے۔ اب میں اس فکر سے بے نیاز ہو چکا ہوں "

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا "میں نے طلاق لینے کے لیئے یہ شادی نہیں کی تھی۔ میں طلاق کیوں لوں؟"

آپ نے جواب دیا "اگر تم اب بھی میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں"

بیوی کا دل گداز اور کمزور تھا شوہر کو اداس اور ملول دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

آپ کے مریدوں میں سے دو ایسے بھی تھے جن کا نام احمد تھا آپ نے ان دونوں میں تمیز کی خاطر ایک کا نام احمد کہہ اور دوسرے کا نام احمد مہ رکھ دیا۔ لیکن آپ کو احمد کہہ سے بڑی انسیت تھی حالانکہ عبادت اور ریاضت میں احمد مہ کا کوئی جواب ہی نہ تھا دوسرے مرید جب یہ دیکھتے کہ ایک دیندار کے مقابلے میں دوسرے کمتر درجے کے دیندار کو زیادہ سراہا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ایک دن ایک مرید نے عرض کیا "حضرت! میں ایک بات معلوم کرنے کی جرات کر رہا ہوں اگر اس کا صحیح جواب مل جائے گا تو میں نہایت خشوع و خضوع سے یادالہٰی میں مشغول رہ سکوں گا"

آپ نے کہا "وہ کیا؟ پوچھو"

مرید نے عرض کیا "آپ کے دونوں مرید احمد کہہ اور احمد مہ میں جو زیادہ عبادت گذار اور متقی ہے آپ اس کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہتے ہیں جو نسبتہً کم عبادت گذار ہے اس کی کیا وجہ ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں تیرے سوال کا جواب کسی خاص وقت پر دوں گا اس کیلئے تجھے انتظار کرنا ہوگا"

مرید چپ ہو گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گذر گیا۔

آپ ایک بڑے اجتماع سے مخاطب تھے آپ کے دلکش اندازِ وعظ گوئی نے مجمع پر سحر سا کر رکھا تھا۔ وعظ کے خاتمہ پر آپ نے احمد مہ سے کہا "احمد مہ! میرا ایک

کام تو کر دے ۔

احمد مہ نے ادب سے عرض کیا "ارشاد، ایک کیا دس کام ارشاد فرمائیے، میں دل وجان اس کی تعمیل کروں گا "

آپ نے کہا "میرے اونٹ کو، جو باہر بندھا ہوا ہے، ذرا اوپر چھت پر باندھ دے "

احمد مہ آپ کی صورت دیکھنے لگا، آپ نے پوچھا "میری صورت کیا دیکھ رہا ہے میں نے جو کام تیرے سپرد کیا ہے اسے انجام دے "

احمد مہ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا "حضرت! آپ نے اس پر غور بھی فرمایا کہ کیا حکم دے رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیا ہے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ دے "

احمد مہ نے کہا "حضرت! ذرا غور تو فرمائیے، اونٹ کوئی بکری یا بھیڑ کا بچہ تو ہے نہیں جسے میں گود میں لے کر چھت پر پہنچا دوں "

آپ نے احمد کہہ کو آواز دی "احمد کہہ! ذرا میرے پاس تو آنا "

احمد کہہ بھاگا بھاگا آپ کے روبرو آکھڑا ہوا "ارشاد!"

آپ نے فرمایا "ذرا میرے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ تو دے "

احمد کہہ نے گردن جھکا کر بصد ادب عرض کیا "بہت بہتر ابھی لیجئے "

احمد کہہ فوراً اٹھا اور اونٹ کے پاس پہنچ گیا اس نے اونٹ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہاتھ اگر اونٹ کی پچھلی ٹانگ پر تھا تو دوسرا اونٹ کے نصف حصے تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھا لے لیکن ناکام رہا ۔

آپ اپنے چند مریدوں کو ساتھ لے کر احمد کہہ کے پاس پہنچ گئے ۔

ان میں وہ مرید بھی شامل تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال کیا تھا کہ آپ عبادت گذار احمد مہ کے مقابلے میں نسبتہً کم عبادت گذار احمد کہہ کو کیوں زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کے ساتھ یہ تماشا دیکھا کہ احمد کہہ پسینے میں تر بتر اونٹ کو اٹھا لینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا ہے لیکن اونٹ کو جنبش تک نہیں دے پا رہا۔ آپ نے احمد کہہ سے کہا

"اب بس کر۔ اگر اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھتا تو مت اٹھا، میرا منشا پورا ہو چکا۔"

مرید حیرت سے آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ احمد کہہ نے عرض کیا۔ "حضرت! میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا حکم بجا لاؤں۔"

آپ نے کہا۔ "میرا حکم تو تُو بجا لایا اب مزید ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔"

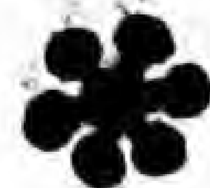
جس مرید نے کچھ عرصہ پہلے اعتراض کیا تھا، اس نے کہا۔ "آپ کو خود بھی اس کا پہلے ہی علم ہوگا کہ اونٹ اس کے اٹھائے نہیں اٹھے گا پھر اسے خواہ مخواہ ہلکان فرمایا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تجھ اور تیرے جیسے دوسروں کو یہ بتانے کے لئے کہ میں عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "اس طرح اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بات اب بھی نہیں آئی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے ایک ہی حکم دونوں کو دیا۔ ان میں جو زیادہ عبادت گزار تھا وہ اپنی عبادت پر نازاں رہا اور میرے حکم کی بجا آوری کے بجائے یہ عذر پیش کر دیا کہ اونٹ کو چھت پر لے جانا اس کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس کے برعکس احمد کہہ، جو تم سب کی نظروں میں احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار ہے میرا زیادہ فرمانبردار ہے چنانچہ جب میں نے اسے یہ حکم دیا کہ اونٹ چھت پر لا دھر دے تو اس غریب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ تعمیل حکم کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ایسا ہی انسان زیادہ پسند ہے جو حکم کی بجا آوری میں احمد کہہ جیسا ہو۔"

معترض مرید اور ان جیسے دوسرے مریدوں کو اپنے اپنے شک و شبہات کا جواب مل چکا تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔



ایک شخص آپ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ کھانا تناول فرمانے کی سعادت عطا فرمائیں۔

آپ نے پہلے تو تامل سے کام لیا لیکن جب اس کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور ارشاد فرمایا۔ "مجھے کھانے کے وقت اپنے ساتھ لے جانا۔"

وہ شخص چلا گیا اور کھانے کا اہتمام کرنے لگا۔ جب کھانا پک چکا تو وہ آپ کو بلانے آگیا۔

آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پہلے ہی لقمے پر کچھ کراہیت سی محسوس ہوئی آپ کو گوشت میں کچھ خرابی محسوس ہوئی۔ صاحب خانہ نے پوچھا "حضرت! کوئی خاص بات؟"

آپ نے اس کی پردہ پوشی کی "نہیں تو، کوئی خاص بات نہیں"

اس شخص نے نہایت عقیدت اور محبّت سے عرض کیا "حضرت! میں ایک سعادت اور حاصل کرنا چاہتا ہوں"

آپ نے پوچھا "وہ کیا؟"

اس نے عرض کیا "میں لقمے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا چاہتا ہوں"

آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے، بولے "تو اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے"

اس شخص نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا شروع کر دیا جیسے جیسے وہ لقموں کو چباتے تھے انہیں گوشت کی خرابی اور سرانڈ کا شدید احساس ہوتا جارہا تھا۔ جب وہ آپ کے چہرے سے نظریں ہٹالیتا تو آپ کے چہرے پر کراہیت کی شکنیں نمودار ہو جاتیں اور جب وہ دیکھنے لگتا تو آپ ضبط و احتیاط سے کام لیتے کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہو جائے۔ لیکن آخر کار صاحب خانہ کو اس کا احساس ہو گیا کہ گوشت صحیح نہیں ہے اور اس میں سے سرانڈ محسوس ہو رہی ہے اس نے شرمندگی سے منہ چھپالیا۔ آپ نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے اچھی طرح نادم ہونے کا موقع دیا۔

اسی سال آپ ایک بار پھر حج پر روانہ ہو گئے۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے وہ قادسیہ پہنچ کر راستہ بھول گیا۔ یہ اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے لگے پاس کھانے کو جو کچھ تھا، ختم ہونے لگا۔ آس پاس کوئی بستی بھی نہ تھی یہ کئی دن بھٹکنے کے بعد اپنا کھانے پینے کا سامان تک ختم کر بیٹھے اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے کھانے کیلئے بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن بڑی مایوسی رہی اور بھوک حد سے تجاوز کرتی رہی۔

آخر وہ لوگ اضطراری حالت کو پہنچ گئے جہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے بھوک نے ان سب کو جاں بلب کر رکھا تھا۔ قافلے کے لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے وہ آبادی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں تھے آخر شام کے وقت قافلے کے ایک آدمی کو نہیں

اطلاع دی کہ اس ویرانے میں ایک گھر ایسا مل گیا ہے جس کے پاس ایک ہی جانور ہے جسے وہ چالیس دینار سے کم پر دینے کو تیار نہیں۔

آپ نے جواب دیا "اسے فوراً حاصل کر لیا جائے کیونکہ اہل قافلہ کی بھوک حالت اضطراری میں داخل ہو چکی ہے"۔

خبر دینے والے نے ذرا تامل سے کہا "لیکن یہ بھی تو سنئے کہ وہ جانور کون سا ہے؟

آپ نے جواب دیا۔ وہ کوئی سا بھی ہو اس حالت میں حرام بھی حلال کر دیا گیا ہے

اس شخص نے قافلے والوں سے پوچھا "آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟"

اہل قافلہ نے متفقہ عرض کیا "عبداللہ خفیف صحیح کہہ رہے ہیں"۔

اس شخص نے آنکھیں بند کر لیں اور دانت بھینچ کر عرض کیا "حضرات! وہ جانور موٹا تازہ، خاصے تن و توش کا دنبے جیسا ایک کتا ہے۔

قافلے والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اس شخص نے کہا "آپ لوگ جلدی فیصلہ کر لیجئے کیا اس بھوک کو کتے کے گوشت سے مٹانے کی ہمت رکھتے ہیں آپ لوگ؟"

ان میں سے بیشتر کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ صبح تک ہلاک ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا ان میں سے ایک نے جواب دیا "بھوک سے مر جانے کی نسبت یہ زیادہ اچھا ہے کہ کتے کا گوشت کھا کر زندہ رہا جائے اس طرح ہمیں زندگی کے کچھ دن تو مل جائیں گے اور ہم ان دنوں میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کر سکیں گے جس سے اس حرام کے گناہ کو دھو دیں گے"۔

اس شخص نے عبداللہ خفیف سے پوچھا "اور آپ کیا فرماتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "میں حالت اضطراری میں حرام کو حلال قرار دیتا ہوں"۔

اس وقت آپ کو وہ شخص یاد آ رہا تھا جس نے آپ کی دعوت کی تھی کہ گوشت کی سڑاند کا علم ہو جانے کے بعد شرمندہ اور نادم ہو کر ایک طرف جا بیٹھا تھا اور آپ نے اس کی ندامت دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی تھی۔ آپ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس عذاب میں ہو رہا ہے آپ کو اس شخص کی ندامت اور دل شکنی کا خیال ضرور کرنا چاہیئے تھا شاید کتے کا گوشت اسی سزا میں کھلایا جا رہا ہے۔

چالیس دینار میں فربہ کتا خرید لیا گیا۔ اسے ذبح کر کے بھونا گیا اور قافلے والوں نے خوب مزے لے لے کر اپنی بھوک مٹائی لیکن عبداللہ خفیف ان سب سے دور بیٹھ کر ان کے کھانے کا منظر دیکھتے رہے وہ اس وقت کفارہ ادا کر رہے تھے وہ مزید بھوکے رہ کر خود کو سزا دے رہے تھے آنتیں کھرچ رہی تھیں اور سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی لیکن انہوں نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کیا اور کھانے کا ایک لقمہ بھی زبان پر نہیں رکھا۔

آپ نے آخری عمر میں بادشاہ کے دربار میں جانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اس تغیر پر حیران تھے لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تھے لیکن آپ بڑی پابندی سے دربار جانے لگے تھے آپ کے مرید اس پر معترض تو تھے لیکن زبان سے کچھ نہ کہتے تھے کسی نے احمد کبیر کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ آپ سے پوچھے کہ آپ نے بادشاہ کی دربار داری کیوں شروع کر دی ہے؟

لیکن احمد کبیر نے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔

آپ دربار جا رہے تھے اور آپ کے مرید گو مگو بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان میں ہر شخص اس تبدیلی کو بڑی ناگواری سے محسوس کر رہا تھا جب آپ دربار چلے گئے تو آپ کی عدم موجودگی میں دو درویش نہایت دور دراز سے سفر کر کے آپ کی ملاقات کو حاضر ہوئے انہوں نے پوچھا۔ "عبداللہ خفیف کہاں ہیں؟"

کسی مرید نے جواب دیا "وہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔"

درویشوں نے حیرت سے کہا "عبداللہ خفیف اور بادشاہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

مرید نے جواب دیا "ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں ادھر کچھ دنوں سے وہ شاہی دربار میں باقاعدگی سے حاضری دے رہے ہیں۔"

ایک درویش نے اپنے ساتھی درویش سے کہا "یہ کیسے بزرگ ہیں جو شاہی دربار جایا کرتے ہیں حالانکہ درویشوں کو شاہوں اور ان درباروں سے کیا تعلق؟"

دوسرے درویش نے جواب دیا "خدا عالم الغیب ہے وہی چھپی باتوں اور دلوں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔"

دونوں درویش آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ عبداللہ خفیف کا کہاں انتظار کیا جائے؟ ان کی خانقاہ میں یا کہیں اور۔ پھر دونوں نے یہ طے کیا کہ شیراز کے بازاروں میں گھوم پھر

لیا جائے یہ طے کرکے دونوں بازار کی طرف نکل گئے وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہے اچانک ان کی نظریں ایک درزی پر پڑیں۔ ایک درویش کے خرقے کی جیب پھٹی ہوئی تھی اس نے اپنے ساتھی سے کہا "میرا خیال ہے وقت غنیمت ہے کیوں نہ میں اپنے خرقے کی جیب سلوا لوں۔"

دوسرے درویش نے تائید کی، بولا "بے شک وقت غنیمت ہے۔"

دونوں درزی کی دکان پر بیٹھ گئے اور ایک درویش نے اپنا خرقہ اتار کر درزی کے حوالے کیا اور کہا "او بھائی درزی! ذرا میری یہ پھٹی ہوئی جیب تو سی دے۔"

درزی نے خرقہ لیا اور جیب سینے لگا۔ اسی دوران اسے قینچی کی ضرورت پیش آگئی اس نے اپنا سامان میں قینچی تلاش کی لیکن وہ نہیں ملی۔ اس نے ان درویشوں کی طرف دیکھا۔ کوسوں کی مسافت طے کئے ہوئے یہ درویش پراگندہ و پریشان عجب بے اعتبار سے محسوس ہوئے درزی نے ان سے پوچھا "تم دونوں نے میری قینچی تو نہیں دیکھی؟"

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا "بابا! ہم دونوں اس شہر میں نوارد ہیں اور بھلا ہمیں تیری قینچی کا کیا علم؟ یہ سوال تو ان سے کر جو تیری دکان پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔"

درزی کا شک اور بڑھا، بولا "سیدھی طرح بتا دو کہ میری قینچی کہاں ہے ورنہ دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔"

ایک درویش نے کہا "تو دوسرا نہیں تیسرا طریقہ اختیار کر، جب ہمارے پاس تیری قینچی موجود نہیں تو تیرا دوسرا یا تیسرا طریقہ اسے کہاں سے فراہم کر دیگا۔"

درزی نے کہا "تم دو ساتھی ہی میری دکان پر آئے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا بھی تھا؟"

ایک درویش نے جواب دیا "ہم دو ساتھی ہیں، بہت دور سے دو ہی آئے ہیں اور تیری دکان پر بھی ہم دو ہی آئے ہیں تیسرے ساتھی سے تیری کیا مراد ہے؟"

درزی نے کہا "تم دونوں کا کوئی تیسرا ساتھی ضرور ہوگا اور تم دونوں نے میری قینچی اس کے حوالے کرکے چلتا کر دیا ہوگا۔"

دونوں درویشوں کو غصہ آگیا، ایک نے ذرا جوشیلے لہجے میں کہا "تیرا دماغ تو صحیح ہے تو ہم دونوں کو چور ٹھہراتا ہے تجھے شرم آنی چاہئے ہم درویشوں کو چوری چکاری

سے کیا تعلق ؟"

درزی نے کہا "میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا بس سیدھی طرح میری قینچی فراہم کر دو ، ورنہ میں پولیس بلوالوں گا "

ایک درویش نے عاجزی سے کہا " بھائی ! یہ تجھ ہو کیا گیا ہے جو ہم کو چور بناتا ہے کچھ تو خدا کا خوف کر "

درزی نے جواب دیا " میں خدا کا خوف کیوں کروں ؟ تم چوری کر کے خدا سے ڈر نہیں رہے اور مجھے خدا کے خوف سے ڈرا رہے ہو ، کمال کے ہو تم دونوں "

دوسرے درویش نے کہا " بھائی ! یہ تکرار بعد میں کر لینا ، پہلے میرے خرقے کی جیب تو سی دو "

درزی نے خرقہ اٹھا کر دکان کے اندر پھینک دیا ، کہا " اب یہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تم دونوں قینچی نہیں دو گے "

ایک درویش نے اپنا سر پکڑ لیا ، پیشانی دباتا ہوا بولا " بھائی ! تو نے تو کمال ہی کر دیا - ہم دونوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے اور خدا کے غضب سے ذرا بھی نہیں ڈرتا "

درزی نے جھنجلا کر کہا " دیکھو ، مجھے بار بار خدا کے غضب سے مت ڈراؤ - میں بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک پولیس آچکی ہوتی "

درویشوں نے کہا " دیکھ تنگ نہ کر ، ہم چور نہیں ہیں "

درزی نے کہا " تم چور اگر نہیں ہو تو پھر میری قینچی کہاں چلی گئی ؟"

درویشوں نے گرم ہو کر کہا " ہم کیا جانیں تیری قینچی کہاں چلی گئی ؟"

درزی نے کہا " واہ جناب ! ایک تو میری قینچی غائب کر دی دوسرے مجھی کو آنکھیں بھی دکھاتے ہو "

ایک درویش نے نرمی سے کہا " بابا ! کیسی باتیں کرتے ہو ہم تمہیں کس طرح یقین دلائیں کہ ہم نے تمہاری قینچی نہیں لی "

درزی نے جواب دیا " تمہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں ، کیونکہ میں یقین کرنے کو تیار ہی نہیں - مجھے یا تو قینچی واپس کر دو ، ورنہ میں سپاہیوں کو بلاتا ہوں "

درویش نے کہا " تم ہمیں برابر سپاہیوں کی دھمکی دیئے جا رہے ہو - اگر تم واقعی

تمہاری بے گناہی پر یقین نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں اور وہی کرو جس پر تمہارا دل راغب ہے۔"

درزی نے اسی وقت سپاہیوں کو بلا لیا اور ان دونوں درویشوں کو قینچی چرانے کے جرم میں گرفتار کرا دیا۔ سپاہیوں نے انہیں حکمران کے دربار میں پیش کر دیا۔ وہاں عبداللہ خفیف پہلے ہی موجود تھے آپ نے دونوں درویشوں کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔ اور ان سے سوال کیا "درویشو! میں تمہیں بتاؤں کہ میں بادشاہ کے دربار میں کیوں آتا ہوں؟"

دونوں درویش بہت پریشان تھے بولے "اس وقت تو ہم دونوں مصیبت میں گرفتار ہیں اس سے نجات ملے تو کچھ عرض کریں۔"

عبداللہ خفیف نے بادشاہ سے کہا "تیرا میری بابت کیا خیال ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا "میں آپ کو انتہائی بزرگ سمجھتا ہوں۔"

آپ نے پوچھا "میں سچا ہوں یا جھوٹا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "آپ سچے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا "اگر تو مجھے سچا سمجھتا ہے تو میری بات کا یقین کر یہ دونوں درویش دور دراز سے میری ملاقات کو آئے ہیں یہاں بے وجہ چوری کے الزام میں گرفتار کر کے تیرے دربار میں لا کھڑے کئے گئے ان بے گناہوں کو چھوڑ دے۔"

بادشاہ نے ان دونوں کو اسی وقت رہا کر دیا۔ آپ ان دونوں کو لے کر دربار سے باہر نکلے اور سیدھے درزی کے پاس پہنچے، درزی سے پوچھا۔ "کیا تو ان دونوں کو چور سمجھتا ہے؟"

درزی بہت ڈرا سہما تھا، اس نے جواب دیا "نہیں تو، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔"

آپ نے پوچھا "تیری قینچی ملی یا نہیں؟"

درزی نے جواب دیا "مل گئی، وہ کپڑوں میں بندھ گئی تھی۔"

آپ نے کہا "تب پھر تو نے اپنے کپڑوں میں پہلے ہی اسے اچھی طرح کیوں نہیں تلاش کر لیا تھا؟"

درزی نے عاجزی سے جواب دیا "حضرت! میں حیران اور پریشان ہوں کہ میں نے ان دونوں درویشوں پر چوری کا الزام لگایا کیوں؟ میں اپنی اس حرکت پر بہت زیادہ پشیمان ہوں۔"

آپ نے دونوں درویشوں سے کہا "میں شاہی دربار کیوں جاتا ہوں؟ یہ تو تم دونوں کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا آج اگر میں دربار میں موجود نہ ہوتا تو تم دونوں کا معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔"
پھر درزی سے کہا "کیا ان کے خرقے کی جیب سل گئی؟ اگر سل گئی ہو تو دے دے۔"
درزی نے خرقہ آپ کے حوالے کر دیا، کہا "اسے تو میں نے سب سے پہلے سی دیا تھا۔"
آپ نے اس کی سلائی دریافت کی۔ لیکن درزی نے اس کی سلائی نہیں لی۔ آپ دونوں درویشوں کو اپنی خانقاہ لے گئے وہاں ان دونوں نے اپنی بدگمانی کی معافی مانگی۔



ایک مسافر نے آپ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہ بہت تھکا ہارا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ناقص کھانے یا شیراز کے پانی کی ناموافقت سے اپنے پیٹ میں گڑبڑ محسوس کی۔ پھر اجابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ اس کی تیمارداری میں لگ گئے اس کی حالت نازک ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر تک اسے پچاس بار رفع حاجت کے لئے جانا پڑا۔ رات کے آخری حصے میں آپ کی آنکھ لگ گئی، مہمان کو ایک بار پھر رفع حاجت کی ضرورت پیش آگئی اس نے آپ کو آواز دی۔ لیکن نیند اتنی گہری آئی ہوئی تھی کہ آپ کی آنکھ نہیں کھلی۔ اس نے پھر آواز دی، لیکن آپ سوتے رہے۔ مہمان پر کمزوری اتنی غالب تھی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہو چکا تھا اس نے آپ کو پوری قوت سے پکارا اور جب یہ محسوس کیا کہ آپ بیدار نہیں ہوئے ہیں تو اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا "او شیخ! تجھ پر خدا کی لعنت، کہاں چلا گیا؟"
مریدوں نے آپ سے کہا "حضرت! آپ نے اس کے گستاخانہ کلمات سنے؟"
آپ نے جواب دیا "ہاں! میں نے اس کے کلماتِ رحمت سن لیے۔"
اس کے بعد آپ مہمان کو بیت الخلاء لے گئے۔ جب واپس آئے تو مریدوں نے کہا "گستاخانہ کلمات کو کلماتِ رحمت کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"
آپ نے جواب دیا۔
"خدا نے مجھے خراب بات سننے کے لئے کان نہیں دیئے میں نے تو اسے یہ کہتے سنا او شیخ! تجھ پر خدا کی رحمت، کہاں چلا گیا؟"
مریدوں نے عرض کیا "آپ اس گستاخ کی بے جا طرفداری فرما رہے ہیں۔"
آپ نے جواب دیا "نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں اپنے منصب کا حق ادا کر رہا ہوں۔"

مریدوں نے خاموشی اختیار کی۔

ایک مسافر آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ اس نے جو کچھ پہن رکھا تھا سیاہ تھا۔ گویا ماتم کدے کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا "تو نے یہ سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

اس نے جواب دیا "اے خفیف امیرے حکمراں یعنی نفس اور ہوا، دونوں فوت ہو چکے ہیں اس لئے میں نے ماتمی لباس پہن لیا ہے"

آپ نے حکم دیا "اس شخص کو فوراً باہر نکال دو"

مریدوں نے حکم کی تعمیل کر دی اور اس شخص کو نکال باہر کیا لیکن ذرا دیر بعد دیکھا کہ وہ شخص پھر آگیا ہے آپ نے اسے پھر نکلوا دیا لیکن وہ پھر آگیا۔ اس طرح آپ نے اس شخص کو ستر بار نکلوایا اور ستر بار واپس آیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر نہ آئے آخر آپ نے فرمایا "اے شخص! واقعی یہ لباس تجھے زیب دیتا ہے کیونکہ ستر بار کی تذلیل بھی تجھے آزردہ نہیں کر سکی"

آپ نے ایک بار دوران وعظ فرمایا "لوگو! اللہ تعالیٰ نے پہلے پہل ملائکہ اور انس وجن کو تخلیق فرمایا۔ ان کے بعد عصمت، کفایت اور جبلت کو تخلیق فرما کر حکم دیا کہ تینوں ان میں سے ایک ایک شے اپنے لئے پسند کر لیں۔

چنانچہ ملائکہ نے عصمت کو اختیار کیا، اجنہ نے کفایت کو اور انسانوں نے جبلت کو منتخب کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کثرت سے حیلہ سازی سے کام لیتا ہے عہد گزشتہ میں انسان اجنہ پر غالب رہتے تھے لیکن پھر معاملہ الٹا ہو گیا"

کسی مرید نے دریافت کیا "حضرت! فقیر کی خوبیاں بیان فرمائیے"

آپ نے جواب دیا "وہ تو میں بیان کر دوں گا، لیکن یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اظہار فقر معیوب شے ہے" پھر فرمایا "جو کچھ میسر آجائے کھا کر خدا کا شکر ادا کرے اور میسر نہ آئے تو صبر سے کام لے"

آپ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا "لوگو! کچھ جانتے ہو، عبادت کسے کہتے ہیں؟"

لوگوں نے جواب دیا "نہیں، آپ اس کی وضاحت فرما دیجئے"

آپ نے کہا "عبادت نام ہے دائمی غم اور خوشی کو ترک کر دینے کا"

پھر پوچھا "اور وصل کیا ہوتا ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا "آپ ہی ارشاد فرمائیں، ہم نہیں جانتے"

آپ نے کہا "وصل نام ہے محبوب سے اس اتصال کا جس کے بعد کچھ بھی یاد نہ رہے"

پھر پوچھا "اور تقویٰ کیا ہے؟"

لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا "حضرت! اس سوال کا جواب بھی آپ ہی مرحمت فرمائینگے"

آپ نے کہا "نفس، دنیا اور ابلیس سے بیک وقت کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام تقویٰ ہے"

"اور رہی ریاضت؟ تو اس کے معنیٰ ہیں، عبادت الہٰی سے نفس کو شکست دینا۔ اسی چیز کو ریاضت کہتے ہیں" آخری عمر میں جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ "اے خادم! ادھر میرے پاس آؤ"

خادم آپ کے روبرو آکر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ موت کے بعد میرے ہاتھوں میں رسی باندھ کر اور گلے میں طوق ڈالوا کر قبلہ رو بٹھا دینا۔ شاید اسی طرح میری مغفرت ہو جائے

آپ کے انتقال کے بعد خادم نے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو کسی نے اسے ڈانٹ دیا "خبردار! او بے ادب! جو تو نے خفیف کی وصیت پر عمل کیا! کیا تو ہمارے محبوب کو رسوا کرنا چاہتا ہے؟"

خادم نے خوف زدہ ہو کر آپ کی وصیت پر عمل نہیں کیا۔

آپ کے بعد کسی نے آپ کے مزار پر لکھ دیا "قابو یافتہ شئے سے اعراض اور غیر قابو یافتہ شئے کو طلب نہ کرنا قناعت ہے زہد نام ہے زر و مال کو نظر انداز کر دینے کا اور اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کر کے مصائب پر صبر کرنے کا نام ہے عبودیت"

آپ کو آپ کے ہم عصر بزرگوں نے مشائخین کے شیخ کا لقب دیا تھا جو آپ کے نام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گیا۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

خزینۃ الاصفیا	تذکرۃ الاولیاء	سکینۃ الاولیاء	طبقات الکبریٰ	ریاض الریاحین	سفینۃ الاولیاء
مفتی غلام سرور	شیخ فریدالدین عطار	شاہزادہ داراشکوہ	علامہ شعرانی	ابی جعفر	شاہزادہ داراشکوہ

حضرت ابو احمد چشتیؒ

چشت کا رئیس سلطان فرسناقہ ہر وقت شراب و شاہد میں مشغول رہتا تھا۔ سلطان فرسناقہ جتنا سیر و شکار اور شراب کا شوقین تھا اس کی بہن اتنی ہی پاک باز اور ولیہ تھی بھائی کی صحبت میں شکاریوں اور خوشامدی مصاحبوں کا جمگھٹا لگا رہتا مگر بہن کی صحبت میں ذکر و فکر کا چرچا رہتا۔ اس وقت کی صاحب کمال شخصیات اس عارفہ کی خدمت میں حاضری کو باعث فخر سمجھتیں۔ اس عہد کے نامی گرامی بزرگوں میں خواجہ ابو اسحٰق شامی کا مرتبہ بہت بلند تھا اور ان کا یہ قاعدہ تھا کہ جب بھی چشت تشریف لاتے، سلطان فرسناقہ کی بہن کے پاس ضرور جاتے اور وہاں ذکر و فکر پر گفتگو شروع ہو جاتی۔

شام سے ذرا پہلے عصر کی نماز پڑھنے کے دوران سلطان فرسناقہ کی بہن کو مطلع کیا گیا کہ مشہور صوفی ابو اسحٰق شامی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ولیہ بہن نے سلام پھیرنے کے بعد کنیز کو ہدایت کی "وہ انہیں خاص مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے۔ میں ابھی حاضر ہوتی ہوں۔"

کنیز چلی گئی اور ابو اسحٰق شامی اور ان کے چند ساتھیوں کو خاص شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا کچھ دیر بعد یہ خود بھی وہیں پہنچ گئیں اور خواجہ ابو اسحٰق شامی کو سلام کیا۔

انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا "اے پاک باز عورت! کیا تو جانتی ہے کہ میں اس وقت کیوں آیا ہوں؟"

سلطان کی بہن نے جواب دیا "حضرت مجھے کیا علم۔ میں تو حضور کے عقیدت مندوں میں شامل ہوں۔"

ابو اسحٰق شامی نے کہا "میں یہاں قیام نہیں کروں گا مجھے اپنے ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھ جانا ہے میں نے سنا ہے ان دنوں تیری بھاوج حمل سے ہے کیا یہ درست ہے؟"

سلطان کی بہن نے جواب دیا "حضور نے صحیح سنا ہے۔"

ابواسحٰق نے کہا "اے پاک باز عورت! میں یہ بشارت دینے آیا ہوں کہ تیرے بھائی فرسناقہ کے گھر میں جو ولادت ہونے والی ہے وہ ایک بلند مرتبہ فرزند ہوگا۔ خدا نے تجھ جیسی ولیہ کو اس کی پیشوائی کی خاطر اس گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔"

سلطان کی بہن نے دریافت کیا "جب وہ بچہ پیدا ہو جائے گا تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

ابواسحٰق شامی نے جواب دیا "تو اپنی بھاوج کا خاص خیال رکھے گی۔ پھر جب وہ بچہ پیدا ہو جائے گا تو اس کی پرورش اور نگہداشت میں تو خاص دلچسپی لے گی اور کوئی بھی مشتبہ غذا اس کے حلق کے نیچے نہیں جانے دے گی۔"

بہن نے جواب دیا "بہتر ہے میں آپ کی ہدایات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی خدا مجھے اس کی توفیق عطا فرمائے۔"

ابواسحٰق شامی یہ ہدایات دے کر چلے گئے سلطان کی بہن نے اپنی بھاوج سے کہا "بھابی! میں آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔"

بھاوج نے پوچھا "کیا؟ پوچھو۔"

انہوں نے پوچھا "آپ کے حمل کو کتنا عرصہ گزرا ہے؟"

بھابی نے جواب دیا "بس چند دن۔ کیوں؟"

نند نے ابواسحٰق شامی کا پورا واقعہ سنا دیا اور کہا "مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اس بچے کی خاطر آپ کے حلق سے کوئی مشتبہ نوالہ نہ اترنے دوں۔"

بھابی نے حیرت سے پوچھا "پھر تم کیا کرو گی؟"

نند نے جواب دیا "میں یہ کروں گی کہ سوت کاتوں اور اس سے جو آمدنی ہو اس سے آپ کے کھانے پینے کا انتظام کروں۔"

بھابی نے کہا "لیکن یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"چشت کے حاکم سلطان فرسناقہ کی بہن سوت کات رہی ہے کیا لوگ ہمارا مذاق نہیں اڑائیں گے؟"

نند نے جواب دیا "میں مذاق یا استہزا سے ذرا نہیں ڈرتی۔ میں محنت کروں گی، چوری تو نہیں کروں گی اور محنت کا کون مذاق اڑا سکتا ہے میں نے یہ ساری باتیں اس لیئے آپ سے کہیں کہ ان کا تعلق آپ کی ذات سے ہے میری محنت کی کمائی پر آپ کو گزر کرنا ہے میں چاہتی ہوں

آپ راضی ہو جائیں آپ ہنسی خوشی میری محنت کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کا وعدہ کرلیں پھر میں کسی کی بھی پرواہ نہیں کروں گی۔"

بھابی سوچ میں پڑ گئیں، وہ کچھ دیر سر جھکائے سوچتی رہیں۔ پھر پوچھا۔

"میرے شکم میں پرورش پانے والا بچہ کیا کوئی عظیم الشان انسان ہوگا؟"

نند نے جواب دیا۔" اس عہد کے مشہور صوفی خواجہ ابو اسحٰق شامی نے یہ بشارت دی ہے اور وہ جھوٹ کیوں بولنے لگے؟ وہ یہ بشارت دینے آئے تھے اور ہدایات دے کر چلے گئے۔"

بھابی نے کہا۔" میں جانتی ہوں کہ جس زندگی کی تو تلقین کر رہی ہے کتنی مشکل زندگی ہوگی لیکن میں اس عظیم انسان کی خاطر یہ تکلیفیں جھیل لوں گی جو خدا کا بزرگ و برتر انسان ہوگا۔"

نند نے بھابی کو اپنے سینے سے لگالیا۔ بولی " بھابی! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ میری باتوں کو ہنسی میں نہ اڑا دیں اور مجھ سے تعاون نہ کریں۔"

بھابی نے تردد سے کہا " بس ذرا سا ڈر تیرے بھائی کی طرف سے ہے میں سوچتی ہوں کسی دن وہ اپنے ساتھ مجھے اپنے دستر خوان پر نہ بٹھالیں اگر انہوں نے ایسا کیا تو میں مجبور ہو جاؤں گی۔"

نند نے جواب دیا۔" اس کی فکر آپ نہ کریں آپ کا شوہر میرا بھائی ہے اسے میں سنبھال لوں گی۔"

اس کے بعد نند نے سوت کاتنا شروع کر دیا اور اس کی آمدنی سے دونوں گزر بسر کرنے لگیں چشت کے حاکم کی بہن کا سوت کاتنا راز میں کس طرح رہ سکتا تھا لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ کہ آخر سلطان فرسناقہ کی بہن پر کون سی افتاد پڑی ہے جو وہ گزران کے لیے محنت مشقت پر مجبور ہوگئی ہے جب یہ بھنک سلطان فرسناقہ کے کان میں پڑی تو وہ مشتعل ہو کر بہن کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا " بہن! یہ میں تیری بابت کیا سن رہا ہوں؟ کیا میں کنگال ہوں جو تو سوت کات کر گزر بسر کر رہی ہے؟ کیا میں نادار اور مفلس انسان ہوں جو اپنی بہن کا خرچ پورا نہیں کر سکتا؟"

بہن نے بڑے تحمل سے کہا۔" بھائی! میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ آپ مجھ سے اس موضوع پر بات کریں، کیونکہ میں خود اپنے طور پر یہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہتی تھی۔"

بہن نے ابو اسحٰق شامی کی آمد اور بشارت کا پورا قصہ سنا دیا۔ سلطان یہ سب بڑی توجہ سے سنتا رہا پھر پوچھا "کیا تو یہ سچ کہہ رہی ہے؟"

بہن نے جواب دیا "اوّل تو مجھے خود ہی جھوٹ سے نفرت ہے اور پھر جب خواجہ ابو اسحٰق شامی کی ذاتِ بابرکات درمیان میں آجائے تو پھر جھوٹ کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتی"

سلطان نے کہا "بہن اگر ایسی بات ہے تو میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ جس طرح چاہے اپنی بھابی کو رکھ، میں کوئی دخل نہ دوں گا اور اس سلسلے میں جو بھی لب کشائی کرے گا اس کی اچھی طرح خبر لوں گا"

بہن نے عرض کیا "نہیں بھائی کسی کی خبر لینے کی ضرورت نہیں، زمانہ تو بکتا رہا ہے بکتا رہے گا، اس کی پرواہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں"

بھائی کو مطمئن کر دینے کے بعد وہ بڑے اطمینان اور تن دہی سے سوت کاتنے لگیں اور اس سے اپنا اور اپنی بھابی کا خرچ چلانے لگیں۔

یہ ہارون رشید کے بیٹے معتصم باللہ کا دور تھا چھ رمضان ۲۶۰ھ کو یہ بچہ پیدا ہو گیا۔ بچے کا ابو احمد رکھا گیا ابو احمد کی پرورش بھی پھوپھی نے اپنی نگرانی میں کی۔ کچھ عرصہ بعد خواجہ ابو اسحٰق شامی بھی تشریف لائے اور سلطان کی بہن سے کہا "اے پاک باز عورت! میں تیری محنت اور مشقت کی داد دیتا ہوں۔ تو نے جس دیانت اور ذمہ داری سے اپنا فرض انجام دیا ہے اس کی تعریف ممکن نہیں"

انہوں نے بچے کو ابو اسحٰق شامی کی گود میں دے دیا۔ آپ نے ابو احمد کی پیشانی کو بوسہ دیا اور چہرے پر نظریں جما کر فرمایا "ابو احمد! میں تیرے بارے میں یہ پیش گوئی کرتا ہوں کہ تو ایک بہت بڑے بزرگ خانوادے کا آغاز ثابت ہو گا اور اس خانوادے سے عجیب و غریب احوال اور آثار ظہور پذیر ہوں گے"

ابو احمد نے ابو اسحٰق کو دیکھ کر تبسم فرمایا۔

سات برس کے سن میں ابو اسحٰق شامی سے اُن کی محفل سماع میں ملاقات ہو گئی۔ ابو احمد کھیلتے کودتے ابو اسحٰق شامی کی طرف جا نکلے۔ اس وقت مجلس میں بڑے پائے کے لوگ موجود تھے ابو اسحٰق شامی نے ابو احمد کو اپنی طرف آتے دیکھا تو احتراماً کھڑے

ہو گئے اور جس طرح کسی بزرگ سے مخاطب ہوا جاتا ہے، ابواحمد کو مخاطب کیا "ابواحمد! آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟"

ابواحمد نے جواب دیا:- "میں گیا کہیں بھی نہ تھا میں تو آپ سے ملاقات کرنے آ گیا تھا۔"

ابواسحٰق شامی نے حیرت سے ابواحمد کی طرف دیکھا اور کہنے لگے "یعنی میرے پاس! میری محفل میں! میں کتنا خوش نصیب ہوں، ابواحمد! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے بلائے بغیر ہی تشریف لے آئے اس سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کروں یا اپنے رب کا؟"

ابواحمد نے جواب دیا:- "آپ میرا شکر کیوں ادا کریں شکریہ تو رب العالمین کا ادا کیجئے جو انسانوں کو کام کی توفیق عطا فرماتا ہے۔"

ابواسحٰق شامی سات سالہ بچے کی زبان سے یہ جواب سن کر دنگ رہ گئے فرمایا "میں نے عالم رویا میں ابواحمد کو جیسا دیکھا تھا اس مادی اور کثیف دنیا میں بھی ویسا ہی دیکھ رہا ہوں۔"

سامنے سامانِ سماع موجود تھا اور قوالوں نے ابھی قوالی شروع نہیں کی تھی۔ ابواحمد نے ابواسحٰق شامی سے پوچھا:- "جناب یہ سب کیا ہے؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سارا ساز و سامان کیا ہے اور یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

ابواسحٰق شامی نے جواب دیا "یہ سامانِ سماع ہے اور ہم جس محفل میں اس وقت بیٹھے ہیں، یہاں زوردار محفلِ سماع منعقد ہونے والی ہے آپ خود سے تشریف لائے ہیں یہی بات میرے لئے موجب فخر و انبساط ہے۔"

اس کے بعد قوالوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا کلام شروع کر دیں۔ قوالوں نے ساز بجانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد حقانی کلام شروع کر دیا گیا اس کلام نے ہر کسی کو مست و بے خود کر دیا لیکن ابواحمد پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا حاضرین محفل سماع حیران تھے کہ یہ بچہ کہاں سے آ گیا اور اس کی اتنی عزت و تکریم کیوں کی جا رہی ہے؟

کسی حاسد نے ابواسحٰق شامی سے پوچھا "حضرت! کیا اس محفل میں اس بچے سے زیادہ بزرگ اور محترم کوئی اور نہیں ہے؟"

ابو اسحٰق شامی نے جواب دیا: "ہاں میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ اس محفل کا سب سے زیادہ محترم اور بزرگ یہی بچہ ہے جب اس کی شہرت اور بزرگی کا آفتاب چمکے گا تو بہتوں کے چراغ ماند پڑ جائیں گے۔"

حاسد نے غصے سے کہا: "اس طرح آپ ہم سب کی توہین کر رہے ہیں۔"

ابو اسحٰق شامی نے جواب دیا: "میں کسی کی توہین کیوں کرنے لگا میں نے تو ایک واقعہ بیان کر دیا ہے۔"

کچھ لوگ ناراض ہو کر محفل کے باہر چلے گئے ابو اسحٰق شامی نے آپ کو گود میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر فرمایا: "ابو احمد! میں علم لدنّی کو بیدار کر رہا ہوں، کیونکہ اندھی دنیا کو اس وقت تیری بزرگی اور مرتبے کا کوئی علم نہ ہو گا جب تک کہ تو اُن پر اسے ظاہر نہ کر دے گا۔"

سینے سے لگنے کے بعد جب ابو احمد جدا ہوئے تو انہیں ایسا محسوس ہوا گویا وہ علم و عرفان سے دبے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ابو احمد نے ابو اسحٰق شامی کی خدمت میں حاضری کو فرض سمجھ لیا اور جب تیرہ سال کے ہو گئے تو انہوں نے ابو اسحٰق شامی سے درخواست کی "حضرت! میں کب تک اس کا انتظار کروں گا کہ آپ مجھے اپنی مریدی میں لے لیں؟"

ابو اسحٰق شامی نے جواب دیا "ابو احمد! انتظار کس بات کا؟ تُو آج ہی میری مریدی میں آسکتا ہے۔"

چنانچہ اسی دن آپ کو ابو اسحٰق کے حلقۂ مریداں میں داخل کر لیا گیا مُرشد نے اُسی دن سے آپ کو خلوت میں بٹھا دیا اور مجاہدے اور ریاضت کی ابتدا ہو گئی۔ ابھی چالیس دن بھی نہ گزرے تھے کہ ابو احمد کے چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال و جمال نمایاں ہو گیا۔ جو بھی آپ کی طرف دیکھتا دہشت زدہ ہو جاتا اور آخر کار آپ کے چہرے سے نور سا مترشح ہونے لگا ایسا نمایاں اور واضح نور کہ اندھیرے میں اس نور کی مدد سے تلاوت بھی ممکن ہو گئی۔

ابو احمد کے باپ کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ وہ اپنی بیوی اور بہن سے جھگڑتا رہتا کہ میرے بیٹے کو حکمران ہونا چاہیئے، یہ کیا درویشی میں لگا دیا ہے۔

بہن نے جواب دیا: "وہ تو پیدائشی درویش ہے اور پیدائشی ہی کیوں بشارتی درویش۔ بھائی! آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ خدا نے آپ کو اتنا عظیم الشان فرزند عطا فرمایا۔

سلطان نے بدمزگی سے کہا "میں اسے سیر و شکار میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں لیکن تم لوگوں نے اُسے خانقاہ کی نذر کر دیا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی پوری دُنیا کو چھوڑ کر ذرا سے گوشے میں اپنا منہ چھپا لے"

بہن نے جواب دیا "بھائی! پوری دُنیا میں ایک سے ایک دنیا دار مل جائے گا اس بھری پُری دنیا میں ابواحمد جیسے انسان نہیں ملیں گے۔ آپ ابواحمد کے حال پر رحم کیجئے اور اسے سیر و شکار پر لے جانے کی کوشش نہ کیجئے"

سلطان نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ابواحمد کو آج ہی سیر و شکار میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا"

انہوں نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ابواحمد جہاں کہیں بھی ہو، اسے فوراً حاضر کیا جائے۔

ابواحمد، ابواسحٰق شامی کی خانقاہ میں تھے خدمت گار بھی وہیں پہنچ گئے اور ابواحمد کو ان کے باپ کا حکم سنا دیا۔

ابواحمد نے اپنے پیر و مرشد ابواسحٰق شامی سے پوچھا "آپ کیا فرماتے ہیں؟ میں جاؤں یا نہ جاؤں؟"

ابواسحٰق شامی نے جواب دیا "سلطان فرسناقہ تمہارا باپ ہے تمہیں اس کا یہ حکم ماننا ہی پڑے گا"

ابواحمد نے افسوس سے کہا "لیکن میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا"

مرشد نے جواب دیا "عارضی فراق میں کوئی حرج نہیں، ہم دونوں بہت جلد پھر مل جائیں گے"

ابواحمد نے پوچھا "بہت جلد کب اور کہاں؟"

مرشد نے جواب دیا "کہیں بھی یہ اپنے خدا پر چھوڑ دو"

ابواحمد مجبوراً باپ کے پاس چلے گئے سلطان اپنے بیٹے کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ انہیں گلے سے لگا لیا۔ بولا "بیٹے! تو کہاں غائب رہتا ہے؟"

ابواحمد نے ادب سے جواب دیا "میں کہاں رہتا ہوں آپ واقف ہیں اس لیے میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں۔ بہر حال میں آپ کے حکم پر حاضر ہو گیا ہوں"

سُلطان فرسناوہ نے کہا " میں تجھے حکمران دیکھنا چاہتا ہوں لیکن تو معلوم نہیں کیا بن رہا ہے بہرحال اب تو میرے ساتھ سیر و شکار کو چلا کرے گا میرا خیال ہے تو بہت جلد سیر و شکار کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں کھو جائے گا "

ابواحمد نے کراہت سے جواب دیا " ہو سکتا ہے آپ بجا فرماتے ہوں لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ میرا خمیر کسی اور ہی مٹی کا ہے میں مادی اور دنیاوی حکومت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا "

باپ نے پرامید لہجے میں کہا " تو اس کی فکر نہ کر۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر کسی شخص کو دس پانچ سال تک کے لئے گوشہ نشین کر دیا جائے تو وہ دنیا سے بےزار ہو جاتا ہے لیکن اگر اسے دس پانچ سال تک دنیا میں مشغول رکھا جائے تو وہ پھر دنیا کے لائق ہو جاتا ہے "

ابواحمد نے خاموشی اختیار کی اور باپ اُن کو اسی دن اپنے ساتھ لے کر سیر و شکار کو چلا گیا۔

شکار کے لئے جو جگہ پسند کی گئی تھی، وہ ایک کوہستانی وادی تھی سُلطان اپنے آدمیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑاتا پھر رہا تھا ابواحمد بھی ایک گھوڑے پر سوار مہمیز لگاتے پھر رہے تھے ایک بار سلطان کو ہرنوں کی ایک ڈار نظر آئی اس نے اس ڈار کے تعاقب میں گھوڑا ڈال دیا۔ ساتھ ہی سلطان کے ہمراہی بھی اپنے اپنے گھوڑے سرپٹ بھگانے لگے ابواحمد نے بھی ان سب کا ساتھ دینا چاہا لیکن نہ دے سکے اور ابھی ان کا گھوڑا کچھ ہی دور بھاگا ہو گا کہ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ آگے جانے والوں کی گرد بھی نہ پا سکیں گے پھر بھی انہوں نے اپنے والد کو تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پہاڑی سلسلوں میں گرد و غبار بھی نہیں ہوتا جس کو دیکھ کر جانے والوں کی راہ کا پتہ چلا لیا جائے۔

ابواحمد اپنے باپ اور ان کے ساتھیوں سے بچھڑ کر اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے بچھڑنے والوں کے نقش پا بھی نہیں مل رہے تھے یہ کوہستانی سلسلوں کو عبور کرتے ہوئے اوپر تک چلے گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک جگہ انہوں نے چالیس پچاس آدمیوں

کو کھڑے دیکھا۔ آپ اُن کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر انہیں پہچاننے کی کوشش کی لیکن ان کے لئے ہر چہرہ اجنبی تھا آپ نے اُن سے پوچھا "حضرات! کیا آپ میں سے کسی نے کچھ آدمیوں کو سیر و شکار میں بھاگ دوڑ کرتے دیکھا ہے؟"

ان میں سے کسی شناسا آواز نے جواب دیا "ابو احمد! ہم میں سے کسی نے بھی تیرے باپ اور اس کے ساتھیوں کو ادھر سے گزرتے نہیں دیکھا۔"

ابو احمد نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ اُن کے پیر و مرشد۔ ابو اسحٰق شامی کی آواز تھی۔ ابو احمد نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن ان کے مرشد کہیں نظر نہ آئے آپ نے بے بسی سے پوچھا "حضرت! آپ کی آواز تو سنائی دے رہی ہے لیکن آپ خود نظر کیوں نہیں آ رہے ہیں؟"

ابو اسحٰق شامی چالیس آدمیوں کے بیچ سے نمودار ہوئے بولے "ابو احمد! میں یہاں ہوں۔ بولو کیا بات ہے؟"

ابو احمد نے جواب دیا "حضرت! میں اپنے باپ سے بچھڑ گیا ہوں اور اب انہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، خدا کے لئے میری رہنمائی فرمائیے۔"

ابو اسحٰق نے کہا "میں لہو و لعب کی طرف تیری رہنمائی نہیں کر سکتا، اور اس وقت میرے یہاں آنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ تیرے باپ نے تجھے جس غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہے، میں تجھے اس سے باز رکھوں تیری وہ راہ نہیں ہے جس پر ابھی تو ذرا دیر پہلے چل پڑا تھا۔ آ میرے ساتھ چل، خانقاہ تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

ابو احمد نے عرض کیا "مجھے چلنے میں کوئی اعتراض نہیں، لیکن کیا اس طرح والد صاحب مجھ سے ناراض نہیں ہو جائیں گے۔"

ابو اسحٰق شامی نے جواب دیا "تو نے اپنے باپ کی فرماں برداری کر لی، اب معذرت کر لینا۔ بات ختم ہو جائے گی۔"

ابو احمد نے دوسرے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "حضرت یہ کون لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ اس پہاڑی پر کھڑے ہیں؟"

ابو اسحٰق شامی نے حیرت سے پوچھا "کون سے لوگ؟ وہ کہاں ہیں؟"

ابو احمد نے لوگوں کی طرف متوجہ ہونا چاہا مگر اب وہاں کوئی تھا ہی نہیں، بس

ان کے پیر و مرشد ابو اسحٰق شامی کھڑے تھے ابو احمد نے حیرت سے پوچھا " یہ سب کہاں چلے گئے ؟"

ابو اسحٰق نے جواب دیا " یہ سب رجال الغیب تھے اور میری مدد کو پہنچ گئے تھے ۔"

ابو احمد سراپا حیرت سے بولے " میں حیران ہوں کہ جس کو آنا شاندار مرشد مل جائے وہ اپنے باپ کا اس کے لہو و لعب میں ساتھ دے ! اب اس پہ لعنت ہے جو ان فضول اور بیکار مشاغل میں باپ کا ساتھ دے ۔"

ابو اسحٰق شامی نے پوچھا " اب کیا ارادے ہیں ؟"

ابو احمد نے جواب دیا " حضور میرا ارادہ دریافت فرما رہے ہیں ؟ جبکہ اب میرا ارادہ کوئی چیز ہی نہیں ۔ اب میں آپ کا تابع ہوں اور آپ جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کروں گا ۔"

ابو اسحٰق شامی نے کہا " اپنا گھوڑا ، اسلحہ اور اسی قسم کا دوسرا سامان یہیں چھوڑ دو اور یہ لو کمبل ، اسے اوڑھ کر میرے ساتھ ہو لو ۔"

ابو احمد نے اُن کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور سب کچھ وہیں چھوڑ دیا ۔ مرشد کا دیا ہوا کمبل اوڑھ کر اُن کے ساتھ چل دیے ۔

سُلطان فرسناقہ کو بڑی دیر بعد اپنے بیٹے کا خیال آیا ۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ابو احمد کو تلاش کیا جائے حکم پاتے ہی وہ لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے اور بڑی دیر بعد چند آدمیوں نے ابو احمد کا گھوڑا ، اسلحہ اور دوسرا سامان سلطان فرسناقہ کی خدمت میں پہنچا دیا اور عرض کیا " یہ سامان تو ایک جگہ سے دستیاب ہو گیا ہے لیکن خود ابو احمد کا کہیں پتہ نہیں چلا ۔ معلوم نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا ۔"

سلطان فرسناقہ نے تشویش سے کہا " ابو احمد کسی کمند میں بھی نہیں گر سکتا ۔ کیونکہ اگر وہ گرتا تو اسلحے اور سامان کے ساتھ گرتا لیکن ان چیزوں کی موجودگی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ کہیں چلا گیا ہے اور زندہ سلامت موجود ہے ۔"

خدمت گاروں نے عرض کیا " اب ہمارے لئے کیا حکم ہے ؟"

سُلطان فرسناقہ نے جواب دیا " میں گھر واپس جا رہا ہوں تم لوگ ابو احمد کی

تلاش میں نکل جاؤ اور اس وقت تک تلاش کرو جب تک اُسے کسی حال میں پا نہ لو۔"

سلطان فرناق چشت واپس گیا اور اس کے آدمیوں نے ابواحمد کی تلاش شروع کردی۔

گھر میں جب سلطان کی بہن اور بیوی کو ابواحمد کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئیں اور ان دونوں نے تقریباً ایک ہی جیسی بات کی " ابواحمد ایک شاندار ولی ہے اور یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس سے شاندار اور عظیم خانوادے وجود میں آئیں گے جب تک یہ باتیں ظاہر نہیں ہوتیں ابواحمد کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔"

سُلطان فرناق کے آدمی ایک عرصے تک ابواحمد کی جستجو میں سرگرداں رہے۔ آخر ایک پہاڑی غار میں انہیں دیکھ ہی لیا۔ یہاں وہ اپنے پیر و مرشد ابواسحٰق شامی کے ساتھ مصروف عبادت تھے۔

ان لوگوں نے ابواحمد سے کہا " حضرت! ہم تو آپ کی تلاش میں عاجز اور مایوس ہو چکے تھے آپ گھر واپس چلیے۔ آپ کی مفارقت میں آپ کے والد کا بُرا حال ہے۔"

ابواحمد نے جواب دیا " یہ جھوٹ ہے میری مفارقت کا میرے باپ پر کوئی اثر نہیں۔ اگر اُسے غم ہوتا تو آج تم سب کی جگہ میرے روبرو میرا باپ کھڑا ہوتا۔"

لوگوں نے کہا " بہر حال ہم آپ کو لینے آئے ہیں آپ ہمارے ساتھ چلیے۔"

ابواحمد نے جواب دیا " جب تک میں عبادت اور ریاضت میں ہوں، نہیں چل سکتا۔ پھر جب میرے مرشد ابواسحٰق شامی مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں گے تو میں گھر چلا جاؤں گا۔"

ان لوگوں نے بڑا اصرار کیا لیکن آپ واپسی پر تیار نہ ہوئے۔ آخر وہ واپس چلے گئے اور انہوں نے سارا حال سلطان فرناق کے گوش گزار کر دیا۔ باپ نے ابواحمد کو لانے کے لئے اپنے کئی سردار روانہ کر دیے اور انہیں تاکید کر دی کہ جس طرح بھی ممکن سمجھو ابواحمد کو لے آؤ۔

سردار بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے بڑی کوشش کی کہ ابواحمد کو گھر واپس لے آئیں لیکن وہ واپسی پر آمادہ نہ ہوئے آخر ان سرداروں کو بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔ انہوں نے سُلطان فرناق کو مطلع کر دیا کہ ابواحمد کی اس وقت

تک واپسی ناممکن ہے جب تک وہ اپنے مجاہدے اور ریاضت میں کامل نہیں ہو جاتے
سلطان فرسناقہ نے کہا "تم لوگوں نے اس کا ٹھکانہ تو دیکھ لیا ہے؟"
سرداروں نے کہا "بالکل دیکھ لیا ہے"
سلطان فرسناقہ نے کہا "اچھا پھر میں اس وقت تک کے لئے صبر کرتا ہوں جب تک کہ ابواحمد اپنے مجاہدے اور ریاضت میں کامل نہیں ہو جاتا اس کے بعد تو اس کو واپس آنا ہی پڑے گا"

ابواحمد آٹھ سال تک اپنے مرشد ابواسحٰق شامی کے ساتھ مصروفِ مجاہدہ رہے اور اس عرصے میں وہ اتنے ہو گئے کہ روشن ضمیر پیر نے انہیں خرقۂ خلافت کا مستحق مان لیا۔ ابواسحٰق شامی نے اپنا خرقۂ خلافت دے کر اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور فرمایا "ابواحمد تو میرا فرزند ہے۔ مجھے اپنے پیرانِ سلاسل سے جو نعمتیں بھی ملی تھیں وہ سب تیرے حوالے کر رہا ہوں"

اس کے بعد ابواسحٰق شامی نے ابواحمد کا ہاتھ پکڑ لیا اور قبلہ کی طرف منہ کر کے فرمایا "اے اللہ! ابواحمد پر رحم فرما اور اسے وہ مرتبہ عطا فرما جس کا تو نے وعدہ فرما رکھا ہے"

ابواحمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن یوں محسوس ہوا گویا کوئی غیبی آواز کہہ رہی تھی "ابواسحٰق شامی! میں نے ابواحمد کو اپنے مقبول بندوں میں شامل کر لیا۔ یہ میرا دوست ہے اور جو شخص اس کی صحبت اختیار کرے گا وہ بھی میرا دوست ہو گا"
ابواسحٰق شامی نے خوش ہو کر پوچھا "ابواحمد تو نے کوئی آواز سنی؟"
ابواحمد نے جواب دیا "ہاں میں نے بھی وہ آواز سنی"
ابواسحٰق شامی نے کہا "تب پھر آج سے تو بھی کاملوں میں شامل ہوا"

آپ گھر واپس آ گئے باپ نے بڑی خوشی منائی۔ پھوپھی بہت ضعیف ہو چکی تھیں انہوں نے ابواحمد کو سینے سے لگا لیا۔ ماں نے پیشانی کو بوسہ دیا۔ گھر کے در و دیوار خوشی سے روشن ہو گئے۔
کئی دن بعد آپ کی نظر ایک ایسے حصے پر پڑی جو چاروں طرف سے بند تھا

آپ نے کسی خدمت گار سے پوچھا "اس میں کیا بند ہے؟"
خدمت گار نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامنے سے ٹل گیا آپ نے دوسرے خدمت گار سے پوچھا "اس میں کیا بند ہے؟"
اس دوسرے خدمت گار نے عرض کیا "اگر حضور یہ وعدہ فرمائیں کہ میرے سچ بولنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔"
آپ نے وعدہ کیا "میں اپنے رب پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ تیرے سچ بولنے پر تجھے کوئی گزند نہیں پہنچائے گا - اب بتا اس میں کیا ہے؟"
خدمت گار نے عرض کیا "حضور یہ میخانہ ہے اس میں شراب کا ذخیرہ بند ہے۔"
ابواحمد نے حیرت سے کہا "میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں پہلے تو یہاں کوئی میخانہ نہیں تھا۔"
خدمت گار نے جواب دیا "پہلے بھی تھا لیکن یہاں نہیں تھا گھر سے دور ایک دوسرے مکان میں تھا، لیکن آپ کی غیر موجودگی میں سلطان نے اُسے میخانہ بنالیا۔"
ابواحمد نے کہا "اچھا تو یہ بات ہے لیکن میں تو اسے برداشت نہیں کر سکتا - میں اسے تباہ و برباد کر دوں گا۔"
خدمت گار نے تشویش سے کہا "اگر حضور نے ایسا کیا تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ سلطان آپ کے خلاف مزاحمت کریں گے اور اس مزاحمت سے کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔"
ابواحمد نے جواب دیا "مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں - اس میخانے کو تباہ کر کے رہوں گا۔"
یہ میخانہ ہر وقت مقفل رہتا تھا ایک دن سلطان نے کسی خدمت گار سے شراب منگوائی اور دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پینے لگا جب شراب ختم ہو گئی تو مزید کی ضرورت پیش آئی اور اسی خدمت گار کو دوبارہ شراب لینے بھیج دیا - یہ شخص شراب کے لیے جیسے ہی اندر گھسا، اس کے پیچھے ابواحمد بھی پہنچ گئے اور خدمت گار کو حکم دیا "تو باہر نکل جا۔"
خدمت گار نے خوفزدہ لہجے میں کہا "مجھ سے سلطان نے شراب منگوائی ہے میں شراب لینے آیا ہوں۔"

آپ نے سختی سے کہا "سلطان سے کہہ دے کہ میں نے میخانہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب اس کو تباہ و برباد کر کے ہی دم لوں گا"۔

خدمت گار کو مارے ڈر کے واپس چلا گیا اور آپ نے اندر سے میخانہ کا دروازہ بند کر لیا سلطان کو اس واقعے کا جوں ہی علم ہوا، وہ بھاگا بھاگا میخانے کے در پر آیا اور بلند سے دروازہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "ابو احمد! دروازہ کھولو۔ یہ تم اندر کیا کر رہے ہو؟"

ابو احمد نے جواب دیا "والد محترم! دروازہ نہیں کھلے گا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس میخانے کو تباہ و برباد کر کے ہی باہر نکلوں گا"۔

سُلطان نے غصّے سے کہا "لیکن میں تمہاری اس حرکت کو برداشت نہیں کروں گا تمہیں میری ذات سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے"۔

ابو احمد نے جواب دیا "آپ کے ارادوں میں جب تک مشیت ایزدی شامل نہ ہو آپ کسی کو نہ تو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، میں ان نوں سے نہیں ڈرتا"۔

سُلطان نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور بہت ہی غصّے سے کہا "دروازہ کھولو"

ابو احمد نے جواب دیا "میں نے ایک بار کہہ دیا کہ دروازہ اس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک پوری شراب زمین پر انڈیل نہ دی جائے"۔

باپ نے کہا "تو اپنے باپ کی عدول حکمی کر رہا ہے"۔

ابو احمد نے جواب دیا "لیکن میں اپنے رب کی فرماں برداری کر رہا ہوں"۔

باپ نے غصّے سے کہا "اگر تو سیدھی طرح دروازہ نہیں کھولے گا تو مجھے دوسرا طریقہ بھی آتا ہے"۔

ابو احمد نے پوچھا "وہ کونسا طریقہ ہے؟"

باپ نے جواب دیا "میں وہ طریقہ ابھی بتاتا ہوں"

اس کے بعد سلطان کئی بڑے بڑے پتھر لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ ابو احمد نے شراب لڑھکانا شروع کر دی وہ ہاتھوں سے اور ٹھوکروں سے شراب کے مٹکے توڑنے میں مشغول تھے شراب کی تیز بو چاروں طرف پھیل گئی۔ باپ کو غصّہ جو آیا تو ایک پتھر روشن دان کی راہ سے ابو احمد کے سر پر مارا۔ سُلطان کا خیال تھا کہ یہی ایک پتھر ابو احمد کو بے ہوش کر کے گرا دے گا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پتھر ہوا میں معلق ہو گیا۔ سُلطان کے حواس ہی

جاتے رہے وہ دوسرا سپھر نہیں مار سکا۔ ابو احمد کسی خوف یا لحاظ کے بغیر شراب کو انڈیلتے لڑھکاتے رہے اور کچھ ہی دیر میں ساری شراب زمین پر گرا دی اور میخانے سے باہر نکل آئے۔
حیران اور پریشان سلطان چھت سے نیچے اترا اور کمزور آواز میں بیٹے کو پکارا۔
"ابو احمد! ذرا ٹھہرنا تو۔"
ابو احمد ٹھہر گئے۔ اداس اور نادم باپ اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا ولی بیٹے کے پاس پہنچا آہستہ سے پوچھا "بیٹے! یہ تو نے کیا کر دیا؟"
ابو احمد نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا، آپ اچھی طرح واقف ہیں۔"
باپ نے پوچھا "کیا یہ تو نے جو کچھ کیا اچھا کیا ہے؟"
ابو احمد نے جواب دیا "آپ یہ سوال مجھ سے نہیں اپنے ضمیر سے کیجئے اپنے رب سے کیجئے۔"
باپ بیٹے سے نظریں نہیں ملا رہا تھا ندامت سے کہا "میں تجھے اپنا بیٹا تو سمجھتا تھا لیکن اس پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ تو ولی ہے۔"
ابو احمد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔
باپ نے جھک کر بیٹے کے پاؤں پکڑنا چاہے لیکن ابو احمد نے باپ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور عاجزی سے کہا "والد محترم! آپ مجھے گنہگار نہ کیجئے۔"
باپ کی آنکھوں سے چشمہ ابل پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا "ابو احمد! میں بہت گنہگار ہوں اور اس پر مزید یہ ستم کہ میں نے تجھے نہیں پہچانا۔"
ابو احمد نے جواب دیا "میں آپ کا بیٹا ہوں اور کچھ نہیں۔"
باپ نے کہا "اچھا اپنے ہاتھ لا۔ میں تیرے ہاتھوں پر شراب نوشی سے توبہ کرنا چاہتا ہوں۔"
ابو احمد نے اپنے دونوں ہاتھ باپ کی طرف بڑھا دیے اور باپ نے الحاح و زاری سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر شراب نوشی سے توبہ کی اور یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ شراب کو ہاتھ تک نہ لگائے گا۔

باپ نے توبہ کی اور عزلت نشینی اختیار کی۔ آپ کے ماموں امیر نصیر ملک کا اقتدار بڑھا

اور ساری امارت گویا ماموں کی طرف منتقل ہوگئی ۔ آپ کو سماع سے بڑی رغبت تھی اور جب سماع سنتے تو اُن کی حالت کچھ عجیب ہو جاتی ۔ علمائے عصر اس کو بدعت سمجھتے انہوں نے آپ کے ماموں سے شکایت کی اور کہا "حضور والا! آپ اپنے بھانجے کو اس بدعت سے روکیئے ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے"

نصیر ملک نے جواب دیا "میرا بھانجہ ابو احمد بھی کوئی معمولی انسان نہیں ہے یہ فیصلہ کون کرے گا کہ حق پر تم لوگ ہو یا میرا بھانجہ ابو احمد؟"

علماء نے کہا "ہم اسے اپنے علم سے قائل کر دیں گے اور وہ خود ہی کہہ دے گا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بدعت میں داخل ہے"

نصیر ملک نے پوچھا "اگر تم لوگ یہ ثابت نہ کر سکے تو؟"

ایک عالم نے جواب دیا "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہمیں اپنی علمیت کا اندازہ ہے ہم ابو احمد کو لاجواب کر دیں گے"

نصیر ملک نے کہا "بہتر ہے میں ابو احمد کو بلواتا ہوں تم لوگ بھی علمائے مناظرہ کو تیار کر لو ۔ پھر میں دیکھتا ہوں کون کس کو قائل کرتا ہے"

نصیر ملک نے اسی دن ابو احمد کو ایک خط لکھا ۔

"پیارے بھانجے ابو احمد! مجھے تیری علمیت اور بزرگی کا بھی اعتراف ہے اور احترام بھی، لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے تنگ نظر عالم تیرے مقام اور مرتبے سے واقف نہیں ہیں اور تیرے اقوال اور افعال پر معترض ہیں وہ تیرے ذوقِ سماع کو بدعت سمجھتے ہیں میں ان کی شکایات اور اعتراضات سے عاجز آچکا ہوں اور انہیں ہمیشہ کے چپ کرا دینے کی یہ ترکیب سوچی ہے کہ تو میرے پاس آجا ۔ دوسری طرف سے علمائے کرام بھی آجائیں گے پھر تم دونوں آپس میں مناظرہ کر کے اپنے اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرو گے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہی وہ واحد طریقہ ہے جو تیرے مخالفوں کی زبان بند کر سکتا ہے میں تیرا انتظار کر رہا ہوں"

ماموں کا خط پڑھتے ہی ابو احمد نے سفر کی تیاری شروع کر دی ۔ انہوں نے اپنے خادم محمدؒ خدابندہ کو بھی ساتھ لے لیا ۔ محمدؒ خدابندہ سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص سے زیادہ نہیں پڑھا تھا ۔

جب علماء کو یہ معلوم ہوا کہ ابواحمد مناظرے کی غرض سے تشریف لا رہے ہیں تو انہوں نے نصیر ملک سے التجا کی "وجناب والا! ابواحمد اور آپ کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ماموں، بھانجے ہیں دوسرے یہ ہے کہ عوام الناس پر اُن کی بزرگی اور ولایت کا بھی بڑا رعب ہے ہم سب ان باتوں کے پیش نظر یہ چاہتے ہیں کہ ابواحمد کا استقبال نہ کیا جائے کیونکہ اگر ان کا استقبال کیا گیا تو بیشتر علمائے کرام پر ان کا رعب طاری ہو جائے گا اور وہ آزادی سے مناظرہ نہیں کر سکیں گے"۔

امیر نصیر نے وعدہ کر لیا کہ ان کا استقبال نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ابواحمد جیسے ہی شاہی محل کے دروازے تک پہنچے امیر نصیر خود کو قابو میں نہ رکھ سکا وہ بے اختیار محل سے باہر نکلا اور ابواحمد کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگایا پھر انہیں عزت و تکریم سے اپنی مجلس میں لے گیا وہیں علما کو بھی طلب کر لیا گیا۔

امیر نصیر نے علما سے پوچھا "کیا آپ لوگوں نے مناظرے کی تیاری کر لی ہے"۔

علمائے نے جواب دیا "ہاں اور ہمارا خیال ہے ابواحمد بھی تیاری کر کے ہی آئے ہوں گے"۔

ابواحمد نے بے نیازی سے جواب دیا "میں نے کوئی تیاری نہیں کی پھر بھی تمہارے سوالوں کے جوابات میرا یہ خادم محمدؐ خدابندہ دے گا، میری ضرورت ہی نہیں رہے گی"۔

علما ہکا بکا رہ گئے انہوں نے خادم محمدؐ خدابندہ کی طرف دیکھا۔ ابواحمد کی بات ان کی سمجھ میں یوں نہیں آئی کہ خادم خدابندہ صورت و شکل سے اَن پڑھ معلوم ہوتا تھا ایک عالم نے حیرت سے سوال کیا "یعنی آپ کی بجائے یہ اَن پڑھ شخص ہم سے مناظرہ کرے گا؟"

ابواحمد نے جواب دیا "ہاں یہی شخص تم سب کے لیے کافی ہے"۔

علما یہ سمجھے "شاید آپ مناظرے سے بچنا چاہتے ہیں اسے علما نے اپنی توہین سمجھا ایک عالم نے کہا "ابواحمد! یہ تو ہم سب پہ بڑا ظلم ہے کہ ہم تم سے مناظرہ کرنے آئے تھے اور تم اپنے خادم محمدؐ خدابندہ سے بھڑا رہے ہو"۔

ابواحمد نے جواب دیا "اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ محمدؐ خدابندہ تمہارے سوالوں کے جوابات نہیں دے پا رہا ہے تو مناظرے میں میں بھی شریک ہو جاؤں گا"۔

علما نے اپنی دانست میں مشکل ترین سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ قرآنی آیات زیر بحث لائی گئیں ان کے معانی و مطالب اور تفسیر پوچھی گئی الٰہیات پر سوال ہوئے تصوف

کے پیچیدہ مسائل زیر بحث آئے۔ ادھر محمد خدابندہ کا یہ حال تھا کہ علمائے کرام کے ہر سوال کا مدلل جواب اس کے پاس موجود تھا۔ وہ علما کے روبرو اس طرح بول رہا تھا گویا وہ سب طفل مکتب تھے اور محمد خدابندہ انہیں درس دینے پر مامور کیا گیا تھا

امیر نصیر یہ کیفیت دیکھ کر مبہوت تھا وہ علمائے کے سوالات گنتا رہا تھا چند گھنٹوں میں اسّی سوالات کئے گئے اور محمد خدابندہ نے ان کے تشفی بخش جوابات دے کر علماء کو شرمندہ اور خاموش کر دیا۔

ابواحمد نے پوچھا "علمائے کرام! آپ کوئی سوال کریں گے یا سارے سوالات ختم ہو چکے ہیں؟"

کئی علماء نے یک آواز میں جواب دیا "ہم سوالوں کا سلسلہ ختم کرتے ہیں اور اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم سب مل کر بھی محمد خدابندہ کے علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

ابواحمد نے پوچھا "آپ لوگ تو مطمئن ہو گئے اب میرے خادم محمد خدابندہ کو اجازت دیجئے کہ آپ سے چند سوالات کرے"۔

کئی علماء ایک ساتھ بولے "ہم تیار ہیں اور محمد خدابندہ کو اجازت ہے کہ سوالات کرے"

ابواحمد نے محمد خدابندہ کی طرف دیکھا اور حکم دیا "تو بھی چند سوالات کر لے"

خدابندہ نے کہا "بہتر ہے" پھر علماء سے کہا "حضرات! میرے سوالوں کے جواب دینے کے لئے تیار ہو جائیں"

کئی علماء نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا "ہم تیار ہیں"

محمد خدابندہ نے پوچھا "حضرات! میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار سوال نہیں کروں گا لوگ کہتے ہیں کہ نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نیند میں واقعی لذت ہوتی ہے؟"

ایک عالم اس طرح مسکرایا گویا وہ اس بچکانہ سوال پر طنزاً ہنس رہا ہو، بولا "یہ بھی کوئی سوال ہے بھلا"

خدابندہ نے جواب دیا "حضرات میرا سوال کتنا ہی معمولی اور حقیر سہی لیکن آپ اسے حقیر کہہ کر رد تو نہیں کر سکتے۔ مجھے میرے سوال کا جواب ضرور دیا جائے۔"

ایک دوسرے عالم نے مسکرا کر کہا " ہاں تو تو نے کیا سوال کیا تھا؟ ذرا اسے دہرانا تو سہی!"

محمد خدابندہ نے اپنا سوال پھر دہرایا " لوگ کہتے ہیں نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے کیا نیند میں واقعی لذت ہوتی ہے؟"

ایک عالم نے جواب دیا " ہاں نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے"

محمد خدابندہ نے پوچھا " اس لذت سے انسان کب لطف اندوز ہوتا ہے؟ یعنی اس کا مزہ کب چکھتا ہے سونے سے پہلے یا سونے کے بعد؟"

اس سوال نے سبھی کو چکرا دیا۔ ایک نے جواب دیا " سونے سے پہلے"

محمد خدابندہ نے ہنس کر کہا " کیا کسی چیز کی لذت کا احساس کھانے سے پہلے ہی کیا جاسکتا ہے میرا مطلب ہے آدمی کوئی چیز کھائے بغیر ہی اس کی لذت کا مزہ کس طرح حاصل کرسکتا ہے"

دوسرے عالم نے گھبرا کر جواب دیا " سونے کے بعد"

محمد خدابندہ نے کہا " یہ بھی ناممکن ہے جب ایک چیز حلق سے نیچے اتر جائے تو ساتھ ہی اُس کا مزہ بھی زائل ہو جاتا ہے جب نیند جاتی رہی تو اس کا مزہ کہاں باقی رہا"

علما اور زیادہ چکرا گئے کسی تیسرے عالم نے جواب دیا " نیند کی لذت آدمی سوتے میں محسوس کر لیتا ہے"

محمد خدابندہ نے جواب دیا " یہ بھی غلط ہے عالم مدہوشی میں کسی چیز کی لذت محسوس کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

اب سارے عالم بے بس اور لاجواب ہو چکے تھے۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سادا معمولی سوال تھا جس نے سب کو گونگا اور لاجواب کر دیا تھا۔

امیر نصیر کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا۔ اس نے بے بس علماء سے پوچھا " حضرات آپ کا کیا خیال ہے؟ محمد خدابندہ جو ابو احمد کا معمولی پڑھا لکھا خادم ہے اس نے تمہارے سوالوں کے مدلل جوابات دیے لیکن تم اُس کے ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکے کہاں اسّی سوال اور کہاں ایک سوال۔ اب تم سب ابو احمد کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

سب سے جید عالم نے جواب دیا " جناب امیر! ہم سب خطا کار اور قصور وار ہیں

ابو احمد کو علم لدنی حاصل ہے علم لدنی کا علم اکتسابی مقابلہ نہیں کرسکتا، ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب ہم لوگ ابو احمد کے خادم محمد خدابندہ کا مقابلہ نہیں کرسکے تو ان کا کیا مقابلہ کریں گے؟ ابو احمد سے مباحثہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"

اس کے بعد علماء نے اپنے عمامے اپنی گردنوں میں ڈالے اور ابو احمد کے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھ گئے اور درخواست کی یہ حضرت! ہم اپنی نادانی پر شرمندہ ہیں آپ ہمیں بھی اپنے ارادت مندوں میں شامل فرمالیں۔"

آپ نے جواب دیا یہ کوئی مضائقہ نہیں، بس میری ایک نصیحت پر زندگی بھر کاربند رہنا۔ وہ یہ کہ کسی بھی انسان کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا اور دل آزاری کے عذاب سے بچتے رہنا۔"

امیر نصیر بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ "ابو احمد! گو رشتے میں، میں تم سے بڑا ہوں لیکن باقی تمام باتوں میں تم افضل اور بزرگ ہو۔ بخدا مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تم کو مناظرے کے لئے زحمت دیتا۔ لیکن علمائے کرام کے مجبور کرنے پر میں نے یہ گستاخی کی۔ اب جبکہ تم کامیاب ہو چکے ہو، میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔"

ابو احمد نے جواب دیا۔ "مناظرہ تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ میں اس میں کسی قسم کی شرمندگی یا عار محسوس کرتا، لیکن ایک ایسا مناظرہ جس میں عالموں کی ایک جماعت پہلے ہی سے یہ طے کرلے کہ اپنے حریف یا فریق کو ذلیل و خوار کرے گی میری اپنی نظر میں گناہ ہے کیونکہ اس میں انسان کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے۔"

امیر نصیر نے آپ کی خدمت میں بڑے بڑے تحفے پیش کئے لیکن آپ نے انہیں قبول نہیں کیا۔

اس واقعے کا اتنا شہرہ ہوا کہ چاروں طرف سے لوگ جوق در جوق حاضریاں دینے لگے اور ہزاروں آدمیوں نے آپ کے حلقہ ارادت مندی میں شمولیت کا شرف حاصل کیا۔

***

آپ سیر و سیاحت کے لئے چلے تو آپ کے ارادت مندوں نے ایک منزل تک آپ کا ساتھ دیا، لیکن ان میں سے اُناسی ایسے ارادت مند تھے جو ایک منزل سے آگے تک آپ کے ساتھ رہے جب یہ لوگ دریائے دجلہ کے کنارے پہنچے تو وہاں کشتی کا دُور دُور تک نام و نشان نظر نہ آیا۔ آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا، یہاں کشتی کا

دُور دُور تک پتہ نہیں، اس لئے اب تم لوگ واپس جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو "

ارادت مندوں نے عرض کیا "حضرت! ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو دَجلہ کے اس پار پہنچا کر واپس ہوں گے "

آپ نے لاپرواہی سے کہا " چلو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن کشتی کا تو کہیں پتہ نہیں "

کچھ دیر تک تو وہ لوگ چپ چاپ کھڑے رہے آخر آپ نے کہا " ہم لوگ کشتی کے انتظار میں کب تک کھڑے رہیں گے آؤ ہم لوگ کشتی کے بغیر ہی دجلہ عبور کریں "

لوگوں نے پوچھا " وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا " آؤ ہم سب حلقہ بنا کر ذکرالٰہی میں مشغول ہو جائیں اور آہستہ آہستہ دجلہ کی طرف بڑھیں اللہ نے چاہا تو اس سے ہماری مشکل حل ہو جائے گی "

لوگوں نے آپ کی اتباع کی اور وہ سب حلقہ بنا کر اللہ اللہ کرنے لگے آپ اُن کو لے کر دجلہ میں اُتر گئے پانی کو دیکھ کر ان کے ارادت مندوں نے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب کچھ دیر بعد آپ نے انہیں حکم دیا " کہ اپنی آنکھیں کھول دو " تو وہ حیران رہ گئے وہ دجلہ کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے اور اُن کے پاؤں تک خشک تھے۔

اس منظر کو دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے چوبیس کفّار بھی دیکھ رہے تھے وہ سب آپ کی خدمت میں پہنچے اور پوچھا " حضرت! آپ کی تعریف؟"

ایک ارادت مند نے جواب دیا " ابو احمد چشتی - کیا تم لوگ اتنے ہی کور اور نابینا ہو کہ انہیں پہچانتے ہی نہیں؟"

ان میں سے دو نے ایک ساتھ جواب دیا " یارو! ہم نہ مسلمان ہیں نہ عیسائی نہ یہودی ہم سب بت پرست ہیں اور ان حضرت کو تم سب کے ساتھ کشتی کے بغیر دَجلہ سے پار اترتے جو دیکھا تو حیران ہو رہے ہیں ہم سب مسلمان ہونا چاہتے ہیں "

ابو احمد کفّار کی طرف بڑھے اور فرمایا " سبحان اللہ، نیک کام میں دیر کیوں؟ خدا تمہیں مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرمائے " اس کے بعد آپ نے ان سب کو مسلمان کر لیا۔

دوران سفر آپ کا گذر ایک ایسی بستی کے پاس سے ہوا کہ مسلمان اس بستی کے

سامنے تک سے خوفزدہ رہتے تھے شام کا وقت تھا اور اس بستی میں دیے ٹمٹمانے لگے تھے آپ نے سوچا اس بستی میں داخل ہو کر رات یہیں گزاروں گا ، صبح دیکھا جائے گا ابھی آپ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کوئی شخص پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور آپ کا دامن پکڑ لیا - آپ نے گھوم کر دیکھا ایک بوڑھا شخص آپ کا دامن پکڑے گھسیٹ رہا تھا -

آپ نے پوچھا " تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے ؟"

بوڑھے نے جواب دیا " میں ایک مسلمان ہوں اور شاید آپ بھی مسلمان ہیں "

ابو احمد نے جواب دیا " ہاں ، بحمداللہ کہ میں مسلمان ہوں "

بوڑھے نے عرض کیا " حضرت ! میں آپ کی ہمدردی میں بڑی دور سے بھاگا چلا آرہا ہوں یہ سامنے کی بستی ، جس میں دیے ٹمٹمانے لگے ہیں کافروں کی بستی ہے یہ بڑے ظالم اور سنگ دل کافر ہیں انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے اتنی نفرت کہ جب یہ کسی مسلمان کو پکڑ لیتے ہیں تو پہلے تو اس پر خوب ظلم کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ان کے ظلم و جور کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان کے ظلم و جور سے نہیں مرتا تو وہ اس مسلمان کو آگ میں ڈال کر مار دیتے ہیں "

ابو احمد نے پوچھا " آخر تو مجھ سے کہنا کیا چاہتا ہے ؟"

بوڑھے نے جواب دیا " میں یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ ادھر کا رخ نہ کریں اور اس بستی کے کنارے سے کہیں اور چلے جائیں "

آپ نے کہا " لیکن میں مجبور ہوں - میں کفار سے نہیں ڈرتا میں تو یہ رات اسی بستی میں گزاروں گا "

بوڑھے نے عاجزی سے کہا " آپ نادانی نہ کریں میرا کہنا مانیں - میں نے آج تک کسی مسلمان کو اس بستی میں داخل ہو کر باہر نکلتے نہیں دیکھا اگر آپ اتنے ہی بضد ہیں ، تب پھر آپ اپنا لباس ضرور بدل دیجئے اور یہ کہ ان کفار جیسا ہی لباس پہن لیں - اس طرح آپ انہی جیسے ہو جائیں گے اور وہ آپ سے تعرض نہیں کریں گے "

آپ نے جواب دیا " اے شخص ! خدا نے مجھے اسلام کا لباس پہنایا ہے میں کفار کے ڈر سے یہ لباس کیوں اتار دوں ؟"

بوڑھا بے بس ہو گیا - بولا " حضرت ! میں آپ کو نہ تو مطمئن کر سکتا ہوں نہ اس پر

مجبور کر سکتا ہوں کہ آپ میری بات مان لیں ۔ اس لئے جو مناسب سمجھیں کریں ۔ میں واپس جاتا ہوں ۔"

بوڑھا واپس چلا گیا ۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس بستی میں قدم رکھ دیا ۔ آپ کے لباس کو دیکھ کر کفار آپ پر ٹوٹ پڑے اور " مسلمان ہے مسلمان " کہہ کر اپنے نرغے میں لے لیا ۔

وہ لوگ آپ کو پکڑ کر ایک بہت بڑے احاطے میں لے گئے اور پوری بستی میں یہ اعلان کر دیا ۔ کہ خوش قسمتی سے ایک مسلمان ہاتھ آ گیا ہے کل صبح اس کی درگت بنائی جائے گی اس لئے جس جس کو یہ دلچسپ اور مزیدار تماشا دیکھنا ہو ، اس احاطے میں آ جائیں ۔

دوسرے دن علی الصبح پوری بستی اسی احاطے میں جمع ہو گئی کفار کے دو پروہت آگے بڑھے اور انہوں نے بستی والوں کی موجودگی میں باآواز بلند پوچھا ۔ " اے شخص کیا تو مسلمان ہے ؟"

آپ نے جواب دیا " ہاں میں مسلمان ہوں اور اپنے مسلمان ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں "

ایک پروہت نے کہا " اگر تو مسلمان ہے اور تجھے اپنے مسلمان ہونے کا غرور ہے تو میں بھی تجھے یہ بتاتا ہوں کہ اس بستی سے ایک مسلمان بھی صحیح سلامت بچ کر نہیں گیا ہے ہم تجھے بھی تیرے مسلمان ہونے کی سزا دیں گے ۔"

آپ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا " لیکن اے نامعقول پروہت ! کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ سزا اور جزا تیرے یا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تو یا کوئی اور مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچائے ۔"

پروہت نے حقارت سے کہا " ایسی باتیں کئی اور مسلمان بھی کر چکے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ہم میں موجود نہیں ۔"

آپ نے جواب دیا " تب پھر جو کچھ کرنا ہے کر کے دیکھ لے میں تیری اور تیری قوم کی طاقت اور اختیار کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔"

پروہت نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ باری باری آگے بڑھیں اور اس مسلمان پر

تھوکیں۔ اس کی قوم نے اس پر عمل کیا ، لیکن جس نے بھی تھوکنا چاہا اس کا تھوک خود اس کے اپنے منہ پر آن گرا۔ لوگ حیرت زدہ اور شرمندہ ہو کر تھوکنے سے باز آ گئے۔

پروہت نے جھنجھلا کر حکم دیا "اس پر ڈنڈے برسائے جائیں۔ تھوک کا کیا ہے وہ ہوا سے اڑ کر بھی منہ پر آ سکتا ہے۔"

کئی آدمی موٹے موٹے ڈنڈے لے کر آپ کی طرف بڑھے اور آپ پر وار کیا ڈنڈے آپ سے بالشت سوا بالشت دور رہ کر اس طرح واپس ہو جاتے گویا کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر واپس کر دیا ہو۔ واپسی میں یہ ڈنڈے اسی شخص کی پیشانی یا سر سے ٹکرا کر اسے لہولہان کر دیتے۔

جیسے جیسے وار خالی جا رہے تھے پروہت کا غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پروہت نے ایک ڈنڈا خود لیا اور آپ کے سر پر ضرب لگائی لیکن وہ ڈنڈا بھی واپس ہوا اور اُلٹے پروہت کو لہولہان کر دیا۔

دوسرا پروہت ابھی تک کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے زخمی پروہت کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔ بولا "تو بھی کیسی بے عقلی کی بات کر رہا ہے یہ شخص مجھے جادوگر معلوم ہوتا ہے اور اس کے جادو کا میرے پاس ایک توڑ موجود ہے۔"

زخمی پروہت کا سر چکرا رہا تھا۔ کراہتے ہوئے پوچھا "یقیناً یہ شخص جادوگر ہے اب جادو کا توڑ بتا تا کہ اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔"

دوسرے پروہت نے اسے سمجھایا وہ آگ جادو ٹونے کو ختم کر دیتی ہے بہتر یہ ہے کہ یہاں ایک بہت بڑا الاؤ جلایا جائے اور جب منوں لکڑی سے آتش کدہ تیار ہو جائے تو اس شخص کو اس میں جھونک دیا جائے اس طرح نہ تو یہ شخص بچے گا اور نہ ہی اس کا جادو اثر دکھائے گا۔"

زخمی پروہت کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔

دونوں پروہتوں نے بستی والوں کو حکم دیا کہ منوں لکڑی کا انتظام کیا جائے پوری بستی لکڑیاں جمع کرنے میں مشغول ہو گئی آخر شام کے ہوتے ہوتے آدھا احاطہ لکڑی سے بھر گیا اس لکڑی پر چربی ڈالی گئی اور چربی کو آگ لگا دی گئی بستی والوں نے احاطہ خالی کر دیا کیونکہ شعلوں کی لپیٹ میں وہاں کھڑا ہونا محال تھا وہ لوگ درختوں

اور مکانوں پر چڑھ گئے اور ایک مسلمان کے زندہ جلائے جانے کا منظر دیکھنے کے لئے بے چین نظر آنے لگے۔

جب شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو دونوں پروہتوں نے آپ کو احاطے کی دیوار پر بٹھا دیا اور پوچھا "کہو اب تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "کیسا لگ رہا ہے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ آگ جل رہی ہے شعلے اٹھ رہے ہیں اس کی تپش سے در و دیوار تپ رہے ہیں اس کے سوا اور کیا لگے گا؟"

پروہت آپ کے جواب سے بہت خوش ہوئے کیونکہ اس سوال سے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اگر یہ جادوگر ہیں تو کیا اس آگ نے ان کے جادو کا اثر زائل کر دیا جب آپ نے یہ بتایا کہ آگ کی تپش سے در و دیوار تپ رہے ہیں تو دونوں پروہت بہت خوش ہوئے۔

ان پروہتوں نے آپ کو شعلوں میں دھکیل دیا۔ آپ آگ میں گر گئے اور بستی والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابو احمد آگ میں جس جگہ گر رہے تھے وہ حصہ سرد پڑ چکا تھا اور آس پاس کے شعلے ابو احمد سے دور بھاگ رہے تھے۔

آپ نے اسی جگہ، جہاں گرے تھے مصلّٰی بچھا دیا اور نماز پڑھنے لگے۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ نے پروہتوں سے پوچھا "کیا خیال ہے؟ اب تو میں نکل سکتا ہوں تمہاری آگ مجھے جلانے سے انکار کر رہی ہے"

پروہتوں کی زبان گنگ ہو چکی تھی ان سے بولا نہیں جا رہا تھا بستی والوں پر ابو احمد کا رعب طاری ہو گیا تھا ابو احمد جیسے ہی باہر نکلے پوری بستی نے والہانہ آپ کو گھیر لیا۔ وہ شور کر رہے تھے "یہ شخص باکمال ہے سچا ہے، آگ نے اسے جلانے سے انکار کر دیا ہے اس لئے ہم اس کا دین اختیار کریں گے"

پروہتوں نے انہیں سمجھایا "یہ شخص جادوگر ہے، لوگو! ذرا صبر کرو۔ اس کا دین اتنی جلدی نہ اختیار کرو"

لیکن لوگوں نے اپنے پروہتوں کی ایک نہ سنی اور آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔

دونوں پروہتوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم کے لوگ ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے وہ خود اپنے دل میں بھی ابو احمد کی سچائی اور عظمت کا اعتراف

کر رہے تھے لہٰذا انہوں نے آپ سے درخواست کی "حضرت! ہم دونوں نے آپ کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اب ہمیں بھی مسلمان کر لیجئے اور ہماری قوم کو، جو اب مسلمان ہو چکی ہے ہدایت کر دیجئے کہ بدستور ہمیں بڑا مانتی رہے"۔

آپ نے جواب دیا "میں تم دونوں کو پہلے اسلامی تعلیم دوں گا اس کے بعد تم دونوں بستی کو تعلیم دینا۔ اسی طرح تم دونوں خود بخود بڑے ہو جاؤ گے"۔

آپ نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا اور اس بستی کو دونوں دین دار پروہتوں کے حوالے کر کے آگے بڑھ گئے۔

ایک عرصے بعد جب آپ وطن واپس پہنچے تو بڑھاپا آچکا تھا۔ یہاں اس بستی کے سو آدمی آپ کا انتظار کر رہے تھے ان سو آدمیوں نے آپ کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ اب تک دس ہزار افراد کو مسلمان کر چکے ہیں آپ بہت خوش ہوئے اور ان پر اتنی توجہ دی کہ ان میں سے بعض نے شیخ کامل کا مقام حاصل کیا۔

آپ نے جمادی الثانی ۳۵۵ھ میں وصال فرمایا اور جیسا کہ ابو اسحٰق شامی نے آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ یہ لڑکا ایک بہت بزرگ اور خانوادے کا بانی ہو گا ان کی یہ بشارت حرف بہ حرف پوری اُتری۔ بعد میں مشہور زمانہ خانوادہ، سلسلہ چشتیہ، انہی سے پھیلا اور اس خانوادے کی شعاعیں عرب، ایران، افغانستان، ماوراء النہر اور ہندوستان اور پاکستان میں قیامت تک پھیلتی رہیں گی۔



تلاش میں نکل جاؤ اور اس وقت تک تلاش کرو جب تک اُسے کسی حال میں پا نہ لو۔"

سلطان فرسافہ چشت واپس گیا اور اس کے آدمیوں نے ابو احمد کی تلاش شروع کر دی۔

گھر میں جب سلطان کی بہن اور بیوی کو ابو احمد کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئیں اور ان دونوں نے تقریباً ایک ہی جیسی بات کی: "ابو احمد ایک شاندار ولی ہے اور یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس سے شاندار اور عظیم خانوادے وجود میں آئیں گے جب تک یہ باتیں ظاہر نہیں ہوتیں ابو احمد کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔"

سُلطان فرسافہ کے آدمی ایک عرصے تک ابو احمد کی جُستجو میں سرگرداں رہے۔ آخر ایک پہاڑی غار میں انہیں دیکھ ہی لیا۔ یہاں وہ اپنے پیر و مرشد ابو اسحٰق شامی کے ساتھ مصروف عبادت تھے۔

ان لوگوں نے ابو احمد سے کہا "حضرت! ہم تو آپ کی تلاش میں عاجز اور مایوس ہو چکے تھے آپ گھر واپس چلیے۔ آپ کی مُفارقت میں آپ کے والد کا بُرا حال ہے۔"

ابو احمد نے جواب دیا: "یہ جھوٹ ہے میری مفارقت کا میرے باپ پر کوئی اثر نہیں۔ اگر اُسے غم ہوتا تو آج تم سب کی جگہ میرے روبرو میرا باپ کھڑا ہوتا۔"

لوگوں نے کہا: "بہر حال ہم آپ کو لینے آئے ہیں آپ ہمارے ساتھ چلیے۔"

ابو احمد نے جواب دیا: "جب تک میں عبادت اور ریاضت میں ہوں، نہیں چل سکتا۔ پھر جب میرے مرشد ابو اسحٰق شامی مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں گے تو میں گھر چلا جاؤں گا۔"

ان لوگوں نے بڑا اصرار کیا لیکن آپ واپسی پر تیار نہ ہوئے۔ آخر وہ واپس چلے گئے اور انہوں نے سارا حال سلطان فرسافہ کے گوش گزار کر دیا۔ باپ نے ابو احمد کو لانے کے لئے اپنے کئی سردار روانہ کر دیے اور انہیں تاکید کر دی کہ جس طرح بھی ممکن سمجھو ابو احمد کو لے آؤ۔

سردار بھی ان کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے بڑی کوشش کی کہ ابو احمد کو گھر واپس لے آئیں لیکن وہ واپسی پر آمادہ نہ ہوئے آخر ان سرداروں کو بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔ انہوں نے سُلطان فرسافہ کو مطلع کر دیا کہ ابو احمد کی اس وقت

تک واپسی ناممکن ہے جب تک وہ اپنے مجاہدے اور ریاضت میں کامل نہیں ہو جاتے
سلطان فرساقہ نے کہا "تم لوگوں نے اس کا ٹھکانہ تو دیکھ لیا ہے؟"
سرداروں نے کہا "بالکل دیکھ لیا ہے"
سلطان فرساقہ نے کہا "اچھا پھر میں اس وقت تک کے لئے صبر کرتا ہوں جب تک کہ ابو احمد اپنے مجاہدے اور ریاضت میں کامل نہیں ہو جاتا اس کے بعد تو اس کو واپس آنا ہی پڑے گا"

ابو احمد آٹھ سال تک اپنے مرشد ابو اسحٰق شامی کے ساتھ مصروفِ مجاہدہ رہے اور اس عرصے میں وہ اتنے ہو گئے کہ روشن ضمیر پیر نے انہیں خرقۂ خلافت کا مستحق مان لیا۔ ابو اسحٰق شامی نے اپنا خرقۂ خلافت دے کر اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور فرمایا "ابو احمد تو میرا فرزند ہے۔ مجھے اپنے پیرانِ سلاسل سے جو نعمتیں بھی ملی تھیں وہ سب تیرے حوالے کر رہا ہوں"

اس کے بعد ابو اسحٰق شامی نے ابو احمد کا ہاتھ پکڑ لیا اور قبلہ کی طرف منہ کر کے فرمایا "اے اللہ! ابو احمد پر رحم فرما اور اسے وہ مرتبہ عطا فرما جس کا تو نے وعدہ فرما رکھا ہے"

ابو احمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن یوں محسوس ہوا گویا کوئی غیبی آواز کہہ رہی تھی "ابو اسحٰق شامی! میں نے ابو احمد کو اپنے مقبول بندوں میں شامل کر لیا۔ یہ میرا دوست ہے اور جو شخص اس کی صحبت اختیار کرے گا وہ بھی میرا دوست ہو گا"

ابو اسحٰق شامی نے خوش ہو کر پوچھا "ابو احمد تو نے کوئی آواز سنی؟"
ابو احمد نے جواب دیا "ہاں میں نے بھی وہ آواز سنی"
ابو اسحٰق شامی نے کہا "تب پھر آج سے تو بھی کاملوں میں شامل ہوا"

آپ گھر واپس آ گئے ماں باپ نے بڑی خوشی منائی۔ پھوپھی بہت ضعیف ہو چکی تھیں انہوں نے ابو احمد کو سینے سے لگا لیا۔ ماں نے پیشانی کو بوسہ دیا۔ گھر کے در و دیوار خوشی سے روشن ہو گئے۔

کئی دن بعد آپ کی نظر ایک ایسے حصے پر پڑی جو چاروں طرف سے بند تھا

آپ نے کسی خدمت گار سے پوچھا " اس میں کیا بند ہے ؟"

خدمت گار نے کوئی جواب نہیں دیا اور سامنے سے ٹل گیا آپ نے دوسرے خدمت گار سے پوچھا " اس میں کیا بند ہے ؟"

اس دوسرے خدمت گار نے عرض کیا " اگر حضور یہ وعدہ فرمائیں کہ میرے سچ بولنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا "

آپ نے وعدہ کیا " میں اپنے رب پر یقین رکھتا ہوں کہ وہ تیرے سچ بولنے پر تجھے کوئی گزند نہیں پہنچائے گا - اب بتا اس میں کیا ہے ؟"

خدمت گار نے عرض کیا " حضور یہ میخانہ ہے اس میں شراب کا ذخیرہ بند ہے "

ابو احمد نے حیرت سے کہا " میں بھی اس گھر کا ایک فرد ہوں پہلے تو یہاں کوئی میخانہ نہیں تھا "

خدمت گار نے جواب دیا " پہلے بھی تھا لیکن یہاں نہیں تھا گھر سے دور ایک دوسرے مکان میں تھا ، لیکن آپ کی غیر موجودگی میں سلطان نے اُسے میخانہ بنا لیا "

ابو احمد نے کہا " اچھا تو یہ بات ہے لیکن میں تو اسے برداشت نہیں کر سکتا - میں اسے تباہ و برباد کر دوں گا "

خدمت گار نے تشویش سے کہا " اگر حضور نے ایسا کیا تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ سلطان آپ کے خلاف مزاحمت کریں گے اور اس مزاحمت سے کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو سکتا ہے "

ابو احمد نے جواب دیا " مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں - اس میخانے کو تباہ کر کے رہوں گا "

یہ مے خانہ ہر وقت مقفل رہتا تھا ایک دن سلطان نے کسی خدمت گار سے شراب منگوائی اور دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پینے لگا جب شراب ختم ہو گئی تو مزید کی ضرورت پیش آئی اور اسی خدمت گار کو دوبارہ شراب لینے بھیج دیا - یہ شخص شراب کے لیئے جیسے ہی اندر گھسا ، اس کے پیچھے ابو احمد بھی پہنچ گئے اور خدمت گار کو حکم دیا " تو باہر نکل جا "

خدمت گار نے خوفزدہ لہجے میں کہا " مجھ سے سلطان نے شراب منگوائی ہے میں شراب لینے آیا ہوں "

آپ نے سختی سے کہا" سلطان سے کہہ دے کہ میں نے میخانہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب اس کو تباہ و برباد کر کے ہی دم لوں گا"

خدمت گار تو مارے ڈر کے واپس چلا گیا اور آپ نے اندر سے میخانہ کا دروازہ بند کر لیا سلطان کو اس واقعے کا جوں ہی علم ہوا، وہ بھاگا بھاگا میخانے کے در پر آیا اور بلند سے دروازہ تھپتھپاتے ہوئے کہا" ابواحمد! دروازہ کھولو۔ یہ تم اندر کیا کر رہے ہو؟"

ابواحمد نے جواب دیا" والد محترم! دروازہ نہیں کھلے گا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس میخانے کو تباہ و برباد کر کے ہی باہر نکلوں گا"

سلطان نے غصے سے کہا" لیکن میں تمہاری اس حرکت کو برداشت نہیں کروں گا تمہیں میری ذات سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے"

ابواحمد نے جواب دیا" آپ کے ارادوں میں جب تک مشیت ایزدی شامل نہ ہو آپ کسی کو نہ تو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، میں ان نوں سے نہیں ڈرتا۔"

سلطان نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور بہت ہی غصے سے کہا" دروازہ کھولو"

ابواحمد نے جواب دیا" میں نے ایک بار کہہ دیا کہ دروازہ اس وقت تک نہیں کھلے گا جب تک پوری شراب زمین پر انڈیل نہ دی جائے"

باپ نے کہا" تو اپنے باپ کی عدول حکمی کر رہا ہے"

ابواحمد نے جواب دیا" لیکن میں اپنے رب کی فرماں برداری کر رہا ہوں"

باپ نے غصے سے کہا" اگر تو سیدھی طرح دروازہ نہیں کھولے گا تو مجھے دوسرا طریقہ بھی آتا ہے"

ابواحمد نے پوچھا" وہ کونسا طریقہ ہے؟"

باپ نے جواب دیا" میں وہ طریقہ ابھی بتاتا ہوں"

اس کے بعد سلطان کئی بڑے بڑے پتھر لے کر چھت پر چڑھ گیا۔ ابواحمد نے شراب لڑھکانا شروع کر دی وہ ہاتھوں سے اور ٹھوکروں سے شراب کے مٹکے توڑنے میں مشغول تھے شراب کی تیز بو چاروں طرف پھیل گئی۔ باپ کو غصہ جو آیا تو ایک پتھر روشن دان کی راہ سے ابواحمد کے سر پر مارا۔ سلطان کا خیال تھا کہ یہی ایک پتھر ابواحمد کو بے ہوش کر کے گرا دے گا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پتھر ہوا میں معلق ہو گیا۔ سلطان کے حواس ہی

جاتے رہے وہ دوسرا پتھر نہیں مار سکا۔ ابو احمد کسی خوف یا لحاظ کے بغیر شراب کو انڈیلتے لڑھکاتے رہے اور کچھ ہی دیر میں ساری شراب زمین پر گرا دی اور میخانے سے باہر نکل آئے حیران اور پریشان سلطان چھت سے نیچے اُترا اور کمزور آواز میں بیٹے کو پکارا۔

"ابو احمد! ذرا ٹھہرنا تو۔"

ابو احمد ٹھہر گئے۔ اداس اور نادم باپ اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا ولی بیٹے کے پاس پہنچا آہستہ سے پوچھا "بیٹے! یہ تو نے کیا کر دیا؟"

ابو احمد نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کیا، آپ اچھی طرح واقف ہیں۔"

باپ نے پوچھا "کیا یہ تو نے جو کچھ کیا اچھا کیا ہے؟"

ابو احمد نے جواب دیا "آپ یہ سوال مجھ سے نہیں اپنے ضمیر سے کیجئے اپنے رب سے کیجئے۔"

باپ بیٹے سے نظریں نہیں ملا رہا تھا ندامت سے کہا "میں تجھے اپنا بیٹا تو سمجھتا تھا لیکن اس پر یقین نہیں رکھتا تھا کہ تو ولی ہے۔"

ابو احمد نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

باپ نے جھک کر بیٹے کے پاؤں پکڑنا چاہے لیکن ابو احمد نے باپ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور عاجزی سے کہا "والد محترم! آپ مجھے گنہگار نہ کیجئے۔"

باپ کی آنکھوں سے چشمہ اُبل پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا "ابو احمد! میں بہت گنہگار ہوں اور اس پر مزید یہ ستم کہ میں نے تجھے نہیں پہچانا۔"

ابو احمد نے جواب دیا "میں آپ کا بیٹا ہوں اور کچھ نہیں۔"

باپ نے کہا "اچھا اپنے ہاتھ لا۔ میں تیرے ہاتھوں پر شراب نوشی سے توبہ کرنا چاہتا ہوں۔"

ابو احمد نے اپنے دونوں ہاتھ باپ کی طرف بڑھا دیے اور باپ نے الحاح وزاری سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر شراب نوشی سے توبہ کی اور یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ شراب کو ہاتھ تک نہ لگائے گا۔

باپ نے توبہ کی اور عزلت نشینی اختیار کی۔ آپ کے ماموں امیر نصیر ملک کا اقتدار بڑھا

اور ساری امارت گویا ماموں کی طرف منتقل ہوگئی۔ آپ کو سماع سے بڑی رغبت تھی اور جب سماع سنتے تو اُن کی حالت کچھ عجیب ہو جاتی۔ علمائے عصر اس کو بدعت سمجھتے انہوں نے آپ کے ماموں سے شکایت کی اور کہا "حضور والا! آپ اپنے بھانجے کو اس بدعت سے روکیے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

نصیر ملک نے جواب دیا "میرا بھانجہ ابواحمد بھی کوئی معمولی انسان نہیں ہے یہ فیصلہ کون کرے گا کہ حق پر تم لوگ ہو یا میرا بھانجہ ابواحمد؟"

علماء نے کہا "ہم اسے اپنے علم سے قائل کر دیں گے اور وہ خود ہی کہہ دے گا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بدعت میں داخل ہے۔"

نصیر ملک نے پوچھا "اگر تم لوگ یہ ثابت نہ کر سکے تو؟"

ایک عالم نے جواب دیا "اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی علمیت کا اندازہ ہے ہم ابواحمد کو لاجواب کر دیں گے۔"

نصیر ملک نے کہا "بہتر ہے میں ابواحمد کو بلواتا ہوں تم لوگ بھی علمائے مناظرہ کو تیار کر لو۔ پھر میں دیکھتا ہوں کون کس کو قائل کرتا ہے۔"

نصیر ملک نے اسی دن ابواحمد کو ایک خط لکھا۔

"پیارے بھانجے ابواحمد! مجھے تیری علمیت اور بزرگی کا بھی اعتراف ہے اور احترام بھی، لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے تنگ نظر عالم تیرے مقام اور مرتبے سے واقف نہیں ہیں اور تیرے اقوال اور افعال پر معترض ہیں وہ تیرے ذوقِ سماع کو بدعت سمجھتے ہیں میں ان کی شکایات اور اعتراضات سے عاجز آچکا ہوں اور انہیں ہمیشہ کے لئے چپ کرا دینے کی یہ ترکیب سوچی ہے کہ تو میرے پاس آجا۔ دوسری طرف سے علمائے کرام بھی آجائیں گے پھر تم دونوں آپس میں مناظرہ کر کے اپنے اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرو گے جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہی وہ واحد طریقہ ہے جو تیرے مخالفوں کی زبان بند کر سکتا ہے میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

ماموں کا خط پڑھتے ہی ابواحمد نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے خادم محمدؒ خدابندہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ محمدؒ خدابندہ سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص سے زیادہ نہیں پڑھا تھا۔

جب علماء کو یہ معلوم ہوا کہ ابواحمد مناظرے کی غرض سے تشریف لا رہے ہیں تو انہوں نے نصیر ملک سے التجا کی "جناب والا! ابواحمد اور آپ کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ماموں، بھانجے ہیں دوسرے یہ ہے کہ عوام النّاس پر ان کی بزرگی اور ولایت کا بھی بڑا رعب ہے ہم سب ان باتوں کے پیش نظر یہ چاہتے ہیں کہ ابواحمد کا استقبال نہ کیا جائے کیونکہ اگر ان کا استقبال کیا گیا تو بیشتر علمائے کرام پر ان کا رعب طاری ہو جائے گا اور وہ آزادی سے مناظرہ نہیں کر سکیں گے۔"

امیر نصیر نے وعدہ کر لیا کہ ان کا استقبال نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ابواحمد جیسے ہی شاہی محل کے دروازے تک پہنچے امیر نصیر خود کو قابو میں نہ رکھ سکا وہ بے اختیار محل سے باہر نکلا اور ابواحمد کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگایا پھر انہیں عزت و تکریم سے اپنی مجلس میں لے گیا وہیں علما کو بھی طلب کر لیا گیا۔

امیر نصیر نے علما سے پوچھا "کیا آپ لوگوں نے مناظرے کی تیاری کر لی ہے"

علمائے نے جواب دیا "ہاں اور ہمارا خیال ہے ابواحمد بھی تیاری کر کے ہی آئے ہوں گے"

ابواحمد نے بے نیازی سے جواب دیا "میں نے کوئی تیاری نہیں کی پھر بھی تمہارے سوالوں کے جوابات میرا یہ خادم محمدؒ خدابندہ دے گا، میری ضرورت ہی نہیں رہے گی"

علما ہکا بکا رہ گئے انہوں نے خادم محمدؒ خدابندہ کی طرف دیکھا۔ ابواحمد کی بات ان کی سمجھ میں یوں نہیں آئی کہ خادم خدابندہ صورت و شکل سے ان پڑھ معلوم ہوتا تھا ایک عالم نے حیرت سے سوال کیا "یعنی آپ کی بجائے یہ ان پڑھ شخص ہم سے مناظرہ کرے گا؟"

ابواحمد نے جواب دیا "ہاں یہی شخص تم سب کے لئے کافی ہے"

علما یہ سمجھے، شاید آپ مناظرے سے بچنا چاہتے ہیں اسے علما نے اپنی توہین سمجھا ایک عالم نے کہا "ابواحمد! یہ تو ہم سب پر ظلم ہے کہ ہم تم سے مناظرہ کرنے آئے تھے اور تم اپنے خادم محمدؒ خدابندہ سے بھڑا رہے ہو"

ابواحمد نے جواب دیا "اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ محمد خدابندہ تمہارے سوالوں کے جوابات نہیں دے پا رہا ہے تو مناظرے میں میں بھی شریک ہو جاؤں گا"

علمائے نے اپنی دانست میں مشکل ترین سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ قرآنی آیات زیر بحث لائی گئیں ان کے معانی و مطالب اور تفسیر پوچھی گئی الہٰیات پر سوال ہوئے تصوف

کے پیچیدہ مسائل زیر بحث آئے۔ ادھر محمد خدابندہ کا یہ حال تھا کہ علمائے کرام کے ہر سوال کا مدلل جواب اس کے پاس موجود تھا۔ وہ علما کے روبرو اس طرح بول رہا تھا گویا وہ سب طفل مکتب تھے اور محمد خدابندہ انہیں درس دینے پر مامور کیا گیا تھا

امیر نصیر یہ کیفیت دیکھ کر مبہوت تھا وہ علمائے کے سوالات گنتا رہا تھا چند گھنٹوں میں اسّی سوالات کیئے گئے اور محمد خدابندہ نے ان کے تشفی بخش جوابات دے کر علماء کو شرمندہ اور خاموش کر دیا۔

ابواحمد نے پوچھا "علمائے کرام! آپ کوئی سوال کریں گے یا سارے سوالات ختم ہو چکے ہیں؟"

کئی علماء نے یک آواز میں جواب دیا "ہم سوالوں کا سلسلہ ختم کرتے ہیں اور اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم سب مل کر بھی محمد خدابندہ کے علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے"

ابواحمد نے پوچھا "آپ لوگ تو مطمئن ہو گئے اب میرے خادم محمد خدابندہ کو اجازت دیجئے کہ آپ سے چند سوالات کرے"

کئی علماء ایک ساتھ بولے "ہم تیار ہیں اور محمد خدا بندہ کو اجازت ہے کہ سوالات کرے"

ابواحمد نے محمد خدابندہ کی طرف دیکھا اور حکم دیا "تو بھی چند سوالات کر لے"

خدابندہ نے کہا "بہتر ہے" پھر علماء سے کہا "حضرات! میرے سوالوں کے جواب دینے کے لیئے تیار ہو جائیں"

کئی علماء نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا "ہم تیار ہیں"

محمد خدابندہ نے پوچھا "حضرات! میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار سوال نہیں کروں گا لوگ کہتے ہیں کہ نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نیند میں واقعی لذت ہوتی ہے؟"

ایک عالم اس طرح مسکرایا گویا وہ اس بچکانہ سوال پر طنزاً ہنس رہا ہو، بولا "یہ بھی کوئی سوال ہے بھلا"

خدابندہ نے جواب دیا "حضرات میرا سوال کتنا ہی معمولی اور حقیر سہی لیکن آپ اسے حقیر کہہ کر رد تو نہیں کر سکتے۔ مجھے میرے سوال کا جواب ضرور دیا جائے"

ایک دوسرے عالم نے مسکرا کر کہا "ہاں تو تو نے کیا سوال کیا تھا؟ ذرا اسے دُہرانا تو سہی!"

محمد خدابندہ نے اپنا سوال پھر دُہرایا "لوگ کہتے ہیں نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے آپ کا کیا خیال ہے کیا نیند میں واقعی لذت ہوتی ہے؟"

ایک عالم نے جواب دیا "ہاں نیند میں بڑی لذت ہوتی ہے"

محمد خدابندہ نے پوچھا "اس لذت سے انسان کب لطف اندوز ہوتا ہے؟ یعنی اس کا مزہ کب چکھتا ہے سونے سے پہلے یا سونے کے بعد؟"

اس سوال نے سبھی کو چکرا دیا۔ ایک نے جواب دیا "سونے سے پہلے"

محمد خدابندہ نے ہنس کر کہا "کیا کسی چیز کی لذت کا احساس کھانے سے پہلے ہی کیا جاسکتا ہے میرا مطلب ہے آدمی کوئی چیز کھائے بغیر ہی اس کی لذت کا مزہ کس طرح حاصل کر سکتا ہے"

دوسرے عالم نے گھبرا کر جواب دیا "سونے کے بعد"

محمد خدابندہ نے کہا "یہ بھی ناممکن ہے جب ایک چیز حلق سے نیچے اتر جائے تو ساتھ ہی اس کا مزہ بھی زائل ہو جاتا ہے جب نیند جاتی رہی تو اس کا مزہ کہاں باقی رہا"

علما اور زیادہ چکرا گئے کسی تیسرے عالم نے جواب دیا "نیند کی لذت آدمی سوتے میں محسوس کر لیتا ہے"

محمد خدابندہ نے جواب دیا "یہ بھی غلط ہے عالم مدہوشی میں کسی چیز کی لذت محسوس کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

اب سارے عالم بے بس اور لاجواب ہو چکے تھے۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سادا معمولی سوال تھا جس نے سب کو گنگ اور لاجواب کر دیا تھا۔

امیر نصیر کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا۔ اس نے بے بس علما سے پوچھا "حضرات آپ کا کیا خیال ہے؟ محمد خدابندہ جو ابو احمد کا معمولی پڑھا لکھا خادم ہے اس نے تمہارے سوالوں کے مدلل جوابات دیے لیکن تم اُس کے ایک سوال کا جواب بھی نہ دے سکے کہاں اسّی سوال اور کہاں ایک سوال۔ اب تم سب ابو احمد کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

سب سے جید عالم نے جواب دیا "جناب امیر! ہم سب خطاکار اور قصوروار ہیں

ابو احمد کو علم لدنی حاصل ہے علم لدنی کا علم اکتسابی مقابلہ نہیں کر سکتا،
ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب ہم لوگ ابو احمد کے خادم محمد خدا بندہ کا مقابلہ نہیں کر سکے
تو ان کا کیا مقابلہ کریں گے ؟ ابو احمد سے مباحثہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔
اس کے بعد علماء نے اپنے عمامے اپنی گردنوں میں ڈالے اور ابو احمد کے سامنے
ادب سے دو زانو بیٹھ گئے اور درخواست کی یہ حضرت! ہم اپنی نادانی پر شرمندہ ہیں
آپ ہمیں بھی اپنے ارادت مندوں میں شامل فرمالیں۔
آپ نے جواب دیا یہ کوئی مضائقہ نہیں، بس میری ایک نصیحت پر زندگی بھر
کاربند رہنا۔ وہ یہ کہ کسی بھی انسان کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا اور دل آزاری کے عذاب
سے بچتے رہنا۔
امیر نصیر بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ ابو احمد!
گو رشتے میں، میں تم سے بڑا ہوں لیکن باقی تمام باتوں میں تم افضل اور بزرگ ہو۔ بخدا مجھ
میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تم کو مناظرے کے لئے زحمت دیتا۔ لیکن علمائے کرام کے مجبور کرنے
پر میں نے یہ گستاخی کی۔ اب جبکہ تم کامیاب ہو چکے ہو، میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔
ابو احمد نے جواب دیا۔ مناظرہ تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ میں اس میں کسی قسم
کی شرمندگی یا عار محسوس کرتا، لیکن ایک ایسا مناظرہ جس میں عالموں کی ایک جماعت پہلے ہی سے
یہ طے کرے کہ اپنے حریف یا فریق کو ذلیل و خوار کرے گی میری اپنی نظر میں گناہ ہے
کیونکہ اس میں انسان کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے۔
امیر نصیر نے آپ کی خدمت میں بڑے بڑے تحفے پیش کئے لیکن آپ نے انہیں قبول نہیں کیا۔
اس واقعے کا اتنا شہرہ ہوا کہ چاروں طرف سے لوگ جوق در جوق حاضریاں
دینے لگے اور ہزاروں آدمیوں نے آپ کے حلقہ ارادت مندی میں شمولیت کا شرف حاصل کیا۔

***

آپ سیر و سیاحت کے لئے چلے تو آپ کے ارادت مندوں نے ایک منزل تک آپ کا
ساتھ دیا، لیکن ان میں سے اُناسی ایسے ارادت مند تھے جو ایک منزل سے آگے
تک آپ کے ساتھ رہے جب یہ لوگ دریائے دجلہ کے کنارے پہنچے تو وہاں کشتی کا دُور
دُور تک نام و نشان نظر نہ آیا۔ آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا، یہاں کشتی کا

دُور دُور تک پتہ نہیں، اس لئے اب تم لوگ واپس جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

ارادت مندوں نے عرض کیا "حضرت! ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو دجلہ کے اس پار پہنچا کر واپس ہوں گے۔"

آپ نے لاپرواہی سے کہا "چلو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن کشتی کا تو کہیں پتہ نہیں۔"

کچھ دیر تک تو وہ لوگ چپ چاپ کھڑے رہے آخر آپ نے کہا "ہم لوگ کشتی کے انتظار میں کب تک کھڑے رہیں گے آؤ ہم لوگ کشتی کے بغیر ہی دجلہ عبور کریں۔"

لوگوں نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

آپ نے جواب دیا "آؤ ہم سب حلقہ بنا کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائیں اور آہستہ آہستہ دجلہ کی طرف بڑھیں اللہ نے چاہا تو اس سے ہماری مشکل حل ہو جائے گی۔"

لوگوں نے آپ کی اتباع کی اور وہ سب حلقہ بنا کر اللہ اللہ کرنے لگے آپ ان کو لے کر دجلہ میں اُتر گئے پانی کو دیکھ کر ان کے ارادت مندوں نے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب کچھ دیر بعد آپ نے انہیں حکم دیا "کہ اپنی اپنی آنکھیں کھول دو" تو وہ حیران رہ گئے وہ دجلہ کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے اور ان کے پاؤں تک خشک تھے۔

اس منظر کو دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے چوبیس کفّار بھی دیکھ رہے تھے وہ سب آپ کی خدمت میں پہنچے اور پوچھا "حضرت! آپ کی تعریف؟"

ایک ارادت مند نے جواب دیا "ابو احمد چشتی۔ کیا تم لوگ اتنے ہی کور اور نابینا ہو کہ انہیں پہچانتے ہی نہیں؟"

ان میں سے دو نے ایک ساتھ جواب دیا "یارو! ہم نہ مسلمان ہیں نہ عیسائی نہ یہودی ہم سب بت پرست ہیں اور ان حضرت کو تم سب کے ساتھ کشتی کے بغیر دجلہ سے پار اترتے جو دیکھا تو حیران ہو رہے ہیں ہم سب مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔"

ابو احمد کفّار کی طرف بڑھے اور فرمایا "سبحان اللہ، نیک کام میں دیر کیوں؟ خدا تمہیں مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔" اس کے بعد آپ نے ان سب کو مسلمان کر لیا۔

دوران سفر آپ کا گزر ایک ایسی بستی کے پاس سے ہوا کہ مسلمان اس کے

سانپ تک سے خوفزدہ رہتے تھے شام کا وقت تھا اور اس بستی میں دیے ٹمٹمانے لگے تھے آپ نے سوچا اس بستی میں داخل ہو کر رات یہیں گزاروں گا، صبح دیکھا جائے گا ابھی آپ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کوئی شخص پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور آپ کا دامن پکڑ لیا۔ آپ نے گھوم کر دیکھا ایک بوڑھا شخص آپ کا دامن پکڑے گھسیٹ رہا تھا۔

آپ نے پوچھا "تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "میں ایک مسلمان ہوں اور شاید آپ بھی مسلمان ہیں"

ابواحمد نے جواب دیا "ہاں، بحمداللہ کہ میں مسلمان ہوں"

بوڑھے نے عرض کیا "حضرت! میں آپ کی ہمدردی میں بڑی دور سے بھاگا چلا آرہا ہوں یہ سامنے کی بستی، جس میں دیے ٹمٹمانے لگے ہیں کافروں کی بستی ہے یہ بڑے ظالم اور سنگ دل کافر ہیں انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے اتنی نفرت کہ جب یہ کسی مسلمان کو پکڑ لیتے ہیں تو پہلے تو اس پر خوب ظلم کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ان کے ظلم و جور کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان کے ظلم و جور سے نہیں مرتا تو وہ اس مسلمان کو آگ میں ڈال کر مار دیتے ہیں"

ابواحمد نے پوچھا "آخر تو مجھ سے کہنا کیا چاہتا ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا "میں یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ اُدھر کا رخ نہ کریں اور اس بستی کے کنارے سے کہیں اور چلے جائیں"

آپ نے کہا "لیکن میں مجبور ہوں۔ میں کفار سے نہیں ڈرتا میں تو یہ رات اسی بستی میں گزاروں گا"

بوڑھے نے عاجزی سے کہا "آپ نادانی نہ کریں میرا کہنا مانیں۔ میں نے آج تک کسی مسلمان کو اس بستی میں داخل ہو کر باہر نکلتے نہیں دیکھا اگر آپ اتنے ہی بضد ہیں، تب پھر آپ اپنا لباس ضرور بدل دیجئے اور یہ کہ ان کفار جیسا ہی لباس پہن لیں۔ اس طرح آپ انہی جیسے ہو جائیں گے اور وہ آپ سے تعرض نہیں کریں گے"

آپ نے جواب دیا "اے شخص! خدا نے مجھے اسلام کا لباس پہنایا ہے میں کفار کے ڈر سے یہ لباس کیوں اتار دوں؟"

بوڑھا بے بس ہو گیا۔ بولا "حضرت! میں آپ کو نہ تو مطمئن کر سکتا ہوں نہ اس پر

مجبور کرسکتا ہوں کہ آپ میری بات مان لیں۔ اس لئے جو مناسب سمجھیں کریں۔ میں واپس جاتا ہوں"۔

بوڑھا واپس چلا گیا۔ آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس بستی میں قدم رکھ دیا۔ آپ کے لباس کو دیکھ کر کفار آپ پر ٹوٹ پڑے اور "مسلمان ہے مسلمان" کہہ کر اپنے نرغے میں لے لیا۔

وہ لوگ آپ کو پکڑ کر ایک بہت بڑے احاطے میں لے گئے اور پوری بستی میں یہ اعلان کر دیا۔ کہ خوش قسمتی سے ایک مسلمان ہاتھ آگیا ہے کل صبح اس کی درگت بنائی جائے گی اس لئے جس جس کو یہ دلچسپ اور مزیدار تماشا دیکھنا ہو، اس احاطے میں آجائیں۔

دوسرے دن علی الصبح پوری بستی اسی احاطے میں جمع ہو گئی کفار کے دو پروہت آگے بڑھے اور انہوں نے بستی والوں کی موجودگی میں باآواز بلند پوچھا۔ "اے شخص کیا تو مسلمان ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہاں میں مسلمان ہوں اور اپنے مسلمان ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں"۔

ایک پروہت نے کہا "اگر تو مسلمان ہے اور تجھے اپنے مسلمان ہونے کا غرور ہے تو میں بھی تجھے یہ بتاتا ہوں کہ اس بستی سے ایک مسلمان بھی صحیح سلامت بچ کر نہیں گیا ہے ہم تجھے بھی تیرے مسلمان ہونے کی سزا دیں گے"۔

آپ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "لیکن اے نامعقول پروہت! کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ سزا اور جزا تیرے یا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تو یا کوئی اور مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔

پروہت نے حقارت سے کہا "ایسی باتیں کئی اور مسلمان بھی کر چکے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ہم میں موجود نہیں"۔

آپ نے جواب دیا "تب پھر جو کچھ کرنا ہے کر کے دیکھ لے میں تیری اور تیری قوم کی طاقت اور اختیار کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

پروہت نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ باری باری آگے بڑھیں اور اس مسلمان پر

تھوکیں۔ اس کی قوم نے اس پر عمل کیا۔ لیکن جس نے بھی تھوکنا چاہا اس کا تھوک خود اس کے اپنے منہ پر آن گرا۔ لوگ حیرت زدہ اور شرمندہ ہو کر تھوکنے سے باز آ گئے۔

پروہت نے جھنجھلا کر حکم دیا "اس پر ڈنڈے برسائے جائیں۔ تھوک کا کیا ہے وہ ہوا سے اڑ کر بھی منہ پر آ سکتا ہے"۔

کئی آدمی موٹے موٹے ڈنڈے لے کر آپ کی طرف بڑھے اور آپ پر وار کیا ڈنڈے آپ سے بالشت سوا بالشت دور رہ کر اس طرح واپس ہو جاتے گویا کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر واپس کر دیا ہو۔ واپسی میں یہ ڈنڈے اسی شخص کی پیشانی یا سر سے ٹکرا کر اسے لہولہان کر دیتے۔

جیسے جیسے وار خالی جا رہے تھے پروہت کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر پروہت نے ایک ڈنڈا خود لیا اور آپ کے سر پر ضرب لگائی لیکن وہ ڈنڈا بھی واپس ہوا اور اُلٹے پروہت کو لہولہان کر دیا۔

دوسرا پروہت ابھی تک کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے زخمی پروہت کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔ بولا "تو بھی کیسی بے عقلی کی بات کر رہا ہے یہ شخص مجھے جادوگر معلوم ہوتا ہے اور اس کے جادو کا میرے پاس ایک توڑ موجود ہے"۔

زخمی پروہت کا سر چکرا رہا تھا۔ کراہتے ہوئے پوچھا "یقیناً یہ شخص جادوگر ہے اب جادو کا توڑ بتا تا کہ اس کا مقابلہ کیا جا سکے"۔

دوسرے پروہت نے اسے سمجھایا وہ آگ جادو ٹونے کو ختم کر دیتی ہے بہتر یہ ہے کہ یہاں ایک بہت بڑا الاؤ جلایا جائے اور جب منوں لکڑی سے آتش کدہ تیار ہو جائے تو اس شخص کو اس میں جھونک دیا جائے اس طرح نہ تو یہ شخص بچے گا اور نہ ہی اس کا جادو اثر دکھائے گا"۔

زخمی پروہت کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔

دونوں پروہتوں نے بستی والوں کو حکم دیا کہ منوں لکڑی کا انتظام کیا جائے پوری بستی لکڑیاں جمع کرنے میں مشغول ہو گئی آخر شام کے ہوتے ہوتے آدھا احاطہ لکڑی سے بھر گیا اس لکڑی پر چربی ڈالی گئی اور چربی کو آگ لگا دی گئی بستی والوں نے احاطہ خالی کر دیا کیونکہ شعلوں کی لپیٹ میں وہاں کھڑا ہونا محال تھا وہ لوگ درختوں

اور مکانوں پر چڑھ گئے اور ایک مسلمان کے زندہ جلائے جانے کا منظر دیکھنے کے لئے بے چین نظر آنے لگے۔

جب شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو دونوں پروہتوں نے آپ کو احاطے کی دیوار پر بٹھا دیا اور پوچھا "کہو اب تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "کیسا لگ رہا ہے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ آگ جل رہی ہے شعلے اٹھ رہے ہیں اس کی تپش سے در و دیوار تپ رہے ہیں اس کے سوا اور کیا لگے گا؟"

پروہت آپ کے جواب سے بہت خوش ہوئے کیونکہ اس سوال سے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اگر یہ جادوگر ہیں تو کیا اس آگ نے ان کے جادو کا اثر زائل کر دیا جب آپ نے یہ بتایا کہ آگ کی تپش سے در و دیوار تپ رہے ہیں تو دونوں پروہت بہت خوش ہوئے۔

ان پروہتوں نے آپ کو شعلوں میں دھکیل دیا آپ آگ میں گر گئے اور بستی والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابو احمد آگ میں جس جگہ گرے تھے وہ حصہ سرد پڑ چکا تھا اور آس پاس کے شعلے ابو احمد سے دور بھاگ رہے تھے۔

آپ نے اسی جگہ، جہاں گرے تھے مصلّا بچھا دیا اور نماز پڑھنے لگے۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ نے پروہتوں سے پوچھا "کیا خیال ہے؟ اب تو میں نکل سکتا ہوں تمہاری آگ مجھے جلانے سے انکار کر رہی ہے"

پروہتوں کی زبان گنگ ہو چکی تھی ان سے بولا نہیں جا رہا تھا بستی والوں پر ابو احمد کا رعب طاری ہو گیا تھا ابو احمد جیسے ہی باہر نکلے پوری بستی نے والہانہ آپ کو گھیر لیا۔ وہ شور کر رہے تھے "یہ شخص باکمال ہے سچا ہے، آگ نے اسے جلانے سے انکار کر دیا ہے اس لئے ہم اس کا دین اختیار کریں گے"

پروہتوں نے انہیں سمجھایا "یہ شخص جادوگر ہے، لوگو! ذرا صبر کرو۔ اس کا دین اتنی جلدی نہ اختیار کرو"

لیکن لوگوں نے اپنے پروہتوں کی ایک نہ سنی اور آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔

دونوں پروہتوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کی قوم کے لوگ ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے وہ خود اپنے دل میں بھی ابو احمد کی سچائی اور عظمت کا اعتراف

کر لیے تھے لہٰذا انہوں نے آپ سے درخواست کی " حضرت! ہم دونوں نے آپ کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اب ہمیں بھی مسلمان کر لیجئے اور ہماری قوم کو، جواب مسلمان ہو چکی ہے ہدایت کر دیجئے کہ بدستور ہمیں بڑا مانتی رہے "۔

آپ نے جواب دیا۔ "میں تم دونوں کو پہلے اسلامی تعلیم دوں گا اس کے بعد تم دونوں بستی کو تعلیم دینا۔ اسی طرح تم دونوں خود بخود بڑے ہو جاؤ گے "۔

آپ نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا اور اس بستی کو دونوں دین دار پروہتوں کے حوالے کر کے آگے بڑھ گئے۔

ایک عرصے بعد جب آپ وطن واپس پہنچے تو بڑھاپا آچکا تھا۔ یہاں اس بستی کے سو آدمی آپ کا انتظار کر رہے تھے ان سو آدمیوں نے آپ کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ اب تک دس ہزار افراد کو مسلمان کر چکے ہیں آپ بہت خوش ہوئے اور ان پر اتنی توجہ دی کہ ان میں سے بعض نے شیخ کامل کا مقام حاصل کیا۔

آپ نے جمادی الثانی ۳۵۵ھ میں وصال فرمایا اور جیسا کہ ابو اسحٰق شامی نے آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ یہ لڑکا ایک بہت بزرگ اور خانوادے کا بانی ہوگا ان کی یہ بشارت حرف بہ حرف پوری اتری۔ بعد میں مشہور زمانہ خانوادہ، سلسلہ چشتیہ، انہی سے پھیلا اور اس خانوادے کی شاخیں عرب، ایران، افغانستان، ماوراء النہر اور ہندوستان اور پاکستان میں قیامت تک پھیلتی رہیں گی۔



حضرت شیخ احمد رفاعیؒ

بصرہ اور واسط کے درمیان جہاں دجلہ و فرات کا پانی جمع ہو کر زمین میں جذب ہو جاتا ہے، وہاں جو بہت سارے گاؤں آباد تھے انہیں بطائح کہتے ہیں انہی بطائح میں ایک بستی میں امّ عبیدہ نام کی تھی اس بستی میں ایک عرب قبیلہ بنی رفاعہ آباد تھا۔ مشہور صوفی شیخ احمد کا اسی قبیلہ سے تعلق تھا وہ رفاعہ قبیلے سے تعلق کی بنا پر رفاعی کہلاتے تھے۔ یہ مروّت اور محبت کے پتلے تھے اور ان کے نزدیک مروّت اور محبت کے مستحق محض انسان ہی نہیں، تمام جاندار ہیں، چنانچہ جانور تک آپ سے فیض پاتے تھے۔

آپ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے کہتے کہ تصوّف یہ نہیں ہے کہ کوئی صوفی کرامات اور خوارق عادات چیزیں دکھا کر لوگوں کو عاجز اور مغلوب کر لے بلکہ صوفی کا اصل کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ جانداروں کی خدمت کرے۔ طبیعت میں حلم اور عاجزی اتنی تھی کہ آپ کے مخالف تک نادم اور شرمسار ہو جاتے۔

آپ چلّہ کشی کی خاطر امّ عبیدہ کے باہر ایک جنگل میں چلے گئے۔ وہاں چلّہ کشی کرتے رہے اور جب اس سے فارغ ہوئے تو اچانک خیال آیا کہ بستی میں بہت سے گھر ایسے ہیں جنہیں ایندھن کی پریشانی درپیش رہتی ہے آپ اُن کے لیئے لکڑیاں چنتے رہے اور جب لکڑیوں کا گھٹر اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ اُسے بہ آسانی اٹھالیں تو اسے اپنے سر پر رکھ لیا اور اس شان سے بستی میں داخل ہوئے۔ بستی والوں نے جب یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو آپ سے دریافت کیا "حضرت! یہ کیا؟ کیا آپ نے لکڑیاں بیچنے کا پیشہ اختیار کر لیا؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں بھائیو! ایسی کوئی بات نہیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جو انسانی خدمت کے ذیل میں آتا ہو مگر اس کا معاوضہ وصول کیا جائے۔"

اس کے بعد آپ نے یہ لکڑیاں مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ آپ کے مریدوں نے آپ کی اتباع میں یہ کام اجتماعی شکل میں انجام دینا شروع کر دیا۔ وہ اپنی مصروفیات میں سے

اتنا وقت ضرور نکال لیتے کہ جنگل سے لکڑیاں لا کر مستحقین میں مفت تقسیم کر دیا کریں بستی کے ناداروں کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا اور وہ شیخ احمد رفاعی کو دعائیں دینے لگے۔

ایک دن لوگوں نے آپ کو ایک جگہ کھڑے دیکھا، چند ساعتوں بعد جب ادھر سے لوگوں کا پھر گزر ہوا تو آپ کو اسی جگہ بدستور کھڑے دیکھا۔ ایک شخص نے آپ کے قریب پہنچ کر طنزاً پوچھا "حضرت! آپ کے پاس بڑا فالتو وقت ہے کہ ایک ہی جگہ بے مقصد گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا "میں بے مقصد نہیں کھڑا ہوں بھائی۔ یہاں میں ایک شخص کا انتظار کر رہا ہوں۔"

معترض نے پوچھا "کیا کسی مرید کا انتظار فرما رہے ہیں آپ؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں، مرید تو خود بھی میرے پاس پہنچ سکتے ہیں۔"

سوال ہوا "پھر یہاں کس کا انتظار فرما رہے ہیں آپ؟"

آپ نے جواب دیا "دراصل اس راہ سے ہر روز ایک نابینا گزرتا ہے کل میں نے اُسے ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرتے دیکھا ہے بس اس کے بعد ہی سے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب میں ہر روز اس جگہ آجایا کروں گا اور اس نابینا کو اس کی منزل مقصود تک پہنچا دیا کروں گا۔"

ایک مخلص مرید نے کہا "حضرت! یہ کام تو بڑا مشکل ہے اور اس صورت میں اس کی دشواری میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، جب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس بستی میں کئی اور اندھے بھی موجود ہیں آپ کس کس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی منزل تک پہنچائیں گے بڑی دشوار ذمے داری اپنے سر لی ہے آپ نے۔"

آپ نے جواب دیا "لوگو! مجھے اس میں مزہ آتا ہے اور اگر کسی کام میں مزہ آنے لگے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کام کی لذت آدمی کو اس کام سے لگائے رکھے گی۔"

اس کے بعد آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے یہ اصول بنا لیا کہ وہ بستی کے اندھوں کو بڑی ذمے داری اور مستعدی سے اِدھر اُدھر لیے جایا کرتے یہ اندھے ان مریدوں کے ساتھ شیخ احمد رفاعی کو بھی بڑی دعائیں دیا کرتے۔



عصر کا وقت جا رہا تھا آپ کے پاس ایک بلی اس طرح بیٹھی تھی کہ کرتے کی داہنی آستین بلی کے نیچے تھی بلی خراٹے لینے کے انداز میں خرخر کر رہی تھی، نماز قضا نہیں کر سکتے تھے

اور بلی کو بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ آخر آپ نے یہ مسئلہ اس طرح حل کیا کہ قریب رکھی ہوئی قینچی سے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنی آستین کا وہ حصّہ کاٹ دیا۔ جو بلّی کے نیچے دبا ہوا تھا اس کے بعد آپ نماز پڑھنے چلے گئے نماز سے فارغ ہونے کے بعد بلّی کو تلاش کیا تو پتہ چلا کہ وہ کہیں چلی گئی ہے اور کٹی ہوئی آستین فرش پر پڑی ہوئی ہے آپ نے آستین اٹھالی اور گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا "میرے مولا! میں نے تو حتی المقدور یہی کوشش کی تھی کہ بلّی کے آرام میں میری وجہ سے خلل نہ پڑے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ اس سلسلے میں، میں نے کیا کیا، اب اگر بلّی میری وجہ سے جاگی ہے تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں، معاف کر دے"۔

کچھ دیر بعد مغرب کا وقت آگیا آپ نے آنسو خشک کئے اور مغرب کی نماز ادا کی۔ فراغت کے بعد کٹی ہوئی آستین دوبارہ سینے لگے ابھی آپ آستین سی ہی رہے تھے کہ بلّی میاؤں میاؤں کرتی دوبارہ آگئی اور آتے ہی اس نے خود کو آپ کی آغوش میں گرا دیا اور آنکھیں بند کر کے پڑ رہی۔ آپ نے اوپر دیکھا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا "الٰہ العالمین! میں کس زبان سے تیرا شکریہ ادا کروں، بلّی کا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں، یہ مجھ سے خوش ہے"

آپ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے اور بلّی آنکھیں بند کئے خر خر کر رہی تھی۔

آپ کے بے پناہ حلم اور مروّت نے نادانوں کو گستاخ بنا دیا تھا، ایک دن آپ بستی کی ایک گلی سے جو گزرے تو بہت سارے لڑکوں کو کھیلتے اور آپس میں لڑائی جھگڑا کرتے دیکھا آپ ان کے پاس ٹھہر گئے لڑکوں میں سے ایک تیز طرار لڑکا آپ کے پاس آیا اور گستاخی سے پوچھا "تو ہمارے جھگڑے کا تماشا کیوں دیکھ رہا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میرے بچو! آپس میں مت لڑو جھگڑو، تم سب شریف والدین کے بچے ہو"

شریر لڑکے نے کہا "واہ ایک ہی رہی، لڑیں جھگڑیں ہم آپس میں اور نصیحتیں کرنے والا یہ معلوم نہیں کہاں سے آگیا"

دوسرے لڑکے نے زور سے سیٹی بجائی اور کہا "جانے نہ پائے"

تیسرے نے آواز کسا "یہ کھسکا ہوا ہے"

چوتھا بولا "علاج کراؤ، جلدی ٹھیک ہو جائے گا ابھی زیادہ خرابی نہیں نظر آتی۔

آپ نے نہایت نرمی سے کہا "کیا یہ ساری باتیں تم سب میری بابت کہہ رہے ہو؟"

ایک لڑکے نے جواب دیا "واہ جناب! اتنی سادہ لوحی بھی کس کام کی؟"

آپ نے لڑکے سے پوچھا "بیٹے تمہارے والد کا کیا نام ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا "فسادی"

آپ نے کہا "میرے بیٹے! باپ کو اس طرح نہیں کہتے۔ تم مجھے برا بھلا کہہ لو لیکن اپنے والدین کی عزت کرو"

ایک دوسرے لڑکے نے کہا "تب پھر تم ہمارے معاملے میں کیوں دخل دیتے ہو؟"

آپ نے جواب دیا "میں تمہارے معاملے میں دخل نہیں دے رہا ہوں میرے بچو! بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ آپس میں لڑو جھگڑو نہیں، دوست ہو تو دوست ہی بن کر رہو"

ایک شریر لڑکے نے غصے میں کہا "اچھا اب اپنی بکواس بند کر اور اپنا راستہ لے"

آپ نے نرمی سے کہا "بیشک میرے بچے میں نے جو کیا یا کہا، اس کی حیثیت بکواس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتی، اگر میں بکواس کر رہا ہوں تو تم سب خدا سے میرے حق میں دعا کرو کہ وہ مجھے صحیح راستے پر ڈال دے، سنتا ہوں، جوانوں اور بوڑھوں کے مقابلے میں بچے کم گناہگار ہوتے ہیں، خدا تمہاری دعائیں ضرور قبول کرے گا"

ایک لڑکے نے کہا "دوستو! تم سب اس نیک اور بزرگ شخص کی باتوں کا کس طرح مذاق اڑا سکتے ہو، یہ شخص تو بڑی اچھی باتیں کر رہا ہے"

دوسرے نے کہا "کیا تم نے سنا نہیں کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ جوانوں اور بوڑھوں کے مقابلے میں بچے کم گناہگار ہوتے ہیں یعنی ہم لوگ کم گناہگار ہیں اس لیے ہم سب اس نیک انسان کو ستا کر خواہ مخواہ اپنے گناہوں میں کیوں اضافہ کریں۔ اگر ہم اس کی نصیحتیں مان لیں اور ان پر عمل کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی اس جیسے نیک اور اچھے انسان نہ بن جائیں"

سب سے زیادہ شریر لڑکا، جس نے آپ کا مذاق اڑانے میں پہل کی تھی، آپ کے قریب پہنچا اور التجا کرتے ہوئے کہا "جناب والا! مجھے معاف کر دیجئے میں نے آپ کا بڑا دل دکھایا ہے"

آپ نے جواب دیا "تو نے میرا دل نہیں دکھایا میرے بچے! اس عمر میں سارے ہی بچے شریر ہوتے ہیں، میں نے تمہیں جو نصیحت کی تھی وہ اس عمر کے لئے تھی جب تم سب باشعور اور سمجھدار ہو جاؤ گے"

لڑکے سنجیدہ ہو گئے بولے " نہیں جناب! آپ کی نصیحتیں ہماری جیسی عمر والوں کے لئے بھی ہیں کیوں کہ ہم سب میں اتنی سمجھ تو موجود ہی ہے کہ آپ کی باتوں کے مُفید اور مُضر اثرات کو سمجھ رہے ہیں"
آپ بہت زیادہ خوش ہو گئے بولے " اگر یہ بات ہے تو میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری زبان میں تاثیر پیدا کر دی اور میری باتوں میں مفید اور صالح مطالب بھر دیئے"
لڑکوں نے آپ کو تھوڑی دور ساتھ چل کر رخصت کیا اور اس کے بعد جو کھیل شروع کیا اس میں لڑائی جھگڑے کے بجائے، ضبط و مروّت اور حلم و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔



درویشوں کی ایک جمعیت نے آپ کی بستی میں قیام کیا۔ یہ درویش دنیادار تھے اور ان کا کام ہی یہ تھا کہ بستی بستی کا دورہ کر کے لوگوں کو بیوقوف بنائیں اور اپنا اُلّو سیدھا کریں۔ آپ کو ان کی آمد کی خبر ملی تو ان سے ملنے چلے گئے اور انہیں دعوت دی کہ جب تک آپ لوگ میری بستی میں ہیں میرے مہمان بن کر رہیں۔
دنیادار درویشوں نے کہا " کیوں؟ ہم تمہارے مہمان بن کر کیوں رہیں کیا ہم متوکّل نہیں ہیں؟"
آپ نے جواب دیا " میرے دوستو! توکّل کا تھوڑا بہت مفہوم تو مجھے بھی معلوم ہے اگر آپ لوگ مجھے شرف میزبانی بخشیں گے تو اس سے آپ کے توکّل میں کوئی فرق نہ آئیگا"
ایک درویش نے کہا " سنا ہے تو بھی ہماری طرح ایک درویش ہے؟"
آپ نے جواب دیا " میں عاجز و درماندہ انسان آپ کی برابری کس طرح کر سکتا ہوں میں ایک معمولی انسان ہوں اور درویش کے مرتبے سے ابھی تک محروم ہوں"
دوسرے درویش نے پوچھا " تو باتیں تو بڑی اچھی کر لیتا ہے اچھا اب یہ بتا کہ اگر ہم میں سے کوئی یہ کہے کہ تو مجھے کوئی نصیحت کر تو تو کون سی نصیحت کرے گا؟"
آپ نے کچھ تامّل اختیار کیا۔ اس کے بعد کھجور کے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا " کیا تم ان درختوں کو دیکھ رہے ہو؟"
درویش نے جواب دیا " ہاں دیکھ رہا ہوں"
آپ نے پوچھا " کیا دیکھ رہے ہو؟"
درویش نے جواب دیا " یہ دیکھ رہا ہوں کہ کھجور کے درخت آسمان کی طرف سر اٹھائے تنے کھڑے ہیں اور وہ کھجوروں سے لدے ہوئے ہیں"

آپ نے کہا "یہ مت کہو کہ کھجوروں سے لدے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہو کہ کھجوروں کے بوجھ سے لدے ہوئے ہیں۔"

درویش نے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر طنزاً کہا "باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے یہ شخص۔"

دوسرے درویش بھی آپ کی باتوں میں بڑا مزہ لے رہے تھے۔ ایک نے کہا "بیچ میں مت بول۔ اسے اپنی بات پوری کر لینے دے۔" پھر آپ سے کہا "ہاں تو تو اپنی بات جاری رکھ۔"

آپ نے کہا "کیا تم لوگوں نے کدو کی بیل دیکھی ہے؟"

درویش نے جواب دیا "ہاں دیکھی ہے۔"

آپ نے پوچھا "کیا وہ بھی کھجور کی طرح تنی کھڑی رہتی ہے؟"

درویش نے جواب دیا "نہیں، وہ زمین پر بچھی رہتی ہے اور کدو زمین پر پڑا رہتا ہے۔"

آپ نے کہا "خدا تمہارا بھلا کرے جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔"

درویش حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے ایک نے پوچھا "آخر تو کیا کہنا چاہتا تھا ہمیں بھی تو معلوم ہو۔"

آپ نے جواب دیا "ان دونوں مثالوں میں قدرت کا یہ نکتہ پنہاں ہے کہ جس نے سر اٹھایا اور غرور سے تن کر کھڑا ہوا، خدا نے اس پر کھجور کی طرح ایک بوجھ لاد دیا اور یہ بوجھ بلا شرکت غیر اس کو تنہا ہی اٹھانا پڑے گا برخلاف اس کے کدو کی مثال میں یہ نکتہ چھپا ہے کہ جس نے خاکساری، عاجزی اور فروتنی اختیار کی، اس کا بوجھ دوسروں پر ڈال دیا گیا، بالکل کدو کی طرح، جو بیل کے بجائے زمین پر ڈال دیا جاتا ہے۔"

درویش اس طرز استدلال سے بہت محظوظ ہوئے بولے "مثال تو تو نے بڑی اچھی دی، اور کچھ؟"

آپ نے جواب دیا "میں جب کسی درویش کو دیکھتا ہوں تو یہی کہتا ہوں کہ دیکھو اور غور کرو تم نے کس کا لباس پہن لیا ہے اور کس کی طرف کا ارادہ کر لیا ہے یاد رکھو یہ نبیوں اور متقیوں کا لباس ہے اسے پہنا ہے تو مقربین کے راستے پر چلو ورنہ یہ لباس اتار دو۔"

ایک فقیر کو غصہ آگیا، وہ آپ کو بُرا بھلا کہنے لگا " او دجال ! میں تجھے سمجھ گیا ۔
مجھے تیری بابت پہلے ہی لوگوں نے یہ بتایا ہے کہ تو نے محرمات کو حلال قرار دے
رکھا ہے، میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تو قرآن کے معانی اور مطالب بدل دیا کرتا ہے ۔
او ملحد اوکتے ! اپنی زبان بند رکھ ورنہ میں مزہ چکھاؤں گا کہ تو زندگی بھر یاد رکھے گا "
آپ نے درویش کے قدموں میں سر رکھ دیا اور نہایت عاجزی سے کہا " اے میرے
سردارو ! اپنے غلام کو معاف کرو ۔ میرا روئے سخن تمہاری طرف ہرگز نہ تھا" اس کے
بعد آپ نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسے دینا شروع کر دیا " آپ لوگ خدا کے لئے
مجھ سے راضی ہو جائیے ورنہ میں اپنے خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا میں دل آزاری کر کے اپنا چین
اور سکھ ختم کر دوں گا ۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے ورنہ میں کہیں کا بھی نہ رہوں گا "
ایک درویش نے کہا " یارو ! میں نے بہت سے درویش دیکھے ہیں لیکن اس جیسا آدمی
کوئی نہیں دیکھا اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا، میرا خیال ہے اس پر زیادتی ہو گئی ہے اور
ہمیں اتنے تند و تلخ لب و لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیئے تھی "
دوسرے درویش نے کہا " میرا اپنا بھی یہی خیال ہے میں یہ جانتا ہوں کہ اگر یہی باتیں
اس کے بجائے کسی اور کو کہی جاتیں تو اس وقت یہاں ایک ہنگامہ برپا ہوتا اور ہم سے معلوم
نہیں کس کس کی، مار پیٹ سے حالت غیر ہو چکی ہوتی "
آپ نے کہا " اس لیئے میں آپ سب سے کہتا ہوں کہ آپ کو جو کچھ کہنا سننا ہے مجھے کہہ
سن لیجئے ۔ میں آپ کو جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہوں گا لیکن اس قسم کی گفتگو کسی اور سے
ہرگز نہ کیجئے گا کیونکہ دوسرا شخص فتنہ و فساد پر اتر آئے گا اور اس سے آپ میں سے
کسی کو کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے "
ان لوگوں نے آپس میں کہا " یہ شخص کمال کا ہے، برداشت اور حلم تو کوئی اس سے سیکھے "
ان لوگوں نے اسی وقت اس بستی سے کوچ کیا اور کہا " جس بستی میں آتنا زبردست
بزرگ رہتا ہو، وہاں ہم دنیا داروں کو اپنی کمینی حرکتوں سے باز رہنا چاہیئے "
آپ کے گاؤں سے دور، ایک دوسرے گاؤں میں ایک اور بزرگ رہتے تھے ان کا
نام شیخ ابراہیم تھا، شیخ ابراہیم کے پاس آنے جانے والے شیخ احمد رفاعی کی بڑی تعریفیں
کرتے، جس سے شیخ ابراہیم کو تکلیف پہنچتی ۔

شیخ ابراہیم نے اپنے چند مرید شیخ احمد کے پاس اس غرض سے بھیجے کہ وہ شیخ احمد رفاعی کے جملہ کوائف معلوم کرکے شیخ ابراہیم تک پہنچا دیں۔ چنانچہ یہ مُرید کچھ عرصہ آپ کے پاس رہ کر اپنے پیر کے پاس چلے گئے اور انہیں مطلع کیا کہ یہ عجیب سادہ سا درویش ہے اس کے پاس نہ تو کوئی خانقاہ ہے نہ حجرہ نہ کچھ اور، عبادت اور ریاضت کے بعد جو وقت بچتا ہے لوگوں کی خدمت میں گزار دیتا ہے عورتوں مردوں کو یکجا کرکے وعظ و تلقین کرتا ہے اور اس کے ماننے والے اس کی اتنی عزّت کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

شیخ ابراہیم نے پوچھا "کیا یہ بات بالکل درست ہے کہ شیخ احمد عورتوں اور مردوں کو یکجا کرکے وعظ و تلقین کرتا ہے؟"

مریدوں نے جواب دیا "ہم نے جو کچھ دیکھا، بیان کر دیا۔ جھوٹ اور مبالغے سے ہمیں کیا لینا ہے"

شیخ ابراہیم کو ایک نکتہ ہاتھ آ گیا تھا، اسی وقت شیخ احمد رفاعی کو ایک خط لکھا۔

"او دجّال! او بدعتی! اور اے وہ شخص جس نے مردوں اور عورتوں کو یکجا جمع کر دیا ہے اپنی یہ حرکتیں بند کر دے اور درویشی کا ڈھونگ نہ رچا۔ میں تجھے انسان کے بجائے کتّے کی اولاد سمجھتا ہوں اگر تو اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں اپنے مریدوں کی فوج لے کر اُمّ عبیدہ آؤں گا اور تیرا کام تمام کر دوں گا تاکہ خلائق تیری نحوست سے بچ جائے"

آپ نے یہ خط پڑھا اور ذرا بھی ملول نہ ہوئے۔ جو شخص خط لے کر آیا تھا اس سے فرمایا "میں ابھی ابھی اس خط کا جواب لکھ کر تیرے حوالے کرتا ہوں، لیتا جا"

آپ نے جواب میں لکھا "میرے لائق صد احترام شیخ ابراہیم! آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسا چاہا، پیدا فرمایا اور جو باتیں چاہیں مجھ میں رکھ دیں لیکن اس کے باوجود میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنی نیکوکاری سے میرے حق میں دُعا کیجئے اور اپنے حلم و کرم سے مجھے محروم نہ کیجیے"

شیخ ابراہیم کو جب یہ جواب ملا، تو اس پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ دیوانہ ہو گیا

اس نے اپنی خانقاہ چھوڑ دی اور کسی طرف کی راہ لی ۔ کہتے ہیں اس کے بعد کسی نے بھی شیخ ابراھیم کو نہیں دیکھا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ شیخ کہاں غائب ہو گیا ۔



بستی کے دو آدمیوں میں بڑی دشمنی ہو گئی تھی، پہلے یہ دونوں دوست تھے بعد میں کسی عورت کے سبب سے اختلاف ہو گیا اور دونوں اس فکر میں رہنے لگے کہ جس کسی کو بھی موقع ملے گا دوسرے کی مرمت کر دے گا اس بات اور اس ارادے کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس عورت نے دونوں ہی کو دھوکا دیا اور کسی تیسرے کے ساتھ فرار ہو گئی دونوں کو ایک دوسرے پر یہ شبہ تھا کہ اس نے عورت کو کہیں چھپا دیا ہے اس سلسلے میں دونوں ہی ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے رہتے اور دھمکیاں دے کر کہتے کہ اس عورت کو جہاں کہیں بھی چھپایا ہے نکال لاؤ اور میرے حوالے کر دو ورنہ اس کا بڑا بُرا نتیجہ نکلے گا لیکن دونوں ہی اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے کہ اس سے جھوٹ بولا جا رہا ہے ۔

ایک دن، سرِ شام ایک نے دوسرے کو بازار میں پکڑ لیا، کہا ۔ "دیکھ تو سیدھی طرح سے اُس عورت کا پتہ بتا دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا ۔"

دوسرے نے جواب دیا ۔ "خوب! یعنی اس کو چھپایا خود تو نے اور اُلٹا مجھ سے اُس کا پتہ پوچھ رہا ہے میں خود تجھ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اُسے جہاں کہیں بھی چھپا رکھا ہے پتہ بتا دے ورنہ اگر میں نے تیری مرمت کر کے اس کا پتہ معلوم کر لیا تو تیری کرکری ہو جائے گی ۔"

پہلے نے جواب دیا ۔ "یہی عمل میں بھی کر سکتا ہوں، کیا اللہ نے مجھے ہاتھ پیر نہیں دیے تو مارے گا تو میں بھی ماروں گا تو اس بھول میں بھی نہ رہ کہ میں آسانی سے تیری مار کھا لوں گا ۔"

دوسرے نے ہوا میں ہاتھ لہرایا ۔ "تب پھر یہی، میں اگر اپنے ماں باپ کا ہوں تو اس عورت کا پتہ چلا کر رہوں گا اور تجھے اس کا پتہ بتلانا ہی پڑے گا ۔"

پہلے نے کہا ۔ "میں بھی یہی کہتا ہوں کہ تو مجھ سے اس عورت کو کب تک چھپائے گا ۔ ایک نہ ایک دن میں طاقت کے ذریعے یہ معلوم کر کے رہوں گا ۔"

دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اور عہد کیا کہ جو بھی پیش پا جائے جان سے مارے بغیر محض مار پیٹ کر کے عورت کا پتہ معلوم کرے ۔ جو اس میں کامیاب ہو جائے گا اُسے انعام بھی دیا جائے گا اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس پر خوش تھے کہ انہیں

جب اس عورت کا پتہ معلوم ہی نہیں تو وہ ایک دوسرے کو بتائیں گے کیا؟

دونوں موقعے کی تاک میں تھے لیکن ایک دوسرے سے اتنے ہوشیار تھے کہ کسی کو کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا ان دونوں کی اس شرط کا حال شیخ احمد کو بھی معلوم ہو گیا چنانچہ وہ ان دونوں میں سے ایک سے ملے اور کہا "برادر عزیز! جیسا کہ تم سب پہلے ہی سے واقف ہو کہ میں ایک بے ضرر انسان ہوں اور کسی کو آج تک نقصان نہیں پہنچایا"

اس شخص نے پوچھا "حضرت! اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "میں چاہتا یہ ہوں کہ چند دن تمہارا مہمان رہوں، کیا تم مجھے اپنا مہمان بنانا پسند کرو گے؟"

اس نے کہا "کیوں نہیں کیوں نہیں، ضرور، جب کہئے آپ کو مہمان بنانے کا شرف حاصل کر لوں"

آپ نے کہا "لیکن ایک شرط پر مہمان بنوں گا"

اس نے جواب دیا "حضرت! آپ جیسے حلیم الطبع انسان کی ہر شرط منظور، فرمائیے"

آپ نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم میرے مہمان ہونے کی خبر کو راز میں رکھو، کسی کو اس کی خبر نہ ہونے پائے"

اُس نے فراخدلی سے جواب دیا "منظور، اور کچھ؟"

آپ نے کہا "اور دوسری شرط یہ ہے کہ تم ایک رات کے لئے اپنا لباس مجھے دے دو گے اور میرا لباس تم پہن لو گے"

اُس نے آپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیسی شرط ہے اور اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اس نے یہ بھی سوچا کہ کہیں ان کے دماغ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی آپ نے کہا "اے شخص تو کن وسوسوں میں پھنس گیا؟ میرے دماغ میں کوئی خرابی نہیں، میں جو کچھ کر رہا ہوں تیری بھلائی کی خاطر کر رہا ہوں"

اس شخص نے پریشان ہو کر عرض کیا "مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے فرمائیے، ان دو کے علاوہ کوئی اور شرط؟"

آپ نے جواب دیا "بس، اور یہ کہ میں آج رات تیرے ہی گھر میں رہوں گا"

اس شخص نے آپ کو مہمان بنا لیا۔ وہ آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی گھبرا

رہا تھا کیونکہ اس کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ احمد کو دلوں کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

شام سے ذرا پہلے آپ نے اپنے میزبان کو منع کر دیا کہ وہ کسی سے ملاقات نہ کرے اور کوشش کر کے ٹال دے چنانچہ میزبان نے اس پر آنکھ بند کر کے عمل کیا۔ رات کو دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد آپ نے میزبان کو اپنے کپڑے پہنا دیے اور خود میزبان کے کپڑے پہن لیے۔ سوتے وقت آپ نے دریافت کیا "تو کہاں سوتا ہے؟"

اُس نے ایک کمرے میں لے جا کر بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کمرے اور اس بستر پر"

آپ نے جواب دیا "میں اس کمرے اور اس بستر پر آرام کروں گا"

میزبان نے کہا "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، جیسی آپ کی مرضی"

چنانچہ آپ اس کمرے میں اور اسی بستر پر سو گئے۔

رات کے پچھلے پہر اُن کے کمرے میں ایک سایہ چھپتا چھپاتا، بچتا بچاتا داخل ہوا، کمرے میں ایک مدھم لَو والی شمع روشن تھی۔ آنے والا آپ کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی اس نے آپ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور آپ کی پٹائی شروع کر دی وہ آپ کو پیٹتا جاتا اور کہتا جاتا "آج تو مجھ سے نہیں بچ سکتا۔ اس عورت کو تو نے کہاں چھپا دیا ہے؟ پتہ بتا دے ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا"

آپ فوراً کھڑے ہو گئے لیکن آپ نے اپنے چہرے کو چادر میں چھپا لیا تھا۔ پیٹنے والے نے لکڑی تو پھینک دی، مکّوں اور لاتوں سے مرمت کرنے لگا۔ آپ نے کوئی مزاحمت نہ کی اور نہ ہی شور و غل کیا۔ پیٹنے والا برابر چیخے جا رہا تھا "میں کہتا ہوں اس عورت کا پتہ سیدھی طرح بتا دے ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا"

آپ نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آپ کے چہرے پر پے در پے کئی مکّے رسید کر دیے۔ بولا "کیا تو گونگا ہو گیا ہے کیا تیری زبان کٹ گئی ہے؟ کیا خدا نے تیری قوت گویائی چھین لی؟"

آپ نے بدستور خاموشی اختیار کیے رکھی۔ آپ کی خاموشی نے پیٹنے والے کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا۔ وہ بہت زور سے چیخا "اگر تو اس عورت کا پتہ نہیں بتلائے گا تو آج مجھ سے بچے گا بھی نہیں۔ میں تیری جان لے لوں گا، تجھے جان سے مار دوں گا

میں تیرا خون پی جاؤں گا"

اسی لمحے کمرے میں شیخ احمد کا میزبان داخل ہوا اور اس نے اس شخص کو پکڑ لیا اور چیختا ہوا بولا "ارے یہ تو کیا کر رہا ہے؟ تو شیخ احمد کو مار رہا ہے، یہ تجھے اس عورت کا پتہ کیا بتائیں گے"

پیٹنے والا سناٹے میں آگیا اور اپنے ہاتھ روک لئے، حیرت سے شیخ احمد کے میزبان کو دیکھا اور شرمندگی سے کہا "ارے یہ تم ہو۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے تم پہ قابو پالیا ہے میرے دوست اور آج تم سے اس عورت کا پتہ معلوم کرکے ہی رہوں گا"

میزبان نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ اس کا وہی دوست تھا جس سے عورت کے بارے میں یہ معاہدہ ہوگیا تھا کہ دونوں میں سے جس کسی کو موقع ملے گا وہ فریق مخالف کو دھوکے سے قابو میں کرکے، مار پیٹ کر اپنی مشترکہ محبوبہ کا پتہ معلوم کرے گا۔

دوست نے حیرت سے پوچھا "لیکن یہ معاملہ کیا ہے؟ تیرا کمرہ، تیرا بستر، تیرا لباس، یہ سب کیا ہے؟"

میزبان دوست نے پوری تفصیل بتا کے کہا "آج شیخ احمد خواہش کرکے میرے مہمان ہوئے تھے اور مہمانی کی شرائط یہ رکھی تھی کہ اس بات کو راز میں رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ رات کو میرا لباس پہنیں گے اور میں ان کا لباس پہن لوں گا۔ انہوں نے تیسری شرط یہ رکھی تھی کہ میں انہیں سونے کے لئے اپنا کمرہ اور اپنا بستر دے دوں گا چنانچہ میں نے رات کے کھانے کے بعد اپنا لباس، اپنا کمرہ اور اپنا بستر آپ کے حوالے کردیا"

اب آپ کے چہرے سے چادر ہٹ چکی تھی اور آپ کا چہرہ صاف دیکھا جاسکتا تھا آپ کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور آپ کے دوسرے اعضائے جسمانی بھی چوٹ سے بری طرح دکھ رہے تھے میزبان نے چادر کے پلو سے آپ کے چہرے کا خون پونچھنا شروع کردیا اور پوچھا "یہ آپ نے کیا کیا؟"

آپ نے جواب نہیں دیا۔ پیٹنے والا شرمندہ اور خجل گردن جھکائے کھڑا تھا بولا "کمال تو یہ ہے کہ میاں جی نے شروع سے آخر تک اپنی زبان بند رکھی، چاہتے تو احتجاجاً شور و غل کر سکتے تھے"

میزبان نے عاجزی سے پوچھا "حضرت! آپ مدد کے لئے آواز تو دی ہوتی

مجھے پکار تو لیا ہوتا۔"

آپ نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔" اگر میں بول دیتا تو یہ شخص میری مرمت نہ کرتا بلکہ رُک جاتا اور میرے یہاں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔"

میزبان نے پوچھا۔" آپ کے یہاں آنے کا کیا مقصد تھا؟ کون سا مقصد فوت ہو جاتا؟"

آپ نے جواب دیا۔" مجھے کشف سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آج تیرا یہ دوست تیری پٹائی کے لیئے آئے گا اور تجھے اس حد تک مار لگائے گا کہ تیری جان ہی چلی جائے گی چنانچہ میں نے سوچا کہ تیرے گھر میں تیرے لباس اور تیرے کمرے میں تیرے سونے کے بستر پر میں خود ہی لیٹ جاؤں اور تو اپنے دوست کے شر سے محفوظ رہے۔"

میزبان نے کہا۔" لیکن حضرت! آپ یہ تو سوچیں کہ اگر آپ خاموش نہ رہتے اور اس کے پہلے وار پر ہی شور کر دیتے تو آپ مار سے بھی بچ جاتے اور میں آپ کی مدد کو آجاتا۔"

آپ نے جواب دیا۔" خاموشی میں نے اس لئے اختیار کی کہ تیرا دوست اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکال لے اگر اسے اس کے پہلے وار پر ہی روک دیا جاتا تو اس کے دل کی بھڑاس نہ نکلتی اور یہ کسی دوسرے موقع پر بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب یہ ایسا نہیں کرے گا اور اپنے دل میں ندامت ضرور محسوس کر رہا ہو گا۔"

میزبان کا دوست واقعی بہت شرمندہ تھا، اس کا دل بھر آیا، رونے لگا گلوگرفتہ آواز میں کہا۔" یہ میں نے کیا کر دیا میاں جی! یہ میں نے کیا کر دیا؟"

آپ نے اس کی پشت تھپتھپائی، فرمایا۔" شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ہو گیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب تو بھی خوش ہو جا۔"

اس شخص میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آپ سے آنکھ ہی ملا لیتا۔

میزبان نے کہا۔" میاں جی! مجھے پٹ جانے دیتے۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ آپ نے میرے خاطر دکھ اٹھایا ہے یہ چوٹیں برداشت کیں، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

آپ نے جواب دیا۔" مجھے اس میں مزہ آتا ہے کہ دوسروں کے دکھ خود جھیلوں، دوسروں کے زخم خود سہوں، اس میں جو لذت ہوتی ہے اگر تم دونوں کو اس کا علم ہو جائے تو تم بھی یہی کرنے لگو۔"

دونوں دوست شرمندہ اور نادم سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد آپ نے پوچھا" وہ عورت کہاں ہے جس کی وجہ سے تم دونوں کی دوستی میں دشمنی کا عنصر شامل ہوگیا "

میزبان نے پورا واقعہ بتا کے عرض کیا " اب ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم میں سے کسی ایک نے اس عورت کو کہیں چھپا دیا ہے اور اسی لیئے ہم دونوں اس فکر اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس کا پتہ معلوم کرلیں "

آپ نے قطع کلام کیا، فرمایا" تو اب تم دونوں اپنے اپنے دل میں سے یہ غلط فہمی نکال دو، کیونکہ اس عورت کو ایک تیسرا شخص لے اڑا ہے۔ اللہ نے چاہا تو میری اس بات کا کوئی نہ کوئی ثبوت بھی عنقریب مل جائے گا"

میزبان کے دوست نے شرمندگی سے کہا" آپ نے جو کچھ فرمایا۔ ہمیں اس کی صداقت پر پورا پورا یقین ہے اور ہمیں اس کے لیئے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے "

آپ نے جواب دیا" نہیں میرے دوستو! تم پریشان نہ ہو۔ خدا نے وہ انتظام بھی کر دیا ہے جس سے تمہارے دلوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور تم دونوں ایک بار پھر مخلص اور گہرے دوست بن جاؤ گے "

آپ دوسرے دن صبح ان دونوں سے جدا ہو گئے، اس دن سہ پہر کو وہ عورت خود بخود ان دونوں کے پاس پہنچ گئی اور رو رو کر اپنی مصیبت کی داستان سناتی رہی۔ اس نے بتلایا کہ اُسے کس طرح ایک شخص اغوا کر لے گیا تھا اور وہ کتنی مشکلوں سے بھاگ کر واپس آئی ہے وہ دونوں شیخ احمد کے پاس گئے اور اُن سے معافیاں مانگتے رہے آپ نے ان دونوں کو نصیحت کی کہ اب جبکہ عورت آ چکی ہے، تم دونوں میں سے کوئی ایک اس سے نکاح کر لے۔



ایک مرتبہ!

شیخ احمد کے بھانجے شیخ ابوالحسن ماموں کی ملاقات کو جو آئے تو حجرے کے دروازے پر انہیں احساس ہوا کہ اندر کوئی شخص موجود ہے اور وہ شیخ سے باتیں کر رہا ہے۔ شیخ ابوالحسن حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ اندر موجود شخص باتیں کر کے باہر نکلے تو یہ اندر داخل ہوں۔ کافی دیر بعد بھانجے

نے اندر جانا چاہا لیکن اس وقت وہاں ایک عجیب ہی منظر تھا۔ ابوالحسن نے دیکھا، وہ شخص باتیں کرتے کرتے ایک دم جو اُٹھا تو باہر کی طرف آنے کے بجائے دیوار کے چھوٹے سے روزن میں داخل ہوا اور وہاں سے کسی طرف غائب ہوگیا ایک چمک تھی بجلی کی جو روزن میں گھسی اور ناپید ہوگئی۔

ابوالحسن ڈرے سہمے حجرے میں داخل ہوئے اور اپنے ماموں سے کہا "ماموں جان! یہ شخص کون تھا؟"

شیخ احمد نے پوچھا "کیا تو نے اُسے دیکھ لیا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا "ہاں، میں نے اُسے دیکھ لیا اور وہ اس حجرے سے جس طرح گیا ہے اس بات نے مجھے چونکا دیا ہے کہ آخر وہ برقِ خاطف کی طرح اس حجرے سے رخصت کس طرح ہوا؟"

شیخ احمد نے کہا "اب جبکہ تو نے اُسے دیکھ ہی لیا ہے تو میں اس کا تعارف بھی کرائے دیتا ہوں، اصل میں یہ کوئی انسان نہیں تھا اُس کا تعلق رجال الغیب سے تھا یہ تین دن سے بارگاہِ کبریائی سے مہجور (معزول) ہو چکا ہے۔"

ابوالحسن نے پوچھا "معزولی کا سبب؟"

آپ نے جواب دیا "یہ جزائر محیط میں رہتا ہے چند دن گزرے وہاں تین دن لگاتار بارش ہوتی رہی۔ اس شخص نے اپنے دل میں کہا "اے کاش یہ بارش آباد زمین پر ہوتی اور انسان اس کا مزہ چکھتا اور اُسے اس کا فائدہ پہنچتا، اس کے اس خیال سے خدا ناخوش ہوگیا اور اُس نے اسے مہجور (معزول) کر دیا۔"

ابوالحسن نے پھر پوچھا "کیا آپ نے اُسے یہ بتا دیا کہ یہ شخص خدا کا مہجور ہے۔"

آپ نے جواب دیا "نہیں، میں نے اُسے یہ نہیں بتایا۔"

ابوالحسن نے کہا "یہ تو آپ نے بڑا ظلم کیا۔ آخر آپ نے بتایا کیوں نہیں؟"

آپ نے کہا "مجھے اس پر شرم آئی کہ اس کی معزولی کی خبر میں سناؤں۔"

ابوالحسن نے عرض کیا "تب پھر مجھے اس کی اجازت دیجئے کہ میں اُسے اُس کے حال سے مطلع کردوں۔"

آپ نے جواب دیا "اگر تیری یہی خواہش ہے تو میری طرف سے اس کی پوری

پوری آزادی اور اجازت ہے کہ تو اُسے پریشانی سے بچائے، میں تیری جو مدد کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا "

ابوالحسن نے پوچھا " لیکن جزائر محیط تک میں پہنچوں گا کس طرح ؟"

آپ نے کہا " اچھا ! اپنا سر گریبان میں تو ڈالنا "

ابوالحسن نے اپنا سر گریبان میں ڈال لیا ۔ اسی لمحے ابوالحسن کو یہ محسوس ہوا گویا وہ کسی سے مخاطب ہیں اور وہ ان کے سامنے موجود ہے ۔

انہوں نے اپنے ماموں سے کہا " ماموں جان ! میری حیرت کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہی ہے برابر مارے حیرت کے میرا بُرا حال ہے "

آپ نے جواب دیا " ابوالحسن ! خاموش رہ ، دَم نہ مار تو کسی سے بھی مخاطب نہیں ہے اور نہ ہی تو کسی کے سامنے موجود ہے اس وقت تو حالت سفر میں ہے تو سفر کر رہا ہے بحر محیط کی طرف "

ابوالحسن نے محسوس کیا ۔ ماموں کی آواز ڈوبتی جا رہی ہے اور وہ اپنے ماموں سے بہت دور ہوتا جا رہا ہے اچانک اسے حکم ملا " ابوالحسن ! سر اٹھا اور آنکھیں کھول دے "

ابوالحسن نے حکم کی تعمیل میں آنکھیں جو کھولیں تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ کسی اجنبی جزیرے میں کھڑے ہیں انہوں نے پوچھا " یہ میں کہاں آگیا ؟"

کسی نے جواب دیا " یہ بحر محیط کے جزائر ہیں انہی جزائر میں سے ایک میں اس وقت تم کھڑے ہو "

ابوالحسن کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ وہ یہاں کیا کریں ؟ کس سے اور کہاں ملیں اور کدھر کا سفر اختیار کریں ۔ آخر ایک طرف یہ اپنی مرضی ہی سے چل پڑے ابھی یہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک جگہ اس شخص کو بیٹھے دیکھا جسے وہ اپنے ماموں کے حجرے میں باتیں کرتے دیکھ چکے تھے ابوالحسن اس شخص کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اس نے اوپر نظریں اٹھائیں اور پوچھا " تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے ؟"

ابوالحسن نے پوچھا " تو نے مجھے نہیں پہچانا ؟ کیا تو واقعی مجھے نہیں جانتا ؟"

اس نے جواب دیا " نہیں میں تجھے نہیں جانتا اور تو یہاں آیا کس طرح ؟"

ابوالحسن نے کہا " مجھے شیخ احمد رفاعی نے بھیجا ہے اور میں نے تجھے

وہیں دیکھا تھا۔"

اس کے بعد ابوالحسن نے پوری تفصیل سُنادی، کہا "میں تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تجھے بتادوں خدا تجھ سے خوش نہیں ہے اس لیئے کچھ ایسا کر کہ وہ تجھ سے راضی ہو جائے۔"

وہ بہت فکر مند ہو گیا کچھ دیر خاموش رہ کر بولا "میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ میں تجھے جو ہدایت دوں، اس پر تو پوری طرح عمل کرے گا۔"

ابوالحسن نے جواب دیا "میں تیری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

اس شخص نے کہا "تو میرا خرقہ میری گردن میں ڈال کر گھسیٹ پھر اور بآواز بلند یہ کہتا رہ کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے۔"

ابوالحسن نے اس پر پوری طرح عمل کیا۔ اس کا خرقہ گردن میں ڈال کر گھسیٹنا شروع کیا اور ساتھ ہی بآواز بلند کہتا جاتا تھا کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے۔

ابھی اس عمل کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آواز آئی "اے ابوالحسن! یہ تو کیا کرتا ہے اسے چھوڑ دے کیونکہ فرشتوں میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے اور وہ رو رہے ہیں اور اس شخص کو مطلع کر دے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو چکا ہے۔"

ابوالحسن پر اس آواز نے ایک کیفیت طاری کر دی۔ فرطِ خوشی میں ان کی آنکھیں بند ہو گئیں ابوالحسن نے سوچا یہ خوشخبری اس شخص کو بھی سنا دوں لیکن جیسے ہی آنکھ کھولی تو پتہ چلا کہ وہ بحر محیط کے بجائے اپنے ماموں شیخ احمد رفاعی کے سامنے کھڑے ہیں ابوالحسن حیرت زدہ اپنے ماموں کو دیکھتے رہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ گزر چکا ہے کیا وہ ایک واقعہ تھا یا محض خواب و خیال۔ چاہتے تو ماموں سے پوچھ لیتے لیکن اُن میں ہمت نہیں تھی۔ ادب سے خاموش بیٹھے رہے۔

شیخ احمد رفاعی کو حضرت غوث الاعظم کے ہم عصر ہونے کا شرف بھی حاصل تھا ایک دن آپ کی خدمت میں شیخ محمد صادق شیبانی نے حاضری دی اور کہا "حضرت! میں حضرت غوث الاعظم کے پاس سے چلا آرہا ہوں۔"

غوث الاعظم کا نام سُن کر آپ پر لرزہ سا طاری ہو گیا، بولے "دہ انہوں نے

مجھ گناہگار کے پاس تمہیں کیوں بھیجا ہے؟"

شیبانی نے جواب دیا "حضرت غوث الاعظم نے پوچھا ہے کہ عشق کیا ہوتا ہے؟"

آپ نے ایک سرد آہ بھری بولے "حضرت عشق کا مفہوم مجھ سے دریافت فرما رہے ہیں! حالانکہ وہ عشق کے مفہوم سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔"

شیبانی نے عرض کیا "حضرت! بات مذاق یا تمسخر کی نہیں ہے انہوں نے واقعی اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے یہ کہا ہے کہ عشق کا مفہوم شیخ احمد رفاعی سے زیادہ اچھا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔"

شیخ احمد پر رقت طاری ہو گئی اور انہوں نے ایک پُر سوز آہ کھینچی فرمایا "حضرت غوث الاعظم سے فرما دینا کہ عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں اللہ کے سوا ہر شے جل جاتی ہے۔"

جس وقت آپ یہ فرما رہے تھے شیخ احمد کے آس پاس آگ لگ چکی تھی اور اس آگ نے ان دونوں کو بھی نقصان پہنچایا۔ وہ شخص یہ جواب لے کر حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

آپ لوگوں کے اصرار پر تعویذ بھی دے دیا کرتے تھے لیکن یہ تعویذ قلم سیاہی کے بجائے اپنی انگلی سے لکھ دیا کرتے تھے ایک دن کسی ارادت مند نے یہ سوچا کہ غالباً شیخ لوگوں کو ٹالنے کی خاطر ایسا کر دیا کرتے ہیں اس نے ایک شخص سے آپ کا محض انگلی پھیرا ہوا تعویذ لیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اس نے یہ سادہ کاغذ آپ کی طرف بڑھا دیا کہ حضرت! میرے کاغذ پر تعویذ لکھ دیجئے۔

آپ نے سادہ کاغذ لے لیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "بھائی! کیا تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا "بھلا یہ میری مجال کہ میں آپ سے مذاق کروں؟ میں اتنی ہمت کس طرح کر سکتا ہوں۔"

آپ نے کہا "بھائی! اس کاغذ پر تو پہلے ہی سے تعویذ لکھا ہوا ہے، اب مزید کیا لکھوں؟"

اس نے سادے کاغذ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "حضرت! اس پر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ مجھے بھی تو دکھائیے کہ اس پر کیا لکھا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "اس پر جو کچھ بھی لکھا ہے میری آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی ہیں" اس کے بعد آپ نے اس شخص کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا "لے اب پڑھ اس تعویز کو"

اس شخص نے غور سے جو دیکھا تو اس پر واقعی آیات قرآنی کے دو فقرے لکھے ہوئے تھے اُس نے شرمندہ ہو کر آپ سے معافی مانگی اور صاف صاف بتا دیا کہ اس طرح وہ آپ کا امتحان لے رہا تھا۔

ایک دن یہی شخص آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور گزارش کی۔ "حضرت! آج میں اپنی بہت بڑی ضرورت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"

آپ نے جواب دیا "لیکن جو کچھ تو چاہتا ہے اس کا تعلق تیرے اعمال سے ہے"

اس شخص نے عاجزی سے کہا "یہ تو میں خود بھی جانتا ہوں کہ میں آپ سے جو طلب کرنے آیا ہوں اس کا تعلق میرے اعمال سے ہے لیکن کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے میری سفارش فرما دیں اور خدا اُسے منظور کر لے۔"

آپ نے جواب دیا "اگر ایسا ہو جایا کرے تو پھر اچھے اعمال کی کوئی ضرورت ہی نہیں باقی رہے گی۔"

وہ شخص بہت بے چین تھا، بولا "پہلے آپ میری درخواست سُن تو لیجئے سُنے بغیر کوئی فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں آپ۔"

آپ نے فرمایا "میں خوب جانتا ہوں کہ تو کیا درخواست لے کر یہاں آیا ہے، اگر تو اُسے سنا ہی چاہتا ہے تو سُن لے کیا تو میرے پاس اس لیئے نہیں آیا ہے کہ تو میرے واسطے سے آتشیں دوزخ سے نجات پا جائے کیا تو جنت کی خواہش میں میرے پاس نہیں آیا ہے؟"

وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور روتے ہوئے کہا "بے شک میں اسی لیئے یہاں آیا ہوں۔ میں ملتجی ہوں آپ خدا سے میری سفارش کر دیجئے تاکہ آتشیں دوزخ مجھ پر حرام ہو جائے۔"

آپ نے جواب دیا "تیرے حق میں کوئی ایسی دُعا میں اس وقت کر سکتا ہوں

جب تو نے مجھے یہ یقین دلا دے کہ تو اپنی بقیہ زندگی تائب ہو کر گزارے گا جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بخشش کا تعلق انسان کے اپنے اعمال سے ہے اگر انسان زندگی بھر گناہ کرتا رہے گا تو پھر بخشش کس طرح ہو گی۔"

وہ شخص رونے لگا، بولا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی بقیہ زندگی توبہ پر قائم رہ کر گزار دوں گا، اب آپ مجھے یہ یقین دلا دیجئے کہ آپ خدا سے میری سفارش فرما دیں گے آپ مجھے مطمئن فرما دیجئے۔"

آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس شخص کو حکم دیا "تو بھی فضائے بسیط پر نظریں جمائے رکھ اور مجھے بتا کہ تجھے کیا نظر آ رہا ہے۔"

اس شخص نے آسمان کی طرف دیکھا، اوپر کچھ بھی نہ تھا لیکن کچھ دیر بعد بجلی کی طرح لہراتی ہوئی کوئی چیز نیچے اتری اور اس شخص کے بالکل سامنے ایک کاغذ آن گرا۔ آپ نے وہ کاغذ اٹھا کر اس شخص کے حوالے کر دیا اور کہا "دیکھ یہ تیرے لیے اوپر سے پروانہ نجات اُترا ہے، اس کی حفاظت کر اور اپنی بقیہ زندگی توبہ پر قائم رہ کر گزار دے۔ اللہ نے چاہا تو تیری بخشش ہو جائے گی مرنے سے پہلے اپنے ورثا کو وصیت کر دینا کہ وہ اس کاغذ کو تیرے کفن میں رکھ دیں۔"

وہ شخص بہت خوش ہوا اور اس سادے کاغذ کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل سادہ تھا اس نے کہا "حضرت! یہ تو بالکل سادہ ہے اس پر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔"

آپ نے جواب دیا "اس پر جو کچھ لکھا ہے خطِ نور سے لکھا ہے جسے تو نہیں پڑھ سکتا۔"

وہ شخص یہ کاغذ لے کر خوش خوش چلا گیا۔ آپ نے ایک بار پھر اسے ہدایت کر دی کہ بقیہ زندگی معاصی سے پاک ہونا چاہیئے ورنہ میں خدا سے تیرے حق میں اپنی برأت کی دُعا کر دوں گا۔

آپ نے زندگی بھر لوگوں کو اس طرح خوش رکھا کہ دوسروں کی اذیتیں اور مصیبتیں حتی الامکان اپنی جان پر لیتے رہے آپ نے مرض الموت میں اپنے ایک خادم سے فرمایا "مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس بار شاید دلہن آ کے رہے گی۔"

خادم نے پوچھا "حضرت! یہ دلہن کیا چیز ہے؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

آپ نے جواب دیا ”میں موت کو دلہن کہہ رہا ہوں کیونکہ دوسروں کے لیے موت میں اذیتیں ہوں گی، کرب ہوگا، لیکن میں موت کو اس طرح قبول کروں گا جس طرح عام لوگ اپنی دلہن کو قبول کرتے ہیں“

خادم رونے لگا۔

آپ نے اسے چپ رہنے کی تلقین کی اور فرمایا ”تجھے نہیں معلوم کہ میں نے اس بار مرنے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے!“

خادم نے جواب دیا ”حضرت! میں نہیں جانتا“

آپ نے کہا ”اس بستی اُمِّ عُبیدہ پر ایک بہت بڑی وبا کا نزول ہونے والا تھا آج میں کئی دن سے اصرار کر رہا ہوں کہ وہ مجھے اٹھا لے مگر میری بستی والوں کو محفوظ رکھے آج مجھے یہ خوش خبری سنائی گئی ہے کہ بستی کو محفوظ کر دیا گیا مگر مجھے اس دنیا سے چلا جانا ہوگا“

خادم اور زیادہ زور شور سے رونے لگا۔

آخری لمحوں میں آپ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ آخر جمعرات کے دن، بوقت ظہر مورخہ ۱۲۔ ربیع الاوّل ۵۷۸ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔ آخری لمحوں میں آپ نے اپنی انگشت شہادت اٹھا رکھی تھی اور زبان سے کلمۂ طیبہ جاری تھا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



حضرت شمس تبریزیؒ

حضرت امام جعفر صادقؓ کے پوتے سید محمد عرف طبرستان کے شہر رے، سے ہجرت کر گئے اور وہاں محمد آباد نامی ایک بستی بسا کر رہنے لگے بعد میں اس خاندان کے دوسرے لوگ قندھار، خراساں اور سندھ وغیرہ ہجرت کر گئے اور اس خاندان کے ایک بزرگ عراق کے شہر سبزوار میں رہنے لگے یہ لوگ خاندانی روابط اور اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے آپس میں ملتے جلتے ضرور رہتے تھے ایک دوسرے سے بُعد و طویل مُسافت کا خیال کئے بغیر یہ لوگ قافلوں میں شریک ہو جاتے اور کوہستانی سلسلوں کو عبور کرتے اور میدانی علاقوں میں گرد و غبار اڑاتے اپنے عزیز رشتے داروں سے جا ملتے اسی خاندان کے ایک بزرگ خراسان سے سبزوار کے لیئے چلے سبزوار میں ان بزرگ کے عزیز سید صلاح الدین نور بخش رہتے تھے ان بزرگ کا قافلہ صحرائے نمک کے کنارے خیمہ زن تھا اور یہاں سے سبزوار صرف تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا دوپہر کی تند و تیز ہوائیں لوگوں کے چہرے جھلسانے لگیں اور قافلے والوں نے اپنے مخروطی خیموں کے در بند کر کے مضبوط ڈوریوں سے باندھ دیئے۔ ہوا کے تھپیڑے ان خیموں سے ٹکراتے اور پھسل کر ادھر اُدھر نکل جاتے۔ خطرناک موسم نے قافلے والوں کے حوصلے پست کر دیئے اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں پڑاؤ چھوڑیں گے لوگوں نے خیموں کے اندر ہی ظہر کی نماز ادا کی۔ سادات گھرانے کے بزرگ نماز ظہر پڑھ کر آرام کی نیت سے لیٹ گئے ابھی وہ سو بھی نہ سکے تھے اور نیم غنودگی کا عالم طاری تھا کہ انہوں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ انہوں نے دیکھا وہ سبزوار میں اپنے عزیز سید صلاح الدین نور بخش کے گھر میں فرو کش ہیں۔ صحن میں خاندان کے لوگ انہیں گھیرے بیٹھے ہیں اسی وقت آسمان سے سورج نے حرکت کی اور وہ آہستہ آہستہ سید صلاح الدین نور بخش کے مکان کی چھت پر اُترا چلا آ رہا ہے ان کا خوف سے برا حال ہو گیا۔ اور خواب ہی میں یہ سوچنے لگے کہ اگر یہ سورج واقعی نیچے آگیا تو دنیا کا کیا حشر ہو گا، یہ جل بھن کے راکھ ہو جائے گی۔ ابھی وہ یہ سوچ

رہا ہے تھے کہ سورج سید صلاح الدین نوربخش کی بیوی کی گود میں سما گیا۔ اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی یہ بہت پریشان ہوئے۔ رات کو قافلہ سبزوار کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب یہ بزرگ صلاح الدین نوربخش کے گھر میں داخل ہوئے تو انہیں یہ خوش خبری سنائی گئی کہ ایک دن پہلے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے اور لڑکے کا نام شمس الدین رکھ دیا گیا ہے ان بزرگ نے صلاح الدین نوربخش کو اپنا خواب سنایا اور پیش گوئی کی کہ لڑکا بڑا ہو کر کوئی بہت ہی خاص مرتبہ حاصل کرے گا جس سے اس کی شہرت اور عظمت قیامت تک سورج کی طرح چمکتی رہے گی۔

شمس الدین کی پرورش ہوتی رہی اور جب ذرا سن شعور میں داخل ہوئے تو انہیں ان کے چچا عبدالہادی کے سپرد کر دیا گیا عبدالہادی تفسیر، فقہ اور حدیث میں جواب نہ رکھتے تھے انہوں نے نہایت توجہ سے شمس الدین کو تعلیم و تربیت دینا شروع کر دی اور ایک قلیل مدت ہی میں شمس الدین نے علوم ظاہری و باطنی میں وہ مقام حاصل کر لیا کہ ان کے چچا عبدالہادی دنگ رہ گئے۔

۱۵ شعبان ۵۶۰ھ میں پیدا ہونے والا یہ بچہ ابھی انیس سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ باپ نے بدخشاں کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر کسی تجارتی مقصد سے نہیں اختیار کیا گیا تھا کیونکہ یہ لوگ ان میں سے تھے جو دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتے تھے اور جن کا ہر کام خدا کی خوشنودی کے پیش نظر انجام پاتا ہے سید صلاح الدین نوربخش نے کسی سے سنا تھا کہ بدخشاں اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ اللہ سے ناواقف ہے اور ان کے کان صدائے حق سے ناآشنا ہیں انہوں نے بیٹے کو ساتھ لیا اور ۵۷۹ھ میں بدخشاں روانہ ہو گئے بدخشاں والوں نے ان کی آواز اور پیغام کو تعجب سے سنا اور آہستہ آہستہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے یہاں تک کہ تھوڑی سی مدت میں ہزاروں خاندانوں کو دین حق میں داخل کر لیا۔ جب یہاں کام ختم ہو گیا تو انہوں نے تبت کوچک کا رخ کیا۔ تبت کوچک کے لوگ بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے یہاں شمس الدین کے جوہر کچھ زیادہ ہی آشکارا ہوئے یہ اپنے بوڑھے باپ کو چھوڑ کر ادھر ادھر بستیوں میں نکل جاتے اور لوگوں میں دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہتے۔ گوتم بدھ کے پیرو بھی معمولی لوگ نہیں تھے کہ آسانی سے ان کی بات مان لیتے وہ ان سے بڑی جرح بحث کرتے اور کوشش کرتے کہ ان مسلمان فقرا کو لاجواب کر دیا جائے لیکن یہ انہیں لاجواب کر دیتے۔

نوجوان شمس الدین تبت کوچک کی ایک گھاٹی میں بیٹھے مناظر قدرت سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور ان کا دل مالک حقیقی پر درود و سلام بھیج رہا تھا انہوں نے اپنی آنکھیں بند

کر رکھی ہیں اور دل ہی دل میں خدا کی شان بے نیازی اور خلاقی پر واہ واہ کر رہے تھے کہ اچانک انہیں چند آدمیوں کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے سامنے دیکھا چند بدھ متی جسم کو کفن میں چھپائے کھڑے ہیں انہوں نے حیرت سے سوال کیا "بابا! کیا بات ہے تم لوگوں نے مجھے تماشا کیوں بنا رکھا ہے؟"

ایک بدھ بھکشو نے جواب دیا "ہم لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

شمس الدین نے کہا۔ "ہم نے سنا تھا کہ تبت کو چک کے لوگ بے راہ روی اختیار کیے ہوئے ہیں اور ان کے کان صدائے حق سے ابھی تک محروم ہیں چنانچہ ہم لوگ یہاں یہی خدمت انجام دینے آئے ہیں"

بودھ بھکشو نے نفرت سے کہا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ گمراہ ہیں اور تم لوگ ہمیں دین حق اختیار کرنے پر مجبور کرو گے؟"

"نہیں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے ہمارے رسول مقبولؐ نے فرمایا لا اکراہ فی الدین، دین میں جبر نہیں، پھر ہم تم پر کس طرح دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ تم اپنا آبائی دین چھوڑ کے مسلمان ہو جاؤ"

بودھ بھکشو نے تعجب سے پوچھا "پھر تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

شمس الدین نے جواب دیا "اپنے رسول مقبولؐ کی حیاتِ طیبہ اور تعلیمات کے بارے میں ہم تم سب کو کچھ بتانے آئے ہیں اگر یہ باتیں تمہیں اچھی لگیں تو تم ان پر غور کرنا ممکن ہے ان میں کچھ باتیں ایسی موجود ہوں جو کبھی تم کو کام دے جائیں"

بودھ بھکشوؤں نے پوچھا "کیا وہ باتیں ہمارے شاکیہ منی کی باتوں سے زیادہ قیمتی ہیں"

شمس الدین نے جواب دیا "اس کا جواب میں نہیں تم خود دے لوگے کیونکہ اگر میں کچھ کہوں گا تو تم لوگ یہ کہو گے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے اپنے رسولؐ کی بے جا طرف داری کر رہا ہوں"

ایک بودھ بھکشو ذرا اور قریب آگیا بولا "اپنے رشی کی کچھ باتیں بتاؤ"

شمس الدین نے کہا "پہلے تم ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارے شاکیہ منی تمہیں کیا تعلیم دے گئے ہیں؟"

بودھ بھکشو نے جواب دیا "ہمارے شاکیہ منی نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم ظلم و تشدد سے

بچیں، لڑائی جھگڑا نہ کریں، ہتھیار سے بچیں۔"

شمس الدین نے کہا "لیکن ہمارے رسولؐ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی ہمارا ایک دانت توڑے تو ہم بھی اس کا ایک دانت توڑ سکتے ہیں کوئی ہمارے ایک طمانچہ لگائے تو اسے ہم بھی ایک طمانچہ لگا سکتے ہیں۔"

بودھ بھکشو نے کہا "ہمارے شاکیہ منی نے بتایا کہ زندگی اور دنیا بے کار سی چیزیں ہیں خواہشات کو ختم کر کے انسان ایک اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے اور وہ شئے جسے نروان کہتے ہیں خواہشات کو ختم کر کے پاک صاف زندگی گزار کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

شمس الدین نے کہا "لیکن ہمارے رسولؐ نے ہمیں بتایا ہے کہ لا رہبانیت فی الدین ہمارے دین میں رہبانیت نہیں، دنیا میں رہ کے دنیا کو اس طرح ترک کرو کہ دنیا بے معنی نہ کہلائے خدا نے اس دنیا میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے ہم انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اگر ہم اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ دنیا بے کار بنائی گئی ہے دنیا میں رہو لیکن اس طرح کہ دامن نہ آلودہ ہو، پانی سے دور رہ کے دامن خشک رکھنا کون سے کمال کی بات ہے ہاں پانی میں رہ کے آلودگی سے بچنا منتہائے کمال ہے۔"

اس طرح دیر تک ان دونوں میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور جب یہ گفتگو بند ہوئی تو بودھ بھکشو مسلمان ہو چکے تھے انہیں اپنی سابقہ زندگی اور مذہب پر قائم رہنے کا بڑا دکھ تھا۔



تبت کو چک سے فارغ ہو کے یہ کشمیر میں داخل ہو گئے یہاں انہیں بڑی محنت کرنا پڑی یہاں ایک قوم چنگر نامی آباد تھی جو آفتاب پرست تھی اس قوم نے انہیں بہت ستایا لیکن یہ لوگ بھی باز نہیں آئے اور ہمت نہیں ہارے، شمس الدین یہاں بھی پیش پیش تھے وہ اکثر و بیشتر چنگر قوم کے مذہبی رہنما کے پاس پہنچ جاتے اور اس سے باتیں کرتے رہتے۔ چنگر قوم کا یہ رہنما ساٹھ پینسٹھ سالہ ایک بوڑھا تھا جس کی داڑھی قدیم چینیوں جیسی تھی اور جس کی پیشانی پر شکنیں تپلی رسی کی لڑیوں جیسی نظر آتی تھیں اس کے دانت کچھ گر چکے تھے اور کچھ باقی تھے وہ شمس الدین سے ہمیشہ بد اخلاقی سے پیش آتا لیکن شمس الدین ہمیشہ بد اخلاقی کا جواب خوش اخلاقی سے دیتے۔

ایک دن چنگر قوم کے بوڑھے رہنما نے شمس الدین سے کہا "تم میری قوم میں اپنا وقت بلا وجہ ضائع کر رہے ہو کیا تم یہ یقین رکھتے ہو کہ اس دنیا میں کوئی چیز آفتاب سے زیادہ بڑی اور روشن ہو سکتی ہے روشن اور باعظمت۔"

شمس الدین نے جواب دیا: "لیکن بابا! ہم جس خدا کی عبادت کرتے ہیں یہ سورج اس دربار کا ادنیٰ سا چاکر ہے تم لوگ اس کی عظمت اور طاقت کو مانتے ہو تو شوق سے مانتے رہو لیکن میں تم سے درخواست ضرور کروں گا کہ اس معاملے میں ذرا غور و فکر سے بھی کام لو"

بوڑھے آفتاب پرست نے کہا "میرے باپ دادا غلط نہیں تھے اور انہوں نے جو مذہب اور عقائد اختیار کر رکھے تھے وہ غلط نہیں تھے۔"

شمس الدین نے جواب دیا۔ "لیکن بابا! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر یہی انداز فکر دنیا کا ہر آدمی اختیار کر لے تو پھر دنیا کا ہر انسان سچا ہی نکلے گا۔ لیکن ہر بات صداقت اور عقل کے خلاف ہے کہ اس دنیا کا ہر آدمی سچا ہو اور دنیا کے ہر آدمی کے باپ دادا مستند ہوں عقلمندی یہ نہیں ہے کہ جانوروں کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتے رہیں اور عقل اور سوچ بچار سے کام نہ لیں۔ آدمی کو خدا نے عقل اسی لئے دی ہے کہ وہ اس عقل کے ذریعے کھرے کھوٹے میں فرق کرتا ہے لیکن اگر انسان ایسا نہیں کرتا اور محض باپ دادا ہی کی راہ پر چلتے رہنے کو عقل کی کسوٹی پر نہیں کستا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی اور جانور میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔"

بوڑھا رہنما سوچ میں پڑ گیا کچھ توقف کے بعد بولا "اچھا پھر تم بتاؤ کہ سورج سے بڑی کیا چیز ہو سکتی ہے؟"

شمس الدین نے جواب دیا "رات کی وہ چادر جو سورج کے چہرے پر پڑ جاتی ہے اور سورج کی ساری توانائی اور روشنی غائب ہو جاتی ہے۔"

بوڑھا رہنما چونک پڑا۔ غصے میں بولا "اے نوجوان! ادب کرو ادب، سورج کو یوں ذلیل نہ کرو۔"

شمس الدین نے جواب دیا "میں آفتاب کو ذلیل کب کر رہا ہوں۔ میں تو اس کی حیثیت کی نشان دہی کر رہا ہوں"

بوڑھے رہنما نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کسی سوچ میں پڑ گیا کچھ دیر بعد دریافت کیا "اور تم جس کی پرستش کرتے ہو وہ کیسا ہے؟"

شمس الدین نے جواب دیا "ہمارا خدا وہ ہے جو ہمیں یا کسی کو بھی نظر نہیں آتا لیکن وہ ہر جگہ موجود ہے اس کے کان نہیں لیکن وہ سنتا ہے آنکھ نہیں لیکن دیکھتا ہے

وہ ہر شئے اور پوری کائنات پر محیط ہے وہی ہر جاندار کو رزق پہنچاتا ہے اس کی ایما پر ہوائیں چلتی ہیں، سورج اور چاند طلوع ہوتے ہیں بیج نشو ونما پا کے زمین سے پودے کی شکل میں اُبھرتا ہے اور وہی ہے جو ان پودوں کو بڑھاتا ہے ان سے پھل پھول پیدا کرتا ہے اسی کے حکم سے انسان پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے اس کی کوئی شکل نہیں لیکن وہ ہر شکل میں موجود ہے۔

بوڑھے رہنما پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا، پوچھا کیا مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے؟

شمس الدین نے جواب دیا "تعداد نہ صرف بڑھ رہی ہے بلکہ بڑھ چکی ہے دنیا کے دور دراز حصوں میں مسلمان پہنچ چکے ہیں اور پرانے مذہب ختم ہو رہے ہیں اس مذہب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو قبول کرنے والا ایک خدا کو سجدہ کر کے ہزاروں بتوں کے سجدوں سے نجات پا جاتا ہے۔"

بوڑھے رہنما نے کہا "تم لوگ کس طرح عبادت کرتے ہو، مجھے تو سکھاؤ۔"

شمس الدین نے جواب دیا "پہلے تم اسلام قبول کر لو پھر میں مذہبی ارکان بھی سکھا پڑھا دوں گا۔"

بوڑھے رہنما نے ایک عجیب سا سوال کیا پوچھا "مگر ذرا ایک بات تو بتاؤ مسلمان ہو جانے کے بعد میرا مقام کیا ہوگا کیونکہ اس وقت میں اپنی قوم کا رہنما اور پروہت ہوں لیکن کیا مسلمان ہو جانے کے بعد بھی مجھے اپنا یہ مرتبہ حاصل رہے گا؟"

شمس الدین نے جواب دیا "افسوس کہ اسلام میں ایسا کوئی دستور نہیں کہ آدمی اپنے حسب نسب کی بڑائی سے بڑائی حاصل کرنے کا مستحق قرار پائے یہاں تو پہلا کلمہ ہی یہ ہوتا ہے لاالہ الا اللہ، نہیں کوئی اللہ، سوائے اللہ کے۔ یہاں اللہ کی بڑھائی اور عظمت کے آگے کسی کی بڑائی اور عظمت کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنی عزت کرانا چاہتا ہے اور یہ عزت اسے خدا کی نظر میں حاصل ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی ذاتی کردار میں رفعت و عظمت پیدا کرے، زہد و تقویٰ سے بڑا بنے، تم اگر مسلمان ہو جانے کے بعد بھی بڑے رہنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے عمل اور کردار سے بڑے ہو اور اس اعتبار سے جو شخص بھی بڑا بن جائے گا اسے ان تمام لوگوں پر بھی فضیلت اور برتری حاصل ہوگی جو مسلمان ہونے سے پہلے حسب نسب سے بڑے کہلاتے تھے۔"

ان سچی سچی باتوں نے بوڑھے رہنما کے دل پر بڑا اثر کیا اور وہ مسلمان ہوگیا اس کے

ساتھ ہی اس کی قوم بھی مسلمان ہو گئی۔

بدخشاں اور کشمیر میں شمس الدینؒ سات سال تک رہے اور یہاں اپنا کام ختم کر کے ۵۸۶ھ میں سبزوار واپس تشریف لے گئے اب ان کی عمر چھیلس سال کی ہو چکی تھی وطن میں ان کی شادی کر دی گئی شادی کے بعد دو لڑکے پیدا ہوئے ان میں سے ایک کا نام سید نصیر الدین اور دوسرے کا نام سید علاء الدین احمد رکھا گیا

یہاں ان پر ایک عجیب سا غلبہ ہو گیا اور وہ مجذوبانہ زندگی گزارنے لگے اس حال میں نہ تو انہیں کپڑوں کا ہوش رہتا نہ کسی اور بات کا۔ زبان اور نظر میں ایسا اثر ہو گیا کہ جو زبان سے نکلتا فی الفور ہو جاتا اور جس شئے پر نظر ڈال دیتے اپنا اثر اس میں منتقل کر دیتے۔



شمس الدینؒ نے اسی عالم میں سبزوار کو خیر باد کہا اور تبریز چلے گئے تبریز انہیں بہت پسند تھا تبریز سے ترکی کے شہر قونیہ تشریف لے گئے قونیہ کے لوگوں نے ایک ننگ دھڑنگ شخص کو گلی کوچوں اور بازاروں میں چپ چاپ گھومتے پھرتے دیکھا لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں دی شمس الدینؒ بھی کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے یہ چلتے چلتے بازاروں میں دکانوں کے سامنے ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے اور دنیا داروں کو دنیا کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا دیکھتے رہتے یہ ان سے کوئی بات تو نہ کرتے لیکن بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہتے "بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان گلے گلے دنیا کی دلدل میں پھنس جائے"

اس کوچہ گردی اور بازار نوردی میں ایک دن وہ ایک نہایت قابل شخص کے کتب خانے میں گھس گئے یہاں ایک دراز ریش عالم قیمتی لباس میں ملبوس اپنے بہت سارے شاگردوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں استاد اور شاگردوں کے سامنے بھی کتابیں رکھی تھیں ان میں منطق، فلسفہ، الٰہیات، مذہبیات اور دوسرے علوم کی بے شمار کتابیں موجود تھیں کتب خانے کے استاد اور اس کے شاگردوں نے اس ننگ دھڑنگ حواس باختہ شخص کو ناگواری سے دیکھا اور ان سے دریافت کیا "تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

شمس الدینؒ نے کوئی جواب نہ دیا اور کتابوں کو دیکھنے لگے۔

کتب خانے کے مالک اور شاگردوں کے استاد نے تلخی سے سوال کیا "یہاں کیا

لینے آئے ہو؟ اس علمی ماحول میں تم جیسے ان پڑھ اور عقل و خرد سے عاری شخص کا کیا کام؟"
شمس الدینؒ نے کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہے؟"
فاضل استاد نے حقارت سے جواب دیا "یہ وہ ہیں جسے تم نہیں جانتے۔"
شمس الدین نے کتب خانے پر ایک نظر ڈالی اور آپ کی نگاہِ جہاں سوز نے کتب خانے میں آگ لگادی۔ کتابیں جلنے لگیں۔ فاضل استاد گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور بے ساختہ سوال کیا "حضرت! یہ کیا ہے؟"
شمس الدینؒ نے بے نیازی سے جواب دیا "یہ وہ ہیں جسے تم نہیں جانتے۔"
شمس الدینؒ یہ کہہ کر باہر نکل آئے اور فاضل استاد اپنے شاگردوں کی مدد سے کتب خانے کی آگ بجھانے لگا۔ جب آگ پر قابو پالیا گیا تو فاضل استاد کو اس مرد قلندر کی تلاش ہوئی لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ فاضل استاد ایک ایک سے ان کا پتہ پوچھتا پھرتا رہا لیکن قونیہ کے شہریوں کا ایک ہی جواب تھا "اس مرد قلندر سے ہم سب اسی حد تک واقف ہیں کہ ہم نے آج صبح تک اسے قونیہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں مارا مارا پھرتے دیکھا ہے لیکن دوپہر سے یہ شخص بھی نہیں دکھائی دیا۔"
فاضل استاد کے قلب و نظر کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو چکا تھا اس نے کتب خانہ چھوڑ دیا اور اس مرد قلندر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔



کتب خانے کا یہ واقعہ جو اوپر بیان ہو چکا ہے اسے خزینۃ الاصفیاء کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری نے دوسری طرح بیان کیا ہے جو نیچے دیا جا رہا ہے۔
شمس الدین قونیہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے کے دوران ایک دن ایک کتب خانے میں گھس گئے یہ کتب خانہ مولوی جلال الدین رومی (مصنف مثنوی معنوی) کا تھا۔

مولانا رومی اپنے شاگردوں اور کتابوں کے درمیان بیٹھے درس دے رہے تھے مولانا رومی نے ایک ننگ دھڑنگ شخص کو کتب خانے میں کھڑا دیکھ کر حیرت سے کہا۔
"تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"
شمس الدین کتابوں کو دیکھتے رہے کوئی جواب نہ دیا۔

مولانا رومی نے پھر پوچھا "آخر تم چاہتے کیا ہو اور ہمارے درس و تدریس میں کیوں مخل ہو رہے ہو؟"

شمس الدین نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا "یہ کیا ہے؟"

مولانا رومی نے حقارت سے جواب دیا "اسے قیل و قال کہتے ہیں جسے تم نہیں جانتے"

شمس الدین نے مولانا رومی کے آگے سے کتابیں اٹھا کے پانی کے حوض میں پھینک دیں۔

قیمتی کتابیں پانی کی تہہ میں بیٹھتی چلی گئیں مولانا رومی گھبرا کے اٹھے اور حیرت سے کہا "حضرت یہ کیا؟"

شمس الدین نے کوئی جواب دینے کی بجائے حوض سے کتابیں نکال کے مولانا رومی کے آگے بڑھا دیں۔

مولانا رومی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان میں سے ایک کتاب بھی پانی میں بھیگی نہیں تھی انہوں نے ایک ایک کتاب ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھی اور اس میں پانی کی نمی کو تلاش کرتے رہے لیکن وہاں تو کسی کتاب پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

مولانا رومی نے شمس الدین کی طرف حیرت و استعجاب سے دیکھا اور سوال کیا۔

"شیخ یہ کیا ہے؟"

شمس الدین نے جواب دیا "یہ ذوق و حال ہے جسے تم نہیں جانتے"

مولانا رومی پر سکتہ طاری ہو گیا اور شمس الدین نے اپنی راہ لی ہوش میں آتے ہی مولانا رومی نے انہیں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ نہیں ملے اور جب ملے تو مولانا رومی انہی کے ہو کے رہ گئے۔

شمس الدین کو تبریز بہت پسند تھا، وہ تبریز ہی میں رہنے لگے مولانا رومی نے بھی ان کے ساتھ ہی اقامت اختیار کر لی۔ شمس الدین یہیں سے شمس تبریزی ہو گئے تبریز میں وہ بارہ سال تک حالت سکر میں مبتلا رہے یہیں شمس تبریزی اور مولانا رومی نے ایک ہی حجرے میں تین ماہ تک چلہ کشی کی۔ مولانا رومی کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ شب و روز ان کی صحبت میں رہتے۔ مولانا کے عقیدت مندوں کو یہ بات شاق گزرنے لگی۔ لوگ مولانا رومی سے تنہائی میں ملنا اور علمی مباحث پر بات کرنا چاہتے لیکن شمس تبریزی کی موجودگی میں ایسا ہونا ممکن نہ تھا چنانچہ عقیدت مندوں کے دلوں میں شمس تبریزی کی طرف سے غبار رہنے لگا۔

شام سے ذرا پہلے ایک ادھیڑ عمر عالم مولانا رومی سے ملنے آیا۔ مولانا رومی شمس تبریز کے روبرو دو زانو بیٹھے ہوئے تھے عالم نے کہا "مولانا! میں آپ سے بعض علمی مباحث پر باتیں کرنا چاہتا ہوں کیا آپ ہمیں تنہائی کی سعادت بخشیں گے؟"

مولانا رومی نے ننگ دھڑنگ شمس تبریزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جناب آپ کو جو باتیں بھی کرنا ہیں حضرت شمس تبریز کے روبرو ہی کریں کیونکہ میرا معاملہ ان سے الگ نہیں ہے"

ادھیڑ عمر عالم نے کسی قدر تلخی سے کہا "ابھی میں اتنا بھی گزرا انسان نہیں ہوں کہ لوگ مجھے سڑی دیوانہ سمجھنے لگیں، نہ میں اپنے علم کی بیقدری کر سکتا ہوں"

مولانا رومی نے پوچھا "آخر علم کی بے قدری کس طرح ہوتی ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "کیا یہ علم کی بے قدری نہیں ہے کہ ایک ننگ دھڑنگ شخص نے تمہاری جیسی باکمال اور صاحبِ علم شخصیت پر قبضہ کر رکھا ہے"

مولانا رومی نے کہا "یہ ننگ دھڑنگ شخص ہی وہ منارہ رہنمائی ہے جس سے میرے دل نے سوز و گداز کی روشنی پائی ہے"

یہ شخص ناراض ہو کے چلا گیا اور اس نے شمس تبریزی کی مخالفت میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ شمس تبریزی تبریز سے تنگ آ کر اپنے وطن سبزوار چلے گئے وہاں سے بغداد کی راہ لی لیکن ان کی حالت اس بے چین شخص جیسی تھی جس کو ایک جگہ ٹھہرنا اور قیام کرنا نصیب ہی نہ ہوتا ہو، تبریز کی محبت انہیں پھر کھینچ لے گئی لیکن یہاں کچھ دن رہ کر دمشق چلے گئے اور دمشق سے پھر بغداد کی راہ لی۔

علمائے ظاہر کو شمس تبریزی کے خیالات سے سخت اختلاف تھا وہ ان کی حالت اور مقبولیت سے حسد کرتے تھے چنانچہ ان علماء نے بغداد کے حکمران کو خوب خوب ورغلایا اور اسے یہ یقین دلایا کہ اگر شمس تبریزی کو بغداد میں رکھا گیا تو وہ دن دور نہیں جب خدا کا عتاب اس شہر میں نازل ہو جائے بادشاہ نے علمائے دربار اور علمائے شہر کے دباؤ میں آ کے شمس تبریزی کے نام حکم جاری کر دیا کہ وہ فوراً بغداد چھوڑ دیں۔ شمس تبریزی نے حکم ملتے ہی بغداد چھوڑ دیا اور کاظمین چلے گئے۔

بادشاہ شہر بدری کا حکم دے کر تخلیے میں چلا گیا۔ اس وقت اس کا سر بھاری ہو رہا

تھا اور دل پر ایک بوجھ سا تھا اسے ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی اندر بیٹھا دل کو چٹکیوں سے مسل رہا ہے بادشاہ کئی دن تک اداس اداس اور کھویا کھویا سا رہا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہے کئی دن بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ ولی عہد کی حالت نازک ہے بادشاہ گھبرایا ہوا اندر پہنچا، وہاں اس کا عزیز ترین شہزادہ بسترِ مرگ پر دراز اوپر دیکھ رہا تھا گویا اسے اپنی موت کا انتظار ہو۔

بادشاہ نے محل سرا کی خواتین کو ڈانٹا اور کہا "جب شہزادے کی حالت اتنی خراب تھی تو پھر مجھے مطلع کیوں نہیں کیا گیا؟"

کسی خاتون نے جواب دیا۔ "حضور ہم سب کی کوشش یہ تھی کہ شہزادے کی علالت کی خبر حضور کو پہنچا کر پریشان نہ کیا جائے کیونکہ امورِ مملکت کی فکر اور تدبیر پر حضور پہلے ہی الجھے اور پریشان رہتے ہیں۔"

بادشاہ نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "شہزادہ ولی عہد ہے اس کے علاوہ میں اس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں اگر اسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ....."

شاہی اطبا کی پانچ رکنی جمعیت شہزادے کے علاج میں لگی ہوئی ہے اور خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ وہ اسے بچا لیں گے۔

بادشاہ شہزادے کے چہرے پر جھک گیا، کمزوری کی وجہ سے شہزادے کی آنکھیں گڑھے میں چلی گئی تھیں اور رخسار کے دونوں طرف کے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ بادشاہ نے نہایت پیار سے شہزادے کو مخاطب کیا۔ "بیٹے! تمہارا کیا حال ہے؟"

شہزادے نے پھٹی پھٹی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا لیکن اسے پہچان نہ سکا۔

بادشاہ نے اسے پھر مخاطب کیا "بیٹے! اِدھر دیکھو میری طرف میں تمہارا باپ تمہیں دیکھنے آیا ہوں۔"

بیٹے نے باپ کو غصے کی نظروں سے گھورا اور ہذیانی کیفیت میں جواب دیا۔ "وہ کہاں ہے؟ وہ جسے خدا نے تو پسند کیا لیکن اس کے بندوں نے اسے نکال باہر کیا۔ وہ کہاں ہے جسے لوگ پہچان نہیں سکے اور کسی نبی کی طرح جلا وطن کر دیا۔"

بادشاہ کانپ گیا۔ وہ شہزادے کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "بیٹے! تم کس کی بات کر رہے ہو؟ کیا تمہارا اشارہ شمس تبریزی کی طرف تو نہیں؟ اگر تم یہ سب

اس کی بابت کہہ رہے ہو تو میں بتاتا ہوں کہ اسے علمائے دربار اور علمائے شہر نے بالاتفاق بے دین اور گمراہ قرار دے دیا ہے۔"

شہزادے کے ہونٹ کپکپائے، نہایت نحیف آواز میں کہا۔ "خدا کی شان کہ گمراہ دین دار کو گمراہ قرار دے رہے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی ذات کے شر سے بھی آگاہ نہیں دوسرے کے خیر کو شر قرار دے رہے ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "اگر تم کہو تو میں شمس تبریزی کو کاظمین سے بلوا لوں۔"

شہزادے نے کرب سے چہرے کو بھینچا، بولا "میں مر رہا ہوں، میں مر جاؤں گا، میرا جسم کھنچ رہا ہے، میرا دم نکل رہا ہے میری روح جسم کو چھوڑ رہی ہے۔"

بادشاہ نے گھبرا کے طبیبوں کو طلب کیا۔ اس پانچ رکنی وفد نے آتے ہی شہزادے کا علاج شروع کر دیا۔

بادشاہ نے بے چینی سے طبیبوں کو مخاطب کیا کہا۔ "کیا شہزادہ جاں بر ہو جائے گا کیا یہ اچھا ہو جائے گا؟"

اطبا کے سربراہ نے مایوسی سے کہا۔ "میں حضور والا کو تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو بعد میں مجھے پچھتانا پڑے گا۔" پھر سر جھکا کے عرض کیا۔ "کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ خدا ہمیں شرمندہ کرنا چاہتا ہے۔"

بادشاہ اس لطیف اشارے کا مطلب سمجھ گیا بولا۔ "تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو، میں اشاروں کی باتیں پسند نہیں کرتا، میں ابہام کا آدمی نہیں ہوں۔"

طبیبوں کے سربراہ نے جواب دیا۔ "حضور والا! اب دوا کا وقت نہیں رہا، دعا کا وقت ہے بس یہ خادم تو اسی طرح اپنا ما فی الضمیر بیان کر سکتا ہے۔"

شہزادہ ایک بار پھر بڑبڑایا۔ "مجھے کاظمین لے چلو کاظمین جاؤں گا۔"

بادشاہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں اس نے طبیبوں سے دریافت کیا۔ "اسے تم لوگ کتنی دیر تک زندہ رکھ سکتے ہو؟"

طبیبوں کے سربراہ نے جواب دیا۔ "بس چند گھنٹے۔"

بادشاہ نے بے چینی سے کہا۔ "نہیں اس میں کچھ اضافہ کر دو میں اس مرد بزرگ کو کاظمین سے بلائے لیتا ہوں اور اس سے معافی مانگ لوں گا اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے

اور یہ اسی زیادتی کی سزا ہے جو شہزادہ جھیل رہا ہے اور میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ اس کے بعد بادشاہ نے شہزادے کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا، بیٹے تم فکر نہ کرو میں ابھی اسی وقت شمس تبریزی کو بلوائے لیتا ہوں۔

بادشاہ شہزادے کو بوسہ دے کر باہر چلا گیا اور اسی وقت چند آدمیوں کا ایک وفد کاظمین روانہ کر دیا گیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر شمس تبریزی کو اپنے ساتھ لے کر واپس آئیں ادھر سے فارغ ہو کے بادشاہ پھر بیمار شہزادے کے پاس پہنچ گیا شہزادے پر اس وقت بھی ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

کئی دن بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ شہزادہ جاں کنی میں مبتلا ہے اور چند ساعتوں کا مہمان ہے بادشاہ گھبرایا ہوا اندر پہنچا۔ شہزادے نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

بادشاہ نے بے بسی سے شہزادے کی طرف دیکھا اور علمائے شہر اور علمائے دربار کو برا بھلا کہنے لگا شہزادے نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا، گویا وہ باپ کو الوداعی سلام کر رہا ہو بادشاہ کا دل ڈوبنے لگا اس نے جھنجوڑتے ہوئے کہا "بیٹے! کیا بات ہے تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

شہزادے کی آنکھیں پتھرانے لگیں اور کچھ ہی دیر بعد شہزادے کی سانس رک گئی اور سر ایک طرف ڈھلک گیا محل میں کہرام برپا ہو گیا اور بادشاہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شاہی طبیب آگے بڑھے اور بغور معائنے کے بعد اعلان کیا، شہزادہ اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ چکا ہے اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کو نیند سے بیدار نہ کیا جائے۔

اور تھوڑی ہی دیر بعد بادشاہ کو مطلع کیا گیا کہ شمس تبریزی کو کاظمین سے لے آیا گیا ہے بادشاہ بحالت جنون باہر نکلا اور دیوانہ وار چیخا، کہاں ہیں شمس تبریزی؟ انہیں میرے قریب لاؤ تاکہ میں ان سے ہاتھ جوڑ کے اور ان کے قدموں میں گر کے معافی مانگوں۔ میں نے انہیں ستایا تھا ان کا دل دکھایا تھا چنانچہ میں اپنی سزا کو پہنچ گیا، کہو اب تو مجھے معاف کر دیں۔

درحقیقت یوں محسوس ہوا گویا شدتِ غم سے بادشاہ کا دماغی توازن جاتا رہا ہے

شمس تبریزی بادشاہ کے قریب گئے اور پوچھا "بابا! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"
بادشاہ ان کے قدموں میں گر گیا "حضرت! میں لٹ گیا، میں تباہ ہوگیا، میرا تاج و تخت ویران ہوگیا، ولی عہد فوت ہوگیا۔"

"ولی عہد فوت ہوگیا؟" شمس تبریزی نے حیرت سے سوال کیا "کہاں ہے ولی عہد ذرا میں بھی تو اسے دیکھوں۔"

بادشاہ نے جواب دیا "وہ اندر چادر میں منہ ڈھلپے سو رہا ہے۔"
شمس تبریزی نے کہا "تم مجھے اس کے پاس لے چلو، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"
بادشاہ نے مایوسی سے کہا "اب آپ اس سے کیا ملیں گے اب اس میں رہا ہی کیا ہے ایک جسدِ بے روح ہے جو بستر پر دراز مٹی میں ملنے کا منتظر ہے۔"
شمس تبریز نے غصے میں کہا "بابا! تم بیکار باتوں میں وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ مجھے اندر لے چلو۔"
بادشاہ ان کے بیحد اصرار پر اندر لے گیا۔ شمس تبریز مردہ شہزادے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہے پھر چہرے سے چادر سرکا کے شہزادے کو مخاطب کیا "یہ مکاری کیوں؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو اس طرح مکاری سے مر کر مجھ پر تہمت رکھ کے آسانی سے چلا جائے گا نہیں ایسا نہیں ہوگا، ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔"
بادشاہ نے کہا "حضرت! یہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟"
شمس تبریز نے جواب دیا "اس مکار سے، تمہارے ولی عہد سے۔"
بادشاہ گلوگرفتہ آواز میں بولا "لیکن یہ زندہ کب ہے یہ تو مر چکا ہے۔"
شمس تبریز نے کہا "یہ مُردہ کہاں ہے مکر کر کے پڑا ہے" اس کے بعد شہزادے سے کہا "قم باذن اللہ" (اٹھ جا اللہ کے حکم سے)
شہزادہ نہیں اٹھا آپ نے دوبارہ حکم دیا "قم باذن اللہ (اٹھ جا اللہ کے حکم سے)"

شہزادہ پھر نہیں اٹھا۔ شمس تبریز نے تیسری بار پھر یہی کہا لیکن شہزادہ نہیں اٹھا آخر چوتھی بار غصے میں کہا "قم باذنی (اٹھ جا میرے حکم سے)"
شہزادہ فوراً اٹھ کے بیٹھ گیا۔

شمس تبریز اس کے بعد فوراً باہر چلے آئے اور محل میں ایک واویلا سی مچ گئی "شمس تبریز نے مردہ زندہ کر دیا، شمس تبریز نے مردہ شہزادے کو زندہ کر دیا" یہ سنسنی خیز خبر محل سے نکل اور پورے شہر میں پھیل گئی علمائے شہر اور علمائے دربار ناک بھوں چڑھائے چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ غضب خدا کا یہ شمس تبریز کو آخر ہو کیا گیا ہے خدا کے حکم سے مردہ شہزادہ اٹھا نہیں لیکن اپنے حکم سے اٹھایا تو فوراً اٹھ بیٹھا، شمس تبریز نے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہے اس پر شرعی حد جاری ہونا چاہیئے۔

بڑے بڑے تمام علماء جمع ہوئے شمس تبریز کو ان کے روبرو کھڑا کر دیا گیا اس معاملے میں بادشاہ بھی کچھ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ شمس تبریز پر تکفیر اور دعوئے الوہیت کا الزام لگایا گیا تھا۔

علماء نے آپ سے جواب طلب کیا "کیا یہ صحیح ہے کہ جب تم نے قم باذن اللہ کہا تو مردہ شہزادہ زندہ نہیں ہوا"

شمس تبریز نے جواب دیا "ہاں یہ بالکل صحیح ہے"

علماء نے پھر سوال کیا "اور کیا یہ بھی درست ہے کہ جب تم نے مردہ شہزادے سے قم باذنی (اٹھ جا میرے حکم سے) کہا تو مردہ زندہ ہو گیا"

شمس تبریز نے جواب دیا "ہاں یہ بھی درست ہے"

علماء نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا "یعنی مردہ شہزادہ اللہ کے حکم سے اٹھا نہیں لیکن تمہارے حکم سے اُٹھ بیٹھا، آخر یہ کیا بات ہوئی"

شمس تبریز نے جواب دیا "کیا میں اور خدا الگ الگ ہیں وہ بھی خدا ہی کی آواز تھی جس نے یہ کہا تھا کہ اٹھ جا میرے حکم سے چنانچہ مردے نے خدا کے حکم کی تعمیل کی اور اُٹھ بیٹھا"

علماء نے غصے میں پوچھا "کیا تم خدا ہو، کیا تم خدائی کے دعویدار ہو؟"

شمس تبریز نے جوش میں کہا "میں نے یہ کب کہا کہ میں خدائی کا دعوے دار ہوں؟"

علماء نے کہا "جب تم نے اپنے حکم سے مردے کو زندہ کر دیا تو اس کا اور کیا مطلب ہوا؟"

شمس تبریز نے جواب دیا "اس کا مطلب تمہاری موٹی کھوپڑی میں نہیں سمائے

گا بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جس آواز نے قم باذنی کہا تھا وہ میری اپنی آواز نہیں تھی وہ اللہ کی آواز تھی اور جب اللہ نے خود ہی یہ حکم دیا کہ میرے حکم سے اٹھ جا تو مردہ اُٹھ کے بیٹھ گیا پہلے میں نے تین بار اللہ کا نام لے کر اٹھنے کا حکم دیا تھا لیکن مردہ نہیں اُٹھا تھا۔"

علما نے عاجز آ کے کہا "تمہاری باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

شمس تبریزی نے جواب دیا "ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں اس سے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بادشاہ اپنا کوئی حکم اپنے کسی خدمت گار کے ذریعے کسی تک پہنچایا اس شخص نے اس پر عمل نہیں کیا بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا لیکن سننے والے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا آخر بادشاہ خود اس شخص کے پہنچا اور یہی حکم اپنی زبان سے دیا تو بادشاہ کی پہلی آواز پر شخص مذکور نے تعمیلاً اپنا سر جھکا دیا۔"

علما نے حیرت سے کہا "لیکن وہ آواز تو تمہاری تھی وہاں خدا کہاں تھا؟"

شمس تبریز علما کے بحث مباحثے سے تنگ آ گئے تھے، بولے "میں نے تو کہہ دیا کہ خدا نے میری آواز میں اپنا حکم صادر فرمایا تھا۔"

علما نے عاجز آ کے کہا "شمس تبریز کا عذر ناقابل قبول ہے ان کی تاویل بے جان ہے اور ان کی دلیل بعید از فہم ہے اور علما مجبور ہیں کہ شمس تبریزی پر دعوائے الوہیت کی فرد جرم لگا کر حد شرعی جاری کریں۔"

شمس تبریز معصومیت سے علما کی صورتیں دیکھنے لگے۔

علما کے سربراہ نے اپنا فیصلہ سُنایا "چونکہ شمس تبریز نے عملاً الوہیت کا دعویٰ کر دیا ہے اس لئے علمائے حق کی یہ مجلس تعزیراً یہ شرعی حد جاری کرتی ہے کہ شمس تبریز کی کھال کھنچوا کے عبرت کی خاطر پورے شہر میں گشت کرائی جائے۔"

شمس تبریز نے کسی خوف یا دُکھ کا اظہار کئے بغیر کہا "بس اتنی سی بات، تم لوگوں کو میری کھال درکار ہے فکر نہ کرو میں ابھی اتار کے دیتا ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے کمبل اوڑھ لیا اور اپنی کھال خود اپنے ہاتھ سے اتار کے علما کے حوالے کر دی اور کہا "لے جاؤ اسے اور پورے شہر میں گشت کرا کے لوگوں کے لیے عبرت کا نظارہ فراہم کر دو۔"

علما نے یہ کھال پورے شہر میں گشت کرائی ۔

اس کے بعد آپ نے بغداد چھوڑ دیا اور برصغیر کے لئے روانہ ہو گئے اس سفر میں بادشاہ کا بیٹا محمد بھی ان کے ساتھ تھا ایک جگہ یہ کشتی میں سوار دریا کے دوسری طرف جا رہے تھے کہ کشتی ڈگمگانے لگی ۔ آپ نے شہزادے سے کہا "کیا تمہارے پاس کوئی قیمتی چیز موجود ہے ؟"

شہزادے نے جواب دیا "ہاں ایک لعل میرے پاس موجود ہے "

شمس تبریز نے کہا " اسے دریا میں پھینک دو ، ورنہ کشتی ڈوب جائے گی "

شہزادے نے حکم کی تعمیل کی اور لعل دریا میں پھینک دیا ۔ اس کے بعد دریا میں دور تک لعل ہی لعل دکھائی دینے لگے ۔



آپ نے ملتان میں سکونت اختیار کی لیکن یہاں کے لوگوں نے ان کی بڑی مخالفت کی ۔ کھنچی ہوئی کھال کے نیچے سے نکل آنے والے گوشت کا جب بھی کوئی حصہ کھلتا مکھیاں بھن بھن کرنے لگتیں ۔ لوگ ان کے عقائد اور ادھڑے ہوئے جسم سے گھن کھانے لگتے شہزادہ ان کے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا ۔ لوگ ان دونوں کو اپنے پاس نہ آنے دیتے ۔

بھوک سے برا حال ہو رہا تھا ، اتفاق سے آپ کو کہیں سے گوشت کا ایک ٹکڑا ہاتھ آ گیا ۔ آپ نے شہزادے کو حکم دیا " شہزادے ! جاؤ اور کسی سے آگ مانگ لاؤ تاکہ میں اس گوشت کے ٹکڑے کو بھون لوں "

شہزادے نے تعمیل ارشاد میں گلی گلی آگ کی طلب میں نکل کھڑا ہوا لیکن بدقسمتی سے جس سے بھی آگ مانگی اس نے نفی میں جواب دیا ۔

ایک جگہ آگ جل رہی تھی شہزادے نے آگ کے قریب جا کے لوگوں سے کہا " لوگو ! مجھے ذرا سی آگ درکار ہے ۔

ایک تندخو شہزادے کو جلالی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا " کیا تو وہی شخص ہے جو اس ننگ دھڑنگ ادھڑی کھال والے گھناؤنے آدمی کے ساتھ کہیں باہر سے آیا ہے ؟"

شہزادے نے جواب دیا " ہاں ! میں وہی شخص ہوں "

اس خوفناک شخص نے غصے میں کہا " اچھا تو تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے ہم سب پر بھی کوئی عذاب

نازل ہو۔"

شہزادے نے خوشامد سے کہا "لوگو! اب تم لوگ ہمیں آٹا بھی نہ دو تاکہ ہمارے دلوں سے تمہارے لیئے دعائے خیر کی جگہ کچھ اور نکلے۔"

وہ ظالم شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور غصے میں شہزادے کے کئی ہاتھ رسید کر دیئے شہزادے نے بچنے کی کوشش کی تو اس کے کئی ہاتھ دونوں رخساروں اور ناک پر پڑے جس سے شہزادے کی نکسیر پھوٹ گئی اور دونوں نتھنوں سے خون کی دھار بہہ نکلی شہزادہ آگ لیئے بغیر شمس تبریز کی خدمت میں واپس آگیا اور پوری روداد سنانے کے کہنے لگا "حضرت! یہاں کے لوگ بڑے سخت اور ظالم ہیں خوشامد در آمد سے بھی ان کے دل نہیں پسیجے، اس لیئے انہیں چھوڑ کے ہمیں کہیں اور چلا جانا چاہیئے۔"

شمس تبریز نے جواب دیا "نہیں ہم یہیں رہیں گے اور لوگ اگر ہمیں آگ نہیں دیتے تو نہ دیں ہم خود ہی آگ فراہم کیئے لیتے ہیں۔"

اس کے بعد شمس تبریز نے آسمان پر چمکتے ہوئے سورج کو مخاطب کیا "او میرے ہم نام ذرا تو ہی نیچے آجا تاکہ میں اپنا گوشت کا ٹکڑا بھون لوں۔"

آپ نے گوشت کا ٹکڑا سورج کی طرف اٹھا لیا گرمی دم بدم شدید ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تپش میں اتنی حدت پیدا ہو گئی کہ پورا شہر جلنے جھلسنے لگا لوگ ادھر ادھر دیکھنے چھپنے لگے بہت سے دریا کی تہہ میں اتر گئے لیکن دریا کا پانی بھی کھولنے لگا۔ کچھ لوگوں نے ہمت سے کام لیا اور بھاگ کے شمس تبریز کی خدمت میں پہنچ گئے بولے "حضرت! آپ نے یہ کیا غضب کر دیا؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ پورا شہر جل بھن کر ختم ہو جائے؟"

شمس تبریز نے بے نیازی سے جواب دیا "بابا! میں کیا اور میری خواہش کیا! میں ایک مجبور اور معتوب انسان جسے شہر والے اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ اسے ذرا سی آگ ہی دے دیں تاکہ اس میں اپنی غذا بھون لوں۔"

لوگوں نے کہا "حضرت! آپ کو کتنی آگ درکار ہے کہیے تو اسی وقت فراہم کر دی جائے گی۔"

شمس تبریز نے کہا "لوگو! تم میری مدد تو کرتے نہیں لیکن مجھ سے مدد کے طالب ہو۔"

پھر سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اب میں نے اپنے ہم نام کو اپنے کام سے ذرا پیچھے بلا لیا تو تم لوگ پریشان ہو رہے ہو، خیر" اس کے بعد سورج کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا: "بابا! باز بردہ"
یہ کہنا تھا کہ سورج گویا پیچھے ہٹ گیا اور موسم معمول پر آگیا۔
لوگ کہتے ہیں ملتان کی گرمی میں اس واقعے کا بڑا ہاتھ ہے۔



آپ مولانا جلال الدین رومی کے پاس بیٹھے تھے شمس تبریز کی صحبت سے جو لوگ جلتے تھے ان میں مولانا رومی ________ کا بیٹا علاؤ الدین بھی شامل تھا لوگ جب یہ کہتے کہ مولانا رومی ایک پڑھے لکھے لائق آدمی ہیں لیکن یہ بڑی عبرت کی بات ہے کہ ان کی ذات پر شمس تبریز کا قبضہ رہتا ہے، وہ شمس تبریز جو ننگ دھڑنگ رہتا ہے اور جس کے ہوش و حواس تک ٹھکانے نہیں۔ علاء الدین لوگوں کی باتیں سنتا تو اسے شمس تبریز پر بڑا غصہ آتا۔

شمس تبریز جب مولانا رومی کے پاس موجود ہوتے تو مولانا کا بیٹا علاء الدین ان کے پاس نہ جاتا۔

شمس تبریز مولانا رومی سے باتیں کر رہے تھے کہ کسی شخص نے باہر سے جھانک کے دیکھا مولانا رومی نے دریافت کیا "کون ہو بھائی! سامنے آؤ"

مگر وہ شخص سامنے نہیں آیا۔ دونوں پھر باتیں کرنے لگے اسی دوران اس شخص نے ایک بار پھر جھانک کے اندر کی طرف دیکھا۔ مولانا رومی نے پھر پوچھا "تم کون ہو اور اندر کیوں نہیں آتے؟"

اس شخص نے شمس تبریز کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ مولانا رومی نے شمس تبریز سے پوچھا "یہ شخص اشارے سے کیا کہہ رہا ہے؟"

شمس تبریز نے جواب دیا "وہ مجھے باہر بلا رہا ہے"

مولانا رومی نے پوچھا "کیا آپ اس شخص سے واقف ہیں؟"

شمس تبریز نے جواب دیا "نہیں میں اسے نہیں جانتا"

مولانا رومی نے حیرت سے کہا "پھر یہ شخص آپ کو باہر کیوں بلا رہا ہے؟"

شمس تبریز نے جواب دیا "یہ شخص مجھے قتل کرنے کیلئے باہر بلا رہا ہے"

مولانا رومی نے پریشان ہو کے پوچھا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

شمس تبریز نے کہا "میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اس میں جھوٹ ذرا بھی نہیں

اسی دوران اس اجنبی نے ایک بار پھر جھانک کر دیکھا۔ شمس تبریز نے اس سے کہا "اچھا بھائی! تو کیوں پریشان ہوتا ہے میں آ رہا ہوں اور مشیت ایزدی پوری کیے دیتا ہوں"۔

مولانا رومی ابھی یہ باتیں پوری طرح سمجھے بھی نہ تھے کہ شمس تبریز باہر نکل گئے وہاں سات آدمی ان کے منتظر کھڑے تھے ان میں مولانا رومی کا بیٹا بھی شامل تھا شمس تبریز جیسے ہی باہر نکلے ان ساتوں آدمیوں نے یکبارگی شمس تبریز پر حملہ کر دیا اور انہیں چھروں اور تلواروں سے ہلاک کرنے لگے۔ شمس تبریز نے ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے اثر سے یہ ساتوں آدمی بے ہوش ہو گئے۔

مولانا رومی بے چین ہو کے باہر نکلے اور شمس تبریز کو تلاش کرنے لگے جس جگہ انہیں زخمی کیا گیا تھا وہاں خون کے دھبے تو ضرور موجود تھے لیکن شمس تبریز کی لاش وہاں نہیں تھی مولانا نے بے ہوش آدمیوں میں اپنے بیٹے کو بھی موجود دیکھا مولانا رومی اپنے بیٹے سے اس قدر ناراض ہوئے کہ بیٹے کی صورت تک سے نفرت ہو گئی۔

کچھ عرصے بعد مولانا رومی کے دوسرے بیٹے سلطان کو شمس تبریز خواب میں دکھائی دیئے سلطان نے آپ سے پوچھا "حضرت! آپ کہاں ہیں؟ آپ تو ایسے غائب ہوئے کہ والد صاحب تلاش کرتے کرتے پریشان ہو گئے لیکن آپ نہیں ملے، آخر آپ ہیں کہاں؟"

شمس تبریز نے جواب دیا "میرے جسم کے ٹکڑے آبادی کے باہر ایک ویران کنوئیں سے نکال لو۔ مجھے لوگوں نے قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یہ ٹکڑے اس ویران کنوئیں میں ڈال دیئے"۔

مولانا رومی کے بیٹے سلطان نے گھبرا کے پوچھا "میں ان ٹکڑوں کو نکال کے کیا کروں؟"

شمس تبریز نے جواب دیا "یہاں کے مدرسے کے بانی امیر بدرالدین کے پہلو میں ان ٹکڑوں کو دفن کر دو"۔

بیدار ہونے پر اس کنوئیں سے شمس تبریز کے جسم کے ٹکڑے برآمد کر لیئے گئے اور انہیں شمس تبریز کی خواہش کے بموجب وہاں کے مدرسے کے بانی امیر بدرالدین کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔



مولانا رومی کے جس لڑکے نے شمس تبریز کے قتل میں عملی حصہ لیا تھا کچھ عرصے

بعد ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کے ایڑیاں رگڑنے لگا۔ اس کی اذیتیں لوگوں سے دیکھی نہ جاتی تھیں ۔ لوگوں نے مولانا رومی کو مطلع کیا کہ علاءالدین کی حالت بہت خراب ہے آپ اس کا دیدار فرمالیں ۔ کیونکہ وہ صبح شام میں کسی وقت بھی مر جائے گا۔"

مولانا رومی نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

چند دنوں بعد کسی نے مولانا کو مطلع کیا۔ "مولانا! علاءالدین کا انتقال ہو گیا۔"

مولانا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

علاءالدین کا جنازہ قبرستان روانہ ہو گیا، اس جنازے کے ساتھ چند اجنبی چل رہے تھے جو انسانی ہمدردی کی وجہ سے اس میں شامل ہو گئے تھے لوگوں نے مولانا رومی کو ایک بار پھر مطلع کیا۔ "مولانا! علاءالدین کا جنازہ قبرستان جارہا ہے آپ اس میں شرکت فرمالیں۔"

مولانا رومی نے ایک بار پھر نفرت سے منہ پھیر لیا اور جواب دیا۔ "شمس تبریز کا قاتل میرا بیٹا نہیں ہو سکتا، وہ میرا بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑے مردِ حق کا قاتل تھا اس کے جنازے میں میں کیوں شرکت کروں۔"



حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح

خاموش طبع ہر وقت کسی فکر میں ڈوبا رہنے والا بچہ جب اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو گیا تو بیوہ ماں کو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر لاحق ہوگئی، گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ تھا زمانے کے دستور کے مطابق ایک شیرینی اور چھوہاروں سے بھر کر غلام کو کو حکم دیا کہ بچے کو محلے کے مکتب میں داخل کرا دو۔

طباق کاندھے پر رکھے اور ایک ہاتھ سے بچے کی انگلی پکڑے جب غلام گھر کی گلی سے ذرا آگے بڑھا تو ایک بزرگ نے اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا "اس بچے کو کہاں لیے جا رہے ہو؟"

غلام نے جواب دیا "مکتب میں داخل کرانے۔"

اجنبی بزرگ نے جواب دیا "اس بچے کو بھلا مکتب کا مولوی کیا پڑھا سکے گا۔ میرے ساتھ آؤ، میں اس بچے کو اس کے استاد کے پاس پہنچا دوں جو منجانب اللہ مقرر ہوا ہے۔"

غلام سراسیمہ اور سہما سہما ان بزرگ کے ساتھ ہو لیا تھوڑی دیر بعد یہ لوگ مشہور بزرگ اور عالم باعمل ابو حفص رح کے گھر پہنچ گئے اور اجنبی بزرگ نے بچے کو اُن کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا "ابو حفص رح! اس بچے کو خوب پہچان لے اور جی جان سے اس کی تعلیم و تربیت کر۔"

وہ بزرگ یہ کہہ کر چلتے بنے اور ابو حفص رح نے بچے کو احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ پھر غلام سے پوچھا۔

"یہ بزرگ کون تھے؟"

غلام نے شیرینی اور چھوہاروں کا طباق ابو حفص رح کے روبرو رکھ کر پورا قصہ سُنا دیا اور آخر میں کہا "میں انہیں بالکل نہیں جانتا۔"

ابو حفص نے رمز میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ سے کہا "ہاں تم کیا جانو، یہ خضر

علیہ السلام تھے "

غلام ہکا بکا پاگلوں کی طرح ابوحفص کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

ابوحفص کے قریب ہی رحل پر قرآن پاک رکھا ہوا تھا، بچے کے ہاتھ میں تختی تھی، استاد نے قلم سیاہی میں ڈبویا اور پھر تختی کی طرف بڑھاتے ہوئے بچے سے دریافت کیا " ہاں بیٹے! کہاں سے تمہاری تعلیم کا آغاز کیا جائے؟"

بچے نے سادگی سے جواب دیا " لکھیے سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی ..... "

استاد نے حیرت سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا " لیکن یہ تو پندرہویں پارے میں ہے اور اس سے پہلے کے چودہ پارے؟"

بچے نے سادگی سے جواب دیا " جب میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا انہوں نے چودہ پارے ختم کر لیے تھے وہ سارے مجھے حفظ ہو چکے ہیں پندرہواں شروع کیا تھا کہ میری ولادت ہو گئی "

ابوحفص نے امتحاناً کہا " اچھا انہیں سناؤ "

بچے نے بے جھجک الف لام میم سے لے کر رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ (چودہویں پارے) کے آخر تک سنا دیا۔

غلام کے ہوش و حواس جاتے رہے لیکن استاد کا دل جذبۂ فخر و انبساط سے سرشار ہو گیا کہ پوری زندگی میں ایک عظیم الشان بچے کی استادی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

بچے نے بقیہ سولہ پارے بھی حفظ کر لیے۔

یہیں ایک دن بچے کی ملاقات حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہو گئی دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے اور کھنچ کر رہ گئے شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جو دونوں کی مقدرات میں تھا۔



علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل ہو چکی تھی اب وہ بچہ جوانی میں قدم رکھ کر قطب الدین کے نام سے معروف ہو چکا تھا نوجوانی کے آغاز ہی میں مجاہدے اور ریاضت کا یہ عالم تھا کہ نماز اور تلاوت کلام کے مسلسل عمل اور اوراد و وظائف کی شدید محنت کے بعد جب بستر سے پشت لگاتے تو ہزاروں بار درود شریف کا ورد کرتے۔

کچھ دنوں سے ماں یہ محسوس کر رہی تھیں کہ بیٹا انہیں چھوڑ کر کہیں جانے والا ہے۔

کسی لمبے اور دُور دراز سفر پر۔ ماں نے ازراہِ فرض مادری ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی سے بیٹے کی شادی کر دی نوجوان قطب الدّین اس حسین پری پیکر میں کچھ ایسا کھو گیا کہ سارے دن کی ریاضت کے بعد رات کا وقت اس پری پیکر پر وقف کر دیا۔ درود شریف کے وِرد کا عمل فراموش ہو گیا اور اس صورتِ حال کو تین دن گزر گئے۔

قطب الدّین کی بزرگی اور ولایت کا دُور دُور شہرہ ہو چکا تھا آس پاس کے لوگ ان کے مرید ہو چکے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد جب قطب الدّین نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی تو کسی نے بتایا کہ رئیس احمد نامی ایک عمر رسیدہ پڑوسی مرید شرف ہمکلامی کے خواہش مند ہیں۔ نوجوان قطب الدین نے تلاوت کلام پاک کے بعد ان بزرگ سے ملاقات کی اور دریافت فرمایا "ہم سے کوئی خاص کام؟"

بزرگ پڑوسی نے کچھ تکلف اور کچھ شرمائے شرمائے لہجے میں عرض کیا "حضرت! جو عرض کرنا ہے خود میں اس کی ہمت نہیں پاتا۔"

قطب الدّین نے جواب دیا "شرماؤ نہیں جو بات ہے صاف صاف کہہ دو۔"

شرمیلے پڑوسی نے عرض کیا "حضرت! رات کے پچھلے پہر اس ناچیز نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس خادم نے دیکھا کہ ایک عالی شان محل کے سامنے کھڑا ہے اس محل کے سامنے لوگوں کا زبردست ہجوم ہے محل کے اندر سے ایک درمیانہ قد نورانی چہرے کا آدمی باہر آتا ہے اور لوگوں کا پیغام لے کر اندر چلا جاتا ہے اور پھر وہاں سے جواب لیکر واپس آتا ہے یہ غلام آگے بڑھا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ بھائیو! یہ کون بزرگوار ہیں اور یہ محل کن صاحب کا ہے؟ جواب ملا۔ یہ قصر تو رسول مقبولؐ کا ہے اندر آپ تشریف فرما ہیں اور یہ بزرگوار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں جو حضرات رسول مقبولؐ کے نام پیغامات بھیجتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اندر پہنچا دیتے ہیں یہ سنتے ہی یہ خاکسار حضرت عبداللہؓ کی طرف بڑھا اور ان سے درخواست کی کہ حضرت! رسول مقبولؐ کی خدمت میری درخواست پہنچا دیجئے کہ رئیس احمد نامی آپ کا غلام زیادہ دیدار پُرانوار کا مشتاق ہے اس پر بھی کرم ہو جائے تھوڑی دیر بعد حضرت عبداللہ میری درخواست کا یہ جواب لے کر واپس آئے کہ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ ابھی تجھ میں ہمارے دیکھنے کی قابلیت نہیں ہے تو واپس جا اور قطب الدّین سے کہنا کہ کیا بات ہے تین راتوں سے تمہارا تحفہ ہمیں نہیں ملا۔"

خواب سُن کر نوجوان قطب الدّین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے چند لمحوں کے لیئے سکوت اختیار کیا، سینے میں ایک طوفان برپا تھا حسین بیوی کے سحر اور رسولِ مقبولؐ کی محبّت میں برپا ہونے والی جنگ میں عورت کو شکست ہو گئی آپ اُسی وقت اندر گئے، بیوی کو اس کا مہر ادا کیا اور طلاق دیکر ہمیشہ کی جُدائی اختیار کر لی۔ ماں اپنے بیٹے کی عظمت سے واقف تھی وہ خاموش رہی پھر ماں کے استفسار پر بیٹے نے یہ مختصر جواب دے کر اُسے چُپ کر دیا۔ "جو شے رسول اللہؐ کی نظر میں مجھے شرمسار کر دے میں اسے کس طرح رکھ سکتا ہوں"

پھر وطن بھی چھوڑ دیا اور بغداد کے لیئے روانہ ہو گئے جب رات ہو گئی تو ایک مسجد میں قیام کیا نماز کے بعد آپ وظیفے میں مشغول ہو گئے اسی عالم میں انہیں اپنا بچپنا یاد آیا، وہ دن جب کسی اجنبی بزرگ نے انہیں استاد ابو حفصؒ کی خدمت میں پہنچا دیا تھا اور جس کی بابت استاد ابو حفصؒ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ وہ اجنبی بزرگ خضرؑ تھے جو تمہاری رہنمائی کو حاضر ہوئے تھے قطب الدّین نے سوچا کہ خضر علیہ السلام کی ضرورت آج کہیں زیادہ ہے لیکن ایک خوبصورت لڑکے نے مسجد میں داخل ہو کر ان کے انہماک کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس نے پوچھا

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

قطب الدّین نے جواب دیا۔ "ذکر و فکر"

لڑکے نے کہا "ذکر کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن یہ فکر کس کی کر رہے ہو؟"

نوجوان قطب الدّین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "خضر علیہ السلام کی"

لڑکے نے حیرت سے قطب الدّین کو دیکھا اور پوچھا "وہ کس لیئے؟ دین کے لیئے یا دُنیا کے لیئے؟"

قطب الدّین نے بے نیازی سے جواب دیا "بندے کو دونوں سے مطلب نہیں، میں صرف اللہ کے واسطے اُن سے ملنا چاہتا ہوں"

لڑکے نے کہا "خوب! جس خضرؑ کی تو آرزو رکھتا ہے وہ خود تیری ہی طرح سرگرداں ہے"

اسی لمحے مسجد کے ایک گوشے سے ایک عمر رسیدہ شخص ان کے قریب آ گیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟ تم دونوں کس بات پر اُلجھ رہے ہو؟"

لڑکے نے ہنس کر کہا "یہ نوجوان کہتا ہے کہ مجھے نہ تو دین چاہیئے اور نہ دُنیا، پھر بھی خضرؑ کی ضرورت محسوس کرتا ہے"

مسجد کے ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں نوجوان قطب الدین نے ان بزرگ کو دیکھا اور ان کے حلقے میں بچپن کے اس اجنبی بزرگ کی شبیہہ اُبھر آئی جس نے انہیں استاد ابو حفصؒ کی خدمت میں پہنچایا تھا قطب الدین نے کچھ پوچھنے کے لیئے حیرت زدہ انداز میں لڑکے کی طرف دیکھا لیکن لڑکا وہاں موجود نہ تھا اس کے فوراً بعد ہی وہ اجنبی بزرگ کی طرف مڑے لیکن ادھر بھی کوئی نہ تھا حیرت، ٹمٹماتا دیا، رات کا سناٹا اور جھینگروں کے ساز و آواز کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔



یہ سترہ سالہ نوجوان جب شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ احد الدین کرمانیؒ شیخ برہان الدین چشتیؒ اور شیخ محمود اصفہانیؒ جیسے بزرگ جید صوفیائے کرام کی صحبت میں داخل ہوا تو اس مادر زاد ولی کی ولایت پر سبھی رشک کرنے لگے حضرت خواجہ معین الدین سے یہیں ملاقات ہوگئی اور نوجوان قطب الدین نے والہانہ فرمایا۔ یا حضرت! اب تاب صبر نہیں اس ناچیز کو شرفِ غلامی سے سرفراز فرمائیں۔

حضرت خواجہ معین الدین نے تبسم فرمایا اور امام ابو اللیث سمرقندی کی مسجد میں مذکورہ بالا صوفیائے کرام کے روبرو قطب الدین کو شرفِ مریدی بخش کر بختیار کا خطاب عطا فرمایا اور اپنی خلافت بھی بخش دی دونوں حضرات ایک بار پھر جدا ہو گئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سلطان الہند ہو کر اجمیر چلے گئے اور نوجوان قطب الدین ایران اور عرب کی سیر و سیاحت میں مصروف ہو گئے عرصے بعد جب انہیں اپنے مرشد کی اجمیر میں موجودگی کا علم ہوا تو نوجوان مُرید اپنے مرشد سے ملنے کے لیئے ہندوستان چل پڑا ملتان میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ سے ملاقات ہوئی، دونوں ملکر بے حد خوش ہوئے۔

ابھی ملتان میں قیام فرما ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ تاتاریوں نے اُس کا محاصرہ کر لیا، پورا شہر خوف و ہراس میں مبتلا ہو گیا، شہر کا حاکم خوف زدہ تھا فوج محدود اور کسی طرف سے کمک ملنے کی کوئی اُمید نہ تھی مقابلے کی ہمت نہ پا کر حاکم شہر نے تلوار اپنے گلے میں لٹکائی اور مجرموں کی طرح حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ان کے سامنے ہی حضرت بختیار بھی تشریف فرما تھے حاکم شہر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں حضرت بہاء الدینؒ سے کہا:- حضرت! وحشی تاتاریوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے کوئی وقت جاتا ہے کہ وہ فاتحانہ شہر میں داخل ہو جائیں گے اور شہریوں کی دولت و ناموس پر وحشیانہ ہاتھ صاف کرنے لگیں گے، خدا کے لیئے کچھ کیجئے۔

حضرت بہاؤالدینؒ نے معزز مہمان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں
قطب الدین! تمہارے ہوتے ہوئے ہماری کیا مجال جو کوئی قدم اٹھائیں۔"

نوجوان قطب الدین نے حاکم شہر سے کہا۔ وہ تاتاری کہاں ہیں؟ وہاں ہمیں لے چلو!"
حاکم شہر نے جواب دیا۔"حضرت! قلعے کی فصیل یا کسی بُرجی سے تاتاریوں کے لشکر کا مشاہدہ فرما سکتے ہیں"

آپ نے فرمایا۔"چلو ایسا ہی سہی، وہیں سے دیکھ لیں گے"

حاکم شہر نے آپ کو قلعے کے صدر پھاٹک کی بُرجی میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ آپ نے دیکھا، حد نظر تک سیاہ، نیلے اور سُرخ خیموں کا ایک جنگل سا پھیلا ہوا تھا اور خیموں کے سامنے کے میدان میں بڑے بڑے بالوں اور چوڑے اور اُبھرے ہوئے جبڑوں اور کھلی رنگت کے مسلح اور خونخوار تاتاری، دمدموں اور منجنیقوں کے آس پاس ٹہل پھر رہے تھے حضرت قطب الدینؒ نے بُرجی میں متعین ایک سپاہی کے ترکش میں سے ایک تیر نکال لیا اور حاکم شہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا "لو، اسے چلّے میں رکھ کر پوری قوت سے دشمنوں کی طرف چھوڑ دو"

حاکم شہر اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا بولا۔"لیکن جناب والا! یہ تو ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہو جائے گا اور جواب میں جب یہ وحشی قلعے پر یلغار کریں گے تو ہم انہیں روک نہیں سکیں گے"

حضرت بختیارؒ نے بے نیازی سے فرمایا۔"جب تم نے ہم سے مدد مانگی ہے تو پھر جیسا ہم کہیں اُس پر عمل کرو، ورنہ فقیر کو اجازت دو، یہ واپس جائے اور تم جیسا مناسب سمجھو اس پر عمل کرو"

حاکم شہر نے سوچا تباہی اور بربادی کے امکانات تو دونوں ہی صورتوں میں موجود ہیں اگر نوجوان درویش بختیارؒ کے مشورے پر عمل نہ کیا گیا تب بھی یہ وحشی معاف نہ کریں گے اور اگر بختیار کے حکم پر تیر چھوڑا گیا تب بھی بربادی لازم ہے دل نے مشورہ دیا کہ نوجوان بختیار کے حکم کی تعمیل زیادہ اہم ہے اس کے بعد اگر تباہی آتی ہے تو یہ بزرگ خود ہی کچھ کریں گے۔
حاکم شہر نے گلے کی تلوار اُتار کر ایک طرف رکھ دی اور سپاہی سے کمان لے کر چلّے پر تیر چڑھایا اور پھر پوری قوت سے کھینچ کر چھوڑ دیا، تانت سے شپ کی آواز نکلی، کمان تھرتھرا گئی اور تیر ہوا میں لہراتا ہوا ایک منجنیق پر پہاڑی چٹان کی طرح جا گرا، منجنیق چکنا چور ہو گئی اُس کے

اس پاس موجود وحشی خوف زدہ ہوکر اِدھر اُدھر دبک گئے ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہوا؟ ابھی یہ معمہ حل نہ ہوا تھا کہ مغرب سے طوفان گرد و باد اٹھا اور اس نے تاتاریوں کو محاصرے میں لے لیا دمدمے اڑ گئے، منجنیقیں کہیں سے کہیں جا پہنچیں، خیمے ہوا میں غباروں کی طرح اُڑنے لگے تاتاری بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے ابھی طوفانِ گرد و باد کم نہ ہوا تھا کہ موسلا دھار بارش نے آلیا اور تاریکی میں سب کچھ ڈوب گیا۔

حضرت بختیارؒ کے قدموں میں حاکم شہر گر کر انھیں فرطِ عقیدت سے بوسے دے رہا تھا، آپ نے اُسے اُٹھایا، حاکم شہر نے گڑگڑا کر عرض کیا "حضرت! غلام آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے"

آپ نے بے نیازی سے ارشاد کیا "تو ان کی خدمت کر، جنھیں تیرے سپرد کیا گیا ہے یعنی اہالیان ملتان اور بندگانِ خدا کی خدمت، ہم تو خود ہی تم سب کی خدمت پر متعین ہوئے ہیں"

حاکم شہر نے درخواست کی "حضرت! آپ ملتان ہی میں قیام فرمائیں آپ کی موجودگی ہماری طمانیت قلب کا باعث رہے گی"

آپ نے جواب دیا "ملتان بہاء الدین زکریاؒ کے حوالے کیا گیا ہے ہم یہاں چند دنوں کے لئے مہمان کی حیثیت سے تو رہ سکتے ہیں مستقلاً نہیں"

حاکمِ شہر نے اشتیاق سے پوچھا "حضور والا کو کون سا علاقہ تفویض ہوا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ہندوستان کا سلطان اجمیر میں فروکش ہے ہم دہلی جا رہے ہیں ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ ہمیں کہاں متعین کرتا ہے"

حاکم شہر نے گومگو سے پوچھا "ہندوستان کا سلطان اجمیر میں فروکش ہے؟ حضرت وہ تو دہلی سے حکومت کرتا ہے' یہ آپ کو کس نے بتایا کہ ہندوستان کی راجدھانی اجمیر ہے"

آپ نے تبسم فرمایا اور کہا "دہلی کا بادشاہ بھی ہمارے سلطان کا تابع ہے تمہارے بادشاہ کا نام سلطان شمس الدین التمش ہے اور ہمارے سلطان کا نام خواجہ معین الدین چشتیؒ ہے ہمارا سلطان، سلطانوں کا سلطان ہے"

حاکم شہر کو اِن رموز کا کیا پتہ تھا۔ چپ ہو رہا۔

آپ ملتان سے چل کر، دہلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ نے مشہورِ زمانہ بزرگ

قاضی حمید الدّین ناگوری کے یہاں قیام فرمایا، حمید الدّین ناگوری بہ اعتبار سے حضرت بختیار کے مرشد معلوم ہوتے تھے لیکن حفظِ مراتب کی ادائیگی کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ نوجوان بختیار کی عزّت اور احترام حضرت حمید الدین ناگوری مریدوں کی طرح کرتے لوگ چہ میگوئیاں کرتے۔

"عجیب بات ہے کہ قاضی حمید الدّین جیسا بزرگ کامل اس نوعمر بختیار کا اس طرح احترام کرتا ہے جیسے کوئی مرید کسی مرشد کا کرے۔"

ایک رمز شناس نے جواب دیا۔ "تم لوگ کیا جانو حضرت قطب الدّین بختیار اپنی نوعمری کے باوجود قطب المشائخ ہیں اور فضل و کمال میں حضرت حمید الدّین ناگوری سے فائق ہیں۔"

دہلی سے حضرت بختیار نے اپنے مرشد خواجہ چشتی کو لکھا۔ "غلام بختیار دہلی تک آ چکا ہے اور آپ کی زیارت کا خواہاں ہے آپ کی اشارت یا بشارت کے ملتے ہی قدم بوسی کا شرف حاصل کرے گا۔"

چند دنوں بعد حضرت خواجہ چشتی کا جواب آ گیا آپ نے لکھا تھا بختیار تم دہلی میں ٹھیرے رہو اللہ نے وہاں کی ولایت تمہارے سپرد کر دی ہے تمہیں میرا قرب روحانی حاصل ہے جس میں بُعدِ مکانی حائل نہیں ہو سکتا۔ چند دنوں بعد یہ فقیر بھی وہیں پہنچے گا اور ہم دونوں کی ظاہری ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

حضرت بختیار دہلی میں قیام فرما ہو گئے روز بروز ہجوم بڑھنے لگا پھر پورا شہر آپ کا معتقد ہو گیا، آپ اس ہجوم سے تنگ آ کر کہیں چلے جانا چاہتے تھے لیکن حضرت خواجہ چشتی نے یہیں ٹھیرے رہنے کا حکم جو دیا تھا۔

سلطان شمس الدّین التمش بھی ہفتے میں دو دن حاضری دینے لگا اس نے آپ کو کچھ مرحمت فرمانا چاہا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا پھر التمش کا حاجب (سکریٹری) بہت سا نقد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذر پیش کرنا چاہا لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ فقیر کو ان کی کوئی حاجت نہیں۔

بادشاہ کے حاجب نے اصرار کیا، بولا "حضرت! اسے قبول فرما لیں کیوں کہ انسانی ضروریات اسی سے پوری ہوتی ہیں ان کی آپ کو یقیناً ضرورت پیش آئے گی۔"

حضرت بختیار جس بوریے پر بیٹھے تھے آپ نے اس کا ایک کونا اُلٹ دیا اور بادشاہ کی حاجب سے فرمایا۔ "اِدھر دیکھ، میرے بوریے کے نیچے۔"

حاجب نے دیکھا، وہ پیسے کے نیچے سونے کی نہر گہرائیوں میں جاکر غائب ہوگئی ہے وہ حیران رہ گیا حضرت بختیارؒ نے فرمایا "حق تعالیٰ غیب کا خزانہ اپنے دوستوں کے تصرف میں دے دیتا ہے ان کو تمہارے زر و جواہر کی کوئی ضرورت نہیں "

اسی دوران سرکاری شیخ الاسلام کا انتقال ہوگیا التمش نے یہ عہدہ حضرت بختیارؒ کو پیش کیا لیکن آپ نے انکار کر دیا مجبوراً یہ منصب ایک دوسرے بزرگ نجم الدین صغریٰ کو پیش کیا گیا انہوں نے اسے قبول کر لیا، نجم الدین صغریٰ حضرت خواجہ چشتیؒ کے پیر بھائی بھی تھے وہ شیخ الاسلام تو ضرور بن گئے لیکن اپنے روحانی مرتبے سے نیچے آ گئے سارا ہجوم تو حضرت بختیارؒ کے در پر رہتا تھا، شیخ الاسلام کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا ان کے دل میں حضرت بختیارؒ کے خلاف حسد پیدا ہوگیا کچھ دنوں بعد جب حضرت خواجہ چشتیؒ دہلی پہنچے تو حضرت بختیارؒ سے ملکر شیخ الاسلام سے ملنے بھی گئے اُس وقت نجم الدین صغریٰ اپنے مکان کے بعض حصّوں کی تعمیر کرا رہے تھے انہوں نے حضرت خواجہ چشتیؒ کو کنکھیوں سے دیکھا اور نظر انداز کر گئے حضرت خواجہ شیخ الاسلام کی سرد مہری سے آزردہ خاطر ہوئے اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا " نجم الدین! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے کیا شیخ الاسلامی کے منصب نے تیرے دل میں غرور پیدا کر دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تو گویا چاہِ ہلاکت میں گرا "

شیخ الاسلام نے تکدّر آمیز لہجے میں جواب دیا "حضرت! میں تو آپ کا اس حد تک مُخلص اور تابعدار ہوں کہ جہاں آپ قدم رکھتے تھے وہاں میں اپنا سر رکھ دیتا تھا لیکن اب مجھے آپ سے یہ شکایت ہوگئی ہے کہ آپ نے اپنے مُرید قطب الدین بختیارؒ کو دہلی کی ولایت عطا فرما دی ہے اور اجمیر سے تشریف لاکر آپ نے شرفِ مہمان نوازی بھی اپنے اسی مُرید کو بخشا ہے ان تمام باتوں اور آپ کی عنایتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یہاں کی ساری خلقت اسی در پر حاضری دینے لگی ہے اور میں جو شیخ الاسلام ہوں اس حد تک بے وقعت ہو چکا ہوں کہ ایک شخص بھی مجھے پان تک سے نہیں نوازتا۔ میں خود کو حقیر سا محسوس کرنے لگا ہوں "

حضرت خواجہ نے افسوس سے جواب دیا " اچھا شیخ! تو خاطر جمع رکھ ہم قطب الدین کو اپنے ہمراہ اجمیر لے جائیں گے "

حضرت خواجہؒ بختیارؒ کے پاس پہنچے اور ازردگی سے فرمایا " قطب الدین! اس شہر میں تجھ سے حسد کیا جاتا ہے اور بعض تیرے شاکی ہیں تو ہمارے ساتھ اجمیر چل، ہم وہاں

تجھے مسندِ شیوخت پر بٹھا کر تیرے روبرو حاضری دیا کریں گے اور تیری خدمت کیا کریں گے "

نوجوان مرید آب دیدہ ہو گیا اور دلدوز لہجے میں جواب دیا۔ "جو کچھ حضور نے فرمایا ہے یہ آپ کی بندہ نوازی ہے غلام تو بس اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ آپ کے روبرو دست بستہ کھڑا رہے اس کی کیا مجال کہ سامنے بیٹھ بھی سکے "

سامانِ سفر تیار ہو گیا تو بادشاہ کے نمائندے نے حضرت خواجہؒ سے عرض کیا "حضور بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ قطب الدین کو اجمیر نہ لے جائیں "

لیکن یہ قافلہ اجمیر روانہ ہو گیا، دہلی میں صفِ ماتم بچھ گئی لوگ زار وقطار رونے لگے اور شہریوں کا جم غفیر ان کے پیچھے ہو لیا' یہ لوگ رو رو کر واپسی کی درخواستیں کر رہے تھے حضرت خواجہ کا دل پسیج گیا آپ نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا۔ "قطب الدین بختیار! لوگ تیری مفارقت سے پریشان اور آزردہ خاطر ہیں اتنے بہت سارے قلوب کی خرابی اور خستہ حالی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے تم دہلی ہی میں بود و باش رکھو اور ہم یہ شہر اور تمہیں خدا کی حفظ و امان میں چھوڑتے ہیں "

جب حضرت خواجہ تنہا اجمیر جانے لگے تو ایک بار پھر شیخ الاسلام سے ملنے گئے، انہوں نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی حضرت خواجہؒ نے غصے میں فرمایا۔ "نجم الدین! شیخ الاسلامی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تجھے رسوائی سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا "

یہ کہہ کر آپ اجمیر شریف چلے گئے۔

دہلی ہی میں آپ نے دوسری شادی کی دن عسرت اور تنگ دستی میں گزرتے تھے سلطان التمش نے کئی بار چند گاؤں جاگیر میں دینے چاہے لیکن آپ نے انکار کر دیا، پڑوس میں بنیا رہتا تھا اس کی دکان سے ادھار سامان آجایا کرتا تھا ایک دن بنیے کی بیوی نے از راہِ افتخار حضرت قطب الدین کی بیوی سے کہا۔ "ہمارا پڑوس تم لوگوں کے لیے نعمت ہے، اگر ہم یہاں نہ ہوتے تو تم لوگ فاقوں سے مر جاتے "

صابر بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور بنیے کی بیوی کا مکالمہ غم واندوہ سے شوہر کے سامنے دہرایا۔ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر بیوی سے کہا۔ "اب بقال سے کچھ بھی نہ لیا جائے گا ہماری ضرورتیں محدود ہیں جب کھانے کی ضرورت ہو، طاق کا پردہ ہٹا کے کاک (تنوری کلچہ

نانان) حاصل کر لیا کرو۔

اس کے بعد بنیے سے کھانے پینے کا سامان نہیں خریدا گیا اور وقت اشتہا طاق سے کاک حاصل کی جاتی رہیں، یہیں سے آپ کاکی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

پھر محویت اور استغراق اس عروج کو پہنچ گیا کہ لڑکے کا انتقال ہوا اور جب بیوی کے رونے کی آواز سُنی تو کسی سے دریافت فرمایا "یہ کیوں روتی ہے؟"

کسی نے جواب دیا "آپ کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے"

آپ نے افسوس سے کہا "اچھا۔ ہمیں اس کی علالت کا پتہ نہ تھا ورنہ اس کے لئے دُعا ضرور کرتے"

دہلی میں قحط پڑا، لوگ بھوکوں مرنے لگے سلطان التمش نے اپنے بھانجے سعد الدین کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ منوں آٹے کی روٹیاں لگوا کر بھوکوں میں تقسیم کرے ایک دن نانبائی کی غفلت سے بیشتر روٹیاں جل جھلس گئیں، سعد الدین نے غفلت کے جرم میں نانبائی کو گرفتار کر لیا اور اسے قید خانے لے چلا، ایک مجمع ساتھ ہو لیا، ایک طرف سے حضرت کاکی نمودار ہوئے اور لوگوں سے دریافت کیا "یہ مجمع کیسا ہے اور یہ قیدی کون ہے؟"

لوگوں نے پورا قصہ سنا دیا، حضرت کاکی سعد الدین کے قریب گئے اور اس سے کہا اگر تیری جلی جھلسی روٹیاں ٹھیک ہو جائیں تو کیا اس غریب کو چھوڑ دے گا؟"

سعد الدین نے مذاق اڑایا "جلی جھلسی روٹیاں کس طرح ٹھیک ہو جائیں گی؟ پھر ساتھیوں سے کہا "اس شخص کی بزرگی اپنی جگہ لیکن یہ مُردے کو جلانے کا دعوا کس طرح کر سکتا ہے! جلی جھلسی روٹیوں کو صحیح حالت میں لے آنے کا مطلب یہی ہوا جیسے کسی مُردے کو جلا دیا جائے"

حضرت کاکی نے قیدی نانبائی سے پوچھا "تیرا تنور کہاں ہے؟ جلی ہوئی روٹیوں کو لے کر تنور تک واپس چل"

سعد الدین نے حضرت کاکی کی عظمت کا خیال کیا اور نانبائی اور جلی ہوئی روٹیوں سمیت تنور پر واپس گیا حضرت کاکی نے نانبائی کو اس کے بھٹے پر بٹھا کر روٹیاں دہکتے ہوئے تنور میں جھونک دیں اور اسے اوپر سے بند کر دیا۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی سعد الدین ہنسا کر چلو یہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

نانبائی نے سوچا کہ یہ اچھا ہوا کہ میرے جرم میں بختیار کاکیؒ میرے ساتھی ہو گئے حضرت بختیار کاکیؒ نے کچھ دیر بعد تنور کا منہ کھولا اور نانبائی کو حکم دیا "اپنی روٹیاں اندر سے نکال لے"۔

نانبائی نے حکم کی تعمیل کی اور روٹیاں نکالنے لگا۔ تمام روٹیاں بالکل صحیح سے پکی نکل آئیں۔

حضرت کاکیؒ نے سعد الدین سے فرمایا "اپنی روٹیاں لے اور راستہ دیکھ، اس نانبائی غریب کی جان چھوڑ اور ہمیشہ اس کا خیال رکھ کہ تیرے کسی فعل یا عمل سے بندگانِ خدا کو دکھ نہ پہنچے"۔

آپ یہ کہہ کر چلے گئے لیکن شام کو سعد الدین دست بستہ حضرت کاکیؒ کی خدمت میں کھڑا یہ درخواست کر رہا تھا کہ حضرت! خادم کو اپنے حلقہ خدمت گزاراں میں شامل فرمالیں۔

آپ نے جواب دیا "ثروت اور دولت کا درویشی سے بیر چلا آ رہا ہے جب تک تیرے گھر میں یہ چیزیں موجود ہیں تو درویشی کس طرح اختیار کر سکتا ہے"۔

سعد الدین کوئی جواب دیئے بغیر واپس چلا گیا اور دوسرے دن پھر حاضر ہوا نہایت دردمندی سے عرض کیا۔

"حضرت! خادم نے اپنا سب کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا اور شاہی منصب سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اب تو درویش کے دروازے غلام پر وا ہو جانے چاہئیں"۔

پاس ہی قاضی حمید الدین ناگوری موجود تھے آپ نے ان سے کہا "یہ نہیں مانے گا اس ضدی کو حلقہ مریداں میں داخل کر لو"۔

سعد الدین کو مرید کر لیا گیا اور حضرت کاکیؒ کی خدمت میں رہنے لگا۔

سلطان شمس الدین التمش کی انتہائی دلی آرزو تھی کہ حضرت بختیار کاکیؒ اس کے پاس تشریف لائیں حضرت بختیار کاکیؒ بھی سلطان کے زہد و تقویٰ کے بہت قائل تھے ایک دن اچانک سلطان کے روبرو پہنچ گئے التمش کی خوشی کی انتہا نہ رہی اسی وقت اس مجلس خاص میں حاکم اودھ رکن الدین حلوائی بھی حاضر ہوا یہ ذات کا حلوائی سیاست اور حکومت کے میدان میں آ کر بہت اچھا منتظم اور حاکم ثابت ہوا تھا اور اسے سلطان نے اودھ کی حکومت

بخش دی تھی۔ یہ شخص حضرت بختیار کاکیؒ کے مرتبے سے واقف نہ تھا مجلس خاص میں اپنی نشست کے لیئے ایسی جگہ پسند کی جو حضرت بختیار کاکیؒ کی نشست گاہ سے قدرے بلند تھی سلطان اِس بے ادبی کو برداشت نہ کرسکا وہ رکن الدین حلوائی کے خلاف کوئی حکم صادر فرمانے ہی والا تھا کہ حضرت بختیار کاکیؒ بھی اصل حقیقت سے آگاہ ہو گئے آپ نے حاکم اودھ حلوائی پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی پھر سلطان سے فرمایا " رکن الدین نے اپنے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کیا ہے میں کاک ہوں تو یہ حلوا ہے اور حلوا ہمیشہ روٹی کے اوپر ہی رہتا ہے "

سلطان حضرت بختیار کاکیؒ کی منشا سے آگاہ ہو گیا اور اس نے رکن الدین حلوائی کو کچھ بھی نہ کہا۔

عرصے بعد سلطان اپنے سپاہیوں کے ساتھ حضرت کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سپاہ حجرے سے دور رہی اور سلطان آپ کی خدمت میں دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ حضرت کاکی کے ایک طرف حمید الدین ناگوری بیٹھے تھے دوسری طرف سلطان کا بھانجا سعد الدین موجود تھا سلطان نے حضرت کاکی سے کہا " حضرت کچھ اشتہا ہو رہی ہے کھانا مرحمت فرمائیں "

آپ نے اسی وقت گرما گرم کاک پیش کر دیں سلطان نے پوچھا " کیا خالی روٹیاں؟ انھیں کس چیز سے کھاؤں؟

حضرت کاکی نے حمید الدین ناگوری کو اشارہ کیا وہ اُٹھے اور وضوگاہ سے کیچڑ اٹھا لائے اور اسے روٹی پر رکھ دیا، غور سے دیکھنے اور کھانے پر پتہ چلا کہ وہ تو لذیذ ترین حلوہ ہے سلطان ان کرامتوں سے بہت متحیر ہوا اور اپنے بھانجے سعد الدین سے مخاطب ہوا " کیوں سعد الدین! تو جو اتنے دنوں سے یہاں حاضری دے رہا ہے تو نے بھی ان سے کچھ حاصل کیا یا یوں ہی وقت ضائع کر رہا ہے "

سعد الدین نے اپنی گردن جھکالی اور ایک ہاتھ اپنی بغل میں دے لیا۔ جب سلطان روٹی کھا چکا تو سعد الدین نے بغل سے ہاتھ نکال کر اپنے ماموں التمش کی طرف بڑھا دیا، اس میں تازہ ترین پان کا بیڑا تھا۔ سلطان پان کھا کر بہت خوش ہوا اور حضرت بختیار کاکی سے درخواست کی کہ ہمارے سپاہی بھی بھوکے

ہیں اسی طرح انہیں بھی نوازا جائے "

حضرت بختیار کاکیؒ نے اسی طرح پورے لشکر کی دعوت کر دی اور سعد الدین نے اسی طرح سب کو پان پیش کر دیئے اور وہیں سے سعد الدین تنبولی کے نام سے مشہور ہوئے



گھر میں سوائے روٹیوں کے ہر شے کی تنگی تھی حضرت بختیار کاکی کا آٹھ دس سالہ بیٹا اس تنگی ترشی سے پریشان تھا اپنے ایک پڑوسی سے اس کا اظہار کر دیا اس مخلص عقیدت مند نے بہت سارا سامان خرید کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا اور لجاجت سے کہنے لگا "اس غلام کو آپ کی پریشانی کا ذرا علم نہ تھا ورنہ حضرت کو اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی "

آپ نے یہ سامان اسی وقت واپس کر دیا اور انتہائی کرب میں فرمایا " خدایا! تو اس شخص کی گردن توڑ دے جس نے ہمارے گھر کا راز فاش کر دیا "

شام کو خبر آئی کہ حضرت کاکی کے صاحبزادے چھت سے گر کر ہلاک ہو گئے یہ صاحبزادے سر کے بل گرے تھے جس سے ان کا منکا ڈھل گیا تھا اور گردن ٹوٹ گئی تھی — آپ نے اس خبر پر یہ تبصرہ فرمایا " اچھا تو وہ یہ تھا لیکن بخدا مجھے اگر پہلے سے ہی حقیقت کا صحیح علم ہوتا تو شاید میں ایسی بات زبان سے نہ نکالتا لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا "

آپ کو سماع کا بیحد شوق تھا خدا معلوم، شیخ الاسلام کے اشارے پر یا خود ہی قاضی صادق اور مفتی عماد نے آپ کو منع کیا کہ موسیقی شرعاً ناجائز ہے آپ سماع سے پرہیز کریں

آپ نے جواب دیا " ہمارے دو معزز مہمان زکریا ملتانی اور جلال الدین تبریزی دہلی آئے ہوئے ہیں ہم نے ان کے لئے محفل سماع کا انتظام کیا ہے تم دونوں بھی آجانا ہم وہیں تمہیں شیخ الاسلام سے سماع سننے کی اجازت دلوا دیں گے "

قاضی اور مفتی جز بز ہوئے اور انہوں نے سختی سے کہا " ہم اپنے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد متعین کر دیں گے اور دیکھیں گے کہ آپ کس طرح محفل سماع منعقد کرتے ہیں اور لوگ اس میں کس طرح داخل ہوتے ہیں "

آپ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا " معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو بہت جلد زیر زمین چلا جانا ہے "

حمید الدین ناگوری نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے ۔

قاضی اور مفتی اپنے اختیارات کام میں لائے اور مشرقی اور جنوبی دروازوں پر پہرے دار سپاہی کھڑے کر دیے اور انہیں یہ حکم دیا کہ بلا لحاظ مرتبہ و منصب کسی کو بھی محفل سماع میں نہ جانے دیا جائے ۔

لیکن اسی عالم میں حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی مشرقی دروازے سے اور حضرت جلال الدین تبریزی جنوبی دروازے سے محفل سماع میں داخل ہو گئے ان کے پیچھے اور بہت سے لوگ بھی اندر آ گئے اور پہرے دار سپاہی اندھوں کی طرح پہرا ہی دیتے رہ گئے جب قاضی اور مفتی کو اس بات کا علم ہوا تو دونوں دل میں بے حد شرمندہ ہوئے اور دونوں خود بھی محفل سماع میں پہنچ گئے اور سماع سے ان پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ بے حال ہو گئے اسی شب رسول مقبول ﷺ نے انہیں مطلع کیا کہ انہیں بختیار کی محفل سماع میں شرکت کرنی چاہیئے ۔

دونوں نادم و شرمسار جب محفل سے نکلے تو سلطان نے انہیں برخاست کر دیا اور اس کا ان کے دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ اس صدمے اور خجالت نے ان دونوں کی جان لے لی ۔



حضرت خواجہ چشتی کو وصال فرمائے دو سال گزر چکے تھے بختیار کاکیؒ اُداس اُداس رہتے تھے اسی عالم میں عید آگئی نماز ادا کر کے واپس جو ہوئے تو ایک جگہ رُک کر کچھ سونگھنے لگے کسی نے پوچھا "یا حضرت! کیا سونگھ رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا "ہمیں یہاں کی زمین سے بوئے عشق محسوس ہو رہی ہے" پھر اس زمین کے مالک کو طلب کیا اور اس سے یہ زمین خرید لی اور مریدوں سے فرمایا کہ "ہمیں یہیں دفن کیا جائے"۔

محفل سماع گرم تھی قوال پر بھی وجد کی کیفیت طاری تھی اس نے لہرا کر یہ شعر ادا کیا:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حضرت بختیار کاکیؒ کی حالت غیر ہو گئی آپ بے ہوش ہو گئے شعر کی تکرار ہوتی رہی اور آپ کا حال متغیر ہوتا رہا پھر تین دن تک یہی کیفیت رہی، جب آخری بار ہوش میں آئے تو اس وقت آپ کا سر حمید الدین ناگوری کے زانو پر تھا اور پیر بدرالدین غزنوی کے آغوش میں۔ آپ نے خرقہ خلافت اپنے غیر حاضر مرید حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو پہنچانے کا حکم دیا اور وصال فرما گئے۔ چاروں طرف ایک کہرام برپا ہو گیا۔

جب آپ کا جسد مبارک نماز کے لئے سامنے رکھا گیا تو خواجہ ابو سعید نامی ایک محرمِ راز

نے باآواز بلند یہ اعلان کیا کہ حضرت بختیار کاکی نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ ان کے جنازے کی امامت وہ شخص کرے گا جس نے تمام عمر حرام نہ کیا ہو اور عصر کی سنت اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کیا ہو۔

یہ ایک ایسا اعلان تھا جس نے سب کو گونگا کر دیا بڑے بڑے بزرگ اور شیوخ موجود تھے لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو حضرت بختیار کاکی کی شرط وصیت پر پورا اترتا ہو پھر ایک شخص مجمع سے علیحدہ ہو گیا اور آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چل کر جنازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اس نے دُکھ کے لہجے اور رسوا ہو جانے کے احساس سے اپنی زبان کھولی۔

"لوگو! ہمیں بے حد دُکھ اور افسوس ہے کہ جس راز کو ہم پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے حضرت بختیار نہیں چاہتے کہ وہ پوشیدہ رہے ہم ان کی وصیت اور حکم کی تعمیل میں امامت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں"

یہ آواز شہنشاہ ہند شمس الدین التمش کی تھی جس کے لئے بعد میں پتہ چلا کہ حضرت بختیار کے خلفا میں اس کا نام بھی شامل ہے۔

دہلی کی جامع مسجد سے تقریباً گیارہ میل دور قصبہ مہرولی میں حضرت بختیار آرام فرما رہے ہیں اور ان کی وجہ سے لوگ اس جگہ کو قطب صاحب کہتے ہیں۔ ۵۸۲ھ میں پیدا ہونے والے اس ماوراء النہری قطب نے جب ۶۳۴ھ میں دہلی میں وصال فرمایا تو اس وقت آپ کی عمر باون سال کی تھی اور اس مختصر سی مدت میں آپ نے وہ بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا جو ان کے ہمعصر لمبی لمبی عمریں گزار کر بھی نہ حاصل کر سکے۔

بدرالدین غزنوی جن کی آغوش میں آخری لمحات میں آپ کے پیر تھے لوگوں کو بتایا کہ وصال سے ذرا پہلے مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی اسی عالم میں میں نے دیکھا کہ حضرت بختیار اپنے حجرے سے نکل کر متبسم آسمان کی طرف محو پرواز ہیں جب ہم دونوں کی نظریں ملیں تو انہوں نے فرمایا "بدرالدین! اللہ کے دوستوں کو موت نہیں آتی وہ جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں" پھر جب میری آنکھ کھلی تو حضرت بختیار کاکیؒ وصال فرما چکے تھے۔



حضرت جلال الدین تبریزیؒ

معلوم نہیں، کیوں اقتدار سے دل بھر گیا اور شان و شوکت اور نمود و نمائش سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ تبریز کی حکومت بیٹے کے حوالے کی اور بہت سارا مال و منال لے کر شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ سب ان کے سامنے رکھ کر دست بستہ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ ——— اور عرض کیا۔ "حضورؐ آپ کا غلام جلال الدین تبریزی حاضر ہے اس نے حکومت و اقتدار پر لات مار کر حضورؐ کی غلامی کی نیت کر لی ہے آپ اُسے عشق الٰہی کی آگ میں پھونک دینے کے کرم سے سرفراز فرمائیں۔"

شہاب الدین سہروردیؒ کے ارادتمندوں نے اس نووارد کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، تبریز کا حاکم اور فقر و فاقے کی زندگی! کتنی متضاد اور محال بات ہے شہاب الدین سہروردیؒ نے انہیں حکم دیا "یہ مال و زر ہم لے کر کیا کریں گے، اسے حاجت مندوں میں خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کر دو۔"

جلال الدین نے اپنے مرشد کے حکم کی فوراً تعمیل کر دی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ دونوں ہاتھوں سے لٹا کر فراغت حاصل کر لی۔ دونوں ہاتھ جھاڑ کر مرشد کے روبرو مؤدب کھڑے ہو گئے اور عاجزی سے دریافت کیا۔ "حضرت! غلام نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ کوئی اور حکم؟"

مرشد نے اس طالب عشق الٰہی میں معلوم نہیں کیا چیز محسوس کی کہ ارشاد فرمایا۔ "جلال الدین! تجھ میں اب بھی حکومت کی بو باقی ہے پہلے اس کا علاج کر، اس کے بعد تو کچھ حاصل کر سکے گا۔"

جلال الدین نے عرض کیا۔ "یہ غلام ہر آزمائش اور کسوٹی سے گزرنے کو تیار ہے بس آپ کے اشارے کی دیر ہے۔"

شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔ "جلال الدین! تب یہ سر و نمازیوں کے لئے

وضو کے پانی اور استنجے کے ڈھیلوں کی فراہمی کی خدمت کی جا رہی ہے اور یہ کام تجھے پورے چار سال تک انجام دینا ہے، بول منظور؟"

جلال الدینؒ کی پیشانی پر ناگواری یا کراہت کی خفیف سی شکن تک نہ پڑی۔ پُرشوق لہجے میں جواب دیا "منظور، بہ دل و جان منظور"

حکم اور حکومت کا خوگر اپنے سرکش اور مغرور نفس کو، مرشد کی طرف سے مفوضہ خدمات انجام دیکر کچلنے لگا، شہاب الدین سہروردیؒ نہایت گہری نظروں سے جلال الدین کی لگن کا جائزہ لیتے رہے وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے انہیں زود ہضم اور گرم گرم غذائیں پسند تھیں۔ جلال الدین کو جب اپنے مرشد کی اس پسند کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے سر ایک خدمت اور لی، بازار سے ایک انگیٹھی خریدی اور ایک بڑے سے تھیلے میں مرشد کی پسندیدہ چیزیں بھر لیں۔ پھر انگیٹھی میں آگ جلائی۔ اشیاء کا تھیلا شانے سے لٹکا لیا اور انگیٹھی سر پر رکھ لی۔ جہاں جہاں شہاب الدین سہروردیؒ جاتے یہ ان کے پیچھے پیچھے خادموں کی طرح چلتے۔ اس عجیب حلیے میں پیر مرشد نے جو دیکھا تو دریافت کیا "جلال الدین! تو نے یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے خیریت تو ہے؟"

جلال الدین نے جواب دیا "حضور والا! غلام نے آپ کی مریدی اور خدمت کا جو جوا اپنی گردن میں ڈالا ہے ہر طرح اس کا حق ادا کرنا چاہتا ہے معلوم نہیں کس وقت آپ کو کھانے کی اشتہا ہو، اس خیال سے یہ ناچیز کھانے کی اشیاء اور روشن انگیٹھی ساتھ لیے پھرتا ہے کہ بوقت طلبی آپ کو گرم گرم کھانا پیش کیا جا سکے"

مرشد نے اس جذبہ خدمت کو دل ہی دل میں سراہا لیکن زبان سے اظہار نہ کیا۔ ہر وقت جلتی ہوئی انگیٹھی سر پر رکھنے سے بال اور گلے میں لٹکانے سے سینے کے بال اور کھال دونوں جھلس گئے۔

شہاب الدین سہروردیؒ ہر سال حج ضرور کرتے تھے مریدی اختیار کرنے کے بعد جلال الدین تبریزی بھی ساتھ رہنے لگے دورانِ سفر مرشد تو اونٹ پر سوار ہوتے اور جلال الدین پاس ادب سے پیدل چلتے رہتے، گرم ہواؤں کے تھپیڑے، آگ کی طرح جلتے ہوئے ریت کے ذرات اور کھلے آسمان پر آگ کے گولے کی طرح جہنم کی آگ برساتا سورج مکے اور مدینے کے زائرین کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیتے۔ اس عالم میں کس کی مجال تھی جو پیدل سفر کر سکتا لیکن جلال الدین نے اس مشکل مشقت کو بھی اپنے جذبہ شوق سے گلے لگا لیا اور اس امتحان

میں پورے اُترے، منزل تک پہنچتے پہنچتے پیروں میں چھالے پڑ پڑ کر پھوٹ جاتے اور پیروں کے تلوے اور پنجے خون اور آبلوں کے پانی سے پوری طرح بھیگ جاتے اور جب جلال الدّین اس امتحان میں پورے اُترے تو شہاب الدّین سہروردیؒ کی دعاؤں سے اُن کے دونوں پیر بالکل صحیح حالت میں آجاتے۔

حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے بعد شہاب الدّین سہروردیؒ کا قافلہ بغداد میں داخل ہوا تو انہیں ان کے عقیدت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور فرطِ عقیدت میں تحائف پیش کرنے لگے، صبح سے شام تک قیمتی تحائف کا ڈھیر لگ گیا۔ ان ارادت مندوں میں ایک بڑھیا بھی شامل تھی۔ اس نے حضرت سہروردیؒ کی خدمت میں ایک درم پیش کیا۔ رات کو عشاء کے بعد آپ نے اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ "جو تحائف جمع ہوئے ہیں ان میں جو جس کو پسند آئے اپنے گھر لے جائے کیونکہ وہ احتکار کے قائل نہیں ہیں۔"

تمام مرید قیمتی تحائف پر ٹوٹ پڑے لیکن بے غرض، طمع اور حرص سے پاک جلال الدّین نے بڑھیا کے ایک درم پر قناعت کرلی۔ آخر میں حضرت سہروردیؒ نے اس کا جائزہ لیا اور کس کے حصّے میں کیا آیا۔ آپ نے کسی مرید سے پوچھا "تحائف کے اس انبار سے جلال الدّین کے حصّے میں کیا آیا؟"

مرید نے ہنس کر جواب دیا "صرف ایک درم، جو بڑھیا لے کر آئی تھی۔"

آپ نے جلال الدّین کو طلب کیا اور فرمایا: "جلال الدّین! اگرچہ بظاہر تو نے ایک درم اٹھایا ہے لیکن لوگ نہیں جانتے کہ زر و جواہر کے اس انبار میں سب سے زیادہ قیمتی یہی ایک درم تھا...... اللہ تعالیٰ کمی بیشی کو نہیں دیکھتا دل کے اخلاص کو دیکھتا ہے اس نیک بڑھیا نے اس درم کو پورے خلوص اور جوش کے ساتھ پیش کیا تھا اور اس سارے انبار میں جو کچھ تھا وہی ایک درم تھا تو نے وہ درم اٹھا کر دوسروں کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔"

مرشد کی زبان سے کلماتِ خیر سُن کر جلال الدّین کی آنکھیں نم ہوگئیں اور ان کا دل بھر آیا۔

یہیں ان کی ملاقات ایک ہندی درویش سے ہوئی۔ ان کا نام بہاؤالدّین زکریا تھا اور یہ ملتان سے تشریف لائے تھے جلال الدّین تبریزی اُن سے مل کر بہت خوش ہوئے رفتہ رفتہ اُن کی دوستی اتنی بڑھی کہ دونوں علیحدگی میں ایک دوسرے کی کمی محسوس کرنے لگے۔

مرشد کی خدمت میں سات سال رہ کر جلال الدّین مرتبہ کمال کو پہنچ گئے اور اُن کے

رُوحانی کمالات کا چرچا ہونے لگا۔ اسی دوران بہاء الدین ذکریا کو حکم ملا کہ ملتان واپس جاؤ اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دو۔

جلال الدین اس خبر سے ملول ہوئے اور خواہش کی کہ انہیں بھی بہاء الدین کے ساتھ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ مُرشد نے اجازت عطا فرما دی اور دونوں دوست ہندوستان روانہ ہو گئے۔ دونوں کا گزر نیشاپور سے ہوا وہاں مولانا عطّار رومی کا قیام تھا اور یہ علو ئے مرتبت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے جلال الدین تبریزی تے اُن سے ملاقات کی لیکن بہاء الدّین ذکریا ان سے نہیں ملے۔ جب یہ مل کر اپنے دوست بہاء الدّین کے پاس پہنچے تو انہوں نے جلال الدّین سے پوچھا" جلال الدّین! شیخ عطّار سے مل لیے؟

جلال الدّین نے جواب دیا" ہاں مل لیا"۔ اور خوشی سے ان کا چہرہ تمتما گیا۔

بہاء الدین نے اشتیاق سے پوچھا" کہیے ملاقات کے بعد کس درویش کو بہتر پایا؟ اپنے مُرشد شہاب الدین سہروردیؒ کو یا شیخ فرید الدّین عطّار کو؟

جلال الدّین نے خلاف توقع جواب دیا" شیخ فرید الدین عطّار کو"

بہاء الدّین نے حیرانی سے پوچھا" ان سے کیسی صحبت رہی؟

جلال الدّین نے جواب دیا" شیخ عطّار نے مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں سے آ رہے ہو؟ میں نے جواب دیا، بغداد سے، انہوں نے سوال کیا۔ وہاں کون درویش مشغولِ حق ہے؟ میں ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا اور خاموش کھڑا رہا"۔

بہاء الدّین نے کہا" تم نے اپنے مرشد حضرت شہاب الدّین سہروردیؒ کا نام کیوں نہیں لیا؟"

جلال الدّین نے سچائی کا سہارا لیا بولے "میں اس وقت شیخ عطّار کی عظمت سے اتنا...... مرعوب اور متاثر ہو چکا تھا کہ میرا یارائے گفتگو جاتا رہا اور میں بدقسمتی سے اپنے مُرشد کو بھی بھلا بیٹھا"۔

بہاء الدین نے افسوس سے کہا" خوب! جلال الدّین! اب ہم دونوں نہ تو ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ ساتھ ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ تم نے خاموش رہ کر پیر و مُرشد کی بے عزتی کی ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اور ہم اُسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتے"۔

جلال الدّین نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ بولے " بابا بہاء الدّین اگر تم علیحدگی

پر ہی مُصر ہو تو تمہاری مرضی ۔ ورنہ میں اپنی اس کوتاہی کے عذر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شیخ عطارؒ نے اس وقت میری قوت گویائی صلب کر لی تھی اور میں نے اُن کے سوال کے جواب میں وہی روش اختیار کی، جس کے وہ خواہش مند تھے ۔"

دونوں درویش ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے ۔ بہاؤ الدین زکریا ملتان چلے گئے اور جلال الدین نے دہلی کا رُخ کیا ۔ یہ دہلی کے اس عہد کی بات ہے جب یہاں سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی اور حضرت بختیار کاکیؒ کا روحانی فیض ایک نوری ہالے کی طرح پھیل کر دہلی اور اس کے گرد و نواح پر محیط ہو چکا تھا ۔

دہلی پہنچتے پہنچتے انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی حضرت بختیار کاکیؒ ان کے منتظر تھے اور سلطان شمس الدین التمش ان کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لئے مضطرب اور مستعد تھا جب جلال الدین تبریزی دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستان کے بادشاہ کو استقبال کے لئے موجود پایا ۔ التمش نے جوش عقیدت سے انہیں خوش آمدید کہا ۔ التمش کے ساتھ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ بھی تھا اس نے جلال الدین تبریزی کی غیر معمولی آؤ بھگت کو حاسدانہ محسوس کیا ۔ التمش انہیں شاہی محل تک نہایت اعزاز و احترام سے لایا ۔ اس کے بعد اس نے شیخ الاسلام سے مشورے کے طور پر پوچھا "حضرت تبریزی کو کہاں ٹھہرانا چاہیئے؟"

شیخ الاسلام نے حسد سے جواب دیا "بیت الجن میں"

سلطان نے کہا "بیت الجن میں کیوں ؟ اس مکان میں جو جن اقامت گزیں ہیں وہ کس طرح حضرت تبریزی کو سکون سے رہنے دیں گے ؟"

شیخ الاسلام نے کہا "اگر جلال الدین تبریزی مرد کامل ہیں تو جن انہیں نہیں ستائیں گے اور اگر یہ سب کچھ ڈھونگ ہے اور ان کا خرقہ فقیری لوگوں کو ٹھگنے کا جال ہے تو انہیں ان کی ریا کاری کی سزا ضرور ملنی چاہیئے اور بیت الجن کے اجنہ خود ہی انہیں سزا دے لیں گے ۔"

بادشاہ نے کسی حد تک شیخ الاسلام کی بات سے اتفاق بھی کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جلال الدین ہمارے مہمان ہیں ہمیں اُن سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیئے ۔

شیخ الاسلام نے خاموشی اختیار کی ۔ بادشاہ اور شیخ الاسلام کی بات چیت انتہائی رازدارانہ ہو رہی تھی اور اس کا کسی اور کو ذرا بھی علم نہ تھا ۔ ابھی دونوں خاموش ہی ہوئے تھے کہ جلال الدین تبریزی ان دونوں کے پاس آئے اور شیخ الاسلام سے کہا "نجم الدین ! بیت الجن مقفل ہے اس کی چابی کہاں ہے لاؤ ، ہم اس میں قیام کریں گے ۔"

بادشاہ معنی خیز انداز میں شیخ الاسلام کی شکل دیکھنے لگا۔ شیخ الاسلام نے بیت الجن کی چابی تبریزی کے حوالے کر دی۔ تبریزی نے یہ چابی اپنے ایک ساتھی درویش کی طرف بڑھا دی اور اُسے حکم دیا "تراب! یہ کنجی لو اور بیت الجن چلے جاؤ، اسے کھولو اور دروازے پر کھڑے ہو کر باآواز بلند یہ کہہ دو کہ اے قوم اجنہ! اس مکان میں تم ایک عرصے سے رہ رہے ہو اب اسے خالی کر دو کیونکہ اس میں جلال الدین تبریزی رہنا چاہتا ہے"

تراب نے چابی لی اور بیت الجن کا قفل کھول دیا۔ تراب نے دروازے کے اندر قدم رکھ کر تبریزی کا پیغام باآواز بلند سنا دیا اور گلے میں پڑی ہوئی حمائل شریف بیت الجن کی ایک کھونٹی میں لٹکا دی۔ اس کے بعد جلال الدین تبریزی بھی بیت الجن میں داخل ہو گئے اور اطمینان سے رہنے لگے۔

عام شاہراہ کو چھوڑ کر جلال الدین نے چھوٹی چھوٹی گلیاں اختیار کیں وہ حضرت بختیار کاکی سے ملاقات کرنے جا رہے تھے انہوں نے عام شاہراہ اس خیال سے ترک کی تھی کہ بڑے اور معروف راستوں میں ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم تھا اور وہ ہجوم سے گھبراتے تھے اسی غیر معروف اور سنسان راہ میں ایک جگہ حضرت بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہو گئی جلال الدین تبریزی ان سے گلے لگ گئے اور پوچھا "بابا بختیار! ہم تم سے ہی ملنے جا رہے تھے، تم کہاں؟"

حضرت بختیار کاکیؒ نے جواب دیا "ہمیں تمہارے ارادے کی اطلاع ہو گئی تھی اس لئے ہم تمہارے استقبال کے لئے آگے بڑھے اور تمہیں اس جگہ پا لیا"

دونوں دوست ہنسنے لگے۔

ان واقعات اور جلال الدین کی عزت افزائی کی خبریں برابر شیخ الاسلام کو پہنچ رہی تھیں وہ حسد کی آگ میں بُری طرح جل بھن رہا تھا اس کا دماغ جلال الدین تبریزی کے خلاف سازش کرنے میں مصروف تھا۔ رات بے چینی میں گزارنے کے بعد شیخ الاسلام شاہی محل کی مسجد میں نماز پڑھانے پہنچا۔ یہ مسجد بالائی حصے میں واقع تھی اور یہاں سے جلال الدین کی قیام گاہ کا ...... اندرونی حصہ صاف نظر آتا تھا۔ شیخ الاسلام نے دیکھا کہ جلال الدین نماز کی غرض سے مسجد میں نہیں آئے اور وہ اپنے مکان کے صحن میں نہایت اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے اور ایک غلام ان کے پیر دبا رہا تھا۔ غلام نوعمر اور حسین تھا شیخ الاسلام

نے یہ ہوش رُبا منظر دیکھا تو بے چین ہو گیا۔ اس وقت بادشاہ بھی آچکا تھا۔ شیخ الاسلام نے التمش سے جلال الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ حضور! ذرا ملاحظہ فرمایئے، یہ ہے وہ شخص جس کے زہد اور تصوف کا دور دور چرچا ہے۔ مجھے تو بس یہ شخص یوں ہی سا نظر آتا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا "شیخ الاسلام! تم تبریزی کے پیچھے مت پڑو کیونکہ ایسا کرنے میں کسی بڑے نقصان کا احتمال موجود ہے۔"

اسی دوران مکان کے اندر سے باآواز بلند جلال الدین تبریزی کی آواز گونجی، آپ نے فرمایا: "شیخ الاسلام! ابھی تو نے کیا دیکھا ہے اگر ذرا دیر پہلے آجاتا تو تجھے یہ غلام پیر دابتا ہوا نہ ملتا بلکہ یہ ہماری آغوش میں ہوتا۔"

دونوں کی گفتگو بادشاہ نے بھی سن لی اس نے شیخ الاسلام کو ڈانٹا: "شیخ الاسلام تم مزید کوئی ہنگامہ کھڑا کرو گے، ہم تمہیں یہ کس طرح بتائیں کہ جلال الدین ایک غیر معمولی انسان ہے اسے چھیڑو مت۔"

لیکن شیخ الاسلام انتہا پسند تھا اس نے اپنا اصل ارادے کو چھپائے رکھا تقریباً دوپہر سے ذرا پہلے مشہور گانے والی شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچی شیخ الاسلام گوہر سے بات کرنے لگا۔ شیخ الاسلام بات تو گوہر سے کر رہا تھا لیکن اس کا دماغ ایک خطرناک سازش کا منصوبہ تیار کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار کچھ کہنے کے لئے زبان کھولنا چاہی لیکن نہیں کھلی۔ آخرکار ہمت کر کے شیخ الاسلام نے حرفِ مدعا بیان کیا۔

"گوہر! ہم تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں کیا تو اُسے گوارا کرے گی اور اس بات کا حلف اٹھائے گی کہ جو کچھ ہم کہیں گے تو اسے اپنے دل میں کسی کی امانت کی طرح محفوظ رکھے گی۔"

گوہر نے جواب دیا: "حضور حکم تو فرمائیے، پھر دیکھیے گا آپ کی یہ کنیز بجا آوری حکم اور اطاعت میں کتنی مستعد اور محتاط نکلتی ہے۔"

شیخ الاسلام نے ڈھائی سو سرخ دینار اس کی خدمت میں پیش کر دیے اور مسکراتے ہوئے کہا: "گوہر! یہ حقیر سا نذرانہ ہے بقیہ ڈھائی سو دینار ہم احمد اشرف نامی بقال کے پاس رکھوائے دیتے ہیں اور ہم نے اسے یہ ہدایت کر دی ہے کہ جب تو اپنا کام انجام دے چکے تو وہ تجھے بقیہ ڈھائی سو دینار بھی دے دے۔"

گوہر نے پریشان ہو کر پوچھا "وہ کام تو بتائیے پہلے"

شیخ الاسلام نے اس کے کان میں کہا "تو دو چار بار جلال الدین تبریزی کے پاس بھی جا اور انہیں اپنی آواز سے دیوانہ بنا دے۔ تو جلال الدین سے اس طرح ملتی جلتی رہ گویا تیری ان سے قدیم سے راہ و رسم چلی آ رہی ہے پھر ایک دن تو جلال الدین پر یہ الزام لگائے گی کہ انہوں نے تخلیے میں تیری عزت آبرو پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ تجھے یہ تہمت فریادی بن کر بادشاہ کے سامنے دہرانی ہو گی اور تیری گواہی احمد اشرف بقال بھی دے گا"

گوہر نے چند سکوت اختیار کیا پھر کہا "اچھا جناب! بندی کوشش کرے گی کہ اس ناٹک میں اپنا کردار نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے ادا کرے"

گوہر ڈھائی سو دینار سرخ لے کر چلی گئی۔ شیخ الاسلام نے دوسرے ہی دن سے جلال الدین تبریزی کے خلاف یہ افواہ پھیلانا شروع کر دی کہ وہ گوہر نامی مطربہ سے ملوث ہونے کے مرتکب ہو چکے ہیں وہ درویش نہیں بہروپیے ہیں۔

جلال الدین نے جب یہ افواہ سنی تو بہت پریشان ہوئے انہوں نے بادشاہ سے شکایت کی تو بادشاہ نے انہیں تسلی دی اور کہا "آپ پریشان نہ ہوں ہم خود اس معاملے کی تحقیق کریں گے"

جلال الدین چلے آئے تو بادشاہ نے گوہر کو طلب کیا۔ دو سپاہیوں کے درمیان وہ التمش کے سامنے پہنچی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی ہے بادشاہ نے اسے غور سے دیکھا تو اس نے سر جھکا لیا۔ قریب ہی شیخ الاسلام بھی موجود تھا۔

بادشاہ نے شیخ الاسلام سے کہا "نجم الدین! مطربہ رو رہی ہے! کیا واقعی ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ جلال الدین جیسا پاکباز درویش ایسی مذموم اور ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہوا ہو؟"

شیخ الاسلام نے جواب دیا "حضور! گوہر سے دریافت فرمائیں، ظاہر ہے یہ جھوٹ کیوں بولے گی؟"

بادشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مطربہ کی سوگواری نے ہمیں شک و شبہے میں ڈال دیا ہے اور ہمیں کچھ کچھ یہ خیال ہو چلا ہے کہ یہ سب کچھ کسی سازش کے ماتحت ہو رہا ہے"

شیخ الاسلام گھبرا گیا، لیکن چہرے پر اس کا کوئی اثر نہ آنے دیا پوچھا۔

"حضور کو کس قسم کا شبہ کس بات پر ہوا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "یہ ایک مطربہ ہے، بدنام فاحشہ اگر جلال الدین واقعی اس سے ملوث ہو چکے تھے تو اسے اتنا شور نہیں مچانا چاہیئے تھا کیونکہ یہ ایک پیشہ ور زن بازاری ہے"۔

چالاک شیخ الاسلام نے کہا "حضور! اسے ملال تو اس بات کا ہے کہ وہ ایک درویش کی سالہاسال کی عبادت اور تقوے کی بربادی کا سبب بن گئی ہے"

بادشاہ نے گوہر سے پوچھا "مطربہ! تو اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟"

مطربہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے عرض کیا "حضور! میں یوں ہی کیا کم گناہگار تھی کہ جلال الدین نے مجھے اور زیادہ تباہ کر دیا۔ کل ——— قیامت میں اپنے اللہ کو کیا جواب دوں گی؟"

بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا "سارا معاملہ صاف صاف بیان کر کیونکہ اس نازک مقدمے میں اشاروں کنایوں سے باتیں نہیں کی جا سکتیں"۔

مطربہ نے روتے ہوئے عرض کیا "حضور! مجھے جلال الدین نے عشاء کے بعد طلب کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ سننا چاہتے تھے۔ میں چلی گئی انہوں نے دروازے بند کر لیے اور تخلیے میں مجھ سے ایک ایسی شے کے طالب ہوئے کہ میں حواس باختہ ہو گئی جب میں نے اُن سے کہا کہ یہ آپ کیا چاہ رہے ہیں اس طرح تو آپ کا زہد و تقویٰ اور درویشی سب خاک میں مل جائیں گے تو شیخ نے جواب دیا۔ کہ میرے اعمال کی تم فکر نہ کرو، خدا کے سامنے ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہو گا۔ میں نے اس پر بھی مزاحمت کی لیکن جلال الدین کے طاقتور بازوؤں نے وہ سب کر دیا جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سانحے کے بعد میں ایک لمحے کا سکون بھی نہیں حاصل کر سکی ہوں۔ اندر سے کوئی شے مجھ کو کے لگاتی رہتی ہے"

اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

بادشاہ نے فکرمند آواز میں کہا "نجم الدین! مطربہ نے جرم کا اقرار کر لیا ہے یہ تعزیر کی مستحق ٹھیرتی ہے لیکن جلال الدین تبریزی پر اس وقت تک حکم تعزیر جاری نہیں ہو سکتا جب تک وہ واقعی اس جرم کے مرتکب نہ ٹھیر جائیں"

شیخ الاسلام نے کہا "گوہر کے بیان کے بعد کیا کسی اور گواہی کی ضرورت باقی

رہتی ہے، اس ناچیز کی رائے میں اگر گوہر اس سلسلے میں اپنا ایک گواہ پیش کردے تو اس مقدمے کا فیصلہ بآسانی سنایا جا سکتا ہے۔"

بادشاہ نے مطربہ سے پوچھا "اس سلسلے میں تیرا کوئی گواہ؟"

مطربہ نے جواب دیا "جب میں آبرو باختگی کے بعد باہر نکلی تھی تو دروازے پر احمد اشرف بقال سے ملاقات ہوگئی تھی وہ باباجلال الدین تبریزی کی خدمت میں حاضری دینے آیا تھا لیکن جب اس نے میری داستان سنی تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر واپس ہولیا اور توبہ استغفار کرنے لگا۔"

شیخ الاسلام نے کہا "اگر جہاں پناہ اجازت دیں تو یہ ناچیز جلال الدین تبریزی کے خلاف اپنا شرعی فیصلہ سنا دے۔"

بادشاہ نے جواب دیا "نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس مقدمے کے مدعی تم خود ہو اور مدعی خود اپنے مقدمے کا فیصلہ کس طرح سنا سکتا ہے؟ ہمیں اس مقدمے کے لئے دوسرا حاکم مقرر کرنا پڑیں گے۔"

اس کے بعد گوہر کو رخصت کر دیا گیا اور بادشاہ نے ہندوستان کے بڑے بڑے علماء اور شیوخ کو دربار میں حاضری کا فرمان جاری کر دیا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ جنہیں علوم ظاہری کے ساتھ ہی باطنی علوم بھی حاصل تھے یہ دوسو سے زائد تھے اور ان میں بہاء الدین زکریا ملتانی بھی شامل تھے۔

پورے ملک کے علماء اور شیوخ بادشاہ کے پاس پہنچ گئے انہیں جامع مسجد میں جمع کیا گیا۔

بادشاہ نے شیخ الاسلام سے کہا "نجم الدین! تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ تم اپنے حکم سے ان علما اور شیوخ میں سے ایک حکم مقرر کردو تاکہ وہ اس افسوس ناک مقدمے کی کاروائی کرے اور اپنا فیصلہ سنا دے۔"

شیخ الاسلام، جلال الدین تبریزیؒ اور بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی باہمی رنجش سے آگاہ تھا اس نے فوراً حضرت زکریا ملتانی کا نام لیا بولا "میں بہاء الدین کو اس مقدمے کا حکم بناتا ہوں وہ کاروائی شروع کریں۔"

نماز جمعہ کے بعد مقدمے کی کاروائی شروع ہوئی۔ بادشاہ خود بھی اُن سب کے

درمیان موجود تھا۔ شیخ الاسلام نے ایک خدمت گار کو حکم دیا" مطربہ کو حاضر کیا جائے۔
خدمت گار باہر گیا اور مطربہ کو لے کر واپس آگیا۔ اس کے پیچھے ہی جلال الدین تبریزی بھی مسجد میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنے جوتے ہاتھ میں لے لئے اور ننگے پیر مسجد کے صحن کی طرف بڑھے۔ تمام علماء اور صوفیاء ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے بہاء الدین زکریا تیزی سے آگے بڑھے اور جلال الدین تبریزی کے جوتے نہایت ادب سے خود لے لیے اور انہیں شانے سے پکڑ کر اپنی نشست گاہ تک لائے اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

بادشاہ نے کہا" بس جناب ہو چکا فیصلہ۔ اب فیصلے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ شیخ الاسلام نے جس ذات کو اس مقدمے کا حکم بنایا ہے وہ خود جلال الدین کی اس قدر تعظیم بجا لا رہا ہے"

بہاء الدین زکریا نے جلال الدین تبریزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔
" جناب والا! یہ تو اس کے مستحق ہیں کہ میں ان کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں۔ یہ مسلسل سات سال تک حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کے سفر و حضر میں جس طرح ساتھ رہے اس سے ان کے زہد و تقا کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے تبریز کی حکومت اور حکومت کے تعیشات کو لات مار دی۔ اس لئے ہم سب پر ان کی تعظیم واجب ہے" اس کے بعد انہوں نے شیخ الاسلام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ نجم الدین کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ ہم نے جلال الدین کی تعظیم کے پردے میں ان کا عیب چھپا لیا" پھر مسجد میں موجود تمام علماء اور صوفیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" ہمیں یقین ہے کہ یہاں جتنے بھی عالم اور صوفی موجود ہیں وہ جلال الدین کے مرتبے سے خوب اچھی طرح واقف ہیں" مسجد میں سناٹا طاری ہو گیا۔ بہاء الدین زکریا اچانک گوہر مطربہ سے مخاطب ہوئے کہنے لگے " مطربہ! ابھی تیری شکایت کا علم ہو چکا ہے اور تو یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ ہم اور دوسرے صوفیائے کرام جو اس وقت مسجد میں موجود ہیں، باطنی علوم بھی رکھتے ہیں اور انہوں نے جلال الدین کو جس طرح تعظیم دی ہے وہ ریاکاری کی تعظیم نہیں ہے تجھ پر یہ فرض ہے کہ یہاں جو کچھ بھی کہے سچ سچ کہے ورنہ جھوٹ میں تباہ کاری اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"

مطربہ پہلے ہی بدحواس ہو رہی تھی وہ اہل اللہ کی تیز نظروں کی تاب نہ لا سکی سر جھکا کے باآواز بلند اس نے جواب دیا۔

"میرا خدا بہتر جانتا ہے کہ بابا جلال الدین پر یہ صریح تہمت اور بہتان ہے اور یہ سارا کھیل شیخ الاسلام کا تیار کیا ہوا ہے"

اس کے بعد اس نے ساری تفصیل بتا دی اس نے ڈھائی سو دینار بھی وہیں ڈھیر کر دیے اسی لمحے احمد اشرف بقال کو بھی طلب کر لیا گیا اس نے مطربہ کے بیان کی تائید کی اور بقیہ ڈھائی سو دینار بھی پیش کر دیے شیخ الاسلام نے سازش کا بھانڈا پھوٹتے جو دیکھا تو بدحواس ہو گئے اور ان کے اعصابی نظام میں انتشار پیدا ہو گیا وہ تھرتھرا کے مسجد کے صحن میں گرے اور بے ہوش ہو گئے بادشاہ نے انہیں اسی وقت معزول کر دیا اور بہاء الدین ذکریا کو شیخ الاسلام کا منصب بخشا۔

اس واقعے نے جلال الدین کو بے حد ملول کر دیا اور انہوں نے دہلی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُن کا دُوسرا مستقر بدایوں قرار پایا لوگوں نے آپ کو روکنا چاہا لیکن آپ نے یہ کہہ کر ان کی درخواست مسترد کر دی کہ جب میں اس شہر میں آیا تھا تو خالص سونا تھا لیکن اب چاندی رہ گیا ہوں، آئندہ معلوم نہیں کیا ہو

جلال الدین بدایوں چلے گئے وہاں جس مکان میں آپ کا قیام تھا آپ وہاں اکثر دروازے پر بیٹھ جایا کرتے تھے ایک دن صبح ہی صبح ایک ہندو سر پر دہی کا مٹکا لیے سامنے سے گزرا۔ یہ شخص موضع کنہر کا ڈاکو تھا جو دن میں تو دہی بیچتا تھا اور رات میں ڈاکے ڈالتا تھا جلال الدین نے اُسے گھور کر دیکھا اُس کی نظریں بھی ٹکرائیں، وہ کھنچا ہوا آپ کے قریب پہنچا اور بے اختیاری میں کہا "تم مسلمان ہو؟ محمدؐ کی امت میں؟"

آپ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور نظریں اس کے چہرے اور آنکھوں کی راہ سے دل میں اُترتی چلی گئیں۔ اس شخص نے کہا "حضرت! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں مجھے مسلمان کر لیجئے"

آپ نے اُسے مسلمان کر لیا اور اس کا نام علی رکھا، بعد میں یہ شخص بزرگی اور فضیلت کے اس مرتبے تک پہنچا کہ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی دستارِ فضیلت اسی نے باندھی۔

علی نے ایک لاکھ جیتل آپ کی خدمت میں پیش کئے اور عرض کیا "حضرت! آپ انہیں جہاں چاہیں خرچ کریں"۔

آپ نے جواب دیا "انہیں تم اپنے ہی پاس رکھو اور جس کے لئے جتنے کا ہم حکم دیں تم خرچ کر دینا"۔

چنانچہ اس کے بعد جو حاجت مند بھی آیا، آپ ان جیتلوں میں سے کچھ نہ کچھ دلوا دیتے۔ اس تقسیم میں یہ خاص بات تھی کہ کسی حاجت مند کو بھی آپ نے سو سے زیادہ اور پانچ سے کم نہیں دلوائے آخر میں کچھ ایسا ہوا کہ کسی طرح بس ایک جیتل باقی رہا۔ علی نے سوچا کہ اب جو حاجت مند آئے گا اور بابا جلال الدین اس کو پانچ جیتل دینے کا حکم دیں گے تو بقیہ چار کہاں سے لائیں گے علی ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک حاجت مند آگیا بابا جلال الدین نے حکم دیا۔

"علی! تمہارے پاس ایک جیتل باقی بچا ہے وہ اس شخص کو دے دو"۔

علی نے جیتل تو حاجت مند کے حوالے کیا اور فرطِ عقیدت سے بابا جلال الدین کے قدموں میں گر کر رونے لگا۔

بدایوں کے حاکم قاضی کمال الدین کی جلال الدین تبریزی سے بڑی دوستی ہو گئی تھی دونوں ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے ایک دن جلال الدین قاضی سے ملنے جو گئے تو قاضی کے خادم نے انہیں بیٹھک میں بٹھا دیا اور کہا "حضرت تشریف رکھیں، قاضی صاحب اس وقت نماز میں مشغول ہیں"

بابا تبریزی نے فرمایا "خوب! کیا قاضی بھی نماز پڑھنی جانتا ہے؟" اور آپ وہاں رکے نہیں، اپنے گھر واپس چلے آئے۔ خادم نے بابا تبریزی کی آمد اور اُن کا جملہ قاضی کے سامنے بیان کر دیا۔ قاضی کو اس سے تکلیف پہنچی وہ سیدھا جلال الدین کے پاس پہنچا اور حاکمانہ شان سے گردن ٹیڑھی کر کے پوچھا "کیا آپ نے میرے خادم سے یہ فرمایا تھا کہ کیا قاضی بھی نماز پڑھنی جانتا ہے؟"

قاضی کا خیال تھا کہ شاید اس طرح جلال الدین اس کے رعب میں آجائیں گے لیکن اُن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ صاف صاف کہہ دیا "ہاں میں نے یہ کہا تھا"

قاضی نے طنزاً کہا "خوب! میں قاضی ہوں اور میرا علم و فضل مانا ہوا ہے اگر میں نماز پڑھنی نہیں جانتا تو پھر اس شہر میں کون ہے جو نماز پڑھنی جانتا ہے"۔

جلال الدین نے نرمی سے فرمایا "قاضی! تم میرا مطلب نہیں سمجھے، علماء کی نماز اور ہوتی ہے اور فقرا کی اور! تم اس سلسلے میں مجھ سے مت الجھو"۔

قاضی نے غصے میں کہا "کیوں نہ الجھوں، تم باتیں ہی الٹی سیدھی کر رہے ہو نماز میں جو سورتیں پڑھی جاتی ہیں کیا وہ الگ الگ ہوتی ہیں، کیا علماء کا قرآن اور ہوتا ہے اور فقرا کا قرآن کوئی اور۔ کیا ان دونوں کے رکوع اور سجود میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے؟"

آپ نے بدستور تحمل سے جواب دیا "قاضی! تم میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔ بیشک قرآن اور نماز کا طریقہ دونوں کا ایک ہی ہے لیکن دونوں کی نمازوں میں فرق اتنا ضرور ہوتا ہے کہ علماء قیام سے کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور فقرا جب تک کعبے کو دیکھ نہیں لیتے تکبیر تک نہیں کہتے۔ فقرا کی معمولی نماز یہ ہے کہ وہ عرش پر پڑھی جائے"۔

قاضی ان کی بات سے متفق نہ ہوا اور اسے گمان گزرا کہ اس طرح جلال الدین شاید اپنی کرامت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ میں نماز میں کعبے دیکھتا رہتا ہوں اور عرش پر نماز ادا کرتا ہوں۔ دوستانہ تعلقات کا خیال کر کے قاضی نے خاموشی اختیار کی اور چپ چاپ واپس آ گیا۔

رات کو خواب میں قاضی نے دیکھا کہ بابا جلال الدین تبریزی عرش معلّٰے پر جا نماز بچھائے نماز ادا کر رہے ہیں۔

دوسرے دن اتفاق سے دونوں ایک ضیافت میں یکجا ہوئے جب قاضی وہاں پہنچا تو بابا جلال الدین لوگوں سے گفتگو میں محو تھے قاضی پر نظریں پڑتے ہی آپ نے کہا "علماء کی معراج یہ ہے کہ وہ متولی یا مدرس بن جائیں، زیادہ پڑھ لیں تو قاضی بن جائیں اس سے زیادہ ترقی کریں تو صدر الصدور کا عہدہ سنبھالیں اور یہ ان کی انتہا ہے لیکن فقرا کے مرتبے کی کوئی حد نہیں۔ ان کا پہلا مرتبہ وہ ہے جس کا قاضی نے رات کو خواب میں مشاہدہ کیا ہے"۔

قاضی کا سارا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں کھڑا ہوا اور بے ساختہ بڑھ کر بابا جلال الدین کے قدموں میں سر رکھ دیا اور معافی مانگنے لگا۔

بابا جلال الدین نے ایک مسجد کی تعمیر کا کام شروع کرایا تو کعبے کی سمت کا مسئلہ زیرِ غور آیا۔ آپ نے معماروں سے، ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "ادھر دیکھو، کچھ نظر آیا؟"

معماروں کے سامنے کعبہ موجود تھا۔ ہلکے دھوئیں کی چادر کے اُس پار خانہ کعبہ صاف نظر آ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا "اس سے کعبے کی صحیح سمت کا تعین کر لو۔"

ایک دن آپ ندی کے کنارے دوستوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے اور دوستوں سے کہا "دوستو! اُٹھو اور وضو کر لو تاکہ نجم الدین صغریٰ کی نماز جنازہ پڑھ لیں" پھر خود بھی وضو کرنے لگے ساتھ میں دوسروں نے بھی وضو کیا وضو کر چکنے کے بعد آپ نے فرمایا "گو کہ ہمیں نجم الدین کی شرارتوں ہی کی وجہ سے دہلی چھوڑنی پڑی۔ لیکن اب جبکہ وہ ملک عدم سدھار چکا ہے ہمیں اس کے لئے دعائے مغفرت کرنی چاہیئے۔"

آپ نے باقاعدہ نماز جنازہ پڑھی۔ چند دنوں بعد نجم الدین کے انتقال کی باقاعدہ خبر بھی آگئی اور حساب لگانے پر پتہ چلا کہ ٹھیک اسی وقت انتقال ہوا تھا جب بابا تبریزی ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی تیاری کر رہے تھے۔

آپ کا بدایوں سے دل اُکتایا تو اودھ کا رُخ کیا اور اودھ سے بہار روانہ ہو گئے بہار سے بنگال پہنچے، بنگال کا لکھنوتی مسلمانوں کا صدر مقام تھا آپ نے لکھنوتی سے چند فاصلے پر پنڈوہ نامی جگہ پر ایک درخت کے سایے میں قیام فرمایا۔ یہاں مندروں کی کثرت تھی۔ مندروں سے ناقوسوں اور گھنٹیوں کی آوازیں ہر وقت فضائیں گونجتی رہتی تھیں چند دنوں بعد پجاریوں اور ہندوؤں نے انہیں ایک درخت کے نیچے آرام کرتے دیکھا تو حیران ہوئے ہندو ان کی نگرانی کرنے لگے آپ کو جب بھوک لگتی تو درخت کے پتے کھا لیتے کپڑے میلے ہوتے تو خود دھو لیتے۔ جب یہ اپنے کپڑے دھونے تالاب پر پہنچتے تو ہندو بڑا شور کرتے لیکن ان کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں مصروف رہتے کئی پجاری آپ کے اس فعل میں مزاحم ہوئے لیکن آپ کو باز نہ رکھ سکے۔ جب کسی اور طرح بابا جلال الدین کو قائل نہ کر سکے تو انہوں نے مناظرے شروع کر دیئے اور مناظروں کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے کچھ ہی عرصے میں آپ کی تعلیمات اور قوت روحانی کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنڈوہ کی بیشتر آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ مسجدیں تعمیر ہونے لگیں، کل

تک جو پجاری ناقوس پھونکا کرتے تھے اور گھنٹے بجاتے تھے اب مسجدوں میں امامت کرتے نظر آتے تھے اور لوگ پنجوقتہ نماز کی حاضری دینے لگے تھے اور لوگوں نے پھر یہ تماشا بھی دیکھا کہ پنڈوہ سے مندر غائب ہو گئے اور مسجدیں شمار سے باہر ہو گئیں وہاں کی پوری آبادی مسلمان ہو چکی تھی اور جو اسلام قبول نہ کر سکے تھے انہوں نے راہ فرار اختیار کی تھی اور پنڈوہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا تھا۔ بنگال کا اسلام بابا تبریزی کا رہین منت ہے پنڈوہ سے آپ بندرگاہ دیو محل تشریف لے گئے اور وہاں بھی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ یہاں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ بابا تبریزی کی کوشش اور تصرف باطنی سے یہاں بھی اسلام پھیلنے لگا آپ نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دیو محل کے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

آپ کی عمر ایک سو پچاس سال ہو چکی تھی آپ کے گرد و پیش عقیدت مندوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ یکایک آپ نے مراقبے سے سر اٹھایا اور اپنے چار عقیدت مندوں سے کہا "لوگو! ذرا شمال مغرب کی راہ پر جانا تو، طنجہ (افریقہ) کا ایک سیاح ہماری محبت کو دل میں چھپائے ہم سے ملنے آ رہا ہے، ذرا اس کا استقبال تو کرنا"

چاروں عقیدت مندوں نے دو منزل چل کر طنجہ کے اس سیاح کا شاندار استقبال کیا یہ مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ تھا جو شیخ تبریزی کی شہرت سن کر اُن سے ملاقات کرنے آ رہا تھا اسے اپنے استقبال کو پہنچنے والوں کی زبان سے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ بابا تبریزی نے انہیں استقبال کے لئے بھیجا ہے۔

ابن بطوطہ والہانہ جلال الدین تبریزی کی خدمت میں پہنچا اُس نے دیکھا ایک ڈیڑھ سو سالہ دُبلا پتلا، کشیدہ قامت، نورانی چہرے کا باعظمت انسان ابن بطوطہ کا منتظر ہے ابن بطوطہ نے انہیں سلام کیا، آپ نے جواب دیکر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ابن بطوطہ نے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اس وقت جلال الدین تبریزی کے جسم پر ایک نہایت قیمتی عمدہ جبہ تھا ابن بطوطہ نے دل میں سوچا "اے کاش شیخ تبریزی اپنا یہ جبہ مجھے مرحمت فرما دیں"

پھر لوگوں نے یہ دیکھا کہ آپ فوراً اندر تشریف لے گئے اور ایک دوسرا جبہ پہن کر قیمتی جبہ ہاتھ میں لئے دوبارہ نمودار ہوئے آپ نے یہ جبہ ابن بطوطہ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا "یہ جبہ تجھے پسند ہے تو لے لے، لیکن یہ تیری قسمت کا نہیں ہے ملا سے

میں نے اپنے بھائی کے لئے تیار کروایا تھا، خیر تو لے جا، یہ چغہ تیرے پاس نہیں رہے گا نہیں یہ تجھ سے چھن جائے گا ایک غیر مسلم بادشاہ اس چغے کو جبراً چھین لے گا لیکن یہ رہے گا اس کے پاس بھی نہیں یہ آخرکار میرے بھائی کے پاس پہنچ جائے گا۔"

ابن بطوطہ نے شکریے کے ساتھ یہ چغہ قبول کر لیا اور دل میں یہ ارادہ کر لیا کہ وہ یہ چغہ پہن کر کسی حکمران کے سامنے۔۔۔ ہرگز نہ جائے گا چند دن بابا تبریزی کی خدمت میں گزار کر ابن بطوطہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر چین روانہ ہو گیا۔

دریائے ہوانگ ہو کے جنوبی حصے میں کنگ زے نامی نہایت خوبصورت شہر آباد تھا اسے عرب خنسا کہتے تھے کنگ زے یہاں کا دارالخلافہ تھا۔ ابن بطوطہ کنگ زے میں ایک سیاح کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور بادشاہ سے ملنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا ابن بطوطہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوم پھر کر کنگ زے کے بازاروں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ شاہی محل چوک پر واقع تھا یہاں تین نہریں رواں تھیں ایک نہر کے قریب چوک میں شاہی محل کھڑا تھا ابن بطوطہ نے دور سے اس محل کا مشاہدہ کیا ابھی وہ مشاہدے میں کھویا ہوا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ گئے اور ابن بطوطہ تنہا رہ گیا اس وقت بابا تبریزی کا چغہ اس کے جسم پر تھا۔ ایک اجنبی ابن بطوطہ کی حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے تھا ابن بطوطہ نے اِدھر اُدھر اپنے ساتھیوں پر نظریں دوڑائیں تو کوئی نظر نہ آیا۔ پریشان ہو کر واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اجنبی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا پوچھا "کیا تم اجنبی ہو؟"

ابن بطوطہ نے جواب دیا "ہاں میں سیاح ہوں"

اجنبی نے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟"

ابن بطوطہ نے جواب دیا "میں بہت سے ملکوں کی سیاحت کرتا ہوا یہاں آیا ہوں میرا وطن طنجہ ہے جو افریقہ کے انتہائی مغربی سرے پر سمندر کے کنارے آباد ہے"

اجنبی نے خوشی کا اظہار کیا، بولا "میں یہاں کا وزیر ہوں، میرے ساتھ آؤ"

ابن بطوطہ کے جسم پر بابا تبریزی کا چغہ تھا وہ وزیر کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن وزیر اسے جبراً شاہی محل میں لے گیا۔ بادشاہ اس سے ملکر بہت خوش ہوا اور دیر تک مسلمان بادشاہوں کا حال پوچھتا رہا۔ بادشاہ کی نظریں ابن بطوطہ کے چغے پر جمی ہوئی تھیں

اس نے پراشتیاق لہجے میں کہا " سیاح! یہ چغہ ہمیں بہت اچھا لگ رہا ہے کیا تم اسے بطور تحفہ ہماری خدمت میں پیش کرو گے؟"

ابن بطوطہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے لیکن اُسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ بابا تبریزی کی پیش گوئی پوری ہو کر رہے گی ابھی ابن بطوطہ نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ وزیر نے اسے حکم دیا " اپنا چغہ اُتار کر ادب سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرو۔"

ابن بطوطہ نے حکم کی تکمیل کر دی۔ بادشاہ نے اس تحفے کے صلے میں دس خلعتیں، ساز و سامان سے لیس ایک گھوڑا اور سفر خرچ مرحمت فرمایا۔ ابن بطوطہ نے نہایت اذیت کے ساتھ یہ چیزیں وصول کیں۔

ابن بطوطہ ایک سال تک اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا اس کے بعد وہ خان بالغ (قاآن) کے شہر یعنی پیکن چلا گیا یہاں اس کے میزبان نے شیخ برہان الدین صاغرجی نامی بزرگ کی خانقاہ میں پہنچا دیا۔ جب ابن بطوطہ خانقاہ میں داخل ہوا شیخ برہان الدین کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے اور اُن کے جسم پر وہی چغہ تھا جسے بابا تبریزی نے عطا فرمایا تھا اور جسے ابن بطوطہ سے کنگ نسے کے حکمران نے جبراً تحفے میں قبول کر لیا تھا۔

ابن بطوطہ آگے بڑھا اور چغے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا شیخ برہان الدین نے سوال کیا " تو اُسے اُلٹ پلٹ کر کیوں دیکھ رہا ہے کیا اس چغے کو پہچانتا ہے؟"

ابن بطوطہ نے جواب دیا " ہاں خوب پہچانتا ہوں، خنسا کے بادشاہ نے اسے جبراً مجھ سے لے لیا تھا"

شیخ برہان الدین نے کہا " نادان سیاح! شیخ جلال الدین نے یہ چغہ میرے لئے تیار کرایا تھا اور مجھے خط کے ذریعے مطلع کر دیا تھا کہ یہ دو واسطوں سے تیرے پاس تک پہنچ جائے گا۔"

اس کے بعد شیخ برہان الدین نے خانقاہ کی طاق میں رکھی ہوئی ایک کتاب سے بابا تبریزی کا خط نکال کر ابن بطوطہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

" بابا برہان الدین تمہارا چغہ تیار ہے اسے میں ایک مغربی سیاح کے ذریعے روانہ کر دوں گا۔ یہ چغہ سیاح سے چین کا ایک بادشاہ جبراً تحفہ میں لے لے گا اور وہ بادشاہ اسے تمہاری خدمت میں روانہ کر دے گا۔"

ابن بطوطہ خط پڑھتا جاتا تھا اور حیران و پریشان ہوتا جاتا تھا۔ برہان الدین اس کے چہرے کے تاثرات سے اندرونی کشمکش اور حیرت کا اندازہ لگا رہے تھے انہوں نے کہا۔

"سیاح! تو پریشان یا حیران کیوں ہو رہا ہے میرے بھائی جلال الدین تبریزی کا مرتبہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے، جتنا تو نے سمجھ رکھا ہے انہیں دنیا کے معاملات میں حیرت انگیز دخل حاصل ہے کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ ہر روز صبح کی نماز مکہ شریف میں ادا فرماتے تھے اور ہر سال حج پر تشریف لے جاتے تھے عرفہ اور عید کے دن وہ اپنی خانقاہ میں موجود نہیں ہوتے" پھر ذرا دکھ سے کہا "لیکن افسوس کہ جب تو اُن سے رخصت ہوا تھا اس کے چند دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا اور اب وہ اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ اس دُنیا میں موجود نہیں ہیں"

ابن بطوطہ کو سکتہ لگ گیا اور شیخ کے وصال کی خبر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کہتے ہیں آپ کا مزار دیو محل میں ہے آپ کا عرس ۲۲ رجب کو ہوتا ہے ہر روز شام کو یہاں سے غربا و مساکین کو کھانا کھلایا جاتا ہے مرورِ زمانہ سے مزار کا سائبان ٹوٹ گیا تھا لیکن کسی عقیدت مند نے اسے دوبارہ تعمیر کرا دیا۔

وہ شخص جو ایران کے شہر تبریز میں ایک حکمران گھرانے میں پیدا ہوا تھا حضرت ابراہیم بن ادہم کی طرح حکومت پر لات مار کر درویش بن گیا اور عبادت و ریاضت سے وہ بلند مرتبہ حاصل کیا کہ شاہانِ وقت ان کے استقبال کے لیئے حاضری دینا فخر کی بات سمجھنے لگے جس نے ہندوستان کے دور اُفتادہ علاقے بنگال میں اسلام پھیلایا اور آج وہیں محوِ استراحت ہے۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

تذکرہ صوفیائے بنگال	سوانح عمری خواجگان چشت	خواجگان چشت
اعجاز الحق قدوسی	سید قربان علی بسمل	منیر لکھنوی
سفر نامہ ابن بطوطہ	انوار اصفیاء	
ابن بطوطہ	غلام علی اینڈ سنز	

حضرت حمید الدین حاکم رح

بنو ہاشم اور بنو امیہ کے مناقشات اور آویزشیں ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال بڑھتی چلی گئیں، خوش قسمتی اور اقبال مندی بنو امیہ کی یاوری کرتی رہی اور مسلسل سیاسی استحکام حاصل ہوتا رہا اور ان کے مقابلے میں بنو ہاشم پے در پے انتشار اور پریشانیوں کا شکار ہوتے رہے۔ آخر بنو ہاشم کے چند بزرگوں نے اقبال مند بنو امیہ کے مقابلے میں باعزت پسپائی اختیار کی اور مدینہ منورہ سے اپنی مرضی سے شہر بدر ہو کر عراق چلے گئے انہوں نے بغداد کے نواح میں جبل ہنکار میں سکونت اختیار کی۔ ان کے سربراہ کا نام یوسف قریشی ہاشمی تھا یوسف قریشی ہاشمی سرزمین عرب سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتے تھے انہیں اپنے آباؤ اجداد کی زمین سے محبت تھی لیکن بعد کی نسلوں میں یہ محبت قائم نہیں رہی۔ اور انہوں نے جبل ہنکار کو بھی چھوڑ دیا اور سندھ کے سیستان اور کیچ مکران میں داخل ہو گئے قسمت مہربان تھی اور اقبال ان کا ہم رکاب تھا ان دنوں سیستان اور کیچ مکران کے لوگ اپنے مقامی حکمرانوں کے جبر و تشدد اور ظلم و جور سے نالاں تھے انہوں نے آلِ رسولؐ کو اپنے درمیان دیکھ کر بڑی آؤ بھگت کی اور ان کی حمایت میں بغاوت کر کے اپنے مقامی حکمرانوں کو بے دخل کیا اور سیستان اور کیچ مکران کی حکومت نو وارد ان آل رسولؐ کے حوالے کر دی۔

یہ حکومت ایک دوسرے سے منتقل ہوتی ہوئی پانچویں نسل میں شہزادے بہاء الدین تک پہنچی۔ ان دنوں لاہور کے مشہور بزرگ سید احمد توختہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ کیچ مکران تشریف لے گئے اور اپنی صاحبزادی بی بی حاج کی شادی شہزادے بہاء الدین سے کر دی یکے بعد دیگرے ان سے تین اولادیں ہوئیں، جمال الدین، ضیاء الدین، اور حمید الدین۔ یہ خاندان نہایت خوش و خرم اور پر مسرت زندگی گزار رہا تھا، حکومت تھی، بھرا پرا کنبہ تھا عزت تھی۔

بہاء الدین کو اقتدار سنبھالے ایک عرصہ گزر چکا تھا انہیں اپنے جدِ اعلا کی سرزمین یاد آئی۔ جمال الدین، اور ضیاء الدین کو ساتھ لیا اور حج بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔ حمید الدین سب سے چھوٹے تھے کیچ مکران ہی میں رہ گئے بہاء الدین نے اپنی نیابت کا فرض چھوٹے بھائی

شہاب الدین ابوالبقا کو سونپا اور فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور دونوں بیٹوں سمیت رسول اللہؐ کے مزار پر حاضری دی۔ دل بھر آیا اور آنکھیں پرنالا بن گئیں۔ ان کا خاندان یہیں کی مٹی سے عالم وجود میں آیا تھا وہ بے مقصد ایک ایسے ماضی کی یاد میں جسے انہوں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا مدینے کی گلیوں میں گھومتے پھرتے رہتے یہاں کی فضا اور سرزمین میں ایک سحر تھا جس نے سندھ اور کیچ مکران کی یاد دل سے مٹا دی تھی مدینے کے بعد عرب کے دوسرے علاقوں کی سیاحت شروع کر دی۔ وہ ان تمام مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنا چاہتے تھے جہاں کہیں رسول اللہؐ تشریف لے جا چکے تھے ان میں یمن بھی شامل تھا یہ گھومتے پھرتے یمن پہنچ گئے یہاں قیام فرما ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک معمولی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا۔ دونوں لڑکوں نے تجہیز و تکفین کی اور باپ کی محبت میں یمن ہی میں رہ پڑے کیچ مکران کی حکومت ان کے چھوٹے بھائی شہاب الدین ابوالبقا کے پاس رہی دو سال بعد یہ بھی چل بسے اور ان کی جگہ یمن کے مرحوم بہاء الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے حمید الدین حاکم بنا دیے گئے بہاء الدین قریشی ہاشمی کا بیٹا اور لاہور کے مشہور بزرگ سید احمد توختہ کا نواسا برسرِ اقتدار آیا تو کیچ مکران کی فضا ہی بدل گئی۔ حمید الدین کو عدل و انصاف کا اتنا خیال رہتا کہ طاقتور ظالم خود کو تنکے سے زیادہ کمزور محسوس کرتا اور کمزور مظلوم خود کو کیچ مکران کا سب سے زیادہ طاقتور انسان محسوس کرتا —————— حمید الدین کا جدھر سے بھی گزر ہوتا لوگ احتراماً اپنی گردنیں جھکا دیتے۔ یہ احترام یہ قدر و منزلت ان کی نہیں ان کے عدل و انصاف کی تھی۔ اس احترام اور قدر و منزلت سے حمید الدین میں حکومت اور امارت کی خو بو پیدا ہوتی رہی اور حکومت کے اکیسویں سال ان میں ایک ایسے شخص کی تعمیر ہو چکی تھی جس کے سر میں حکومت کا نشہ اور دل میں اپنی برتری کا شدید احساس پیدا ہو چکا تھا۔

دن بھر کاروبار مملکت انجام دینے کے بعد تھکے ہارے حمید الدین محل میں داخل ہوئے راستے کے آس پاس سبزے اور پھولدار پودوں اور درختوں کے قطعات سے گزرتے ہوئے یہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ محنت اور تھکان کا بوجھ اٹھائے جب یہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو یکبارگی ٹھٹک کر رہ گئے۔ سامنے ہی ان کی مسہری بچھی ہوئی تھی اس پر بچھے ہوئے پھولوں کی خوشبو نے پوری خوابگاہ کو معطر کر رکھا تھا اور اس معطر مسہری پر ان کی نونایت نامی کنیز آنکھیں بند کئے دین و دنیا سے بے خبر، مدہوش خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی کنیز کی اس جرأت اور گستاخی نے حمید الدین کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے تالی بجا کے محل

کی پہرے دار مسلح عورتوں کو طلب کر لیا اور ایک تنومند سخت مزاج عورت کو حکم دیا "اس گستاخ کنیز کو گریبان پکڑ کے جگا دیا جائے اور اس کے بعد اسے کوڑے سے زدوکوب کیا جائے۔"

اسی وقت کوڑا بھی مہیا ہو گیا اور موٹی خدمتگار عورت نے کنیز کو گریبان سے کھینچ کر بیدار کر دیا۔ اس نے نیم خوابیدہ نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا تو سہم کر رہ گئی۔ تنومند پہرے دار عورت اپنے آقا کے حکم کی کوڑا زنی کا انتظام کرنے لگی۔

حمید الدین نے قہر آلود نظروں سے کنیز کو گھورا اور دریافت کیا "تجھ میں یہ جرأت کہاں سے آئی کہ اپنے مالک کی مسہری پر خوف و دہشت کے بغیر سو گئی؟"

کنیز نے نہایت اطمینان سے گردن جھکائی اور جواب دیا "مجھے یہ بستر بہت اچھا لگا تھا بس یہ سوچ کر لیٹ گئی تھی کہ دیکھوں اس پر لیٹنے والے کو کیسا آرام ملتا ہے۔"

"و پھر کیسا آرام ملا؟" حمید الدین نے غصے میں سوال کیا۔

کنیز نے بے نیازی سے جواب دیا "وہ ایسا آرام کہ میں آج سے پہلے اس سے آشنا بھی نہ تھی۔"

حمید الدین نے طنزاً کہا "بیشک ہم تجھے ایک ایسی لذت سے بھی آشنا کرائے دیتے ہیں کہ اس سے بھی تو آج تک ناآشنا رہی ہوگی۔"

کنیز حمید الدین کی بات نہیں سمجھ سکی اور ان کی صورت تکنے لگی۔

حمید نے غصے میں چیخ کر تنومند پہرے دار عورت کو حکم دیا "تعمیل ہو۔ اب مزید برداشت کی طاقت نہیں ہے، کوڑا زنی، مسلسل کوڑا زنی، تا حکم ثانی کوڑا زنی۔"

تنومند پہرے دار عورت کا ہاتھ اوپر اٹھا اور کنیز پر برسنے لگا۔ شپ شپ، شڑاپ، شپ۔ کوڑے کی ہر ضرب پر کنیز دوہری ہو جاتی لیکن زبان سے اُف تک نہ کرتی۔

حمید الدین کو رہ رہ کر اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر یہ کنیز روتی کیوں نہیں۔ جب وہ دیر تک کوڑے کی ضربات برداشت کر کے ہنستی مسکراتی رہی تو حمید الدین نے ہاتھ کے اشارے سے کوڑا زنی موقوف کرا دی۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے کنیز کے روبرو پہنچ گئے۔ وہ کنیز سے آنکھ ملاتے گھبرا رہے تھے کنیز اب بھی مسکرا رہی تھی جگہ جگہ سے کپڑے مسک چکے تھے اور ان میں سے خون چھلک رہا تھا۔

حمید الدین نے غصے اور کھسیانے پن کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا "بے شرم، بے غیرت! اس ہنسی کا سبب؟ کیا کوڑے کی ضربات تجھے تکلیف نہیں پہنچا رہیں؟"

مسکراتے ہنستے چہرے پر آنسوؤں کی دھاریں کافوری شمعوں کی روشنی

میں چمک رہی تھیں کنیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میرے مسکے ہوئے کپڑے اور لہولہان جسم کیا یہ گواہی نہیں دے رہے ہیں کہ کوڑوں کی مار نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی ہے؟"

"پھر تو ہنس کیوں رہی ہے؟"

کنیز نے بے نیازی سے جواب دیا "میں یہ سوچ کر ہنس رہی تھی کہ پھولوں سے سجے بستر پر چند لمحے سو کر میں اتنی اذیت ناک سزا بھگت رہی ہوں اس بستر پر ہر روز سونے والا کتنی بڑی سزا کا مستحق ہوگا"۔

اس مختصر سے جملے نے حمید الدین کے دل و دماغ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کے چہرے کا کرب اندرونی کشمکش اور اذیت کی غمازی کر رہا تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھولوں سے لدی ہوئی مسہری کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے بے خیالی میں دو ایک بار اس پر بیٹھ جانے کا ارادہ بھی کیا۔ اس پر بیٹھنے کی نیت سے جھکے بھی لیکن بیٹھے نہیں، کنیز کے پُر اثر، دل کو مجروح کر دینے والے الفاظ کانوں میں مسلسل گونج رہے تھے۔ کنیز اور مسلح پہرے دار خواتین ادب سے سر جھکائے کسی حکم کی منتظر کھڑی تھیں۔

کچھ دیر بعد حمید الدین نے سر اوپر اٹھایا اور حسرت و مایوسی سے انہیں دیکھنے لگے، دل کے سوتے آنکھوں کی راہ سے پھوٹ نکلے تھے کنیز کے سوا کسی اور میں اتنی جرأت نہ تھی کہ آنکھیں تک چار کر سکتی۔

حمید الدین نے انہیں حکم دیا "جاؤ، باہر جاؤ، تخلیہ"

ساری عورتیں منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر الٹے پیروں واپس جانے لگیں۔ انہی میں کنیز بھی شامل تھی۔ حمید الدین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا "تم نہیں، تم رک جاؤ بس چند لمحوں کے لئے"

کنیز رک گئی۔ حمید الدین نے اسے قریب بلایا "ہمارے قریب ہو جاؤ"

کنیز ان کے قریب چلی گئی۔ یہ بغور اس کی صورت دیکھنے لگے کنیز نے نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ حمید الدین نے پوچھا "تم کون ہو؟"

کنیز نے جواب دیا "آپ کی ایک ادنیٰ کنیز نونایت"

حمید الدین نے کہا "نہیں، تم کوئی اور ہو تم نے ایک جملے سے ہمارے دل و دماغ کو پھونک کے رکھ دیا ہے"

کنیز خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا "یہ حضور کے چہرے سے تکان اور محنت کے

آثار ہویدا ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آرام فرمالیں طبیعت قابو میں آجائے گی۔"

حمید الدین نے پھولوں میں رچی بسی مسہری پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ اور پھر کنیز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ آرام کر لیں؟ اس مسہری پر؟ جس پر چند لمحوں کی استراحت کی سزا ابھی تم بھگت چکی ہو؟"

کنیز نے جواب دیا "حضور والا! وہ ایک بات تھی جو ختم ہو گئی آخر میں اس اذیت ناک سزا کی تکلیف کس طرح برداشت کرتی۔ یقین جانیے اس عارفانہ جواز نے یکایک مجھ میں اتنی ہمت اور برداشت کی قوت عطا کر دی کہ اگر میں اسے کرامت یا معجزہ قرار دوں تو غلط نہ ہوگا۔"

حمید الدین نے وہ رات کس طرح گزاری اس کا صحیح علم اور احساس انہی کو ہوگا لیکن رات بھر کی بے چینی اور اضطراب کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صبح ہوتے ہی انہوں نے کنیز کو آزاد کر کے خود سے جدا کر دیا۔

حکومت کی ذمہ داریاں اور اس کی پُر فریب دل نوازیاں اب بھی عناں گیر تھیں اور کنیز کا عارفانہ جواز انہیں شکست دینے کی کوشش میں تھا۔ کبھی یہ حاوی ہو جاتا کبھی وہ۔ اس کشمکش نے انہیں ہلکان کر دیا۔ انہوں نے داروغۂ اصطبل کو طلب کیا اور حکم دیا "ہم شکار پر جانا چاہتے ہیں ہمارا گھوڑا حاضر کیا جائے۔"

داروغۂ اصطبل نے غمزدہ اور سوگوار آقا کی اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے سوال کیا "شکار میں ہمرکابی کا شرف کس کس کو بخشا جائے گا؟"

حمید الدین نے کرب سے جواب دیا "کسی کو بھی نہیں۔ ہم تنہا جائیں گے۔"

داروغۂ اصطبل نے حیرت سے جواب دہرایا "حضور شکار پر تنہا تشریف لے جائیں گے؟"

"ہاں ہم تنہا جائیں گے۔"

داروغۂ اصطبل نے اسی وقت شاہی گھوڑا حاضر کر دیا اور حمید الدین نے اسی وقت شکار کا ضروری سامان ساتھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کے جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ بڑی دیر تک بے مقصد ادھر ادھر گھوڑا دوڑاتے رہے ایک آگ تھی جو دل میں روشن تھی اور وہ اس کی آنچ میں پھنک رہے تھے جنگل کے دلکش حسین نظارے اپنی مرطوب تازگی اور تراوٹ سے اس آگ کو بجھانے سے قاصر تھے اسی عالم میں ایک جھاڑی سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دی کسی جنگلی درندے کے خیال سے انہوں نے اپنی کمان میں تیر جوڑا اور جھاڑی کی طرف

نظر جما کے کھڑے ہو گئے یکایک کوئی چھوٹا سا جانور نکل کے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا انہوں نے اسے ایک نظر میں پہچان لیا - یہ ہرن کا ایک خوبصورت بچہ تھا - یہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کے اس کی طرف بڑھے جو کام جنگل کے قدرتی مناظر نہ کر سکے تھے ہرن کے بچے نے انجام دے دیا تھا - اس کی پیاری پیاری شکل اور ننھے منے سراپا نے حمید الدین کو اس پر مائل کر دیا کہ وہ اسے زندہ گرفتار کرلیں یہ بچہ برق رفتاری سے بھاگ رہا تھا اس کے چاروں پیر بھاگنے کے دوران ایک ہی جگہ پڑ رہے تھے بالکل اس طرح جیسے چاروں انگلیاں انگوٹھے سے مل مل کر اپنی جگہ واپس جاتی رہیں - دونوں کا درمیانی فاصلہ دم بدم کم ہوتا رہا - دونوں جنگل سے نکل کر آبادی میں داخل ہو گئے کچے پکے مکانوں کے ہیولے آہستہ آہستہ اپنی اصل صورت میں نظر آنے لگے ہرن کے بچے نے آبادی کے بجائے ویرانے کی راہ اختیار کی - آگے ایک ندی بہہ رہی تھی - حمید الدین نے سوچا اب یہ بچ کے کہاں جائے گا ندی میں پھاندنے سے رہا - اس دوران وہ بستی کے قبرستان میں داخل ہو گئے کچی پکی قبریں بے ترتیب حالت میں دور تک پھیلی ہوئی تھیں ہرن کے بچے نے کوئی بچنے کی راہ نہ دیکھ کر ایک شکستہ قبر میں گھس کے پناہ حاصل کی ، حمید الدین کے چہرے پر خوشی بکھر گئی گھوڑے سے کودتے ہوئے کہا یہ اب کہاں جاؤ گے بچ کر ؟ آخر پکڑ ہی لیا ہم نے تمہیں ؟

یہ آہستہ آہستہ قبر کے شگاف تک پہنچ گئے اس میں جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی - لیکن وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہ آیا - انہوں نے دونوں ہاتھوں سے شگاف کو بڑا کرنے کی کوشش کی اور جب یہ شگاف اتنا بڑا ہو گیا کہ اندر کی ہر چیز روشنی میں آگئی تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئے کہ وہاں ہرن کے بچے کا نام و نشان تک نہ تھا - البتہ ایک لاش ضرور رکھی تھی - تازہ کفن یہ بتاتا تھا کہ اسے دفن کئے زیادہ وقت نہیں گزرا - آخری دیدار کرنے والوں نے میت کا چہرہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا اور اس کے لب و رخسار پر ایک بچھو رینگتا پھر رہا تھا - وہ بار بار کبھی ہونٹوں پر ڈنک مارتا - کبھی رخساروں پر نیش زنی کرتا - حمید الدین ہرن کے بچے کو تو گئے بھول ، اس تازہ واقعے نے ان کی پوری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی - آخر وہ برداشت نہ کر سکے - انہوں نے تیر کی مدد سے اسے ہٹانے کی کوشش کی - لیکن وہ رینگ کر پھر وہیں پہنچ گیا - انہوں نے سوچا یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے اس خیال سے وہ بار بار بچھو کو ہٹاتے رہے اور وہ ہر بار رینگ کر وہیں پہنچ جاتا - وہ بچھو کو مارنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے کسی طرح بچھو کو قابو کیا اور اسے ندی میں پھینک آئے ان کے خیال میں اس طرح انہوں نے بچھو کو بے بس کر دیا تھا اور اب وہ کسی بھی طرح قبر تک نہیں

پہنچ سکتا تھا لیکن اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک سانپ پانی کی لہروں کو چیرتا ہوا بچھو کی طرف بڑھا اور وہ جیسے ہی بچھو کے قریب پہنچا، بچھو سانپ پر سوار ہو گیا۔ سانپ پانی سے خشکی پر آ گیا اور تیزی سے قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ حمید الدین اس کا پیچھا کرتے ہوئے قبرستان میں داخل ہو گئے۔ سانپ بچھو سمیت اسی قبر میں داخل ہو گیا بچھو سانپ کی پشت سے رینگ کر نیچے اتر گیا اور لب و رخسار پر پھر نیش زنی کرنے لگا۔ سانپ میت کی گدی کو ڈسنے لگا۔ اس واقعے نے حمید الدین کو بہت متاثر کیا۔ یہ وہاں سے اپنے گھوڑے تک پہنچے اور اس پر سوار ہو کر قریب کی آبادی میں داخل ہو گئے۔ سامنے سے گاؤں کا مکھیا آ رہا تھا انہوں نے اُسے روک کر دریافت کیا "کیوں بھائی! کیا تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟"

مکھیا نے جواب دیا "ہاں، کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"تم کیا کرتے ہو؟"

"میں اس گاؤں کا مکھیا ہوں"

"خوب!" حمید الدین نے کہا "میں ایک مسافر ہوں اور تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ گاؤں کے قبرستان میں جو تازہ قبر بنی ہوئی ہے وہ کس کی ہے؟"

مکھیا نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیے، بولا "کیوں؟ تم یہ جان کر کیا کرو گے؟"

حمید الدین نے جواب دیا "میں وہاں سے گزر رہا تھا اور اس تازہ قبر کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی میرا خیال ہے وہ شخص عذابِ قبر میں مبتلا ہے"

مکھیا نے کہا "وہ یہاں کا زمیندار تھا۔ خدا مغفرت کرے اس نے لوگوں کے بڑے دل دکھائے تھے"

حمید الدین لرز گئے۔ ایک زمیندار اتنا گنہگار تھا تو کیچ مکران کا حکمران کتنے گنا زیادہ گنہگار ہوگا۔ مکھیا نے اس فکرمند اور سوچ کی الجھنوں میں مبتلا شخص کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی ہوشمند کسی پاگل کو دیکھتا ہے اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ جس شخص سے مخاطب ہے۔ وہی یہاں کا حکمران ہے۔

حمید الدین نے گھوڑے کا رُخ موڑا اور محل کو واپس ہوئے انہوں نے محل میں داخل ہوتے ہی بیوی کو مطلع کیا کہ وہ تاج و تخت سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں اگر بیوی کو ان کی رفاقت عزیز ہے تو اُسے بھی سب کچھ ترک کر کے ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ وفادار بیوی نے بلا تامل اعلان

گیا کہ "میری موت زندگی کے آپ مالک ہیں آپ جس حال میں بھی رکھیں گے خوش رہوں گی۔"

حمید الدین نے کہا "اگر یہ بات ہے تو سب کچھ اسی محل ہی میں رہنے دو اور ہمارے ساتھ نکل چلو"

شوہر پرست بیوی نے اپنا سب کچھ محل میں ہی چھوڑ دیا اور جو کپڑے پہنی تھی اسی میں شوہر کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی ان کی منزل لاہور تھی جہاں حمید الدین کے نانا سید احمد توختہ قیام فرماتے تھے اور جن کی بزرگی اور عظمت کا دور دور شہرہ تھا۔

ابھی لاہور آٹھ میل دور تھا کہ بیوی پے در پے قے کرنے لگیں پیٹ میں جو کچھ تھا منہ کے راستے نکلنے لگا بیوی بے دم ہو گئیں اور ہاتھ پیر چھوڑ دیئے۔ ایسا لگا جیسے وہ گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہیں جانے ہی والی ہیں حمید الدین قے زدہ بے دم بیوی کے سرہانے جا کھڑے ہوئے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر فرمایا "بیوی! ہمیں تمہارے پاس سے دنیا کی بو آرہی ہے"۔

بیوی نے نحیف و نقیہہ آواز میں کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

حمید الدین نے جواب دیا "ہمارا مطلب واضح ہے تمہارے پاس سے دنیا کی بو آرہی ہے کیا تم نے اپنا سب کچھ محل میں چھوڑ دیا ؟"

"ہاں!" بیوی نے جواب دیا "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائی"

حمید الدین نے بطور تنبیہہ کہا "ہم پھر یہی کہیں گے کہ تمہارے پاس سے دنیا کی بو آرہی ہے ذرا غور کرو کہیں تم غلطی سے کوئی قیمتی چیز لے کر تو نہیں چلی تھیں ؟"

بیوی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "بے شک میں غلطی پر تھی" اس کے بعد بیوی نے اپنے سامان میں سے ایک قیمتی تسبیح نکال کر حمید الدین کے سامنے ڈال دی کہا "بس یہ تسبیح ہے میرے پاس۔ مروارید کی۔ اگر دنیا کی بو اس میں سے آرہی ہے تو اسے آپ اسی وقت کسی کے حوالے کر دیجئے"

حمید الدین نے وہ مروارید کی تسبیح کسی درویش کو دے ڈالی اور ادھر ادھر کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے لاہور میں داخل ہو گئے نانا سید محمد توختہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواسے کی بڑی خاطر مدارت کی۔

نانا سید محمد توختہ نے .... حمید الدین کو اس حال میں دیکھ کر سوال کیا "کیا بات ہے بغیر اطلاع کرائے تم لاہور میں کس طرح وارد ہو گئے ؟"

حمیدالدین کا دل بھر آیا۔ بھرائی آواز میں کہا "نانا جان! ہم درویشی اختیار کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں آپ اس سفر میں ہماری راہ نمائی فرمائیں۔"

نانا نے خوش ہو کر جواب دیا "تم مایوس مت ہو لیکن درویشی اختیار کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لو کہ دنیا تمہیں طرح طرح سے ورغلائے گی اور کوشش کرے گی کہ تم ایک بار پھر اس کے پاس واپس جاؤ اس وقت تم کیا کرو گے؟"

حمیدالدین نے جواب دیا "ہم جس راہ پر چل پڑے ہیں اس پر مستقل مزاجی سے چلتے رہیں گے آپ مطمئن رہیں۔"

نانا نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بسم اللہ۔ ہم ہر طرح حاضر ہیں۔"

اس کے بعد حمیدالدین اپنے نانا کی نگرانی اور سرپرستی میں عبادت و ریاضت کرنے لگے ملنے کی سوزش نے ان کا کھانا پینا سونا جاگنا حرام کر دیا تھا انہیں کسی شے کی پرواہ نہ تھی وہ کسی طرح جلد از جلد راہِ سلوک پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔



چونکہ حمیدالدین پہلے مکران کے حاکم رہ چکے تھے اس لئے انہیں نانا ہمیشہ حاکم ہی کہہ کر مخاطب کرتے۔ یہاں تک کہ جب بعد میں حمیدالدین نے شاعری شروع کی تو انہوں نے اپنا تخلص بھی حاکم ہی اختیار کیا۔

عبادت و ریاضت میں کافی وقت گزار چکنے کے بعد حاکم اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ انہیں نانا کسی اہم خدمت پر متعین کر دیں لیکن وہ ایسی چپ سادھے ہوئے تھے کہ اگر حاکم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اکتا کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن حاکم خود کو فنا کر دینے کے لئے نانا کی خدمت میں پہنچے تھے وہ عبادت و ریاضت میں روزِ اوّل کی طرح مشغول رہے۔

ایک دن نانا نے انہیں طلب کیا اور کہا "حاکم! تمہیں لاہور کے شمالی سرحد پر جانا ہے وہاں ایک ٹیلے پر تمہیں ایک بزرگ یادِ الٰہی میں مشغول ملیں گے تم ان سے ملو اور پینے کا پانی طلب کرو۔"

حاکم نے حیرت سے کہا "اس کے بعد؟"

نانا نے کہا "جب وہ پانی لے کر حاضر ہوں تو پانی کا برتن ہاتھ میں لے کر پٹک دینا۔"

اس عجیب و غریب حکم نے حاکم کو پریشان کر دیا۔ پوچھا "پھر؟ اس کے بعد؟"

نانا نے کہا: "اس سے پھر پانی طلب کرنا"

"پھر اس کے بعد؟"

"پھر اس کے بعد حسب سابق پانی کا برتن زمین پر پٹک کے توڑ دینا"

حاکم نے پھر سوال کیا "اس کے بعد؟"

"اس کے بعد پھر وہی، بار بار یہی کرتے رہنا"

حاکم نے کہا "نانا جان! ظاہر ہے اس کے پاس پانی کے برتن سینکڑوں کی تعداد میں تو ہوں گے نہیں آخرکار یہ ختم ہو جائیں گے اور ایک ایسا مرحلہ بھی آجائے گا کہ وہ پانی دینے سے قاصر ہو جائیں گے اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

نانا نے جواب دیا "جب وہ پانی دینے سے قاصر رہیں تو تم غصے میں ان کے دو چار گھونسے رسید کر دینا اور پھر بھاگ کر ہمارے پاس چلے آنا"

حاکم اس عجیب و غریب حکم کا مطلب نہیں سمجھ سکے لیکن نانا کے حکم کی تعمیل میں مذکورہ ٹیلے پر پہنچ گئے وہاں ایک درویش آنکھیں بند کئے یاد الٰہی میں مشغول تھے۔

حاکم نے اس کے روبرو کھڑے ہو کر پانی طلب کیا "بابا! ہم پیاسے ہیں تھوڑا سا پانی پلا دو"

درویش نے آنکھیں کھولیں اور کٹیا میں پانی لینے چلے گئے۔ حاکم نے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لیتے ہی زمین پر گرا دیا اور کہا "بابا اور پانی لے آؤ"

درویش تیوری پر بل لائے بغیر دوبارہ کٹیا سے پانی لے آئے اس بار حاکم نے پانی کا پیالہ زمین پر پٹک دیا اور غصے میں کہا "ہم پیاسے ہیں بابا ہمیں پانی پلاؤ"

درویش نے بے چوں وچرا اندر گیا اور تیسرا پیالہ لے آئے۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور حاکم نے پانی پھر طلب کیا۔ ان کا خیال تھا درویش کو غصہ آجائے گا لیکن درویش کے تحمل کا جواب نہ تھا وہ متواتر بار بار پانی لائے اور اپنے جملہ پیالوں کا یکساں حشر دیکھتے رہے جب پیالے ختم ہو گئے اور حاکم کی آب طلبی جاری رہی تو درویش نے آہستہ سے کہا "بابا! اب کوئی پیالہ کٹیا میں نہیں ہے ورنہ ضرور حاضر کرتا"

حاکم غصے میں آگے بڑھے اور درویش پر مکوں کی بارش کر دی۔ ان کی خاصی مرمت کر چکنے کے بعد یہ واپسی کے لئے مڑے، تو درویش نے ان کا راستہ روک لیا اور نہایت تحمل سے کہا "بابا! ہمیں آپ سے کچھ عرض کرنا ہے"

حاکم نے درشت لہجے میں حقارت سے کہا "کہو کیا کہنا ہے؟"

درویش نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں سہلانے دبانے لگے، بولے۔

"ہم سالہا سال سے ترک دنیا کیے بیٹھے ہیں کبھی کھایا کبھی نہیں کھایا، کم کھانے اور فاقے کرنے سے ہماری صحت رخصت ہو گئی اور آج ہم ہڈیوں کا ڈھانچا بن کررہ گئے ہیں ہمارا خیال ہے کہ مکوں اور گھونسوں میں آپ کے ہاتھوں کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی ہو گی، ہم آپ کی تکلیف کا فی الحال یہی علاج کر سکتے ہیں کہ انہیں سہلا دبا کے ٹھیک کر دیں، آپ ذرا دیر اور ٹھیریں اور ہم کو اپنی خدمت کا موقع دیں۔"

درویش دیر تک ان کے دونوں ہاتھوں کی مالش کرتے رہے۔

جب یہ اپنے نانا کے پاس واپس پہنچے تو نانا نے ان کی صورت دیکھتے ہی کہا "حاکم! تسلیم و رضا کا مفہوم سمجھ میں آیا؟ اسے ہمیشہ ذہن میں محفوظ رکھنا۔"

حاکم نے آہستہ سے جواب دیا "بہت بہتر۔ گو تسلیم و رضا کی راہ نہایت دشوار ہے لیکن ہم اس پہ چلنے کی کوشش ضرور کریں گے۔"



ابھی عبادت و ریاضت جاری ہی تھی کہ نانا کا آخری وقت آپہنچا۔ انہوں نے اپنے نواسے حاکم کو طلب کیا اور کہا "حاکم افسوس کہ میرا وقت آپہنچا اور میں تمہیں مرتبۂ سلوک تک نہیں پہنچا سکا۔ لیکن یہ بھی مشیت ایزدی تھی کہ میں اپنے حصے کا کام ختم کر کے بقیہ کے لئے صحیح شخص کا نام بتا دوں۔"

حاکم رونے لگے نانا نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شفقت سے دبا کے فرمایا۔

"حاکم! تمہارا باقی مقسوم سہروردی سلسلے میں ہے تم وہاں پہنچو اور اپنی قسمت کا بقیہ حاصل کر لو۔"

اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ حاکم ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدّین سہروردی کی خدمت میں بغداد روانہ ہو گئے اب ان پر کیف و مستی طاری ہونے لگی تھی۔ یہ شہاب الدّین سہروردی کی خانقاہ میں داخل ہو کر اتنے وارفتہ و مست ہوئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ یہاں تک کہ شہاب الدّین سہروردی کی خدمت میں بھی حاضری نہ دے سکے۔ چوتھی رات شہاب الدّین سہروردی سے رسول اللہ ؐ نے خواب میں فرمایا "شہاب الدّین! ہمارا فرزند تین دن سے تمہاری خانقاہ میں ملاقات کو آیا ہوا ہے لیکن اس پر استغراق نے اتنا غلبہ کر رکھا ہے کہ وہ تم سے ملاقات تک نہ کر سکا۔ تم خود اس سے ملو اور چند دن

اسے اپنی صحبت میں لے کر اس کی منزل مقصود کا پتہ دو۔"

شہاب الدین بیدار ہوتے ہی حاکم کو تلاش کرتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ حاکم اس وقت بھی سکر و مستی میں تھے۔ انہیں شہاب الدین کی آمد کا بالکل پتہ نہ چلا۔ شہاب الدین نے حاکم کا ہاتھ پکڑ کے فرمایا "حاکم! ایسی بھی کیا بے خودی کہ جس سے ملنے آئے اس سے ملے بغیر ہی سکر و مستی میں چلے گئے"

حاکم فوراً ہی عالم صحو میں آ گئے ہوش و حواس میں آتے ہی سامنے شہاب الدین سہروردی کو دیکھ کر ادب سے بیٹھ گئے۔

شہاب الدین سہروردی نے کہا "حاکم! ابراہیم بن ادہم کی طرح تم نے درویشی تخت و تاج دے کر حاصل کی ہے تمہارے اس ایثار اور قربانی نے زہد و ریاضت کا پہلا مرحلہ تو یوں ہی طے کر دیا ہے اب مزید کیا درکار ہے ہمیں بتاؤ؟"

حاکم نے جواب دیا "یا شیخ الشیوخ عالم! سید احمد توختہ ترمذی لاہوری اس ناچیز کے نانا تھے انہوں نے ایک عرصہ تک اس خاکسار کی تعلیم و تربیت فرمائی اور اپنے آخری لمحوں میں خالق حقیقی کے پاس جانے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ حاکم! تیری قسمت کا بقیہ ایک ایسے عزیز کے پاس ہے جس کا تعلق سلسلۂ سہروردی سے ہے میں نے سوچا اس بزرگ کو میں کہاں تلاش کروں، سیدھا آپ کے پاس چلا آیا کیونکہ سلسلۂ سہروردیہ آپ ہی کے دم سے قائم ہے اور اس سلسلے میں آپ ہی میری صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں"

شہاب الدین سہروردی نے بہ نظر غائر حاکم کو دیکھا اور مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد فرمایا "حاکم! ہم نے کشف سے اس شخص کو تلاش کر لیا جس کے پاس تمہاری قسمت کا بقیہ ہے افسوس ہے کہ وہ اس وقت عالم وجود میں نہیں"

حاکم نے پریشان ہو کے دریافت کیا "کیا ان صاحب کا وصال ہو چکا ہے"

"نہیں" شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا "وہ تا حال عدم سے وجود ہی میں نہیں آئے"
حاکم نے حیران ہو کے خاموشی اختیار کی۔ کچھ دیر بعد دریافت کیا "حضرت! کچھ وضاحت سے ارشاد فرمائیں"

شہاب الدین سہروردی نے جواب دیا "تمہاری قسمت کا بقیہ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے پوتے کے پاس ہے اور وہ حضرت ابھی تشریف ہی نہیں لائے"

حاکم نے پوچھا۔ "ان بزرگ کا نام کیا ہوگا؟"

شہاب الدین نے جواب دیا۔ "رکن الدین ابوالفتح فیض اللہ"

حاکم فکر مند ہو کر بیٹھ گئے شہاب الدین سہروردی نے پوچھا "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

حاکم نے جواب دیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے کس کے پاس جانا چاہیئے ان کا انتظار کہاں کرنا چاہیئے؟"

شہاب الدین سہروردی نے کہا۔ "تم وہیں چلے جاؤ جہاں تمہارے پیرومرشد ظہور فرمانے والے ہیں یعنی ملتان، اور وہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرو۔"

حاکم نے کہا "بہتر ہے جیسا حکم شیخ الشیوخ عالم!"

چلتے وقت شہاب الدین سہروردی نے انہیں تبرکاً ایک مُصلا عطا فرمایا اور دُعائیں دے کر رخصت کر دیا۔

رحیم یار خاں اسٹیشن سے جب آپ جانب شمال چلیں گے تو آپ چھ میل فاصلہ طے کرنے کے بعد قلعہ مُو مبارک تک پہنچ جائیں گے، ایک ہندو راجا راے ملنس کرو نے اپنی ماں کے لیئے یہاں قلعہ تعمیر کرایا تھا اور ماں کی نسبت سے اس کا نام "مُو" رکھ دیا تھا۔ یہاں آج بھی قدیم مواد، قلعے کے آثار پائے جاتے ہیں چھ سو گز دائرے پھیلی ہوئی فصیل اور پچاس فٹ بلند گڑھی کے آثار اب بھی باقی ہیں حاکم بغداد سے یہیں پہنچے تھے۔ اس وقت یہ جگہ آباد نہیں تھی۔ یہاں ایک ہندو جوگی رہتا تھا جس کے کرشموں کا بڑا چرچا تھا۔ حاکم یہاں پہنچ کے اس کے قریب ہی رہنے لگے جوگی کئی دن تک ان کے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ حاکم کی غربت اور افلاس نے ہندو جوگی کو بہت متاثر کیا' اس نے مٹی اور کانسی کے چند برتن ساتھ لیے اور حاکم کی صحبت میں پہنچ گیا۔ آپ نے سر اٹھا کر جوگی کو دیکھا اور سوال کیا "کیسے آنا ہوا شری مان جی؟"

ہندو جوگی نے کہا "میں تمہیں کئی دن سے پریشان دیکھ رہا ہوں۔"

حاکم نے کہا "پھر اس کا کیا علاج ہے تمہارے پاس؟"

ہندو جوگی نے کہا "علاج تو اس وقت کیا جاتا ہے جب مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے۔"

حاکم نے پوچھا "پھر تم نے کیا مرض تشخیص کیا؟"

جوگی نے جواب دیا "افلاس، غربت، معاشی بدحالی، تہی دستی۔"

حاکم کو ہنسی آگئی بولے "بس تمہاری یہیں تک رسائی تھی۔ خوب اور کچھ؟"

جوگی نے جواب دیا " مرض تو ایک ہی ہے لیکن اس کے نام کئی ہیں مثلاً پریشان حالی، مالی اور معاشی تنگی وغیرہ "

حاکم نے پوچھا " اگر یہی واقعی یہی مرض ہے تو اس کا علاج کیا ہے تمہارے نزدیک ؟"

جوگی نے ساتھ لائے ہوئے برتن حاکم کی طرف بڑھا دیئے اور کہا " سردست ان سے کام چلائیں ۔ آگے بھگوان بھلا کرے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے "

حاکم نے برتن ہاتھ سے نہیں پکڑے بے نیازی سے کہا " انہیں رکھ دو ۔ یہ ہمارے کیا کام آئیں گے ؟"

جوگی نے کہا " یہ بظاہر مٹی اور کانسی کے برتن ہیں لیکن ہماری نظر کیمیا اثر سے سونے کے ہو جائیں گے انہیں بازار میں بیچ کر کھانے پینے کا خرچ چلانا "

یہ کہہ کر جوگی مسکرانے لگا اور ایک نظر خاص برتنوں پر ڈالی ، اس نظر میں کیا اثر تھا کہ سارے برتن آہستہ آہستہ سنہری رنگ اختیار کرنے لگے بالکل اس طرح جیسے دھوپ میں جگمگاتی زمین پر آہستہ آہستہ ابر کا کوئی ٹکڑا سایہ فگن ہو جاتا ہے تھوڑی دیر بعد سارے برتن سونے کے ہو گئے ۔

جوگی نے ان برتنوں کو اک شان متکبرانہ سے دیکھا اور حاکم سے کہا " تم چاہو تو یہیں رہو اور ان برتنوں کی قیمت سے خرچ چلاؤ ۔ جب ساری رقم خرچ ہو جائے تو مجھے دوبارہ مطلع کر دینا ۔ میں اور انتظام کر دوں گا لیکن اگر تم یہاں نہ رہنا چاہو تو جہاں جانا چاہو ان برتنوں کو لے کر چلے جاؤ ، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا "

حاکم نے ان برتنوں کو اٹھا کے دریا کی نذر کر دیا اور اک شان بے نیازی سے کہا " ہم بے غرض اور بے فکر لوگ کہاں سونے چاندی کے چکر میں پڑیں گے جس نے حکومت اور امارت کو اس درویشی پر قربان کر دیا ہو ۔ وہ سونے چاندی کے ان چند ٹھیکروں کی کیا پروا کرے گا "

جوگی بے چین ہو کر کبھی تو حاکم کی صورت دیکھنے لگتا اور کبھی دریا کی ان موجوں کو گھورنے لگتا ۔ جنہوں نے اس کے سونے کے برتنوں کو کھا لیا تھا اسے حاکم کی اس حرکت پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا کچھ دیر بعد اس نے حاکم سے کاروباری انداز میں کہا " میرے سونے کے برتنوں کو دریا میں ڈال کر تم نے میرے دل کو تکلیف پہنچائی ہے اگر تم انہیں اپنے مصرف میں نہیں لانا چاہتے تھے تو تمہیں اس بات کا بھی حق نہ پہنچتا تھا کہ انہیں دریا برد کر دو ۔ میں اپنی محنت اور ریاضت کے ثمرے کا یہ انجام پسند نہیں کرتا اگر تم اتنے ہی غنی اور بے نیاز ہو تو براہ کرم کسی بھی طرح میرے برتن مجھے واپس کر دو ، مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم ان برتنوں کو کہاں سے

اور کس طرح حاصل کرو گے۔ میں تو بس اتنی سی مختصر بات جانتا ہوں کہ میں نے تمہیں جو برتن دیے تھے وہ مجھے واپس مل جانا چاہئیں۔"

حاکم نے بے فکری سے کہا "بس اتنا ہی ظرف تھا تم میں؟ جن برتنوں کو دریا کی نذر کیا جا چکا ہو وہ تمہیں واپس کس طرح کئے جا سکتے ہیں اور پھر یہ کہ وہ برتن تو تم نے ہمیں دے دیئے تھے ان کا ہم کچھ بھی کریں۔ تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہ ہونی چاہیئے۔"

"واہ جناب!" جوگی نے کہا "میں نے جو کچھ تمہیں دیا تھا کسی کام کے لیئے دیا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں اُسے یوں دریا برد کر کے اس کے فائدے سے محروم کر دیا جائے۔"

حاکم نے بظاہر بے بسی کا اظہار کیا "لیکن اب تو وہ دریا کی تہہ میں بیٹھ چکے یا پانی کی موجوں میں کہیں اِدھر اُدھر بہہ گئے اب ان کا دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔"

جوگی نے بے مروتی سے کہا "جناب میں ممکن ناممکن کچھ بھی نہیں جانتا، مختصر بات مجھے اپنے برتن درکار ہیں اور کچھ نہیں۔"

حاکم نے کہا "اگر برتنوں کی واپسی ممکن نہ ہو تو؟"

جوگی نے جواب دیا "تب پھر انہی کے وزن کا سونا فراہم کر دینا۔"

حاکم نے کہا "ہاں یہ متبادل صورت ہمیں منظور ہے تمہیں برتنوں کے عوض ان کے ہی وزن کا سونا فراہم کر دیا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

جوگی نے اکتائے ہوئے پریشان لہجے میں کہا "لیکن کب؟ کب دیا جائے گا نہیں، مجھے تو وہ ابھی اسی وقت اسی جگہ درکار ہے۔"

حاکم نے افسوس سے کہا "اگر تم اپنی ضد پر قائم ہو اور ہمیں وقت اور مہلت نہیں دینا چاہتے ہو تو نہ سہی۔"

جوگی نے چبا چبا کر باتیں بنائیں "شریمان جی! جب بات دل میں آئی ہے تو اسے زبان تک لانے میں کیا حرج ہے تم بے گھر بے در پردیسی، معلوم نہیں بہتے بہاتے کہاں سے یہاں آ گئے ہو۔ تمہارا کیا بھروسہ کہ یہاں رہو گے بھی یا کہیں چلے جاؤ گے اس سے پہلے ہی اپنا حساب کتاب چکا لینا ضروری ہے۔"

حاکم نے کہا "یہ بے اعتباری، یہ بے مروتی! ہم تمہارا حساب کتاب چکا کے یہیں رہیں گے اسی جگہ، تم نے اس گنہگار کو سمجھنے میں غلطی کی ہے تم نے یہ نکتہ نہیں سمجھا کہ یہاں جو کچھ

بھی — یہ محمد عربی کے طفیل ہے تمہاری نظر کیمیا اثر کیسا بھی کرشمہ دکھائے اس کی پرواز کی ایک حد ہو گی، ایک انتہا، لیکن تم یار ڈھونڈ بے کنٹھ ملے گا نا ہیں بلا محمدؐ ذاناؤں، (جنت محمدؐ کا نام لئے بغیر نہیں ملے گی)"

جوگی کو بس ایک ہی بات سے دلچسپی تھی سونے کے برتنوں کی واپسی۔ بولا "شریمان جی! زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے اپنا اور میرا وقت برباد نہ کریں"

حاکم نے جوش میں دریا میں ہاتھ ڈال دیا۔ بولے "دریا! ہمیں سونا اور موتی درکار ہیں اپنے دامن کی ایک حقیر سی مقدار اپنے کنارے ڈھیر لگا دے، یہ لالچی جوگی بےصبرے پن کا اظہار کر رہا ہے ورنہ ہمیں سونے چاندی کی کوئی ضرورت نہیں"

اسی وقت موجوں میں طلاطم پیدا ہوا اور سمندر کی سرکش موجوں کی طرح دریا کی امواج ساحل کی طرف بڑھیں اور جب وہ واپس گئیں تو دریا کے کنارے بے شمار قیمتی موتیوں اور سونے کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حاکم نے جوگی کو حکم دیا "اس میں سے جتنا جی میں آئے اٹھا لے اور اپنی راہ پکڑ"

جوگی حواس باختہ کبھی حاکم کو دیکھتا اور کبھی سونے اور موتیوں کے ڈھیر کو۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا تھا اس نے آہستہ سے پوچھا "شری مان جی! یہ سب کیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "یہ وہ ہے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں"

جوگی آپ کے قدموں میں گر گیا۔ روتا ہوا بولا "شریمان جی! میں ایک لوبھی انسان، مجھ میں وہ بے غرضی اور استغنا کہاں جو تم میں پایا جاتا ہے۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ بے کنٹھ ملے گا نا ہیں بلا محمدؐ ذاناؤں مجھے اس نام کی جاپ کرا کے مسلمان کر لو۔ اب اس ہندو جوگ میں کوئی مزہ نہیں رہا"

آپ نے اسے اسی وقت مسلمان کر لیا اور اس کا اسلامی نام زین الدین رکھ دیا۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی آپ کے مزار کی مجاوری اسی نومسلم زین الدین کی نسل میں چلی آرہی ہے



یہاں رہتے رہتے جب کچھ مدت گزری تو ان کا شہرہ ادھر ادھر پھیلنے لگا۔ کیچ مکران سے آپ کا خاندان بھی ٹھٹھہ پہنچ گیا اور اس درویش کے قدموں میں جھک گیا۔ انہوں نے چند گاؤں آپ کی نذر کیے کہ وہ ان کی آمدنی سے لوگوں اور حاجت مندوں کی دستگیری فرمائیں۔ انہی میں ایک گاؤں لیا

بھی تھا۔ جس پر حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے ایک مرید کو تصرف حاصل تھا اسے حاکم کے کارندوں سے کسی قسم کی تکلیف پہنچی۔ اس نے شکایتاً اپنے پیر زکریا ملتانی کو ایک نامہ لکھا کہ "یا پیر و مرشد حمید الدین حاکم نامی ایک بزرگ جو سید احمد توختہ کے نواسے ہیں اور جو کبھی کیچ مکران کے حاکم تھے درویشی اختیار کر کے مؤ میں قیام فرما ہیں ان کے آدمی میرے ایک گاؤں میں مداخلت کرنے لگے ہیں خاکسار ان سے نہیں الجھنا چاہتا۔ حضور ان سے میری سفارش فرما دیں۔ کیونکہ اللہ والے ہی اللہ والوں سے مناسب مقام بات چیت کر سکتے ہیں۔"

حضرت زکریا ملتانی نے حاکم کو خط لکھا یہ واضح ہو کہ تم قریشی ہاشمی حضرت ابوالحسن ہنکاری کے جانشین ہو اور تمہارا نام حاکم ہے لیکن طریق سلوک میں محکوم ہو کر رہنا ہی لازم ہے اور کسی ایسے امر کا ارتکاب کرنا جو ارباب حال کے مناسب حال نہ ہو اچھا نہیں ہے ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین کی خاطر کسی مسکین کے دل کو آزردہ کرنا کہاں تک مناسب ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اس خط نے حاکم کو جھنجوڑ دیا۔ آپ نے فوراً ہی جواب لکھا ہے "بعد تمہید خدائے ذوالجلال و درود ایزد متعال حضرت پر واضح ہو کہ یہ احقر اگرچہ حاکم کہلاتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ محکوم الٰہی ہے یہ ناچیز خود کو درویشوں کی خاکِ پا سمجھتا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ہمیں درویش مذکور کے رنجیدہ ہونے کا کوئی علم نہیں اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ درویش کا کوئی مزاحم نہ ہوگا۔"

اس خط نے حضرت زکریا ملتانی کو اتنا خوش کیا کہ انہوں نے حمید الدین حاکم کو بلا بھیجا۔ یہ ان کی خدمت میں پہنچے تو حضرت زکریا ملتانی نے بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اور آخر میں اپنی لڑکی بی بی فاطمہ کو ان سے وابستہ کر دیا۔ اس موقع پر زکریا ملتانی کے کسی عقیدت مند نے کہا "جناب یہ بہترین موقع ہے کہ آپ پیر و مرشد سے بیعت و خلافت کی بات بھی کر لیں۔"

حاکم نے جواب دیا "نہیں میں بیعت و خلافت کی خواہش لے کر ہرگز نہیں آیا۔ ہم تو ان کے پوتے حضرت رکن الدین کا انتظار کر رہے ہیں۔"

یہ بیوی کو لے کر مؤ واپس چلے گئے۔

مؤ میں جو مرید اور ارادت مند آپ کے اس پاس رہنے لگے تھے یا حاضریاں دینے لگے تھے۔ ان میں ایک مہر نامی شخص بھی تھا یہ آپ کے لئے ہر روز دودھ لے کر آتا تھا جہاں سے آتا تھا وہ جگہ دریا کے اس پار تھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی کشتی مل جاتی تھی اور وہ اس کے ذریعے دریا عبور کرتا تھا

ایک دن وہ جو دودھ لے کر پہنچا تو دریا میں دور دور تک کوئی کشتی نظر نہیں آئی۔ اس نے کنارے بیٹھ کے کسی کشتی کا کافی دیر تک انتظار کیا۔ لیکن انجام مایوسی نکلا۔ آخر اس نے ہمت کی اور بسم اللہ کہہ کے دریا میں اتر پڑا۔ دودھ کا برتن سر پر رکھ لیا اور دریا کے تند و تیز دھارے کو کاٹتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف بڑھا۔ بیچ دریا میں اسے بھنور نے آلیا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کا دریا سے بچ نکلنا ناممکن ہے تو اس نے آہستہ سے کہا "حضرت! میری نیت ٹھیک تھی اور میری دلی خواہش تھی کہ دودھ پہنچانے کے معمولات میں فرق نہ آئے لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہیں ہے میں دریا کی موجوں اور بھنور کا تو مقابلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھ میں مشیت ایزدی کے مقابلے کی تاب نہیں ہے، ان حالات میں، میں آپ کی مدد کا طالب ہوں۔ لیکن آپ بھی اس حد تک مدد کر سکتے ہیں جتنی خدا کو منظور رہے۔"

اس نے اچانک ایسا محسوس کیا جیسے کسی ہاتھ نے اس کی گدی پکڑ لی ہے اور سرکش امواج اور بھنور کے منہ سے چھین کر ساحل کی طرف لیے جا رہا ہے جب ذرا ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ ساحل پر کھڑا ہے وہ دودھ لے کر دیوانہ وار حاکم کی خدمت میں پہنچ گیا اور انہیں پورا قصہ سنا کے عرض کیا "حضرت آج تو بس خیر ہو گئی ورنہ میں تو زندگی سے مایوس ہی ہو گیا تھا مجھے آپ کے قدموں تک پہنچنے میں جو محنت کرنا پڑی ہے، کچھ میں ہی جانتا ہوں۔"

آپ نے اپنا ہاتھ، جس کی آستین بھیگی ہوئی تھی اپنے ارادت کی طرف بڑھا دیا اور متبسم ہو کر فرمایا "بیشک اس میں کیا کلام لیکن محنت تنہا تمہاری ہی نہ تھی بلکہ ہمارے ہاتھ سمیت!"

اس شخص نے حاکم کا ہاتھ چوم لیا۔ آہستہ سے کہا "اس بھیگی آستین اور محنت کے قربان بخدا۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔"

فقر و فاقہ تو ان کا طرۂ امتیاز تھا انہیں اور ان کی بیوی کو اکثر بھوکا رہنا پڑتا۔ ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ پانچ دن تک متواتر انہیں فاقے کرنے پڑے۔ فاقوں سے نڈھال بیوی ان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ لائے بغیر زبان حال سب کچھ کہہ دیا۔ حاکم نے بے چینی سے پوچھا "نیک بخت! تو کیا چاہتی ہے؟"

بیوی نے اپنے دکھ چھپا کے عرض کیا "صورت بہ بیں حالش مپرس"

آپ نے خاموشی اختیار کی اور پھر مصلے کا ایک کونا اٹھا کے اس کے نیچے سے ایک نہایت قیمتی موتی نکال کر بیوی کے حوالے کیا اور بولے "اس کی بازار میں بہت زیادہ قیمت مل جائے گی

فرط انبساط کے خرچ کرنا ؟

بیوی کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا ۔ قیمتی موتی کے مل جانے کی طمانیت نے انہیں اس حد تک مطمئن کر دیا کہ انہیں نیند آگئی ۔ خواب میں دیکھا وہ جنت میں داخل ہو چکی ہیں وہاں نہایت حسین محل جگہ جگہ بنے ہوئے ہیں اور ان میں ایک محل ایسا بھی تھا جس کے ایک دروازے کا کنگرہ غائب تھا انہوں نے کسی پاسبان سے سوال کیا " یہ محل کس کا ہے ؟"

پاسبان نے جواب دیا " حضرت حمید الدین حاکم کا "

بیوی نے گھبرا کر دوسرا سوال کیا " لیکن اس کا تو ایک کنگرہ غائب ہے آخر یہ کیوں ؟"

پاسبان نے جواب دیا " اس کنگرے کے مرداریہ کو انہوں نے دنیا میں ہی طلب کر لیا ہے جو انہیں دے دیا گیا "

بیوی کی آنکھیں کھل گئیں ، بدحواس پریشان حال موتی ہاتھ میں لے شوہر کے پاس پہنچیں اور اسے شوہر کے حوالے کرتے ہوئے کہا " مجھے فاقوں سے مرجانا گوارا ۔ لیکن آپ اس موتی کو جہاں کہیں بھی حاصل فرمایا ہے وہیں واپس پہنچا دیجئے "

حاکم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی انہوں نے موتی کو مٹھی میں لے کر بیوی کو آنکھیں بند کر لینے کا حکم دیا ۔ جس کی حرف بحرف تعمیل ہوئی اور موتی غائب ہو گیا ۔

بیوی ایک عرصے سے اپنے والد کے پاس نہیں گئی تھیں بھائیوں کی یاد بھی ستاتی رہتی تھی ۔ ایک دن یہ اپنے بھائی صدر الدین عارف کے گھر پہنچیں اور زمین پر بوریہ بچھا کر سوگئیں ۔ صبح صدرالدین سو کر اٹھے اور بہن کو بوریے پر سوتا دیکھا تو حیران رہ گئے ۔ کیونکہ انہوں نے رات کو بہن کے لیئے آرام دہ بستر بچھا دیا تھا ، لیکن وہ خالی پڑا تھا بہن کے بیدار ہو جانے پر بھائی نے سوال کیا " بہن ! جب بستر موجود تھا تو پھر زمین پر بوریہ بچھا کر کیوں سوگئیں ؟"

بہن نے جواب دیا " ایک عرصے سے ایسے بستر پر سونے کی عادت ختم ہو چکی ہے کیونکہ تمہارے بہنوئی (حاکم) پوری رات چار رکعتوں میں گزار دیتے ہیں ۔ ان رکعتوں میں وہ پورا قرآن ختم کرنے کے عادی ہیں انہیں رات کو لیٹنا شاذ و نادر ہی میسر آتا ہے ایک دن وہ آرام فرما رہے تھے کہ قریب صبح میں نے ان کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا ۔ وہ جاگ رہے تھے انہوں نے برہمی سے تکیہ ہٹا کے ایک طرف رکھ دیا اور مجھ سے کہا " تم شیخ کبیر بابا زکریا کی بیٹی ہو کر میرے نفس کو آرام و تلذذ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو ، ان کی اس بات سن کر مجھے شرمسار اور نادم کر دیا اور اسی

دل سے خود میں نے آرام کی نیند ترک کر دی "۔

بھائی کو اس واقعے نے بہت متاثر کیا۔ کہا: "حمید الدین حاکم نام ہی کا حاکم نہیں، بلکہ تزکیہ نفس اور زہد و ریاضت میں بھی ہم سب کا حاکم ہے "۔

آپ کا شہرہ ملتان اور رحیم یار خان کے اس پار شمالی ہند تک جا پہنچا۔ غیاث الدین تغلق کا وزیر اپنے چند مصاحبین کے ساتھ آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا، اس وقت آپ اپنے کپڑوں میں پیوند لگا رہے تھے کسی نے آپ کو مطلع کیا کہ فرماں روائے ہند کا وزیر اپنے خدام کے ساتھ آپ کی زیارت کو حاضر ہوا ہے، ذرا سی دیر کے لیے آپ اس کے روبرو بیٹھ جائیے آپ نے وزیر کو مصاحبین اور خدام سمیت اپنے پاس بلا لیا وزیر اور اس کے ساتھیوں نے حاکم کو پیوند لگاتے جو دیکھا تو ذرا سی دیر کے لیے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ انہیں صحیح سلامت کپڑے تک میسر نہیں اور یہ کہ ان کا کوئی ایسا مخلص ارادت مند بھی نہیں جو ان کے کپڑوں میں پیوند لگا دیا کرے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ حاکم نے پیوند لگانے کا کام موقوف کیا اور اپنی کلاہ کو ٹیڑھا کر دیا۔ کلاہ کا ٹیڑھا ہونا تھا کہ سبھی کے منہ ٹیڑھے ہو گئے وزیر اور اس کے ساتھی گھبرا گئے وزیر مؤدبانہ آگے بڑھا اور حاکم کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور روتے ہوئے عرض کیا "حضرت! مجھے اپنی ناقص اور گناہگار سوچ کا احساس ہے اور میں نادم و شرمسار ہوں براہِ کرم معاف فرما دیجئے۔ آئندہ میں ایسی جسارت نہیں کروں گا "۔

حضرت حاکم نے فرمایا "رسول اللہؐ اپنے کام خود کیا کرتے تھے ہم تو اپنے رسولؐ کی اتباع کرتے ہیں۔ دوسرے اس پر ملول اور افسردہ کیوں ہوں "

وزیر نے عاجزی سے کہا: "میں شرمندہ ہوں، معاف فرما دیجئے "

آپ نے اپنی کلاہ سیدھی کر دی۔ وزیر اور اس کے ساتھیوں کے منہ سیدھے ہو گئے۔ وزیر یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا کہ آپ کی بزرگی اور عظمت کا تہہ دل سے میں معترف ہو چکا ہوں۔ اور آئندہ کسی بھی قسم کی ایسی گفتگو یا رویے سے پرہیز اور گریز کروں گا جس سے کسی بھی انسان کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہو۔

آپ نے آہستہ سے کہا: "یہی مناسب ہے ورنہ دل آزاری کے جواب کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی ذرا سی بے تکلفی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے سے گریز کرے اور دل آزاری کا جواب دل آزاری سے دے "۔

آپ نے سوچا کہ پیر کے انتظار میں ایک جگہ بیٹھے رہنا کیا معنی رکھتا ہے اس سے تو یہی بہتر ہے حج کر لیا جائے آپ نے خانہ کعبہ پہنچنے کی تیاری کی اور جہاز میں بیٹھ کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے ایک جگہ طوفان ایسا آیا کہ جہاز کے بچ نکلنے کے آثار ہی جاتے رہے، کچھ دیر بعد، اس افراتفری میں طوفان کے شور میں منادی نے باآواز بلند اعلان کیا۔ وہ کہہ رہا تھا یہ حضرات جیسا کہ آپ لوگ خود ہی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ جہاز طوفان میں پھنس چکا ہے اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ کوئی شخص سمندر میں پھاند کر اپنا نذرانہ پیش کرے تاکہ اس کی جان کے عوض سینکڑوں جانیں بچ جائیں"

حاکم کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے ارادے کی کسی اور کو خبر تک نہ ہونے دی۔ چپ چاپ جہاز سے پانی میں گر گئے اور ہاتھ پیر مارنے لگے لوگوں نے بڑے افسوس سے کہا "بھئی ہم نے یہ کب کہا تھا کہ حاکم ہی سمندر میں کود جائیں۔ کوئی بھی کود سکتا تھا"۔

جہازیوں نے چاہا کہ انہیں بچا لیا جائے لیکن حاکم غوطے کھاتے، ڈبکیاں لگاتے کہیں غائب ہو گئے جہازیوں کو انہیں دیر تک تلاش کرنے کے باوجود جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ انہیں وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے۔ حاکم غوطے لگاتے ٹکریں مارتے ایک چھوٹے سے جزیرے پہنچ گئے اس جزیرے میں ایک چھوٹا سا پہاڑ بھی تھا حاکم اس پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئے پہاڑی پر پہنچ کر انہوں نے متجسسانہ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کہیں بھی آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ وہ ایک سرسبز شاداب حصے کی طرف بڑھے۔ سبزہ زار پر جگہ جگہ انسانی ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں آپ وہیں بیٹھ گئے اور غور کرنے لگے کہ ان بدبخت انسانوں کے ساتھ وہ کون سا حادثہ پیش آیا جس نے انہیں ہڈیوں کے پنجروں میں تبدیل کر دیا۔ انہیں حیرت تھی کہ کہیں ایک انسان تو نظر آتا۔ آہستہ آہستہ دن ختم ہو رہا تھا اور شام قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں زندگی گزارنے کا تصور ہی محال تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کسی جاندار کی تلاش یا آبادی کی جستجو میں چلنے پھرنے لگے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور سورج مغربی افق میں منہ چھپانے لگا یہ سرسبز و شاداب قطعے پر واپس چلے گئے اور انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں کے درمیان رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سورج چھپا اور چاند نے تب و تاب کا مظاہرہ کیا۔ یہ قبلہ رو ہو کے سربسجود ہو گئے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جب انہوں نے سلام پھیرا تو اپنے بائیں طرف کسی انسانی وجود کو محسوس کیا حاکم نے اب جو غور سے دیکھا تو انہیں ایک نہایت حسین و جمیل عورت کھڑی نظر آئی۔

حاکم نے حیرت سے پوچھا "تم کون ہو اور یہاں کہاں رہتی ہو؟"

عورت نے سوگواری سے جواب دیا "میں وہ بدقسمت عورت ہوں جس کا اب اس جگہ کوئی بھی موجود نہیں، سبھی میرا ساتھ چھوڑ کر ملک عدم سدھار چکے "

حاکم نے پوچھا "یہ سب ہلاک کس طرح ہوئے ؟"

عورت نے جواب دیا "انہیں ان کی ہوس کھا گئی "

عورت کا جواب حاکم کی سمجھ میں نہ آیا۔ عورت سے پوچھا "اب تم کیا چاہتی ہو ؟"

عورت نے جواب دیا "تم یہیں رہ جاؤ "

حاکم نے پوچھا "وہ کیوں ؟ "

عورت نے کہا "اس لیے کہ یہاں میں تنہا ہوں اور ایک تنہا عورت یہاں کس طرح رہ سکتی ہے "

حاکم نے جواب دیا "اچھا صبح ہونے دو۔ سوچ کر جواب دیں گے "



اس کے بعد حاکم پھر عبادت میں مشغول ہو گئے عورت ان کے قریب ہی بیٹھ گئی جب وہ نماز سے فارغ ہو گئے اور عورت کی طرف دیکھا تو اسے نہایت انہماک اور اشتیاق سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ حاکم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ عورت ان کے قریب آ گئی اور چاند کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "کتنا حسین منظر ہے ؟"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عورت نے دل فریب تبسم کا مظاہرہ کیا، بولی "چاندنی اور موسم کا نشہ میں اپنی رگ و پے میں دوڑتا محسوس کر رہی ہوں۔ معلوم نہیں آپ کا کیا حال ہے ؟"

آپ نے سکوت بحال رکھا۔ عورت کسمسا کر بالکل قریب آ گئی بولی "آپ نے اس ویران بستی کی بابت یہ محسوس ہی کر لیا ہوگا کہ یہاں از سر نو آبادکاری کی سخت ضرورت ہے "

آپ نے جواب دیا "ہم یہاں مستقل رہنے نہیں آئے ہیں کل صبح ساحل پر پہنچ کر ہم کسی جہاز کا انتظار کریں گے اور اس پر بیٹھ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن تم یہ تو بتاؤ ہم سے کیا چاہتی ہو؟"

عورت نے افسردگی آمیز شوخی سے کہا "لیکن تم یہاں سے کیوں چلے جانا چاہتے ہو ؟ یہاں رہتے کیوں نہیں ؟"

آپ نے جواب دیا "ہم حج کی نیت سے گھر سے نکلے تھے اور وہی مقصد اس وقت بھی

پیشِ نظر ہے "

عورت نے آپ کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ بولی "لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں اور ہم دونوں کے اتحاد اور یک جہتی سے نسلِ انسانی کا سلسلہ قائم ہو، میں یہاں ایک آباد بستی دیکھنے کی خواہش مند ہوں، میرا خیال ہے آپ کی بھی یہی خواہش ہو گی "

"نہیں!" آپ نے بیزاری سے جواب دیا "ہماری ایسی کوئی خواہش نہیں "

عورت سرمستی و سرشاری سے بے خود ہوتی جا رہی تھی۔ خود کو آپ کی آغوش میں گرا دینے کی کوشش کی۔ لیکن آپ کھسک کر ذرا دور ہو گئے عورت گھاس پر گر گئی۔ سنبھل کر اٹھی تو اس طرح کہ قہر کی نظروں سے انہیں گھور رہی تھی۔ کچھ کہنے کیلئے اس نے ابھی اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ حاکم نے اک ادائے خاص اور بے نیازی سے کہنا شروع کیا "او زنِ بازاری ہماری بات ذرا غور سے سُن ہم تیرے مطلب کے نہیں ہیں۔ اگر تو ہم سے بڑی ہے تو ہم تجھے اپنی ماں کی جگہ تصور کریں گے اگر تو ہماری ہم عمر ہے تو خود کو ہماری بہن تصور کر، اور اگر عمر میں ہم سے چھوٹی ہے تو ہم تجھے اپنی بیٹی سمجھیں گے، ان رشتوں کے علاوہ کسی اور رشتے کا ہمارے ذہن میں کوئی تصور نہیں "

عورت نے سکوت اختیار کیا اور غور سے حاکم کی شکل دیکھنے لگی حاکم نے نظریں چرائیں اور گردن جھکا کے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو پتہ چلا وہ عورت کہیں جا چکی ہے۔

اس وقت کسی نے کہا "حاکم! ہمیں تیرا امتحان مقصود تھا تیرے آس پاس جن لوگوں کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری پڑی ہیں یہ سب اس عورت کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس سے چاہت اور مواصلت کا انہیں یہ صلا ملا ہے یہ عورت بمنزلۂ قحبہ تھی۔ دنیا کی بھی یہی حیثیت ہے تو نے اسے ٹھکرا کر ایک اہم امتحان میں مثالی کامیابی حاصل کی ہے تو صبح ساحل پر پہنچ جا۔ وہاں ایک جہاز تیرا منتظر ہوگا اس پر بیٹھ کر خانہ کعبہ پہنچ "

اس ہاتفِ غیبی کی آواز پر حاکم سجدے میں گر گئے اور روتے ہوئے فرمایا "یا اللہ العالمین! میں ایک کمتر اور بے بس انسان جس امتحان میں کامیاب ہوا ہوں۔ اس میں بھی تیری ہی مہربانی پیش پیش تھی ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ کٹھن امتحان "

دوسرے دن صبح واقعی انہیں ایک جہاز مل گیا اور یہ اس پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کے لئے روانہ ہو گئے۔



حرم کے گرد طواف کرنے کے دوران آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ آپ کے نقشِ پا پر

چلنے کی کوشش کر رہا ہے آپ نے گھوم کر اسے دیکھا اور کہا " ظاہری نشان پر چلنا تو نہایت آسان ہے لیکن باطنی نقش قدم پر چلنا بہت دشوار کیونکہ یہاں ہر ہر قدم پر قرآن پاک ختم کرنا پڑتا ہے "

اس شخص نے دل میں خیال کیا کہ حاکم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا واقعی یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر ہر قدم پر قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں بلکہ یہ محاورۃً فرمایا ہوگا۔ آپ نے اسی وقت فرمایا " نہیں، ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا وہی مطلب ہے جو ہم نے کہا۔ تم ان رموز کو کیا سمجھو "

وہ شخص حیران و پریشان ایک طرف چلا گیا اور کسی دوسرے بزرگ سے حاکم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا " یہ شخص ابھی ابھی جو کچھ کہہ رہا تھا کیا یہ درست ہے؟"

ان بزرگ نے جواب دیا " یہ حمید الدین حاکم سلطان التارکین ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا وہی مطلب ہے جو لفظوں میں ادا کیا گیا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں "

اس طرح وہ ایک عرصے تک اپنے پیر و مرشد کا انتظار کرتے رہے اور آخر کار عمر کا ایک بڑا حصہ گزارنے کے بعد انہیں رکن الدین کی شرف مریدی حاصل ہوئی۔ ایک عمر رسیدہ شخص کا ایک نوعمر شخص کی پیری پر ایمان لے آنا معمولی بات نہیں ہے لیکن حاکم نے یہی کیا۔ نوعمر شیخ رکن الدین شیخ حاکم کے پیر تھے اور عمر رسیدہ شیخ حاکم نوجوان شیخ رکن الدین کے مرید۔



ملتان کے کنارے کفار کا لشکر اس غرض سے اکٹھا ہوا کہ وہ مسلمانوں کو لوٹ لے گا لیکن۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے پہلے ہی حضرت حاکم نے اپنی چھاگل دریا میں ڈال کر نکال لی۔ آہستہ آہستہ پانی کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ دریا خشک ہو گیا کفار کا جو لشکر دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا، دریا کے خشک ہو جانے سے پیاس سے تڑپنے لگا۔ اسی عالم میں ملتان والوں نے ان پر حملہ کر دیا اور چشم زدن میں انہیں شکست دے دی۔ لیکن ان مسلمانوں کو بھی پانی کی سخت دقت اٹھانی پڑی۔ وہ اصل واقعے سے لاعلم تھے اس لاعلمی کے ساتھ وہ کسی اور بزرگ کے پاس پہنچے اور اس کے سامنے مشکلات اور شکایات پیش کیں۔ انہوں نے بھی سکوت اختیار کیا۔ ان سب نے تنگ آ کر لوگوں سے کہا " ہم پیری مریدی کے اتنے دعوے دار تو نہیں لیکن اتنی سی بات ہمیں بھی معلوم ہے کہ تم سب بابا کریا ملتانی کے پاس چلے جاؤ اور اپنی مشکل ان کے روبرو بیان کرو۔ مسئلہ ابھی اسی وقت حل ہو جاتا ہے "

چنانچہ ان لوگوں نے یہ مسئلہ بابا زکریا ملتانی کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا پھر فرمایا "ذرا بابا حمید الدین حاکم کو یہاں آنے کی زحمت تو دینا۔"

لوگوں نے تھوڑی دیر بعد حاکم کو داداپیر کے روبرو کھڑا کر دیا۔ آپ نے حاکم سے کہا۔ "کیوں بھئی حاکم! یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا تم اس پر خوش ہو کر دریا کا سارا پانی اپنے کوزے میں بھر لیا بابا حاکم! ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

حاکم نے نرمی سے جواب دیا "حضرت! وہ پانی تو ہم نے کفار پر بند کیا تھا۔"

بابا زکریا نے کہا "لیکن وہ تو کب کے جا چکے ہیں اب تو اپنے بھائی مسلمان بھائی بھی پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور اس کے ذمے دار تم ہو صرف تم!"

حاکم نے فرماں برداری سے کہا "جیسا حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے گی۔"

بابا زکریا نے فرمایا "کوزے کا پانی دریا میں الٹ دو، بس ہم یہی چاہتے ہیں۔"

"بہتر ہے" حاکم نے اسی وقت کوزے کا پانی خشک دریا میں ڈال دیا اور اسی وقت سے دریا جاری ہو گیا۔

شیخ بہاء الدین زکریا وصال فرما گئے بابا زکریا کے صاحبزادے شیخ علم الدین سجادہ نشینی کے امیدوار بن کر سلطان غیاث الدین کی خدمت میں پہنچ گئے ان کا خیال تھا کہ اس معاملے میں ان کے بھتیجے رکن الدین آڑے آئیں گے اور انہیں اسی طرح اپنی راہ سے ہٹایا جا سکتا تھا کہ بادشاہ خود انہیں سجادہ نشین کی حیثیت سے نامزد کر دے۔ جب یہ دہلی پہنچے تو ان سے دو ایک ایسے کرشمے سرزد ہوئے کہ بادشاہ ان کے مرتبے کا قائل ہو گیا۔ شیخ علم الدین نے بادشاہ سے عرض کیا "جناب والا! میں بادشاہ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ بادشاہ مجھے بابا زکریا ملتانی کی جگہ سجادہ نشین کی حیثیت سے نامزد فرما دیں، میں بابا زکریا کا بیٹا اور پڑھا لکھا شخص ہوں۔ جبکہ رکن الدین میرے بھتیجے اور بابا زکریا کے پوتے ہیں اور پھر بے پڑھے لکھے بھی ہیں لوگوں کا رجحان ان کی طرف ہے اور اس رجحان کے خلاف اور میرے حق میں بادشاہ سلامت جو فیصلہ بھی صادر فرمائیں گے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے۔"

بادشاہ نے اسی وقت حکم صادر کر دیا کہ شیخ رکن الدین کو بھی بادشاہ کے روبرو حاضر کیا جائے حکم کی تعمیل ہوئی اور شیخ رکن الدین، اپنے خدا رسیدہ عمر رسیدہ مرید حاکم کو لے کر دہلی روانہ ہو گئے راستے میں ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ ایک طویل کھڑی ہوئی ہے۔ ایک ایسی دیوار جو

انہیں تو نظر آ رہی تھی لیکن اسے عام انسان نہیں دیکھ سکتے تھے۔

شیخ رکن الدین نے حاکم سے کہا "بابا حاکم! اس دیوار کو دیکھ رہے ہو؟"

حاکم نے جواب دیا "جی پیر و مرشد!"

شیخ رکن الدین نے کہا "یہ دیوار سلسلۂ چشتیہ اور سہروردیہ کے درمیان حد فاصل ہے"

حاکم نے عصا بلند کیا اور دیوار پر رسید کیا "آخر یہ حد بندی کیوں؟ اسے گر جانا چاہیئے۔"

وہ دیوار ایک ہی ضرب میں غائب ہو گئی۔

جب یہ لوگ بادشاہ کے سامنے پہنچے تو علم الدین نے اپنی قابلیت کے اظہار کے طور پر سوال کیا "بادشاہ سلامت شیخ رکن الدین سے معلوم فرمائیں کہ وضو میں ہاتھ دھونا، کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا سنت ہے اور منہ دھونا فرض۔ لیکن فرض پر سنتوں کو کیوں مقدم کیا گیا؟"

شیخ رکن الدین کی طرف سے حاکم نے جواب دیا "سنتوں کی تقدیم رنگ، ذائقہ معلوم کرنے کی غرض سے ہے۔ ہاتھ دھونے سے پانی کا رنگ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح کلی کرنے سے اس کے ذائقے کی اچھائی برائی معلوم ہو جاتی ہے اور جب پانی ناک میں ڈالا جاتا ہے تو ناک ہمیں بتاتی ہے کہ پانی بدبودار ہے یا نہیں۔ جب تین جگہوں سے پانی کی طہارت کی گواہی مل جاتی ہے تب ہم پر فرض کی ادائیگی واجب آ جاتی ہے یعنی منہ دھونا اور فرض پر سنتوں کو اسی لئے مقدم کیا گیا ہے"

شیخ علم الدین نے بادشاہ سے کہا "حضور والا! جواب حاکم نے دیا ہے جو ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سوالوں کے جواب شیخ رکن الدین مرحمت فرمائیں"

شیخ رکن الدین کو غصہ آ گیا۔ فرمایا "اچھی بات ہے" اسی وقت کسی کو حکم دیا "جاؤ بازار سے ایک جاہل غلام خرید لاؤ۔ ہماری طرف سے چچا علم الدین سے وہ سوال جواب کریگا"

بادشاہ کی ایما پر بازار سے ایک غلام خرید کر لایا گیا۔

شیخ رکن الدین نے حاکم سے کہا "بابا حاکم! تم اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ٹپکا دو"

پیر کے حکم کی فوری تعمیل عمل میں آئی۔ شیخ رکن نے بادشاہ سے کہا "اب یہ شخص چچا علم الدین سے کسی بھی موضوع پر بحث و مباحثہ کر سکتا ہے"

بحث مباحثے کا آغاز ہوا۔ پتہ چلا کہ زر خرید جاہل غلام علم الدین پر کس قدر زیادہ فوقیت رکھتا ہے جب بحث و مباحثے کا فیصلہ زر خرید غلام کے حق میں ہو گیا تو رکن الدین نے وہیں یہ اعلان کر دیا

کہ میں اپنے دادا کی سجادہ نشینی ہرگز نہیں چاہتا اس کے لئے چچا علم الدین ہی مناسب رہیں۔

بادشاہ نے علم الدین کو بابا ذکریا کی جگہ سجادہ نشین نامزد کر دیا۔

جب شیخ علم الدین ملتان روانہ ہونے لگے تو رکن الدین نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے کہا "اول تو یہ ہے کہ خانقاہ میں کبھی بھی کسی کو درس نہ دینا دوم یہ ہے کہ روضے میں جو کبوتر رہ رہے ہیں انہیں وہاں سے نکالنا مت"۔

علم الدین نے کوئی جواب نہ دیا۔ رکن الدین نے پھر کہا "جو فقیر مسجد یا حجرے میں اذکار واشغال رکھتے ہوں انہیں ستانا مت!"

علم الدین نے نہ تو کوئی وعدہ کیا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔ بلکہ اس کے بعد انہوں نے ہر وہ حرکت کی جس سے رکن الدین کو تکلیف پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے خانقاہ میں درس کا سلسلہ جاری کیا۔ کبوتروں کو روضے سے نکال باہر کیا اور ان فقرا کو ستانا شروع کیا جو وہیں کہیں گوشہ نشین تھے۔ انہی میں حاکم کے علاقی بھائی شیخ حاتم بھی تھے جن پر سکر و مستی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ علم الدین نے ان کے خلاف سخت محاسبہ کیا انہیں نمازوں میں شریک ہونے سے روک دیا اور کہا "نماز سکر و مستی میں کہاں جائز ہے؟ اس لیے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آئندہ آپ احتیاط رکھیں"

اس پابندی پر کسی نے جو کچھ کہا سو وہ تو ایک الگ بات تھی لیکن اس معاملے میں بطور خاص حاکم کے علاقی بھائی حاتم نے جوش میں کہا "اے برخیز! سوختگان عشق را چرا مے سوزی" (او جلے ہوئے! عشق کے جلے ہوؤں کو کیوں جلاتا ہے؟)

ادھر زبان سے یہ جملہ نکلا اور ادھر علم الدین کو سوزش نے بچانا شروع کیا اور ساتویں دن جاں بحق ہو گئے۔

حکومت کو ٹھوکر مار کر درویشی اختیار کرنے والا یہ شخص ایک سو ستر سال زندہ رہا بڑی بڑی کرامتیں ظہور پزیر ہوئیں۔ لوگوں کی مشکلات حل ہوئیں آپ کو سلطان التارکین کا خطاب عطا ہوا۔ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا مرخرو اور کامیاب ہوا۔

یہ ۷۳۰ھ کا ذکر ہے ملتان میں کسی بزرگ نے نعرہ بلند کیا "لوگو! ہوشیار! اس کی ایک سمت غرق ہونے کو ہے۔ لوگو خبردار! یہاں کی ایک طرف غرق ہونے والی ہے"

لوگ بدحواس اور پریشان آپ کی خدمت میں پہنچے اور کہا "حضرت یہ کیسی آواز بلند ہوئی ہے۔ کیا واقعی یہاں کا کوئی بڑا حصہ غرق ہونے والا ہے اگر ایسا ہے تو ہم لوگ بچ کر نکلنے کی فکر کریں

آپ نے متبسم ہو کر ارشاد فرمایا۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، ہاں ان دنوں کوئی صاحب رحلت ضرور فرمائیں گے۔"

اور ایک ہفتے بعد ۱۲ ربیع الاوّل کو خود حضرت حاکم وفات پا گئے آپ کی وفات ملتان میں ہوئی۔ لیکن تجہیز و تکفین مئو میں ہوئی جو ------------ ضلع رحیم یار خاں کے ریلوے اسٹیشن ترنڈہ سے جانب شمال چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حاکم نے بہت سوں کو مسلمان کیا اور بہت ساری کتابیں بھی تصنیف کیں۔ آپ شاعر بھی تھے اور حاکم تخلص کرتے تھے۔ فقہ میں بخارا، صرف میں پنج گنج، تفسیر میں نیام اور نظم میں گلزار آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

حمیدالدین حاکم کے سوانح حیات میں جلال و جمال کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے شاہی جلال اور فقیری جمال۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الفقر فخری" حمیدالدین حاکم نے اس قول کی صداقت اپنے اعمال سے ثابت کر دی۔ حکومت کو بے نیازی سے ٹھکرا کر فقر کا خرقہ پہن لینا ہی "الفقر و فخری" کی ایک دل کش اور حسین تفسیر ہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے یک سوئی اور توجہ الی اللہ کی خاطر جس خانقاہ میں سکونت اختیار کر رکھی تھی وہ دہلی میں کیلوکھڑی نامی جگہ پر واقع تھی آپ خانقاہ کی بالائی منزل میں قیام فرماتے تھے آپ کے مرید خانقاہ کے نچلے حصے میں موجود رہتے اور اپنے مرشد کی کچھ اس طرح عزت و تکریم کرتے کہ کوئی زر خرید غلام اپنے آقا کی عزت اور خدمت کرتا ہوگا۔

صبح ہو چکی تھی اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ مرغ بانگ دیکر کب کے خاموش ہو چکے تھے مندروں کی گھنٹیاں اور گھنٹوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر دور دور اڑتی پھر رہی تھیں۔ مؤذن اذان دے چکے تھے اور تسلیم و رضا کے پیکر خدا کی بارگاہ میں دست بستہ کھڑے اپنے عجز و بے بسی اور نیازمندی کا مؤدبانہ اظہار کر رہے تھے تھوڑی دیر پہلے جب مؤذن نے "نماز نیند سے بہتر ہے" کا پُر رفعت اعلان کیا تھا تو اس صدا نے بارگاہِ ایزدی کے نیاز مندوں کے دلوں کو گرما دیا تھا اور اب یہی گرمی مسجدوں کی صفوں میں ارکانِ نماز کی ادائیگی کی صورت میں جلوہ نما تھی جس میں لوگوں کا یقین اور اعتماد سیال ملنے کی طرح اِدھر اُدھر متحرک اور سرگرم عمل تھا۔

نماز سے فراغت حاصل کر چکنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ خانقاہ کی بالائی منزل میں اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا دریا کے کنارے غسل کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا نہانے والوں نے اپنے کپڑے ساحل پر ہی چھوڑے اور خود پانی میں اتر گئے ان نہانے والوں میں حضرت محبوب الٰہی کے وہ معزز مہمان بھی تھے جو ملتان سے تشریف لائے تھے، جو حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ سے قرابت داری کا شرف رکھتے۔ یہ حضرات نہاتے جاتے نتھنوں کو انگلیوں سے داب کر ڈبکی لگاتے اور جب دوبارہ اُبھرتے تو سر کو جھٹکا دیکر نتھنے کھول دیتے اور جلدی جلدی سانسیں لینے لگتے۔ اسی عالم میں ایک درویش جو پانی کی سطح پر اُبھرا اور آنکھیں کھول کر ساحل پر رکھے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ ایک اچکا ان

کا لباس لئے بھاگا جا رہا ہے۔ درویش نے پانی کے اندر ہی شور و غل مچانا شروع کر دیا
"لوگو! دوڑنا، پکڑنا، کمبخت میرے کپڑے لئے جا رہا ہے۔"
لوگ دوڑے لیکن شاطر اٹھائی گیرا کپڑے لے کر معلوم نہیں کہاں نو دو گیارہ ہو چکا تھا درویش نے ساحل پر پہنچ کر ہائے واویلا شروع کر دی اور زور زور سے اٹھائی گیرے کو برا بھلا کہنے لگا ذرا سی دیر میں وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ان کی چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں بہت ساری شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونجنے لگیں جس سے حضرت محبوب الٰہی کے ذکر و فکر میں خلل واقع ہونے لگا خانقاہ کے ایک مرید خاص نصیر الدین سے یہ ہنگامی حالت دیکھی نہ گئی۔ شور و غل سن کر یہ خانقاہ سے باہر نکلے اور ہجوم میں داخل ہو کر دریافت کیا "کیا بات ہے یہ شور و غل کیسا مچا رکھا ہے؟"
درویش آگے بڑھا اور ناگواری کی شکنیں دکھاتا ہوا بولا "حضرت! یہاں کے لوگ کیسے ہیں کہ غسل کے دوران لوگوں کے لباس لے بھاگتے ہیں، ایک اٹھائی گیرا میرا لباس لے بھاگا۔"
درویش بھیگے ہوئے تہمد میں برہنہ کھڑا ہجوم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ تہمد کا پانی ٹپک ٹپک کر اس کے قدموں میں جمع ہو رہا تھا اور زمین کی خشک اور پیاسی مٹی اسے نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔
نصیر الدین نے کہا۔ "بھائی! تمہارے شور و غل سے حضرت پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل واقع ہو رہا ہے تم ذرا توقف کرو۔"
درویش نے بے زاری سے پوچھا "کیا ذرا سے توقف سے میرے کپڑے واپس مل جائیں گے؟"
نصیر الدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں تم کپڑوں کی فکر نہ کرو، تمہیں کپڑے بھی مل جائیں گے مگر شرط یہ ہے کہ اپنے شور و غل سے باز آجاؤ۔"
درویش چپ ہو گیا۔ نصیر الدین۔ "ذرا ٹھہرو" کہتے ہوئے خانقاہ میں واپس چلے گئے اور جب تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو اس حلیے میں کہ جسم پر ایک تہمد کے سوا کپڑے کا ایک تار بھی نہ تھا ان کا اپنا لباس ان کے ہاتھوں میں تھا۔ پھٹا پرانا تہمد باندھ کر مضبوط اور کر سے لپٹا ہوا تہمد کرتے کے ساتھ ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ اپنا لباس درویش کے حوالے کرتے ہوئے کہا "لو اس لباس کو پہن لو۔"

درویش نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ اپنا لباس کیوں اتار رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ تمہارے نقصان کی تلافی ہو جائے اور تم شور سے باز آجاؤ، تمہارے شور و غل سے پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل پڑ رہا ہے۔"

درویش کچھ دیر لینے نہ لینے کے تذبذب کا شکار رہا لیکن جب نصیر الدین نے ذرا زور دے کر کہا۔ "لے لو، سوچتے کیا ہو، تم ہمارے مہمان ہو، ملتان جا کر یہی کہو گے نا کہ کیلو کھڑی میں اٹھائی گیرے بستے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہو کہ کیلو کھڑی میں حضرت نظام المشائخ اور ان کے نیاز مند بھی رہتے ہیں جو اٹھائی گیروں سے پہنچنے والے نقصان کی تلافی کر دیتے ہیں۔"

درویش نے کپڑے لے لئے اور نصیر الدین خانقاہ میں واپس چلے گئے۔ مجمع نصیر الدین کے رویے پر تحسین آمیز تبصرے کرنے لگا۔

دریا کے کنارے کیا ہوا تھا اور یہ ہنگامہ کس طرح ختم ہوا، خانقاہ کے لوگ بھی پوری طرح باخبر نہ ہو سکے جب نصیر الدین خانقاہ میں واپس پہنچے تو بعض پیر بھائیوں نے اس عجیب حلیے کی بابت سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ نصیر الدین اس کا چرچا نہیں کرنا چاہتے تھے کسی نہ کسی طرح چھپاتے رہے اوپر محبوب الٰہیؒ نماز چاشت ادا فرما رہے تھے نماز سے فارغ ہوتے ہی آپ نے نصیر الدین کو طلب فرمایا۔ نصیر الدین کو برہنہ حالت میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی، لیکن مرشد کے حکم کو ٹال بھی نہ سکتے تھے وہ حالتِ گومگو میں مبتلا کسی قطعی فیصلے پر نہ پہنچے تھے کہ دوبارہ حکم آیا۔ "جس حالت میں ہو، اسی میں چلے آؤ۔"

یہ بدرجۂ مجبوری ندامت اور خجالت کی تصویر بنے ہوئے شیخ کی بارگاہ میں پہنچے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ نظام المشائخ نے سر اٹھایا اور مسکرا کر پوچھا۔ "نصیر الدین! تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

جھوٹ بولنے کی ہمت نہ تھی اور سچ بولنے میں اس تعلّی اور غرور کا خدشہ تھا کہ نصیر الدین نے اپنے پیر و مرشد کے ذکر و فکر میں خلل انداز ہونے والے واقعے کو اپنے لباس کی قربانی دے کر دور کیا تھا۔

نظام المشائخ نے ارشاد فرمایا۔ "ہم تمہارے تامّل سے آگاہ ہیں ادھر آؤ، ہمارے قریب تم ہمارے سعادت مند اور بلند مرتبہ مرید ہو۔ یہ لو اور اپنی برہنگی دور کرو۔"

یہ کہتے ہوئے نظام المشائخ نے اپنا خاص لباس نصیر الدین کو مرحمت فرما دیا۔ اس

واقعے اور عطیے نے نصیر الدین کا جو حال کر دیا وہ ناقابل بیان تھا حالت وجد اور سرخوشی میں انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے پیرو مرشد نے انہیں پوری کائنات بخش دی ہے اور نصیر الدین جیسا خوش نصیب انسان روئے زمین پر تلاش بسیار کے بعد بھی نہ مل سکے گا۔

نصیر الدین حسنی سید اور دھ کے رہنے والے تھے دادا کہیں باہر سے لاہور میں تشریف لائے اور یہیں نصیر الدین کے والد سید یحییٰ پیدا ہوئے پھر یہ لوگ اودھ چلے گئے اور یہیں نصیر الدین پیدا ہوئے ابھی نو سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ماں نے تعلیم و تربیت کا وہ حق ادا کیا۔ کہ بہتوں کے باپ بھی اس طرح نہ ادا کر سکتے تھے عبد الکریم شیروانی نامی عالم بے بدل سے تعلیم حاصل کرتے رہے ان کے انتقال کے بعد مولانا افتخار الدین گیلانی نامی فاضل اجل سے علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ ترک و تجرید اور نفس کشی کے آثار نو عمری ہی سے ہویدا تھے ہمیشہ روزے سے رہتے اور نماز با جماعت میں کبھی فرق نہ آتا۔ پھر ریاضت و مجاہدے میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور کسی درویش کامل کے ساتھ سات سال اس طرح گزارے کہ سوتے جاگتے اور اٹھتے بیٹھتے اس کی پاک صحبت کا فیضان حاصل رہتا۔ جب یہ اپنی عمر کے چالیسویں سال میں داخل ہوئے تو دہلی تشریف لے گئے اور حضرت نظام المشائخ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھر مستقلاً وہیں رہنے لگے اور محبوب الٰہی کی مریدی اختیار کی اس مقدس چھاؤں میں نصیر الدین کو جیسا سکون ملا اس کا انہیں پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا یہ ان کی آخری منزل مراد تھی۔ ان کی بڑی بہن اب بھی اودھ ہی میں رہ رہی تھیں اور نصیر الدین کو جب بہن کی محبت ستاتی تو حضرت محبوب الٰہی سے اجازت لے کر اودھ تشریف لے جاتے اور کچھ عرصہ رہ کر پھر واپس آجاتے۔

بہن کے پاس قیام فرما ہونے کے دوران انہیں شدت سے یہ احساس بھی ہوتا کہ لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں جس کا یہ نتیجہ نکلتا کہ ان کا بہت زیادہ وقت برباد ہو جاتا۔ جس کا انہیں بڑا قلق ہوتا۔ وقت کی اس بربادی سے بچنے کا یہ طریقہ سوچا کہ وہ علی الصباح نماز فجر کے بعد کسی ویرانے میں نکل جایا کریں اور وہاں اللہ اللہ کرتے رہیں۔ شاید وہ اس طریقے پر فوراً عمل درآمد بھی شروع کر دیتے لیکن اس کے لیئے پیرو مرشد کی اجازت لینی بہت ضروری تھی۔ انہوں نے اودھ سے کیلوکھڑی پہنچتے ہی حضرت محبوب الٰہی سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی، بدرجہ مجبوری امیر خسرو کا سہارا لیا۔ امیر خسرو کو شیخ کی خدمت اور مزاج میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ نصیر الدین نے امیر خسرو سے کہا "حضرت!

آپ کسی مناسب موقع پر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں اس حاجت کی ایک درخواست کرکے منظوری دلوا دیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

امیر خسرو نے پوچھا "کہیے لیکن ایسی نہ ہو جو حضرت پیر و مرشد کے مزاج پر گراں گزرے"

نصیر الدین نے کہا "آپ حضرت سے فرمائیں کہ جب نصیر الدین اودھ میں اپنی بہن کے پاس جاتا ہے تو وہاں اس ناچیز کے گرد لوگوں کا مجمع لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی عبادت و ریاضت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے اور بہت سارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو جاتا ہے۔"

امیر خسرو نے جواب دیا "آپ بے فکر رہیں آپ کی درخواست کسی مناسب موقع پر پیش کرکے منظور کرا دی جائے گی"

عشاء کی نماز کے بعد حضرت امیر خسرو حضرت محبوب الٰہی کے پیروں کے ...... پاس بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ ان کے پیر دابنے لگے آپ اس جامع کمالات شخص کی صورت دیکھ رہے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے کہ نصیر الدین کی درخواست کے لیئے اس سے بہتر وقت شاید نہ مل سکے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے متبسم لہجے میں پوچھا "خسرو! کیا سوچ رہے ہو؟"

خسرو نے جواب دیا "حضور! نصیر الدین نے ناچیز کے توسط سے ایک زبانی درخواست حضور والا کی خدمت میں بھیجی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کر دی جائے"

آپ نے ارشاد فرمایا "کہو، بیان کرو"

خسرو نے عرض کیا "حضرت! نصیر الدین کہتے ہیں کہ جب میں اودھ میں ہوتا ہوں تو عقیدت مندوں کا ہجوم بُری طرح عبادت و ریاضت میں مخل ہوتا ہے اور وقت برباد کرتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو ان حالات میں نصیر الدین کسی ویرانے میں نکل جایا کرے اور وہاں عبادت و ریاضت کر لیا کرے۔"

حضرت محبوب الٰہی نے فوراً بے چینی سے ایک پیر کھینچ لیا اور فرمایا "خسرو! تم نصیر الدین سے کہہ دو کہ اسے خلق کے درمیان ہی میں رہنا ہے اور ان کے جور و ظلم اٹھانے پڑیں گے خلق خدا اگر انہیں ستائے تو نصیر الدین کو اس کے جواب میں مسکرانا پڑے گا، لوگوں کے جور و ظلم کا جواب مہربانی، خوش اخلاقی اور اچھے سلوک سے دینا پڑے گا۔"

پھر فرمایا ۔ "ذرا نصیر الدین کو بلانا تو"

خسرو نے نصیر الدین کو مطلع کیا کہ آپ کی درخواست حضرت کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے وہ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔

نصیر الدین نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا ۔ "حضرت کا رویہ کیسا ہے ؟ انہیں میری درخواست ناگوار تو نہیں گزری ؟ ان کی مزاج میں برہمی کے آثار تو نہیں ؟"

خسرو نے جواب دیا ۔ "حضرت فرماتے تھے کہ آپ کو خلق خدا کے درمیان ہی رہنا ہوگا ان کے جو ظلم سہنے پڑیں گے اور خلق خدا کی زیادتیوں کا جواب مہربانی، سلوک اور خوش اخلاقی سے دینا ہی پڑے گا۔"

نصیر الدین ڈرے سہمے حضرت محبوب الٰہی - کی خدمت میں پہنچ گئے اور پیروں کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

آپ نے نصیر الدین کو دیکھتے ہوئے فرمایا ۔ "نصیر الدین! یہ تجھے کیا سوجھی ہے کہ ویرانے کا خیال اپنے دل میں لایا ہے آخر جنگل میں رہنے سے تیرا مقصد کیا ہے ؟"

نصیر الدین نے جواب دیا ۔ "اس سے اس ناچیز کا مقصد دنیا اور علائق دنیا سے برأت اور بے زاری کے سوا کچھ بھی نہ تھا - ترک دنیا اور ترک لذات اس عاجز کا مقصد اور حضور والا کی مرضی اور خواہش کے مطابق، گزران حیات مقصد اولیٰ ہے۔"

آپ نے دریافت فرمایا ۔ "نصیر الدین! تیرا باپ کیا کام کرتا تھا؟"

نصیر الدین نے جواب دیا ۔ "وہ روئی کے سوداگر تھے۔"

آپ نے کہا ۔ "خوب، لوگوں کو گرمی پہنچایا کرتے تھے اور تو ان سے بچنا چاہتا ہے ہم تجھے جنگل یا ویرانے میں جانے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے " پھر فرمایا ۔ "بابا نصیر الدین! جب ہم اپنے پیر و مرشد بابا فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں رہا کرتے تھے - اتفاق سے وہاں ہمارا ایک دوست بھی پہنچ گیا - یہ دنیا دار دوست ہمیں پھٹے پرانے لباس میں دیکھ کر کہنے لگا ۔ "نظام الدین! تم نے یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے ؟ اگر تم پیری مریدی کی جگہ معلمی کا پیشہ اختیار کرتے تو نہایت آسودگی اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہوتے ۔" ہم نے دوست کی اس دل آزار بات کا کوئی جواب نہ دیا اور تلخ دوا کی طرح حلق کے نیچے اتار گئے اس گفتگو کے بعد جب ہم حضرت بابا کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے میری صورت دیکھتے ہی دریافت فرمایا ۔ "نظام الدین! ایک بات تو بتا

ہم نے کوئی جواب نہ دیا تو بابا نے ارشاد فرمایا "نظام الدین! اگر تیرا کوئی دوست یہ کہے کہ تو نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، اگر تو معلّمی کا پیشہ بھی اختیار کرتا تو تیرا یہ حال نہ ہوتا اور تجھے خوش حالی اور آسودگی میسّر ہوتی تو تُو کیا جواب دیتا؟"

ہم بابا کے کشف پر حیران رہ گئے اور کہا "جو حکم عالی ہو عرض کر دیا جائے۔"

بابا نے فرمایا:۔

نہ ہمسری تو مرا خویش گیر د برو   ترا سعادت باد مرا نگوں ساری

(اپنے ساتھ میری برابری کا خیال بھی دل میں نہ لا۔ جا تجھے تیری خوش حالی مبارک ہو، میرے لیئے میری عاجزی کافی ہے)

اس کے بعد بابا نے فرمایا "کھانے کا خوان لا"۔ میں کھانے کا خوان لے آیا۔ بابا نے فرمایا "اسے اپنے سر پر رکھ اور تیرے جس دوست نے تیری تباہ حالی پر اظہارِ افسوس کیا تھا اس کے پاس لے جا اور اسے بتلا کہ خوش حالی اور آسودگی ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے فقراء کو محروم رکھا گیا ہو بلکہ ہم خود ہی ان سے حذر کرتے ہیں" میں نے بابا کے حکم کی تعمیل کی اور کھانوں کا خوان سر پر رکھ کر دوست کے پاس پہنچ گیا۔ دوست نے خوان پوش ہٹا کر لذیذ اور مرغن کھانوں کو جو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں نے بابا کے ارشادات دہرا دیے وہ شرمسار ہو کر بولا "مبارک باد دوست! میں یہ سب نہیں جانتا تھا"

نصیر الدین پیر و مرشد کی باتیں نہایت انہماک سے سُن رہے تھے اور اپنی درخواست عزلت نشینی اور ویرانہ پسندی پر نادم ہو رہے تھے حضرت محبوب الٰہی نے انہیں خجالت اور شرمساری سے بچانے کے لیئے حکم دیا "جاؤ اور ہماری باتوں کو ذہن نشین رکھو!"

نصیر الدین نیچے خانقاہ میں واپس آ گئے۔



کسی پیر بھائی کے ہاں محفل سماع منعقد ہوئی، قوالوں کی چوکی سازوں کے ساتھ براجمان تھی۔ اس تقریب میں نصیر الدین بھی موجود تھے قوالی کے شروع ہونے سے پہلے ہی یہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پیر بھائی نے حیرت سے پوچھا "کہاں چلے نصیر الدین؟"

انہوں نے جواب دیا " میں قوالی کی محفل میں نہیں بیٹھ سکتا "
پیر بھائی نے پوچھا " وہ کیوں ؟"
آپ نے جواب دیا " اسلام موسیقی کے حق میں نہیں ہے "
پیر بھائی نے ذرا بدمزگی سے کہا " کہاں کی بات کرتے ہو نصیر الدین! سماع سے منکر ہو کر اپنے پیر کے مشرب سے پھر جانے کے مرتکب ہوئے ہو کیا تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا ؟"
آپ نے جواب دیا " یہ کوئی حجت نہیں ہے دلیل تو کتاب اور حدیث سے ملنا چاہیئے جو ظاہر ہے تم نہیں پیش کر سکتے "
نصیر الدین وہاں سے چلے گئے کسی مرید نے حضرت نظام المشائخؒ سے ان کے اس رویے کی شکایت کر دی کہا " حضرت نصیر الدین آپ کے مشرب سے گریزاں ہیں "
محبوب الٰہی نے جواب دیا " نصیر الدین کو کچھ بھی نہ کہو ان کا تقویٰ تم سب سے بڑھا ہوا ہے "
حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپ کو اپنے بعد نہ صرف خلافت سے سرفراز فرمایا بلکہ محمود گنج شرف اور چراغ دہلی جیسے اعلا و ارفع القاب سے بھی نوازا۔
ایک دن جب آپ نے پہننے کے لئے اپنا لباس طلب فرمایا تو پتہ چلا کہ وہ چوری ہو چکا ہے لوگوں نے کہا " حضرت آپ مستجاب الدعوات ہیں چور کے حق میں بددعا فرمائیں تاکہ وہ کیفر کردار کو پہنچے "
آپ نے جواب دیا " میں اپنے پیر و مرشد کے ارشاد گرامی کے خلاف کس طرح زبان کھول سکتا ہوں "
ایک مرید نے کہا " حضرت بابا نظام الدینؒ کو وصال فرمائے کچھ عرصہ گزر چکا ہے انہوں نے اس چوری کی بابت کیا اور کب ارشاد فرمایا ہے ؟"
آپ نے فرمایا " حضرت نے مجھ سے فرمایا تھا کہ لوگ تجھ پر جور و ظلم کریں گے تو اسے بے چون و چرا برداشت کرے گا لوگ تجھے ستائیں گے تو ان کے ساتھ سلوک اور مہربانی سے پیش آئے گا "
مرید خاموش ہو رہا اور آپ چور کے حق میں دعائے خیر فرماتے رہے۔
تراب نامی ایک درویش مدتوں سے آپ کے خلاف عناد رکھتا تھا اور موقع کی تلاش میں

تھا۔آپ بھی اس کے ارادوں سے آگاہ تھے لیکن کبھی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں اور نہ ہی کسی اور پر اس خطرے کا اظہار کیا ایک دن آپ مراقبے میں آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے حجرے میں آپ کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ باہر مرید بھی ذکرو اشغال میں گم صُم بیٹھے تھے تراب نے سوچا اس سے بہتر موقع شاید کبھی اور نہ ملے، چھُرے کو تہمد میں اڑسا اور کرتے کو اوپر ڈال کر حجرے میں داخل ہو گیا آپ نے تراب کی آمد پر کوئی توجہ نہ دی۔ تراب نے پھرتی سے چھُرا نکالا اور پے در پے گیارہ وار کیئے اور اس یقین کے بعد کہ کام تمام ہو چکا ہے چھُرا حجرے میں پھینک کر بھاگ نکلا لیکن خون کے فوارے اس کے تہمد اور کرتے کو داغ دار کر چکے تھے اور وہ بدحواس بھی بہت زیادہ تھا جب حجرے سے باہر نکلا تو مریدوں نے اس بُرے حال میں دیکھ لیا اور کئی مرید تراب پر حملہ آور ہوئے انہوں نے تراب کو گرا کر بے قابو کر دیا اور اس سے پوچھا "تیرے لباس پر خون کے یہ دھبے کیسے ہیں؟"

تراب اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا ایک مرید حجرے میں داخل ہوا اور وہاں اپنے پیر کو زخموں سے چُور کراہتے ہوئے دیکھا تو اس کے حواس ہی جاتے رہے اس نے شور غل مچا کے دوسرے مریدوں کو بھی بلا لیا اور فوراً طبیب اور جراح لائے گئے خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ معالجین نے زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار کیا۔ لیکن اس دوران آپ ہوش میں آ گئے اور شدید کرب اور اذیت کے باوجود متبسم ہو کر فرمایا "تراب کہاں ہے؟"

اشکبار مرید نے جواب دیا "حضرت اسے باندھ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے"

آپ نے ناگواری سے حکم دیا "اسے ہمارے پاس لاؤ"

آپ کے معالج حکیم صدر الدین نے کہا "حضرت آپ بات چیت سے اجتناب فرمائیں، زخم مہلک ہیں"

آپ نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا "ابھی میرا وقت نہیں آیا"

حاضرین حیران تھے اور دل میں سوچتے تھے کیا اب بھی زندگی کے آثار موجود ہو سکتے ہیں پھر بھی یہی کہا "حضور! آپ سکوت اور آرام فرمائیں"

آپ نے پھر حکم دیا "تراب کو ہمارے پاس لاؤ"

لوگوں نے کہا "آپ صحت مند ہو لیں، اسے فرار نہیں ہونے دیا جائے گا آپ تشویش نہ فرمائیں"

لیکن اس بار آپ نے ذرا ترش لہجے میں فرمایا "اسے ہمارے پاس لاؤ، وہ ہمارا مجرم ہے اسے ہم خود سزا دیں گے۔"

لوگوں نے تعمیل ارشاد میں تراب کو آپ کے روبرو پیش کر دیا بیسیوں مریدوں کے درمیان قاتل اپنے زخمی کے روبرو کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا "تو نے چھرے سے کتنے وار کئے تھے بھلا؟"

تراب شرم و ندامت اور خوف کی وجہ سے کوئی جواب نہ دے سکا آپ نے پھر سوال کیا "بتاتا کیوں نہیں؟ کتنے وار کئے تھے تو نے؟"

قاتل نے آہستہ سے جواب دیا "گیارہ!" اور گردن جھکالی۔

آپ نے پھر سوال کیا "آہستہ آہستہ یا زور زور سے؟"

اس عجیب سوال پر لوگ ان کی صورت دیکھنے لگے قاتل کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

آپ نے پھر سوال کیا "تو نے یہ وار پوری قوت سے کیے تھے یا یوں ہی معمولی قوت سے؟"

شرمسار اور خوف زدہ قاتل نے جواب دیا "پوری قوت سے۔"

آپ نے کہا "تیرے ہاتھ کو ان حملوں سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟"

قاتل سمجھا، نصیر الدینؒ شاید اپنے ہوش میں نہیں ہیں تبھی تو ایسے مہمل سوال کر رہے ہیں لیکن اسی لمحے نصیر الدینؒ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا "دیکھ اندر حجرے میں جا، وہاں کچھ اشرفیاں رکھی ہیں اور وہیں ایک قیمتی لباس بھی رکھا ہے جو آج ہی ایک امیر نے ہمیں بھیجا تھا، انھیں یہاں ہمارے پاس لے آ۔"

مرید بے چون و چرا یہ دونوں چیزیں حجرے سے لے کر واپس آیا۔ آپ نے یہ دونوں چیزیں اپنے قاتل کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا "سردست اس فقیر کے پاس ان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تو انہیں قبول کر اور جہاں جانا چاہتا ہے چلا جا، پھر کبھی آئیو، جو کچھ ہمارے پاس ہوگا حاضر کر دیں گے۔"

مریدوں نے عرض کیا "حضور! یہ کیا غضب فرماتے ہیں یہ شخص تو آپ کا قاتل ہے سزا دینے کے بجائے آپ اسے اشرفیوں اور لباس سے نواز رہے ہیں یہ کیوں؟"

آپ نے فرمایا۔ "مشیت ایزدی میں دم مارنے کا حکم نہیں خاموش رہو۔"

حکیم صدر الدین نے کہا "حضرت! اس انوکھے حکم میں مشیت ایزدی کا کیوں ذکر فرما

رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہمارے پیر حضرت نظام المشائخؒ نے بہت پہلے ہی یہ حکم دے دیا تھا کہ نصیر الدّین! لوگ تجھ پر ظلم و جور کریں گے لیکن تو ان سے مہربانی، سلوک اور خوش اخلاقی سے پیش آئے گا لوگ تجھے ستائیں گے تو انہیں معاف کر کے نوازے گا اس وقت بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی اپنے ارشاد کی تعمیل کا تقاضا کر رہی ہیں۔"

آپ نے قاتل کو اشرفیاں اور لباس عطا فرما کر معاف کر دیا اور اسی وقت رخصت فرما دیا۔ قاتل حیران و پریشان، شرمسار اور نادم ہو کر ایسا گیا کہ پھر کبھی معافی مانگنے بھی حاضر نہ ہوا۔



سُلطان محمد تغلق کے دو با اثر امیر عمر سمر قندی اور علی قندھاری معلوم نہیں کیوں آپ سے بے جلتے تھے اور ہر وقت سُلطان کے کان بھرتے رہتے تھے ایک دن بادشاہ نے آپ کو دعوت کے بہانے طلب کیا۔ جب آپ بادشاہ کے روبرو پہنچے تو دیکھا کر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا لگا ہوا ہے۔ سلطان کا مقصد یہ تھا کہ اگر نصیر الدّین سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا نوش فرمالیں گے تو بادشاہ انہیں حدِ شرعی سے سزا دینے میں حق بجانب قرار پائے گا اور اگر انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو بادشاہ انہیں توہینِ سُلطانی کے جرم میں قید کر دے گا۔ آپ بادشاہ کے منشا سے خبردار ہو چکے تھے آپ نے چٹکی میں ذرا سا کھانا لے کر زبان پر رکھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ بادشاہ اس تدبّر اور ذہانت پر دل ہی دل میں عش عش کر اُٹھا۔ عمر سمر قندی اور علی قندھاری شرمندہ ہو گئے۔ بادشاہ نے از راہِ مراحمِ خسروانہ دو توڑے زرِ سُرخ اور دو تھان آپ کی خدمت میں پیش کئے آپ نے اُن پر کوئی توجہ نہ دی اور واپسی کی نیّت سے چل پڑے۔ سُلطان محمد تغلق کا وزیر نظام الدین یہ ساری کارروائی نہایت غصّے اور نفرت سے دیکھ رہا تھا وہ حضرت نظام الدّین اولیا کا مرید، نصیر الدّین کا عقیدت مند اور بادشاہ کا عزیز بھی تھا۔ نصیر الدّین کو واپس جاتے دیکھ کر آگے بڑھا، زرِ سُرخ کے توڑے اور دونوں تھان اٹھا کر خدّام کے حوالے کیے اور آپ کی جوتیوں کو اپنے رومال سے جھاڑ کر اپنے ہاتھوں میں لے کر دو قدم پیچھے ساتھ چلا، بادشاہ یہ ساری کارروائی بہ نظرِ حقارت دیکھ رہا تھا اور اپنے وزیر پر

سخت برہم تھا لیکن خاموش تھا۔ وزیر نے نصیر الدین کو دروازے تک پہنچا کر رخصت چاہی آپ نے دے دی یہ جیسے ہی بادشاہ کے پاس پہنچا، سلطان نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "تو نے اجازت کے بغیر عطیہ سلطانی کو ہاتھ کیوں لگائے؟"

وزیر نے کوئی جواب نہ دیا اور نفرت اور غصے سے پیشانی پر بل پڑ گئے۔

بادشاہ نے ذرا اونچی آواز میں پھر سوال کیا "تو ہماری مملکت کا وزیر ہے تو نے ایک معمولی فقیر کی جوتیاں اپنے رومال سے کیوں جھاڑیں اور کفش برداری کی خدمت کیوں بجا لایا؟"

وزیر نے پھر کوئی جواب نہ دیا لیکن غصے اور نفرت کی سلوٹیں کچھ زیادہ گہری ہو گئیں۔ سلطان اور زیادہ برہم ہو گیا، چیخ کر بولا "تو ہماری مرضی اور اجازت کے بغیر نصیر الدین کو دروازے تک چھوڑنے کیوں گیا؟"

وزیر کے لیئے اب مزید خاموش رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے نہایت دلیری سے جواب دیا "حضور والا! صاف گوئی اور راست بیانی کی گستاخی معاف، اس ملک کے سلطان آپ نہیں، نصیر الدین ہیں، وہ جسے چاہیں سلطان بنا دیں۔ یہ ناچیز حضرت نظام الدین اولیا کا غلام ہے اور میری یہ جان ناتوان ان پر قربان ہے نصیر الدین کی جوتیاں میرے لئے سرمایہ فخر و افتخار ہیں اور اگر میں انہیں تاج بنا کے اپنے سر پر رکھوں تو یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہو گی۔"

بادشاہ کو اس جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن اس کا عملاً اظہار نہ ہوا۔

بادشاہ ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوا تو لشکر کے ساتھ آپ بھی ہو لیے۔ شاہی لشکر میں آپ کی شمولیت ایک پراسرار عمل تھا۔ مستقبل کے دریچے کھلے ہوئے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ٹھٹھہ میں کیا پیش آنے والا ہے۔

ٹھٹھے پہنچ کر شاہی لشکر باغیوں کی سرکوبی ابھی کر بھی نہ سکا تھا کہ سلطان محمد تغلق کا بلاوا آ گیا۔ وہ چل بسا بادشاہ کی بہن خداوندزادہ لشکر میں موجود تھی اس نے اپنے بیٹے کو بادشاہ کا جانشین بنانا چاہا دہلی دور تھا اور وہاں وزارت عظمیٰ، تخت شاہی اور تاج قیصری کے لیئے کسی اور شخص کا انتخاب کر چکی تھی۔ اس افراتفری اور منتشری میں حضرت نصیر الدین بادشاہ کے پینتالیس سالہ چچا زاد بھائی کمال الدین کے پاس

پہنچے ۔ سفید رنگت، درمیانا قد اور مناسب ڈیل ڈول، نہ موٹے، نہ دبلے ناک اونچی اور چوڑے سینے والا یہ شخص فکرمند اور غمگین اپنے خیمے میں منہ لپیٹے پڑا ہوا تھا ۔ نصیر الدین اس کے خیمے میں داخل ہوئے اور آواز دی یہ کمال الدین ! اٹھو، میں ایک ضروری فیصلہ لے کر آیا ہوں اسے سنو اور ۔ مجھے بتاؤ کہ تم اس پر کتنے آمادہ ہو؟

کمال الدین فرط عقیدت سے کھڑا ہو گیا ۔

آپ نے کمال الدین سے کہا ۔ "کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ مخلوق خدا کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آؤ گے؟"

کمال الدین آپکی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا پوچھا " آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟

آپ نے جواب دیا ۔ " اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم بندگان خدا سے اچھا سلوک کرو گے تو میں بھی بارگاہ خداوندی سے تمہاری بادشاہت کی دعا کروں اور اگر تم نفی میں جواب دو گے تو میں کسی دوسرے فرماں روا کو طلب کروں گا "

کمال الدین نے کہا " میں حضور کا خادم ہوں جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کرونگا "

آپ نے ارشاد فرمایا ۔ " کمال الدین ! میں تیرے لئے دہلی سے چل کر ٹھٹھے تک آیا ہوں اگر تو صدق دل سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تو خلق خدا کے ساتھ خلق و مروت سے پیش آئے گا تو میں بھی تیرے لئے خدا سے حکومت طلب کرتا ہوں "

اس کے بعد آپ نے کمال الدین کو انتالیس خرمے پیش کیے اور ارشاد فرمایا " انتالیس سال ۔ حکومت اور تاج و تخت کی امانت انتالیس سال کے لئے تیرے سپرد کی گئی "

یہاں یہ فیصلہ کر دیا گیا دوسری طرف لشکر میں مرحوم بادشاہ کی جانشینی پر گرماگرم بحثیں ہو رہی تھیں اور بادشاہ کی بہن خداوندزادہ نے جملہ خواتین اور امرا کو یہ پیغام بھیجا کہ " میرا بیٹا خسرو ملک لشکر میں موجود ہے اس کی موجودگی میں کسی اور کو فرماں روا بنانا ناجائز اور نامناسب ہے بادشاہ میرا حقیقی بھائی تھا "

خواتین اور امرا کو خداوندزادہ کی بات پر دھیان دینا پڑا لیکن وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہتے تھے ان کے دلوں میں خداوندزادہ کے خلاف گرد کدورت بیٹھ گئی انہوں نے اپنی جماعت میں سے ملک سیف الدین نامی ایک منہ پھٹ اور گستاخ امیر کو

خداوند زادہ کی خدمت میں روانہ کیا اور اس سے کہا کہ تم ہر قیمت پر اسے اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ اپنے بیٹے خسرو ملک کی جانشینی سے باز آجائے۔

ملک سیف الدین ایک سچا اور کھری شخصیت کا انسان تھا فوراً خداوند زادہ کی بارگاہ میں پہنچ گیا اور اس سے سوال کیا "اے عورت! تیرا فرزند لائق جہاں داری نہیں ہے اس سے باز آجا، اگر ہم سب تیری خواہش پوری کردیں تو یقین رکھ کہ مغلوں کے حملوں کو کمال الدین فیروز شاہ کے علاوہ کسی میں بھی روکنے کا دم نہیں ہے"

خداوند زادہ نے کہا "سیف الدین! تم ایک سچے اور صاف گو انسان ہو تم ہی بتاؤ کیا میں نے جو کچھ چاہا ہے غلط چاہا ہے؟" گستاخ صاف گو، امیر نے جواب دیا۔ "عورت! تو ہمارے فیصلے سے اتفاق کر اور کمال الدین فیروز کو فرماں روا تسلیم کرلے اگر نہیں مانے گی تو اس کے نتائج کی تو خود ذمہ دار ہو گی"

خداوند زادہ چپ ہو رہی کیونکہ سیف الدین کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔

امرا اور خوانین تاج شاہی اور لباس خسروی لے کر کمال الدین فیروز کی خدمت میں پہنچے اور اس سے درخواست کی کہ مرحوم بادشاہ کی جانشینی قبول فرمائے۔

کمال الدین فیروز کو ذرا تامل ہوا۔ وہ اتنی بڑی ذمے داری قبول کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ نصیر الدین آگے بڑھے اور حکم دیا "کمال الدین! اب تو فیروز شاہ ہے خواہ مخواہ سوچ میں وقت ضائع نہ کر اور تاج اور لباس شاہی زیب تن فرما"

فیروز شاہ اس وقت ماتمی لباس میں تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے امرا نے درخواست کی کہ اس خوشی کے موقع پر ماتمی لباس اتار دیا جائے لیکن فیروز شاہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور جامۂ ماتمی پر خلعت شاہی زیب تن کی گئی۔ بارگاہ شاہی کے نقیبوں اور چاؤشوں نے مبارک سلامت کی صدائیں بلند کیں اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ فیروز شاہ اسی وقت حرم میں داخل ہوا اور خداوند زادہ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ خداوند زادہ نے فیروز شاہ کو سینے سے لگالیا اور مرحوم بادشاہ کی کلاہ اپنے ہاتھوں سے فیروز شاہ کے سر پر رکھ دی۔

فیروز شاہ ٹھٹھے سے واپس ہوا ابھی وہ ملتان تک ہی پہنچا تھا کہ دہلی سے

وزیراعظم خواجہ جہاں کا فرستادہ ملیح قون پہنچ گیا۔ اس کی گردن میں مرحوم بادشاہ کے فرضی بیٹے کی طرف سے ایک فرمان لٹک رہا تھا اس فرمان میں اسے مرحوم بادشاہ کے بیٹے کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا فیروز شاہ حیران تھا کہ مرحوم بادشاہ کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی پھر یہ بیٹا کہاں سے آگیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر فکرمند ہوگیا کہ یہ ساری عیاری خواجہ جہاں وزیراعظم مملکت تغلقیہ کی ہے۔

فیروز شاہ کے قیاس کی تصدیق دہلی کے فرستادے نے بھی کر دی۔ فیروز شاہ نے مطمئن لہجے میں کہا "کوئی پروا نہیں، جب خدا مہربان ہو تو کوئی بندہ کیا کر سکتا ہے"

اس کے بعد فیروز شاہ نے اپنے خدشات ذکر نصیر الدین سے کیا اور ان سے دعائے طمانیت طلب گار ہوا۔ آپ نے جواب دیا "ہم نے ٹھٹھے میں تجھے بادشاہ بنا دیا تھا دہلی کی بھی فکر کریں گے اداس اور مایوس مت ہو۔"

فیروز شاہ خاموش ہو رہا۔

جب یہ قافلہ ہانسی کے نواح میں پہنچا تو نصیر الدین نے بادشاہ سے کہا "ٹھٹھے سے یہاں تک ہم تجھے بحفاظت لے آئے۔ لیکن یہاں سے قطب الدین منورؒ کی حدود شروع ہو جاتی ہیں اب تو ان سے دعا اور اعانت کا طالب ہو۔"

قطب الدین منور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرید اور ہانسی کے خلیفہ تھے اور نصیر الدین ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

فیروز شاہ ہانسی کے باہر مقیم ہوگیا اور اس نے قطب الدین منور کو ایک خط روانہ کیا اور اس میں لکھا تھا۔

"حضور والا! ناچیز فیروز شاہ کو حضرت نصیر الدین روشن چراغ سے معلوم ہوا ہے کہ یہ علاقہ حضرت قطب الانام شیخ قطب الدین منور ________ کی ولایت میں داخل ہے انہوں نے اس گناہ گار کو آپ کے سپرد فرمایا ہے اب جیسا مناسب ہو اس سے مطلع فرمایا جائے۔"

فوراً ہی اس کا جواب بھی آگیا حضرت قطب الدین منورؒ نے جواب میں لکھا تھا۔

"حضرت شیخ نصیر الدین روشن چراغ نے تجھے اس ضعیف کے حوالے کیا ہے اس لیے مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہی امید ہے دہلی کی بادشاہت تیرے قبضے میں آجائے گی۔"

دہلی میں مرحوم بادشاہ کا وزیر فیروز شاہ سے جنگ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا لیکن عالم یہ تھا کہ ہوا اکھڑی جا رہی تھی سلطنت کے امراء اور خوانین چوری چھپے بھاگ کر فیروز شاہ کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے یہاں تک کہ اس کے قریب ترین ساتھیوں تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا آخر کار ہر طرف سے مایوس ہو کر خواجہ جہاں بھی فیروز شاہ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہو گیا کہ لوہے کی زنجیر اس کے گلے میں پڑی تھی اس نے دستار کی جگہ ٹوپی پہن رکھی تھی اور برہنہ شمشیر گلے میں ڈال رکھی تھی وہ اس حلیے میں فیروز شاہ کے خیمے کے بائیں طرف مؤدبانہ کھڑا ہو گیا - نماز ظہر کے بعد جب خیمہ شاہی کا پردہ اٹھایا گیا تو بادشاہ کی نظر خواجہ جہاں پر پڑی، حیرت سے خدام کو مخاطب کیا "خواجہ جہاں سے دریافت کیا جائے کہ اس نے اپنی گردن میں فولادی زنجیر اور عریاں شمشیر کیوں ڈال رکھی ہے ؟"

خواجہ جہاں نے جواب دیا "حقیر اپنی تقصیر پر نادم اور بادشاہ کی کرم گستری کا منتظر اور امیدوار ہے "

فیروز شاہ نے خدام کو حکم دیا "خواجہ جہاں کے سر پر دستار باندھی جائے اور اس کے لیے شاہی خیمے سے متصل ایک خیمہ نصب کر دیا جائے "

حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور خواجہ جہاں کو اس خیمے میں پہنچا دیا گیا فیروز شاہ خود بھی اس خیمے میں پہنچا اور خواجہ جہاں سے کہا "حضرت روشن چراغ نے اس خاکسار کو تاج و تخت کی بشارت دی تھی اور حضرت قطب الدین منورؒ نے اشاروں کنایوں میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تو دہلی کی فکر کیوں کرتا ہے دہلی تو خود ہی تیری خدمت میں دست بستہ حاضر ہو جائے گی اب آج جب ہم تمہیں اپنے روبرو عاجز اور ناچار دیکھتے ہیں تو حضرت روشن چراغ اور قطب الدینؒ منور کی عزت دوبالا ہو جاتی ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ان حضرات کا دور اور صحبت میسر آئی "

بادشاہ خواجہ جہاں کو معاف کر دینا چاہتا تھا لیکن دربار کی امراء اور خوانین نے بادشاہ کو رحم دلی سے باز رکھا اور خواجہ جہاں کے قتل کا فرمان حاصل کر لیا جس کے نتیجے خواجہ کو قتل کر دیا گیا -

بادشاہ دہلی کے تاج و تخت پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد ہانسی جانے پر آمادہ ہوا روشن چراغ بھی ان کے ہمراہ ہو گئے جب بادشاہ ہانسی میں داخل ہوا قطب الدین منور نماز جمعہ کی غرض سے مسجد تشریف لے جا رہے تھے راستے ہی میں دونوں کی ملاقات ہو گئی - قطب الدین منورؒ اور حضرت نصیر الدینؒ ایک دوسرے کے قدموں میں جھکے جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے پاؤں پکڑ رہے ہوں گے -

لیکن روشن چراغ سے پہلے قطب الدین ان کے قدموں میں جھک چکے تھے پریشان حال بادشاہ اور لشکریوں کو لوگ اسی لیئے تو زیادہ ماننے لگے تھے کہ انہیں وہاں کا تاج وتخت انہی دونوں حضرات کی دعاؤں سے ہاتھ آیا تھا۔

قطب الدینؒ نے بادشاہ سے کہا" فقیر جمعے کی نماز کی نیت سے نکلا تھا کہ بادشاہ کو آتے دیکھ کر حیران ہو گیا یہ ناچیز سوچتا ہے کہ اب گھر کس طرح جایا جائے گا"

فیروز شاہ چپ سادھے کھڑا رہا۔

نصیر الدینؒ چراغ اور قطب الدین منور کی آنکھیں چار ہوئیں ان نظروں میں پتہ نہیں کیا پیام تھا کہ قطب الدینؒ منور سب کچھ سمجھ گئے بادشاہ سے کہا" دعاگو نے سنا ہے کہ بادشاہ کو سے خواری کا بے حد شوق ہے اور اس شغل کی وجہ سے اہل حاجت کی کاربرآری میں رخنہ پڑتا ہے"

بادشاہ نے عاجزانہ عرض کیا" انشاءاللہ آئندہ یہ ناچیز شغل مے کشی سے محفوظ رہے گا"

آپ نے پھر ارشاد فرمایا" دعاگو نے سنا ہے کہ بادشاہ کو صید افگنی کا بھی بہت شوق ہے اپنے شکار کے شوق کے لئے ایک عالم کو پریشان اور سرگرداں رکھنا اچھا مشغلہ نہیں ہے شکار اس حد تک جائز ہے کہ تیری اس سے حاجت پوری ہو جائے"

فیروز شاہ نے عاجزی سے جواب دیا" حضرت شیخ اس ناچیز کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مشغلے سے باز رکھے"

قطب الدین منورؒ نے طنز سے ارشاد فرمایا" سبحان اللہ ہماری دعا کا منکر ہوا کیا تجھے کل کی بات بھی یاد نہیں کہ نصیر الدین اور ہم نے تیرے حق میں کیسی دعائیں کی تھیں تو تو ہماری دعا کا منکر ہے تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ میں نے توبہ کر لی اور آئندہ اس مشغلے سے باز رہوں گا"

بادشاہ نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی اور آہستہ آہستہ توبہ کرنی شروع کر دی۔

حضرت نصیر الدینؒ مسکراتے رہے۔



فیروز شاہ کا وزیر خان جہاں پہلے ہندو تھا اور تلنگانے سے تعلق رکھتا تھا اسلام قبول کر کے حضرت چراغ دہلویؒ کا مرید ہو گیا اور پوچھا" حضرت! یہ عاجز عبادت اور ریاضت کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہے اگر حکم ہو تو دریافت کرے"

آپ نے کہا" پوچھو!

خان جہاں نے کہا "غلام کو کس طرح ریاضت و مجاہدے میں مشغول ہونا چاہیے؟"

آپ نے جواب دیا "خان جہاں! تو وزیر ہے اور یہی تیری عبادت ہے حاجت مندوں کی حاجت براری کرتا رہ، غربا کا خاص خیال رکھ اور دل آزاری سے باز رہ"

خان جہاں نے پھر سوال کیا "اور اوراد و وظائف کی بابت بھی کچھ ارشاد ہو"

آپ نے جواب دیا "اور اد و وظائف بھی یہی ہیں کہ حقوق العباد کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہ اختیار کرنا۔ مسندِ وزارت پر نشست کے دوران بھی اگر وضو ٹوٹ جانے کا احساس ہو جائے تو فوراً اٹھ کھڑے ہونا اور وضو کر کے دوبارہ بیٹھ جانا۔ رات کو جب آنکھ کھلے تو پہلا کام وضو کرنا ہوگا زندگی بھر اس پر کاربند رہ اور پھر دیکھ کہ خدا تیرے لیے کیا کرتا ہے"

خان جہاں زندگی بھر اس نصیحت پر عمل کرتا رہا اور جب اس کا انتقال ہوا تو اسے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے قریب دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت چراغ دہلویؒ کا جب آخری وقت آیا تو آپ کے پاس آپ کے جید مرید بیٹھے تھے ان مریدوں میں حضرت میر سید محمد گیسو دراز بھی شامل ہیں آپ نے وفات سے قبل اپنے مرید شیخ رکن الدین (ہمشیرزادہ چراغ دہلوی) سے فرمایا "رکن الدین! خواجگان چشت کی نعمتوں میں سے جتنا بھی تمہاری قسمت میں تھا دے دیا گیا لیکن خرقہ، کاسۂ چوبیں، تسبیح، نعلین اور عصا میں کسی کو بھی نہ دے سکوں گا"

رکن الدین نے ملول ہو کر جواب دیا "حضرت کی مرضی"

حضرت گیسو دراز کو اس وصیت سے صدمہ پہنچا اور پوچھا "حضرت! گستاخی معاف کیا یہ ناچیز بھی اس سے محروم رکھا جائے گا؟"

آپ نے جواب دیا "میرا خرقہ لے سکتے ہو لیکن اپنے پیر کا خرقہ اور دیگر متبرکات میں نہیں دوں گا"

رکن الدین نے آبدیدہ نظروں سے آپ کو دیکھا اور دریافت کیا "حضور! متبرکات حضرت شیخ المشائخ کے لئے اور کیا ارشاد ہے"

آپ نے جواب دیا "جب تم مجھے قبر میں اتارنا تو کاسہ چوبیں کو سر کے نیچے، خرقہ سینے پر، تسبیح انگلیوں کے نیچے، ایک طرف نعلین اور دوسری طرف عصا رکھ دینا"

بعد وصال وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ ۱۷ اور ۱۸ رمضان کی درمیانی شب اور ۷۵۷ھ (ستمبر ۱۳۵۶ء) کو یہ مہر درخشاں ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اشیائے

متبرکہ کا اپنے ساتھ لے جانا اور کسی مرید کو نہ دینا بہتوں کو شاق گزرا تھا یہاں تک کہ حضرت گیسو دراز نے پیر کی مفارقت اور خرقہ متبرکہ کے نہ ملنے کا اتنا دکھ محسوس کیا کہ دہلی کو فوراً چھوڑ دیا۔ حضرت چراغ دہلوی نے جس چارپائی پر وصال فرمایا تھا اس کا جھلنگا اپنے گلے میں ڈال لیا اور کہا "یہی میرا خرقہ ہے" اور دکن چلے گئے۔

کچھ عرصے بعد حضرت چراغ دہلوی کا ایک ارادت مند آپ کے مزار پر حاضر ہوا اور فاتحہ پڑھ کر دل میں سوال کیا: "حضرت اب تو بتا دیجئے کہ آپ نے اشیائے متبرکہ اپنے مریدوں میں سے کسی کو کیوں نہ مرحمت فرمائیں؟"

جب یہ ارادت مند رات کو سو گیا تو حضرت چراغ دہلویؒ نے خواب میں جواب دیا: "تیرا یہ خیال درست ہے کہ میرے بعض مرید صاحبِ کرامت ہیں اور مقامات بلند رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان سب کے دلوں میں تعصبات کی رمقیں پھر بھی پائی جاتی ہیں جس دل میں تعصب ہو وہ کس طرح اس مقدس امانت کا حقدار ٹھیر سکتا ہے" پھر آپ نے مزید فرمایا "لیکن بعض مریدوں کو میں نے اپنا خرقہ ضرور دیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ انشاأللہ سلسلہ پیرانِ چشت ان سے جاری رہے گا۔"

شاہجہان آباد سے چھ کوس پر جنوب میں یہ ذات بابرکات ابدی خوابگاہ میں محو استراحت ہے وہ ذات جیسے حضرت نظام الدین اولیاؒ نے روشن چراغ دہلیؒ کا لقب مرحمت فرمایا تھا۔ آپ کی درگاہ کا گنبد فیروز شاہ نے آپ کی زندگی ہی میں تعمیر کرا دیا تھا اور درگاہ کا دروازہ بارہ برس بعد فیروز شاہ ہی نے تعمیر کرایا۔ بارہ دری والے اس گنبد میں سنگِ خارا کے ستون بنائے گئے ہیں اور جملہ دروں میں سنگِ سرخ کی جالیاں لگائی گئیں۔ گنبد پر سنہری کلس آج بھی سورج کی روشنی میں اس طرح چمکتا ہے جیسے روشن چراغ دہلویؒ اس کلس میں منعکس ہو کر قرب و جوار کو منور کر رہے ہیں۔



حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ

پانی پت میں ایک عثمانی خاندان رہتا تھا خاندان کے بزرگ کا نام محمود تھا ان کی اولادیں تو کئی تھیں لیکن محمد نامی بچے کی بات ہی کچھ اور تھی ان کے آس پاس رہنے والوں نے اس بچے کے سلسلے میں یہ عجیب بات محسوس کی کہ اس عہد کے مشہور بزرگ بوعلی شاہ قلندر ہر روز اس گھر میں حاضری دیتے محمد کو دیکھتے ان سے پیار محبت کی باتیں کرتے اور واپس تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ محمد ذرا سن شعور کو پہنچے تو خود بھی اِدھر اُدھر جانا شروع کر دیا ان کی عدم موجودگی میں بوعلی شاہ قلندر تشریف لاتے تو اس وقت تک واپس نہ جاتے جب تک محمد سے ملاقات نہ ہو جاتی ایک ایسے ہی موقع پر جب بوعلی شاہ قلندر محمد کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا، محمد اپنی زمینوں پر گئے ہوئے ہیں یہ زمینیں وہاں سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھیں۔ بوعلی شاہ قلندر جس گھوڑے پر تشریف لائے تھے اس کا رخ موڑ دیا اور اس خاندان کے مزرعہ پر روانہ ہو گئے محمد نے انہیں دور سے ہی آتے ہوئے دیکھ لیا۔ انہوں نے بہت سارا غلہ ایک تھیلی میں بھر لیا اور اسے لیکر استقبال کی نیت سے آگے بڑھے جب یہ ذرا قریب پہنچے تو بوعلی شاہ قلندر نے مسکرا کر دریافت کیا "محمد اس تھیلی میں کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "غلہ"

بوعلی شاہ نے دریافت کیا "اسے لے کر ہمارے پاس آنے کا مقصد؟"

انہوں نے جواب دیا "آپ پہلے تو اس ناچیز کے گھر تشریف لے گئے ہوں گے اس کے بعد یہاں تشریف لائے ظاہر ہے اس سفر میں گھوڑا بھوکا ہو گیا ہو گا یہ غلہ اس کی بھوک مٹانے کی غرض سے لے کر حاضر ہوا ہوں"

بوعلی شاہ اب بھی مسکرا رہے تھے بولے "سعادت مند بچے! خدا تجھے صاحب کمال کرے کہ تو نے ہمارے جانور کا اتنا خیال رکھا لیکن دانہ کھلانے سے پہلے گھوڑے سے تو پوچھ لے کہ یہ بھوکا بھی ہے یا نہیں"

انہیں جانور سے اس قسم کا سوال کرنے میں تامل ہوا تو بوعلی شاہ نے فرمایا "سوچتا کیا ہے گھوڑے سے سوال کر یہ تجھے جواب دیگا"

محمد نے مذبذب انداز میں سوال کیا "مویشی! کیا تم بھوکے ہو؟"

گھوڑے نے نفی میں گردن ہلادی۔ محمد نے تعجب سے دوبارہ سوال کیا "کیا تم نے میرے سوال کے جواب میں گردن ہلائی تھی؟"

گھوڑے نے اثبات میں گردن ہلادی انہوں نے پھر پوچھا "کیا تم بھوکے ہو؟"

گھوڑے نے پھر نفی میں گردن ہلادی۔ بوعلی شاہ نے کہا "محمد تو حیرت نہ کر، گھوڑا تیرے سوالوں کا جواب دے رہا ہے، خواہ مخواہ گردن نہیں ہلا رہا۔"

بچے نے کہا "لیکن میں غلہ گھوڑے کے لئے لایا تھا اب میں اس کا کیا کروں؟"

بوعلی شاہ نے جواب دیا "ہم نے یہ غلہ تجھے بخشا۔ خدا تجھے طویل عمر عطا فرمائے اور اسی طرح کثیر اولادوں سے نوازے۔"

اس واقعے کو ایک عرصہ گزر گیا محمد نے جوانی میں قدم رکھا وہ اپنی زمینوں کا گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر دورہ کرتے طبیعت کی بردباری اور سنجیدگی لوگوں کو مرعوب رکھنے لگی تھی اس دن سورج طلوع ہوئے صرف دو ساعتیں گزری تھیں نوجوان محمد نے گھوڑے پر زین کسی اور رکاب میں پیر رکھ کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئے وہ اپنی زمینوں پر جا رہے تھے ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بوعلی شاہ بیٹھے تھے انہوں نے نوجوان محمد کو دیکھتے ہی فرمایا "یہ کیا گھوڑا ہے اور کیسا اس کا سوار ہے۔"

ان لفظوں نے نوجوان محمد کے سینے میں ایک آگ سی لگادی وہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور جوش میں اپنا گریبان چاک کر ڈالا، گھوڑا کہیں گیا اور خود کہیں گئے۔ سالہا سال جنگلوں میں خاک چھانتے رہے مدتوں بعد جب ذرا ہوش آیا تو انہوں نے شہر کا رخ کیا۔ جنگل میں انہیں کچھ اور فقیر بھی ملے ان کے ساتھ انہوں نے بھی شہر کا رخ کیا۔ جنگل سے قریب ترین شہر ہانسی تھا۔ یہ ہانسی میں داخل ہو گئے اس وقت ہانسی کے مشہور بزرگ شیخ جمال بقید حیات تھے یہ وہی شیخ جمال ہیں جن کا سلسلہ حضرت بابا فرید نے فرمان پھاڑ دینے کی وجہ سے چاک کر دیا تھا۔ شیخ جمال ہانسوی کو ایک غیب کی آواز نے بشارت دی "اے شیخ جمال! ہوشیار، شیخ محمد جو عنقریب شیخ جلال کبیر الاولیا کہلائیں گے ہانسی میں آ رہے ہیں ان کی خدمت میں حاضری دے کر ان سے درخواست کرو کہ وہ خدا سے دعا کریں کہ تمہارے سلسلے کو بحال کر دیں۔"

شیخ جمال نے اپنے کئی خادم شہر کی مختلف سمتوں میں روانہ کر دیئے اور انہیں حکم دیا کہ اس دوران جو درویش بھی شہر میں داخل ہوں انہیں احترام کے ساتھ شیخ جمال کے پاس پہنچا دیا جائے۔

خادموں نے نوارد فقراء کو روک لیا اور انہیں اپنے شیخ کی خدمت میں لے آئے۔ شیخ جمال دروازے پر کھڑے نہایت بے چینی سے ان فقراء کے منتظر تھے انہوں نے ہر درویش کو نہایت غور

سے دیکھا اور ان میں شیخ محمد کو تلاش کرتے رہے ۔ آنکھوں کے ساتھ ہی وہ قوت شامہ سے بھی کام لے رہے تھے ان بصارت اور شامہ نے انہیں مایوس کر دیا ۔ فقراء سے پوچھا " اے درویشو! میں تم سب سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنی مجموعی تعداد میں حاضر ہوئے ہو یا ابھی تم میں کا کوئی شخص باقی ہے؟"

ایک عمر رسیدہ درویش نے جواب دیا " ایک نوجوان کے سوا سبھی یہاں آ گئے ہیں ۔ کیوں، کیا بات ہے؟"

شیخ جمال نے افسوس سے سر پکڑ لیا بولے " وہ نوجوان کہاں ہے؟"

عمر رسیدہ درویش نے جواب دیا " ہم سب نے اپنے سامان کی نگہداشت اور نگرانی کے لیے اس نوجوان کو سرائے میں چھوڑ دیا ہے ۔"

شیخ جمال نے کہا " درویشو ! افسوس کہ ہم نے جس شخص کی وجہ سے تم سب کو بلایا وہی نہیں آیا ۔"

اس کے بعد شیخ جمال نے درویشوں کی ایک شاندار ضیافت کی ، جب یہ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو گئے تو شیخ جمال نے ان سب کو مخاطب کیا " حضرات ! اب آپ میں سے کوئی ایک شخص اس نوجوان کی خدمت میں جائے اور اسے عزت و احترام سے لے آئے ۔"

ایک درویش نے اس درخواست پر عمل کیا اور شیخ محمد کو اپنے ہمراہ لے آیا ۔ شیخ جمال نے اس نوجوان کی شاندار پذیرائی کی اور صدر محفل میں بٹھایا درویشوں کو رخصت کر کے شیخ محمد کو کھانا کھلایا اور آخر میں علاء الدین صابر کلیریؒ کا پورا واقعہ سنا کے گزارش کی " حضرت ! حضرت صابر نے جوش میں یہ کہہ دیا تھا کہ میں تمہارا سلسلہ چاک کرتا ہوں ، اس کے بعد بابا فرید گنج شکرؒ نے مجھے بشارت دی تھی کہ ایک درویش کی دعا سے یہ سلسلہ پھر بحال ہو جائے گا اور وہ شخص جس سے میرا سلسلہ جاری ہو گا از روئے کشف مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ آپ کی ذات بابرکات ہے خدا کیلئے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائیے اور میرا سلسلہ جاری فرمائیے ۔"

شیخ محمد نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور جمال ہانسوی کے سلسلے کو دوبارہ جاری کرنے کیلئے خدا سے دعا کرتے رہے ۔

یہ جب دوبارہ اپنے ساتھیوں میں واپس پہنچے تو درویشوں نے ان کی بڑی عزت کی ۔ اس بار درویشوں نے اپنا سامان بھی ان کے سر یا کاندھوں پر نہیں رکھا لیکن شیخ محمد نہیں مانے اور انہوں نے اپنی سابقہ خدمات انجام دینے پر اصرار کیا ۔ درویشوں نے نہایت معمولی اور ہلکا سامان ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا " نوجوان ! اگر تم بضد ہی ہو تو اسے اپنے کاندھے پر رکھ لو ۔"

شیخ محمد نے اس سامان کو اپنے کاندھے پر رکھ لیا ۔ درویشوں کو راستے میں یہ کیفیت دیکھ کر

بڑی حیرت ہوئی کہ شیخ محمد کا کاندھا بالکل خالی ہے اور ان کا سامان کاندھے سے ایک یا دو بالشت اوپر ہوا میں معلق ہے درویشوں کو اپنی لاعلمی اور کم آگہی پر بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے شیخ محمد کے قدموں میں گر کر ان سے معافی مانگی۔

یہ لوگ ابھی چند ہی کوس گئے ہوں گے کہ ایک ہانپتا کانپتا آدمی ان کے پاس پہنچا اور شیخ محمد کا راستہ روک کر کہنے لگا "شیخ! مجھے شیخ جمال ہانسوی نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، براہِ کرم واپس تشریف لے چلیں"۔

شیخ محمد نے جانے سے انکار کر دیا لیکن جمال ہانسوی کا خادم انہیں اپنے ساتھ لے جا کے رہا۔ جب یہ شیخ جمال کی خدمت میں دوبارہ پہنچے تو انہوں نے کہا "شیخ محمد! تم اللہ کے محبوب ہو اور خدا نے تم میں بہت سارے کمالات ودیعت فرمائے ہیں تمہارا اس طرح مارا مارا پھرنا خدا کو پسند نہیں ہے تم اپنے وطن واپس جاؤ"۔

شیخ محمد نے رقت زدہ آواز میں عرض کیا "بزرگ شیخ! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی خوشی سے مارا مارا پھر رہا ہوں؟ ایسا نہیں ہے، میرے سینے میں ایک بھٹی جل رہی ہے اور تلوؤں میں آگ دہک رہی ہے جس نے مجھے اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھگائے پھرتی ہے اور ابھی تک میں اس بزرگ ہستی سے محروم ہوں جو میرے پیروں میں اطاعت و مریدی کی زنجیریں ڈال کے ٹھہراؤ پیدا کرے گا"۔

شیخ جمال نے جواب دیا "عزیزم! تم اپنے گھر پانی پت واپس جاؤ اور ان بزرگ کا وہیں انتظار کرو۔ اُن صاحب کی بہت جلد تم سے ملاقات ہو جائے گی اور وہ تمہیں تمہاری منزلِ مراد تک پہنچا دیں گے تم مطمئن رہو"۔

شیخ جمال کے ارشاد پر پانی پت چلے گئے اور وہیں کچھ عرصے بعد ان کی ملاقات شمس الدین ترک پانی پتی سے ہو گئی۔ شیخ محمد ان کی مریدی میں چلے گئے انہوں نے ان کا نام شیخ جلال الدین رکھ دیا

شیخ جلال نے ایک بار پھر سفر اختیار کیا اور اس بار انہوں نے پورب کا رُخ کیا قریب شام ایک ایسے گاؤں میں داخل ہوئے جہاں افراتفری مچی ہوئی تھی لوگ اپنا سامان سمیٹ کے بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے باربردار مویشیوں کی پیٹھ پر بندھا ہوا سامان رکھا تھا اور عورتوں و بچوں میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس گاؤں میں کسی خونخوار دشمن کا حملہ ہونے والا ہے اور لوگ اپنے جان و مال کی حفاظت کی خاطر ہجرت کر رہے ہیں۔ شام قریب ہونے کی وجہ سے شیخ جلال کو اسی گاؤں میں قیام کرنا تھا انہوں نے لوگوں سے اس افراتفری کا سبب جاننا چاہا لیکن انہوں نے ان کے ہر سوال کا بے رخی سے جواب دیا۔ شیخ جلال ایک سرکش گھوڑے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کے

سوار سے پوچھا "تم لوگ آخر یہاں سے بھاگ کیوں رہے ہو؟"

نوجوان نے گھوڑے کی راس کھینچ لی اور جلدی جلدی غصے میں بولا "اے اجنبی! تم میرا راستہ مت روکو، ورنہ میں تمہیں کچلتا ہوا نکل جاؤں گا۔"

شیخ جلال نے ناگواری سے کہا "ایسی بھی کیا گھبراہٹ، اگر تم مجھے کچل کے جا سکتے ہو تو ضرور ایسا کرو۔"

نوجوان سوار نے ایک بار پھر تنبیہہ کی "یہ آخری بار، میرا راستہ چھوڑ دو اور میرا وقت نہ برباد کرو۔"

شیخ جلال نے کہا "تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ آخر تم لوگ گاؤں خالی کر کے کیوں بھاگ رہے ہو؟"

نوجوان سوار نے غصے میں کہا "تم حاکم علاقہ کے جاسوس معلوم ہوتے ہو جو شاید اس گاؤں میں بھیجا ہی اسی لئے گیا ہے کہ ہمیں باتوں میں الجھا کے اس وقت تک روکے رکھے جب تک کہ اس کے خونخوار سپاہی یہاں نہ پہنچ جائیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں" شیخ جلال نے جواب دیا "نوجوان! میں تمہارا مخلص ہوں اور اگر تم لوگ اپنی پریشانی سے مجھے مطلع کر دو گے تو شاید ممکن ہو جائے کہ میں اسے دور کر دوں اور تمہیں یہاں سے بھاگنا نہ پڑے۔"

نوجوان نے غصے میں گھوڑے کے پیٹ پر گدگدی کی اور راس ڈھیل چھوڑ کے ایڑ لگاتا ہوا بولا "تم یوں نہیں مانو گے۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میرا گھوڑا تمہیں کچل دے۔"

اس کے بعد اس نے گھوڑے کو دو دو کر ایڑ لگائی اور اسے بھگانے کی بار بار کوشش کی لیکن وہ تو زمین سے چپک کر رہ گیا تھا۔ شیخ نے مسکراتے ہوئے لاپرواہی سے فرمایا "نہیں دیتے میرے سوال کے جواب تو نہ دو، جاؤ، میں بھی تم سے کچھ نہیں پوچھتا، جاؤ۔ مجھے کچلتے ہوئے بھاگ جاؤ۔"

نوجوان سوار کی بوکھلاہٹ اور پریشانی قابل دید تھی وہ ذرا سی دیر میں پسینے پسینے ہو گیا اور شیخ جلال نے بے نیازی سے اپنی راہ لی۔ سوار نے انہیں جاتے جو دیکھا تو گھوڑے کی پشت سے پھاند کر ان کی طرف دوڑا اور بھاگ کے ان کے قدموں میں گر گیا بولا "حضرت! میں اپنی گستاخی پر نادم ہوں آپ ہیں کون؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "اب میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہارے سوالوں کا جواب دوں۔"

سوار نے شیخ کے پاؤں پکڑ لیے، بولا "میں اس وقت تک آپ کے پاؤں نہ چھوڑوں گا جب تک آپ مجھے معاف نہ فرما دیں گے، حضرت میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔"

آپ نے جواب دیا " جاؤ گاؤں چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔ ورنہ حاکم علاقہ کے سپاہی کل صبح صبح نازل ہو جائیں گے اور تمہارا سامان چھین کر لے جائیں گے "

سوار نے آنسو بہاتے ہوئے کہا " حضرت غلطی ہو گئی معاف فرما دیں "

شیخ جلال نے غصے میں کہا " —— نادانو! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگا نہیں جا سکتا، وہ تمہیں ہر جگہ پکڑ سکتی ہے اگر تم میں اتنی طاقت اور اتنا اختیار ہے کہ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ جاؤ تو تم یہاں اس گاؤں میں ایک لمحے بھی نہ رکو، اسی وقت بھاگ جاؤ، ابھی بھاگ جاؤ"

سوار نے بے بسی سے کہا " بھاگ کیسے جاؤں حضرت میرا گھوڑا تو زمین میں اس طرح گڑ گیا ہے جیسے کوئی میخ، میں گھوڑے کے بغیر کیسے بھاگ سکتا ہوں "

" یوں ہی پیدل بھاگ جاؤ، خدا نے تمہیں بھی تو دو پیر دیے ہیں ان سے دوڑ کر گاؤں سے کہیں دور چلے جاؤ "

سوار نے آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور روتا ہوا بولا " اب میں یہ پاؤں نہیں چھوڑوں گا آپ مجھے اپنی ٹھوکروں کی ضربات سے ہلاک کر دیں "

یہ تماشا دیکھنے کے لئے گاؤں کے دوسرے لوگ بھی آ گئے اور انہیں جب اس نوجوان کی زبانی سارا واقعہ معلوم ہوا تو ان میں ایک عمر رسیدہ اور چھدری داڑھی والا ذرا آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

" نوجوانی میں، میں بھی بہت بدعقیدہ تھا لیکن جب تجربات اور عقل کی گھنیری چھاؤں میں بیٹھ کر ذرا ستایا تو پتہ چلا کہ جوانی کی سرکشی اور تعجیل پسندی نے مجھے اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ میں حقائق دیکھ سکتا۔ "

پھر نوجوان کو گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ڈانٹتا ہوا بولا " تو نے ان کی شان میں کون سی گستاخی کی تھی جس پر تو پچھتا رہا ہے "

نوجوان نے جواب دیا " میں نے آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دیے اور آپ کو کچل کر جانے کی دھمکی دی تھی جس کی مجھے یہ سزا ملی کہ میں یہ گاؤں چھوڑنے سے معذور ہو گیا ہوں اور میرا گھوڑا زمین میں میخ کی طرح گڑ کے کھڑا رہ گیا ہے "

بوڑھے نے شیخ جلال کی خوشامد کی، اپنی سفید داڑھی مٹھی میں پکڑتا ہوا بولا " حضرت! اس سنتِ رسول کا واسطہ، اس نوجوان کو معاف فرما دیں، یہ نادان ہے اور نہیں سمجھا کہ آپ کا مرتبہ کیا ہے "

آپ نے کہا " میں نے اسے سزا ہی کون سی دی ہے جو معاف کر دوں، بس اتنا ہی تو کیا ہے کہ اسے تقدیرِ الٰہی سے بھاگنے نہیں دیا "

بوڑھے نے کہا "بجا ارشاد لیکن اب میں مناس کی طرف سے بلکہ پورے گاؤں کی طرف سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں کا کوئی فرد بھی آپ کی مرضی اور حکم کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے گا آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا "

آپ نے نرمی سے کہا "تم لوگ جس ڈر سے گاؤں خالی کر رہے ہو کیا خیال ہے، بھاگ کر تم اس آفت سے بچ جاؤ گے؟ حاکم علاقہ تم سب کا دُور تک پیچھا کر سکتا ہے۔"

بوڑھے نے پورے گاؤں کی نمائندگی کی بولا "حضرت! آپ سے کیا چھپانا، آپ بتائے بغیر ہی سب کچھ جانتے ہیں پھر بھی یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا دکھڑا آپ کے سامنے بیان کریں اور آپ سے داد رس ہوں" پھر ذرا دم لینے کے لئے رکا اور گاؤں کے دوسرے آدمیوں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کے کہنے لگا۔

"شاہ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ اس علاقے کا حاکم ہم سے مال و اموال کا طالب ہے بادشاہ نے کسی جنگ کے مصارف کی خاطر اس حاکم سے کچھ رقم طلب کی ہے اور حاکم علاقہ وہ رقم خود دینے کے بجائے ہم سب سے وصول کر کے دینا چاہتا ہے اور ہم سب عاجز آ کے یہاں سے راہ فرار اس لئے اختیار کر رہے ہیں کہ کل پرسوں جب حاکم علاقہ کے سپاہی یہاں آئیں تو یہ گاؤں انہیں خالی ملے اور ہم لوگ اپنا معمولی سامان ان ظالموں سے بچا لینے میں کامیاب ہو جائیں۔"

شیخ جلال نے جواب دیا "لیکن فرار ہونے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ معاملہ بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے، اس سے بھاگ کے تم کہاں جا سکتے ہو۔"

بوڑھے نے بے بسی سے کہا "آدمی اپنی عقل اور اختیار کی حد تک کوشش تو کرتا ہی ہے۔"

"ہاں کرتا ہے لیکن انسان کو ایسی تدبیر نہیں اختیار کرنی چاہیے جس میں انجام کار اسے شرمندگی اختیار کرنی پڑے۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" بوڑھے نے سوال کیا۔

شیخ جلال نے کہا "ہمارے پاس ایک تدبیر ہے اور وہ یہ ہے کہ حاکم علاقہ کو مطلوبہ مال یا اتنی ہی قیمت کی رقم ملنی چاہیئے۔"

بوڑھے نے مایوسی سے گردن جھکا لی اور آہستہ سے کہا "یہ ایسی ترکیب ہے جو ہم بھی جانتے تھے۔"

شیخ جلال نے کہا "اپنے گاؤں کے سردار کو بلاؤ۔ بقیہ باتیں اسی سے ہوں گی۔"

ذرا سی دیر میں گاؤں کا ادھیڑ عمر گٹھے ہوئے جسم کا سردار بھی دھوتی باندھے سر پر پگڑی رکھے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کے مضبوط اور وزنی ہرے والی لاٹھی تھی۔ سردار شیخ جلال

کی پرعظمت اور اہل کرامت شخصیت سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ آتے ہی سرداری کے طنطنے سے پوچھا "شاہ جی مجھ سے کوئی کام ؟"

شیخ جلال نے نرمی سے کہا "ہاں تجھ سے چند باتیں کرنا ہیں۔ تو پہلے اپنے دماغ سے سرداری کا طنطنہ نکال دے اس کے بعد ہم سے بات کر۔"

شیخ جلال کے تو تکار کے لہجے سے گاؤں کے سردار کی انا کو بڑا دھکا لگا لیکن مصلحت اندیشی نے اسے مشتعل نہیں ہونے دیا۔ انکسار سے بولا "شاہ جی! اگر میں نے بات چیت میں کوئی غلطی کی ہے تو اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

شیخ جلال نے کہا "اگر کسی طرح تمہیں اتنی دولت مل جائے کہ حاکم علاقہ کو دے کے گاؤں والوں کی جان بچالو تو کیسا رہے گا ؟"

سردار نے خوش ہوتے ہوئے کہا "اگر کسی طرح ایسا ہو جائے تو پھر مزہ ہی نہ آجائے۔"

آپ نے کہا "ہم تمہیں اتنی دولت ضرور دیں گے کہ تم حاکم علاقہ کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤ۔"

سردار کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ امید اور ناامیدی میں مبتلا ہو کے آہستہ سے کہا "ایسی کوئی امید نہیں لیکن آپ شاید اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ آپ کی دعا کے طفیل ہی کچھ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ یوں کوئی امید نہیں۔"

آپ نے جواب دیا "سردار! تم یہ گاؤں ہمارے حوالے کر دو اور ہمیں یہاں کا مالک و مختار بنا دو۔ تم لوگ اپنا اپنا سامان اپنے اپنے گھروں میں لے جا کے بند ہو کے بیٹھ جاؤ لیکن ایسا کرنے سے پہلے تم لوگ ہمیں رہنے کی ایک جگہ دے دو اور تمہارے پاس لوہے کے جتنے بیکار آلات و اوزار ہیں انہیں ہمارے پاس رکھوا دو۔"

سردار کے حکم پر گاؤں والوں نے شیخ جلال کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور ذرا سی دیر میں لوہے کے سامان کا شیخ جلال کی اقامت گاہ کے سامنے ڈھیر لگ گیا۔ انہوں نے سب کے سامنے لوہے کے سامان کے چاروں طرف لکڑیوں کا انبار لگوا کے اس میں آگ لگوا دی اور گاؤں والوں کو حکم دیا کہ "جاؤ اپنے اپنے گھروں میں جا کے کل صبح تک کے لیئے بند ہو جاؤ۔"

شیخ جلال کی یہ باتیں گاؤں والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں وہ ان کے حکم پر اپنے اپنے گھروں میں جا کے بند ہو رہے۔ ان کی پوری رات نہایت کرب و اضطراب میں گزری اور صبح سویرے ہی شیخ جلال کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لوگوں نے گھر میں گھس کر دیر تک انہیں تلاش کیا

لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا وہ کہیں جا چکے تھے ۔

گاؤں کے سردار نے غصے میں کہا "یہ شاہ صاحب تو بہروپیے ہی نکلے کیسا شعبدے باز تھا یہ شخص کیسا دھوکا دے گیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا ان باتوں سے مقصد کیا تھا؟"

یہاں وہ بوڑھا بھی موجود تھا جس نے شیخ جلال سے لجاجت اور انکسار سے باتیں کی تھیں بولا " سردار! وقت سے پہلے ہی تم ان کے لئے ایسی باتیں مت کرو ، میں نے انہیں پہچان لیا تھا ، وہ مستجاب الدعوات تھے ، انہیں تلاش کرو وہ یہیں کہیں ہوں گے ۔"

سردار نے ہنستے ہوئے کہا وہ زمین کے اندر سما گئے ہوں تو اور بات ہے ورنہ گھر کے اندر تو وہ کہیں موجود نہیں ۔"

بوڑھے نے کہا "انہوں نے لوہے کے سامان کو آگ کیوں لگوائی تھی ؟ اس کا کوئی تو مطلب ہو گا ۔"

سردار پھر ہنسا ۔ بولا " بڑے میاں عمر کے ساتھ ساتھ تمہاری عقل بھی رخصت ہوتی جا رہی ہے کہ تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ ان شاہ صاحب کو اپنی لاف وگزاف پر پردہ ڈالنے کے لئے کسی شعبدے کا انتظام تو کرنا ہی تھا ، چنانچہ لوہے کا سامان جمع کر کے اس کے آس پاس لکڑیوں کا الم غلم لگا کے اس میں آگ لگا کے وہ شعبدہ دکھایا جس سے تم لوگ سوچتے ہی رہ جاؤ اور شاہ صاحب تمہیں گھروں میں بند چھوڑ کے اپنی راہ لیں ۔"

بوڑھا لاجواب ہو رہا تھا پھر بھی بولا "چلو اپنا اپنا لوہے کا سامان تو اٹھا لیں چل کر ، اب تو جو ہونا تھا ہو ہی چکا ۔"

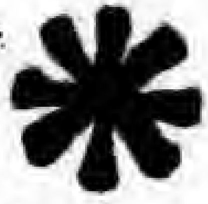
سردار نے کہا ، " وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن ذرا سی دیر میں حاکم علاقہ کے سپاہی پہنچنے والے ہیں ان کے لئے کیا سوچا جائے ؟"

بوڑھا مسلسل لاجواب ہوتا جا رہا تھا وہ اکیلا ہی راکھ کے ڈھیر کو کریدنے چلا گیا جسے کل شاہ صاحب نے سلگایا جلایا تھا اس نے اس میں سے لوہے کا سامان نکالنا شروع کیا اور اس وقت تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اس نے لوہے کی جگہ سنہرے سامان کا ڈھیر لگا ہوا دیکھا اس نے دور ہی سے سردار کو آواز دی " سردار ! یہاں آؤ میرے پاس یہاں آ کے شاہ صاحب کا کمال دیکھو ۔"

سردار آہستہ آہستہ چل کے بوڑھے کے پاس پہنچ گیا بوڑھے نے ایک پھکنی سردار کی طرف بڑھا دی بولا " سردار ! لوہے کا سامان سونے کا بن چکا ہے بولو تمہیں کتنی دولت چاہئے یہاں تو ہر طرف سونے کا ڈھیر لگا ہوا ہے تم ان شاہ صاحب کا ابھی تھوڑی دیر پہلے مذاق اڑا

رہے تھے بولو اب ان کے لئے کیا کہتے ہو؟"

سردار نے شرمندہ ہو کے اپنی گردن جھکالی۔



سالہاسال کی سیر و سیاحت کے بعد جب یہ اپنے وطن واپس پہنچے تو ان کے پیر و مرشد خواجہ شمس الدین ترک نے ان سے کہا: "شیخ جلال اب تمہیں شادی کرلینی چاہیئے"۔

شیخ جلال نے خاکساری اور عاجزی سے جواب دیا: "میں نے اپنے دل میں یہ طے کر رکھا ہے کہ زندگی بھر شادی نہ کروں گا"۔

شمس الدین نے کہا: "ہمیں تمہاری محبت کا یقین ہے اور ہم تمہیں اپنا فرزند سمجھتے ہیں تم نے عبادت و ریاضت میں جتنی مشقت برداشت کی ہے ہمیں اس کا بھی اعتراف ہے لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کل قیامت میں جب تمہارا رسول اللہ ﷺ سے سامنا ہو تو تمہیں ان کے سامنے یہ شرمندگی اٹھانی پڑے گی کہ تم نے ان کی ایک سنت پر عمل نہیں کیا"۔

شیخ جلال نے شرمندگی سے کہا: "آپ کا ارشاد بجا ہے لیکن میں اس بات سے بھی خوفزدہ رہتا ہوں کہ میں اپنی نالائق اولاد کے اعمال سے قیامت کے دن رسول اللہ کی طرف میں شرمندگی نہ اٹھاؤں۔"

شمس الدین ترک نے جواب دیا: "تم اس طرف سے بے فکر رہو میں وعدہ کرتا ہوں کہ نیک اولاد تمہارے نام سے اور بد میرے نام سے منسوب ہوگی اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اولاد پر جب بھی برا وقت پڑے گا، میں اس کی مدد کروں گا۔ میں نے تمہاری لوح محفوظ دیکھ لی ہے اس کی رو سے اس دنیا میں جتنی تمہاری اولاد پھیلے گی، دوسرا اس کا شمار بھی نہ کر سکے گا"۔

شیخ جلال نے کہا: "اس لوح محفوظ کا مجھے بھی مشاہدہ کرا دیجئے"۔

شمس الدین ترک نے اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین شیخ جلال کی طرف بڑھا دی اور کہا "لو اس میں جھانک کے دیکھ لو"۔

شیخ جلال نے اس آستین میں جو جھانکا تو وہاں لوح محفوظ میں بے شمار اولادیں دکھائی دیں انہوں نے ہاتھ بڑھا کے اس لوح کو مٹا دینا چاہا لیکن شمس الدین ترک نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: "جلال! یہ کیا کرتے ہو؟ کیا تم مشیت ایزدی میں دخل دینے کی گستاخی کے مرتکب ہونا چاہتے ہو؟"

شیخ جلال نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور معذرت چاہی۔

شمس الدین نے پوچھا " ہاں تو تم نے اپنی شادی کی بابت کیا فیصلہ کیا ؟"

شیخ جلال نے سر جھکا کے عرض کیا " آپ کے حکم پر سر جھکاتا ہوں "

شمس الدین نے کہا " شادی سے پہلے کوئی شرط ؟"

" ہاں ہے " شیخ جلال نے کہا " میں ایک ایسی لڑکی یا عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بہری بھی ہو، گونگی بھی ہو، اندھی بھی ہو اور ساتھ ہی بھولی بھالی بھی ہو "

شمس الدین نے مسکرا کر کہا " میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ شرط کیوں لگائی تم یہ سمجھتے ہو کہ نہ اس قسم کی کوئی عورت ملے گی اور نہ تم شادی کرو گے۔ کیوں ہے نا یہی بات ؟"

شیخ جلال نے مسکرا کے سر جھکا لیا۔ شمس الدین نے کہا " لیکن میں تمہیں ایک ایسی ہی عورت تلاش کر دوں گا "

شمس الدین ترک نے اپنے مریدوں کو ایسی عورت کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ یہ لوگ اپنے پیرو مرشد کی رہنمائی میں ایسی عورت کو تلاش کرتے ہوئے کرنال پہنچ گئے وہاں کے شیخ زادوں میں ایک ایسی ہی پاکباز خاتون موجود تھیں۔ مریدوں نے معلومات حاصل کر کے اپنے پیر و مرشد کو مطلع کیا اور شمس الدین ترک، شیخ جلال الدین کو لے کر وہاں پہنچ گئے شادی میں دشواری ہی کیا تھی شمس الدین نے گفتگو چھیڑی اور لڑکی والوں نے ہاں کر دی، یہیں نہایت سادہ طریقے سے ان کی شادی ہو گئی یہ لوگ دلہن کو رخصت کر کے وطن پانی پت لے آئے۔

رات کو جب میاں بیوی یک جا ہوئے تو شیخ جلال اپنی اندھی، بہری اور گونگی بیوی کو دیر تک دیکھتے رہے بیوی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کا عظیم شوہر اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس کی زندگی میں ایک حیرت انگیز انقلاب لانے کا ارادہ کر چکا ہے شیخ جلال آہستہ آہستہ چل کے دلہن کے قریب پہنچ گئے اور بیوی سے کہا " کیا تم جانتی ہو کہ میں اس وقت نماز پڑھتا ہوں ؟"

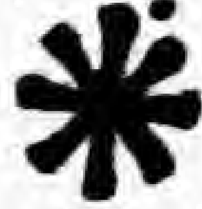
بہری اور گونگی دلہن اس کا کیا جواب دیتی۔

آپ نے بیوی کو حکم دیا " میں وضو کروں گا میرے لئے پانی لاؤ "

دلہن چپ چاپ اٹھی اور ابھی وہ جانا ہی چاہتی تھی کہ آپ نے حکم دیا " جانے سے پہلے میری طرف دیکھو "

اندھی دلہن نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور حیرت اور خوشی سے شوہر کو دیکھنے لگی۔

پھر شیخ جلال نے دوسرا حکم دیا "وضو کے لئے پانی لاؤ"۔
بہری بیوی کو سماعت بھی مل چکی تھی وہ فوراً پانی لینے چلی گئی۔ جب پانی آگیا تو شیخ جلال نے اپنا جھوٹا پانی بیوی کو پلا دیا اور حکم دیا "قرآن پاک اٹھا لاؤ اور پڑھ کر مجھے سناؤ"۔
بیوی قرآن پاک لے آئی اور اسے رحل پر رکھ کے فرفر پڑھنے لگی۔



باہر سے شیخ احمد قلندر نامی ایک بزرگ تشریف لائے ان کی عظمت اور بزرگی کا پورے ملک میں غلغلہ بلند ہوا۔ ان نو وارد قلندر کو بھی اس بات کی جستجو تھی کہ ہندوستان کے صاحب کمال حضرات کا امتحان لیا جائے پانی پت کے قریب لکھی جنگل میں قیام فرمایا اور تمام مشائخ اور فقرا کی دعوت کر دی۔ جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا۔ فقرا اور مشائخ میں شیخ جلال بھی شامل تھے سبزے پر لمبی لمبی چادروں کا دسترخوان بچھا دیا گیا اور جملہ فقرا اور مشائخ اس کے دونوں طرف آمنے سامنے بیٹھ گئے شیخ احمد قلندر کے مریدوں نے دسترخوان پر بڑے بڑے طباق لا کر رکھ دیے یہ طباق سرپوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان کے کناروں سے گرم گرم کھانے کی ہلکی ہلکی بھاپ نکل رہی تھی کچھ دیر بعد شیخ احمد قلندر نے اپنے مریدوں کو حکم دیا "طباقوں سے سرپوش ہٹا دیے جائیں"۔

حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ قلندر نے فقرا اور مشائخ کو حکم دیا "بسم اللہ شروع کریں" لیکن فقرا اور مشائخ سکتے میں مبتلا تھے اور ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھانے کے لئے ہاتھ بڑھا سکتے۔

قلندر نے دوبارہ کہا "بسم اللہ، شروع کیجئے، آپ سب خاموش کیوں بیٹھے ہیں"؟
کسی درویش نے جواب دیا "یہ کھانے، ناشرع اور حرام ہیں ہم انہیں کس طرح کھا سکتے ہیں"۔

ایک درویش نے شیخ جلال کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا "حضرت! اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ہم سب آپ ہی کو حکم مانتے ہیں"۔
شیخ جلال نے جواب دیا "اس میں حیرانی اور پریشانی کی کیا بات ہے" پھر کھانے کی طرف منہ کر کے حکم دیا "اے غذا! جن چیزوں کے کھانے سے خدا نے منع فرمایا ہے وہ دسترخوان پر کیوں موجود ہیں؟ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے چلی جاؤ"۔

دسترخوان پر دو درویش بیٹھے ہوئے مشائخ اور فقراء نے یہ عجیب و غریب تماشا دیکھا کہ حرام اور ناشروع چیزیں آہستہ آہستہ دسترخوان سے کھسکنے لگیں وہ وہاں سے کہاں چلی گئیں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ شیخ احمد قلندر یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں شیخ جلال کی عظمت اور بزرگی کے قائل ہوتے جا رہے تھے کچھ دیر خاموش رہ کے شیخ احمد قلندر شیخ جلال کے قدموں میں گر گئے اور عاجزی سے عرض کیا یہ فقیر نے یہاں کے فقراء اور مشائخ کا امتحان لیا تھا اور میں خوش ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔"

اس کے بعد انہوں نے فقرا اور مشائخ کے لئے واقعی کھانے کا انتظام کیا اور انہیں کھلا پلا کے رخصت کر دیا۔

شیخ جلال سے جواب بھی وہاں موجود تھے، قلندر نے درخواست کی۔

"حضرت! مجھے اپنے مریدوں میں شامل فرمالیں اب تو میں یہاں سے کہیں بھی نہ جاؤں گا"

شیخ جلال نے انہیں اپنا مرید بنالیا اور کچھ عرصے بعد شیخ احمد قلندر کو خرقۂ خلافت سے سرفراز کیا۔

ایک بڑی بی اپنے سر پر پانی کا گھڑا لئے چلی جا رہی تھیں ان کے ہاتھ پیروں میں رعشہ تھا اور سجھائی بھی کم ہی دیتا تھا کسی لمحے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچتیں، سامنے سے شیخ جلال چلے آ رہے تھے انہوں نے بڑی بی کو روک لیا اور پوچھا "اماں! کیا آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے؟"

بڑی بی نے بے بسی سے جواب دیا "بیٹے! اگر گھر میں کوئی مرد ہوتا تو کیا میں خوشی سے یہ دکھ جھیلتی؟"

شیخ جلال نے کہا۔ "اچھا یہ گھڑا مجھے دیجئے"

بڑھیا نے ذرا پس و پیش سے پانی کا گھڑا شیخ جلال کے حوالے کر دیا۔ آپ نے یہ گھڑا بڑھیا کے گھر پہنچا دیا اور گھر سے دوسرا خالی گھڑا ہاتھ میں لے کر کنوئیں کا رخ کیا گھڑے کو رسی میں باندھ کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ پھر پانی بھر کے گھڑا کاندھے پر رکھ لیا اور گھر پہنچا کے دعا دی "اے اللہ اس پانی میں برکت فرما میں اس قابل رحم ضعیفہ کے اسی طرح کام آسکتا ہوں۔"

بڑی بی نے دریافت کیا "لے بیٹا! تمہاری اس دعا سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

آپ نے جواب دیا "اماں! فائدہ آپ خود ملاحظہ فرمالیجئے گا"

آپ اتنا کہہ کر چلے آئے۔ دوسرے دن بڑھیا نے جب گھڑے کو بھرنے کیلئے اٹھایا تو پتہ

چلا وہ کل جیسا لبالب بھرا رکھا ہے تیسرے دن پھر گھڑے کو ہلا جلا دیکھا تو پتہ چلا وہ اب بھی بھرا رکھا ہے۔ اس کے بعد زندگی بھر بڑی بی کو گھڑا بھرنے کی نوبت نہ آئی۔

شیخ جلال اپنی خانقاہ میں تشریف فرما تھے خاندان میں کسی کے توسط سے ایک کیمیا گر آ گیا اس نے اس گھر میں چاروں طرف افلاس ہی افلاس کا فریاد دیکھا۔ خاندان والوں نے کیمیا گر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ان میں شیخ جلال کے ایک صاحبزادے بھی موجود تھے کیمیا گر نے از راہ ہمدردی خاندان کے بڑوں سے کہا "حضرات! میں نے اس گھر میں ہر طرف افلاس ہی افلاس دیکھا۔ مجھے آپ سب کی حالت زار پر رحم چلا آ رہا ہے"

خاندان والوں نے دم سادھ لیا وہ چپ چاپ کیمیا گر کی بات سن رہے تھے۔

کیمیا گر نے مزید کہا "اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے گھر کی حالت سدھاریں فقر اور فاقے سے نجات ملے تو میں پیشکش کرتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے فنِ کیمیا گری سیکھ لیں اور اس سے اپنی غربت و افلاس دور کریں"

خاندان والوں نے سکوت اختیار کیا۔ شیخ جلال کے صاحبزادے بھاگ کے اپنے باپ کے پاس پہنچے اور خوش ہو کر عرض کیا۔

"بابا جان! آج ہمیں ایک ایسا آدمی میسر آ گیا ہے جو ہماری تنگدستی اور افلاس کا علاج کر سکتا ہے"

شیخ جلال نے چونک کر سوال کیا "غربت و افلاس کا علاج، کیا مطلب؟"

صاحبزادے نے جواب دیا "ہاں تنگدستی اور افلاس کا علاج۔ اس شخص کو فنِ کیمیا گری آتا ہے اور اس نے ہم سب کو یہ پیشکش کی ہے کہ اس سے کیمیا گری سیکھ کے اپنے دلدر دور کریں"

آپ نے طیش میں آ کے دیوار پر تھوک دیا اور فرمایا "کس کیمیا کی بات کر رہے ہو؟ اس کیمیا کی جو مجھے بھی آتی ہے تمہیں کتنا سونا درکار ہے صاحبزادے اس سامنے کی دیوار سے جتنا سونا چاہو لے لو اور اپنی غریبی دور کرو"

لڑکے نے دیکھا آپ نے جہاں تھوکا تھا وہاں کی دیوار سونے کی بن چکی تھی وہ سخت شرمندہ تھا۔

آپ نے فرمایا "بیٹے جس کیمیا کی تم بات کر رہے تھے وہ ایک پیچیدہ اور مشتبہ عمل ہے اور اس میں ہمیشہ ناکامی کا خطرہ رہتا ہے لیکن جس کیمیا سے میں واقف ہوں اس میں اس قسم کا کوئی خطرہ

نہیں اس لیئے میرا کہنا مانو اور کیمیائے سعادت سیکھ لو"

بیٹے نے شرمندہ ہو کے گردن جھکالی اور دیر تک معافی طلبی کے انداز میں بیٹھا رہا۔

عبادت و ریاضت میں اتنی زیادتی ہوتی کہ استغراق کا غلبہ رہنے لگا نماز کا وقت آتا تو مرید آپ کے کان میں آہستہ آہستہ حق حق حق جل جلالہٗ کہتے۔ آپ ہوش میں آجاتے اور وضو کر کے نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد پھر استغراق میں چلے جاتے۔

آپ کے پانچوں صاحبزادے آپ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور آپ پر استغراق کا عالم طاری تھا مرید اور صاحبزدگان گھڑیاں گن گن کے وقت گزار رہے تھے عصر کی نماز کا وقت قریب آتا جارہا تھا ابھی لوگ حق حق حق جل جلالہ کان میں کہنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آپ نے خلاف توقع خود بخود آنکھیں کھول دیں اور اپنے بڑے صاحبزادے خواجہ عبدالقادر کو مخاطب کیا "بیٹے! مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب حکم دیا ہے"

عبدالقادر ان کی شکل دیکھنے لگے۔ شیخ جلال نے فرمایا "بیٹے دہلی میں سید جلال مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری سخت علیل ہیں ان کی زندگی پوری ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنی عمر کا کچھ حصہ انہیں بخش دوں تمہاری کیا رائے ہے؟"

عبدالقادر نے جواب دیا "بابا جان! خدا آپ کو ہماری عمر میں سے بھی کچھ دے دے ہم یہ کس طرح گوارا کریں گے کہ آپ کی عمر میں کچھ کمی ہو جائے"

آپ نے اپنے دوسرے بیٹے ابراہیم سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا "بیٹے! ابراہیم! اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟"

ابراہیم نے غمزدہ ہو کر جواب دیا "وہی جو ابھی ابھی بھائی عبدالقادر فرما چکے ہیں"

اس کے بعد آپ اپنے تیسرے صاحبزادے شبلی سے مخاطب ہوئے "اور شبلی! تم کیا کہتے ہو؟"

شبلی نے اپنی اندرونی اذیت چھپاتے ہوئے بجز عرض کیا "بابا جان میرا جواب اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے"

شیخ جلال نے کہا "ہاں ہاں کہو جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو، شرماؤ نہیں"

شبلی نے رقت زدہ آواز میں جواب دیا "بابا جان! میری دعا ہے کہ خدا آپ کی عمر دراز کرے لیکن اگر حکم الٰہی یہی ہے کہ آپ اپنی عمر کا کچھ حضرت جہانیاں جہاں گشت کو مرحمت فرمادیں تو آپ کو تعمیل حکم میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنی چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ عدم تعمیل کے باعث آپ کو

شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ایسی ایسی ہزار جانیں نثار کردی جائیں تب بھی کوئی بات نہیں۔"

شیخ جلال شبلی کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا "شبلی! ذرا میرے قریب تو آؤ"

شبلی اٹھ کے باپ کے قریب پہنچ گئے باپ نے بیٹے کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کے قریب کیا اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا "خدا تمہاری عمر دراز کرے شبلی۔ تمہارے جواب نے ہماری طبیعت خوش کر دی"

اس کے بعد آپ نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اور خود استغراق میں چلے گئے کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول دیں اور اپنے آس پاس دیکھا بڑے صاحبزادے عبدالقادر اب بھی موجود تھے آپ نے انہیں مسکرا کے دیکھا اور دریافت کیا "تم نہیں گئے، ابھی تک بیٹھے ہو؟"

عبدالقادر نے افسردہ لہجے میں جواب دیا "باوا جان! مجھے آپ کی فکر پریشان کر رہی ہے"

شیخ جلال نے کہا "جب تم یہاں بیٹھے ہی رہ گئے ہو تو ذرا میرے ساتھ چلو"

عبدالقادر نے پوچھا "کہاں باوا جان؟"

آپ نے جواب دیا "جہاں میں جا رہا ہوں"

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" عبدالقادر کو حیرت تھی کہ جو شخص ایک عرصے سے خانقاہ سے باہر نہ گیا ہو اس نے اس وقت کہاں جانے کا ارادہ کر لیا ہے؟

شیخ جلال کھڑے ہو گئے اپنا داہنا پیر عبدالقادر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "عبدالقادر میرے پیروں پر اپنے پیر رکھ دو"

بیٹے نے باپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔

باپ نے مزید حکم دیا "اپنی آنکھیں بند کر لو"

بیٹے نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے حکم دیا "آنکھیں کھول دو"

بیٹے نے آنکھیں کھول دیں تو حیرت کی انتہا نہ رہی، یہ پانی پت سے بالکل مختلف جگہ تھی ڈرتے ڈرتے باپ سے پوچھا "باوا جان! یہ کون سی جگہ ہے؟"

آپ نے جواب دیا "دہلی، ہم مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پاس چل رہے ہیں، سامنے دیکھو وہ ان کا آستانہ ہے"

بیٹے نے حیرت سے جہانیاں جہاں گشت کے آستانے کی طرف دیکھا اور باپ کے ساتھ چل دیا۔ جب یہ لوگ آستانے میں داخل ہوئے اس وقت جہانیاں جہاں گشت پر نزع کا عالم

طاری تھا۔ ان کے آس پاس مریدوں اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ ہندوستان کا بادشاہ فیروز شاہ تغلق بھی جہانیاں جہاں گشت کا مرید تھا۔ اس وقت وہ بھی آیا ہوا تھا لیکن اپنے پیر کی آخری حالت کا اندازہ کر کے وضو کرنے چلا گیا تھا۔ شیخ جلال نے جہانیاں جہاں گشت کے سرہانے کھڑے ہو کے آواز دی "مخدوم جلال بخاری"

جہانیاں جہاں گشت نے آنکھیں کھول دیں اور شیخ جلال کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

آپ نے پوچھا "کیا حال ہے؟"

جہانیاں جہاں گشت نے کمزور آواز میں جواب دیا "اللہ کا شکر ہے، ایسا لگتا ہے جیسے چل چلاؤ کا وقت قریب آ گیا ہے"

آپ نے کہا "نہیں ایسا نہیں ہو گا، اٹھو اور وضو کرو"

جہانیاں جہاں گشت بمشکل اٹھے، شیخ جلال نے انہیں وضو کرایا اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں ان کے جسم پر پھیرتے ہوئے فرمایا "مخدوم جلال! میں بحکم خدا اپنی زندگی کے دس سال تمہیں بخشتا ہوں"

جہانیاں جہاں گشت کو ایسا محسوس ہوا جیسے توانائی کی تیز رو ان کے جسم میں اچانک داخل ہو گئی۔

شیخ جلال نے اپنے بیٹے عبدالقادر سے کہا "بس بیٹے اب واپسی کی تیاری کرو، اپنا کام ختم ہو گیا"

بیٹا باپ کے حکم کی تعمیل میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ باپ نے حکم دیا "میرے پیروں پہ اپنے پیر رکھ لو"

بیٹے نے باپ کے پیروں پر اپنے پیر رکھے، حکم ملا "آنکھیں بند کر لو"

عبدالقادر نے آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اس کے بعد پھر حکم ملا "آنکھیں کھول دو"

بیٹے نے آنکھیں کھول دیں اور خود کو پانی پت میں پایا۔

آپ کے چلے جانے کے بعد بادشاہ فیروز شاہ تغلق بھی وضو کر کے اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسی وقت یہ محسوس کر لیا کہ اب ان کی حالت بہت ٹھیک ہے دریافتِ حال پر جب اصل واقعہ معلوم ہوا تو اسے شیخ جلال سے ملاقات نہ ہونے کا سخت ملال ہوا اور کہنے لگا "ہم کتنے خوش قسمت حکمران ہیں کہ ہمارے عہد میں ایسے ایسے اولیائے عظام موجود ہیں اور ہمیں افسوس ہے

کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔"

کسی مصاحب نے عرض کیا "حضور والا! اگر ان سے ملاقات ہی کرنا ہے تو آپ پانی پت چلے چلیے، وہاں تفصیل سے کہیں، سنیں۔"



فیروز شاہ تغلق مصاحب کی بات مان گیا اور پانی پت پہنچ گیا اور آستانے پر کھڑے ہو کے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اسے اندر بلا لیا اور پوچھا "اس غریب کے در پر بادشاہ کی آمد کا مقصد؟"

بادشاہ نے کہا "آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ آپ دہلی تشریف لے گئے لیکن بدقسمتی سے یہ خاکسار شرف نیاز نہیں حاصل کر سکا تھا اس لیے یہاں پانی پت چلا آیا۔"

آپ نے کہا "تم نے ہمیں اچھی طرح دیکھ لیا، اب واپس جاؤ۔"

بادشاہ نے خوشامد سے کہا "میں آپ سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔"

آپ نے کہا "پوچھو کیا پوچھتے ہو؟"

بادشاہ نے سوال کیا "حضرت! کیا آپ نے خدائے عزوجل کو بھی دیکھا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "حق سبحانہ' تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھنا از روئے شریعت محال ہی نہیں، ناممکن ہے لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سائے کو ضرور دیکھا ہے۔"

بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور واپسی کے وقت وافر مقدار میں نقد اور جنس آپ کی خدمت میں پیش کیا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا "بابا! ہم اہل فقرا نہیں لے کر کیا کریں گے؟"

فیروز شاہ نے اصرار کیا "اگر آپ انہیں قبول نہیں کریں گے تو ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔"

آپ نے جواب دیا "بابا! جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہم فقیر لوگ ہیں ان کی حفاظت کے لیے دربان پاسبان کہاں سے لائیں گے، یہ چیزیں آپ ہی کو زیب دیتی ہیں، ہمیں تو معاف ہی رکھیں۔"

فیروز شاہ تغلق کچھ دیر گم صم کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے شیخ جلال کے آستانے کے باہر کسی شخص سے پوچھا "حضرت کی اولادیں کتنی ہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا "کئی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا "ان میں کوئی لڑکا بہرا گونگا بھی ہے؟"

"ہاں ایک لڑکا گونگا بہرا بھی ہے" کسی نے جواب دیا۔

بادشاہ نے اس شخص سے پوچھا "اس گونگے بہرے سے مجھے بھی ملاؤ"

اس شخص نے جواب دیا "ابھی حاضر کرتا ہوں لیکن حضور کا اس سے کام کیا ہے؟"

بادشاہ نے ناگواری سے کہا "تم بحث مت کرو اور جلد از جلد اس لڑکے کو حاضر کر دو"

اس شخص نے ذرا دیر بعد اس گونگے اور بہرے کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

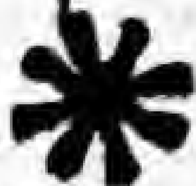
بادشاہ نے کچھ دیر تک ان صاحبزادے کو بغور دیکھا اور پھر اشاروں میں کہا "یہ چند چیزیں میں تمہیں تحفے میں دینا چاہتا ہوں"

گونگے بہرے بیٹے نے بادشاہ کو، پھر ان چیزوں کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھوں کے اشارے اور ہونٹوں کی حرکت سے دریافت کیا "یہ چیزیں کس کام آتی ہیں؟"

بادشاہ نے اپنے مصاحب خاص کو حکم دیا کہ وہ اس بات کا اشاروں ہی میں جواب دے مصاحب خاص نے پہلے انگلیوں کو اس طرح یکجا کیا گویا نوالہ بنا رہا ہو پھر اسے منہ تک لے گیا اور فوراً اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا گویا اس نے جواب دیا تھا "اس سے روزی کا مسئلہ حل ہوتا ہے کھانے پینے کا سامان آتا ہے اور اس کے ذریعے پیٹ کا جہنم بھرا جاتا ہے"

گونگے بہرے بیٹے نے اشاروں ہی میں اس طرح جواب دیا کہ پہلے تو اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا پھر انگلیوں سے نوالہ بنا کے منہ تک لے گیا اور پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کے آسمان کی طرف دوبارہ اشارے کرنے لگا گویا کہہ رہا ہو "یہ میرے کس کام کا جس نے پیدا کیا ہے وہی رزق بھی دے گا اور رزق دینے والا اللہ ہے جس نے منہ اور پیٹ کی تخلیق کی ہے، وہی اس جہنم کا ایندھن بھی عطا کرے گا"

بادشاہ حیران و ششدر اس گونگے بہرے کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اس نے شرمندہ و خفیف ہو کر وہ ساری چیزیں خانقاہ کے باہر غربا میں تقسیم کر دیں۔



فیروز شاہ تغلق کے خالہ زاد بھائی کا نام فتح خاں تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے بادشاہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کے قدمِ مبارک کا ایک نشان موجود تھا اور بادشاہ نے یہ طے کیا تھا کہ انتقال سے پہلے وہ وصیت کر جائے گا کہ اس نشان مبارک کو تکفین سے پہلے اس کے سینے پر رکھ دیا جائے لیکن فتح خاں نے کہا کہ "نشان میں لایا ہوں اس لئے اصولاً یہ حق مجھے پہنچتا ہے کہ مرنے کے بعد تکفین سے پہلے میں اسے اپنے سینے پر رکھواؤں گا"

انصاف پسند بادشاہ دیر تک اپنے خالہ زاد بھائی فتح خاں سے بحث و مباحثہ کرتا رہا دونوں ایک دوسرے کو دلیلوں اور مثالوں سے زک دینے کی دیر تک کوششیں کرتے رہے لیکن جب اس کے باوجود کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بادشاہ نے نہایت عمدہ اور قابل قبول تجویز پیش کی۔ اس نے کہا "فتح خاں یہ ایک ایسی بحث ہے جس میں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا بھی جیتنا ناممکن ہے اس لئے میں اس کا ایک نہایت مناسب حل پیش کرتا ہوں"۔

فتح خاں نے دریافت کیا "وہ کیا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "ہم میں سے جو پہلے مرجائے یہ نشان مبارک تکفین سے پہلے اس کے سینے پر رکھ دیا جائے اس طرح ہم دونوں اپنی خوش قسمتی کے منتظر رہیں گے اور کوئی نہیں جانتا کہ ہم میں سے کون پہلے مرے گا اور کون بعد میں"۔

فتح خاں بھی اس تجویز سے متفق ہو گیا کیونکہ اس میں دونوں ہی کے لئے موقع موجود تھا اس کے باوجود فتح خاں کے دل و دماغ ہر وقت اس فکر میں رہتے کہ یہ بازی بادشاہ سے کس طرح جیتی جائے کئی دن بعد اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی اس نے شیخ جلال اور جہانیاں جہاں گشت کا واقعہ آنکھوں سے دیکھ رکھا تھا اس نے سوچا کہ یہ سعادت شیخ جلال ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اس نے فوراً گھوڑا نکالا اور اس پر بیٹھ کے پانی پت روانہ ہو گیا۔

خانقاہ کے باہر شیخ زینا نامی مست قلندر ہاتھی کی طرح جھوم رہے تھے اور ان کی قلندری اور قول کی زود اثری کا بڑا چرچا تھا۔ لوگ ان سے بہت زیادہ خوفزدہ رہتے تھے فتح خاں نے اپنا گھوڑا ان کے سامنے روکا اور خانقاہ کے اندر داخل ہونا چاہا۔

شیخ زینا فتح خاں کو دیکھتے ہی جھومتے ہوئے اٹھے اور راستہ روک کر کھڑے ہو گئے قلندرانہ آن بان سے پوچھا "کدھر جاتا ہے؟"

فتح خاں نے نہایت تحمل سے جواب دیا "بابا شیخ جلال الدین کبیرالاولیاء کے پاس"۔

شیخ زینا نے دونوں ہاتھ پھیلا کے راستہ روک لیا بولے "اندر مت جا ورنہ پچھتائے گا"۔

فتح خاں نے ان کے ہاتھ ہٹانا چاہے بولے "شیخ زینا! میرے سامنے سے ہٹ جاؤ میں نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب اندر جانے سے مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا"۔

شیخ زینا نے کہا "تجھے میں روک سکتا ہوں۔ ابھی اسی وقت لیکن مشیت ایزدی۔ ہائے مشیت ایزدی"۔

فتح خاں نے کہا "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا اندر جانا مشیت ایزدی میں داخل ہے تو میرا راستہ روکے کیوں کھڑے ہو؟ سامنے سے ہٹ جاؤ اور مجھے اندر جانے دو"

شیخ زینا نے برہم ہو کے کہا "بچہ! تو اندر تو چلا جائے گا لیکن یاد رکھ کہ اندر سے زندہ سلامت نہیں نکلے گا!"

فتح خاں نے طنز کیا "جناب! میں اندر زندہ و سلامت پہنچوں گا اور زندہ سلامت ہی واپس آؤں گا"

شیخ زینا نے پُر جوش لہجے میں کہا "او باشاہ کی خالہ کے بیٹے! اگر تو اندر سے زندہ و سلامت نکل آیا تو میں تجھے اس بات کی اجازت دے دوں گا کہ میرا پیراہن پھاڑ دے لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں تیرا جامۂ ہستی خود چاک کر دوں گا"

فتح خاں تو یہی چاہتا تھا۔ شیخ زینا کے دونوں ہاتھ ہٹا کے اندر چلا گیا۔ اندر شیخ جلال استغراق میں تھے۔ فتح خاں ایک گوشے میں ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا اور استغراق سے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد شیخ جلال نے آنکھیں کھول دیں اور فتح خاں کو سرسری نظر سے دیکھ کے ارشاد فرمایا "کھڑے کیوں ہو، جاؤ، لے لو"

فتح خاں سلام کر کے اُلٹے قدموں واپس ہوا۔ باہر شیخ زینا بدستور کھڑے جھوم رہے تھے فتح خاں نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا "واہ شیخ جی! میں تو زندہ و سلامت واپس بھی آ گیا اور آپ کو سلام کر کے گھر واپس جانے کی اجازت طلب کر رہا ہوں"

شیخ زینا نے چڑ کے جواب دیا "فتح خاں! یہ اتفاق کی بات ہے کہ تیرا تیر نشانے پر لگ گیا اور میں ذرا بے بس ہو گیا لیکن یہ بات بھی کان کھول کے سن لے کہ تو پانی پت سے دہلی تک نہیں پہنچ سکے گا کیونکہ میں نے تیرا جامۂ ہستی چاک کر دیا ہے"

فتح خاں نے ہنس کر کہا "حضرت یہی تو خاکسار چاہتا تھا"

فتح خاں نے گھوڑے پر بیٹھ کر اسے ایڑ لگائی اور آناً فاناً وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس سفر میں اس نے یہ عجیب سی بات محسوس کی کہ جیسے جیسے دہلی قریب آ رہی تھی فتح خاں پر نیند کا شدید غلبہ ہوتا جا رہا تھا جب یہ نیند ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ گھوڑے سے اُتر کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ نیند تھی کہ اس کے وجود پر چھائی چلی جا رہی تھی وہ اپنے انجام سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے منہ پر چادر ڈال لی اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ کی

نیند سو گیا۔ فتح خاں کی موت کی خبر بجلی کی رو کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ بادشاہ نے اس کی نہایت شاندار طریقے سے تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی اس نے تکفین سے پہلے فتح خاں کے سینے پر رسول اللہ کا نشان مبارک رکھ دیا۔ اور اس کے سرہانے کھڑے ہو کر افسردہ لہجے میں کہنے لگا۔ "فتح خاں! تم جیت گئے۔ مجھے حیرت ہے یہ ترکیب میری سمجھ میں کیوں نہ آئی تھی، خیر جو ہوا سو ہوا"

فتح خاں کو اس کی خواہش کے مطابق دفن کر دیا گیا۔

آپ نے ایک سو ستّر سال سے زیادہ زندگی پائی اور اس مدّت میں آپ نے اسلام اور انسانوں کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ آپ کو لوگ زندگی ہی میں کبیرالاولیا اور قطب ربّانی جیسے گرانقدر لقب دے چکے تھے ان کے جن مریدوں نے غیر معمولی شہرت پائی، وہ ہیں شیخ زینا شیخ احمد قلندر شیخ احمد عبدالحق کارودلوی اور سیّد محمود۔ شیخ زینا کا مزار اندری، شیخ احمد قلندر کا ملتان میں اور شیخ عبدالحق کا ردولی میں ہے آپ کی وفات ۱۲ ربیع الاوّل ۷۶۵ھ میں ہوئی۔



حضرت سیّدی مولہؒ

دوگھڑی دن چڑھے ایک خوبصورت اور بارعب شخص حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اِک شانِ استغنا سے گویا ہوا۔ "السلام علیکم!"

بابا فرید نے اس اجنبی کو بہ نظرِ خاص ملاحظہ فرمایا اور افسوس زدہ لہجے میں جواب دیا "وعلیکم السّلام بابا سیدی مولہ!"

اجنبی نے مسکرا کر سوال کیا۔ "بابا فرید! آپ ہم سے واقف ہیں؟"

"ہاں، خوب"۔ بابا فرید نے جواب دیا۔ "اس بات سے بھی کہ تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟"

اجنبی نے کہا۔ "فی الحال تو یہ ناچیز آپ کی خدمت میں رہے گا اور جو قدم بھی اٹھائے گا پہلے آپ کی مرضی معلوم کر لے گا۔"

"کاش تم یہی کرتے" بابا فرید نے اداسی سے کہا۔ "لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تم وہی کرو گے جو تقدیرِ الٰہی ہے، سیّدی مولہ! ہماری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ امراء کی صحبتیں ہم فقراء کو راس نہیں آتیں اگر ہم ایسا کریں گے تو خود کو برباد کر لیں گے تم بھی اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ ملوکیت اور امارت کا سایہ تک تمہیں راس نہ آئے گا ان سے اس طرح بھاگنا جس طرح سورج سے سائے۔"

سیّدی مولہ بابا فرید کے سامنے دو زانو بیٹھ گئے، بولے۔ "بابا! جیسا آپ فرمائیں گے یہ گنہگار اس پر عمل کرے گا فقیری اور امیری کا کیا میل؟ ایک دن کا نور ہے تو دوسرا شب کی سیاہی، اس فرق سے یہ ناچیز بھی آگاہ ہے۔"

بابا فرید نے پوچھا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

سیّدی مولہ نے جواب دیا۔ "چند دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں، اس کے بعد مدعا عرض کروں گا۔"

بابا فرید نے رہنے کی اجازت دے دی، سیّدی مولہ ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

بابا فرید نے سیّدی مولہ کو سخت ترین عبادت و ریاضت میں مشغول دیکھا اور دل سے ان کی عزت کرنے لگے لیکن جب بھی سیّدی مولہ سے ان کی نظریں ملتیں، بابا فرید اُداس ہو جاتے اور کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے۔ سیّدی مولہ بھی بابا فرید کی اس ذہنی کیفیت اور رُوحانی کوفت سے واقف تھے لیکن کوئی سوال نہ کرتے تھے۔ کئی دن بعد ظہر کی نماز پڑھ کر بابا فرید جیسے ہی ذرا فراغت سے بیٹھے، سیّدی مولہ سلام کر کے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

بابا فرید نے دریافت کیا "کیا بات ہے سیّدی مولہ؟"

سیّدی مولہ نے عرض کیا "حضرت! ناچیز دہلی جانا چاہتا ہے بس بابا کی اک ذرا اجازت درکار ہے"

بابا فرید کے چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوئے آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور چند لمحے اسی حالت میں گزار دیے، پھر آنکھیں کھول کر دریافت فرمایا "کیا یہ حتمی فیصلہ ہے؟"

سیّدی مولہ نے ادب سے جواب دیا "جیسا کہ یہ ناچیز پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ اپنا مدعا بعد میں ظاہر کرے گا وہ مدعا یہ ہے کہ دہلی چلا جائے، بس ذرا حضور کی اجازت درکار ہے"

بابا فرید نے کرب ناک لہجے میں کہا "ہم تمہیں دہلی جانے سے کس طرح روک سکتے ہیں دہلی جانا مقدرات میں سے ہے آسمانی فیصلہ کس طرح بدل سکتا ہے"

سیّدی مولہ نے انکسار سے سوال کیا "کوئی نصیحت، کوئی ہدایت؟"

بابا فرید نے جواب دیا "سیّدی! ہم وہی باتیں پھر دہرائیں گے جو تم سے پہلے کہہ چکے ہیں، تم دہلی جا رہے ہو اور وہاں پہنچ کر تم یہ چاہو گے کہ اپنا دروازہ سب پر کھلا رکھو اور نام پیدا کرو۔ ٹھیک ہے تم جس طرح چاہو اور جس طریقے میں اپنی بہتری اور بھلائی دیکھو اسے اختیار کرو لیکن ہم تمہیں ایک نصیحت ضرور کریں گے اگر تم اس پر عمل کرو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ ہلاکت میں پڑو گے"

سیّدی مولہ نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی سوال کیا "ارشاد!"

بابا فرید نے افسوس سے کہا "ملوک اور امراء سے پرہیز، اپنی خانقاہ میں ان کی آمد کو مہلک اور وجہِ تباہی سمجھنا، ہمارا یہ قول ہمیشہ یاد رکھنا کہ جو درویش ملوک اور امراء سے میل جول کا دروازہ کھولتا ہے وہ اپنا دین اور دنیا دونوں خراب کر لیتا ہے"

سیدی مولہ نے کسی خیال میں ڈوب کر آہستہ سے کہا "بہتر ہے ناچیز ان گراں مایہ ہدایات کا بطورِ خاص خیال رکھے گا لیکن تقدیرِ الٰہی سے کوئی انسان کس طرح بچ سکتا ہے؟"

سیدی مولہ بابا فرید سے رخصت ہو کر دہلی چلے گئے۔ بابا فرید نے ایک سرد آہ بھری اور مغموم آواز میں ارشاد فرمایا "بابا تم بھی کیا کرو گے لوحِ محفوظ میں تو کچھ اور ہی رقم ہے جاؤ اور اپنے حصّے کا کام انجام دو"



سیدی مولہ نے دہلی پہنچ کر ایک شاندار خانقاہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا، یہ منصوبہ معمولی سرمائے کا نہیں تھا اس پر اتنا سرمایہ خرچ ہوا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں لوگ حیران تھے کہ ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی مزدوروں اور کاریگروں کو کام سے چھوٹتے ہی چاندی کے نئے نئے سکے تقسیم کیے جاتے۔ دہلی والے حیران تھے کہ سیدی مولہ ایک بے نوا اور بے سہارا اجنبی جن کا دہلی میں کوئی شناسا نہیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی وظیفہ مقرر نہیں، جاگیر میں کوئی گاؤں نہیں۔ پھر ان کے پاس یہ دولت کہاں سے آگئی؟ لوگ اس جگہ کی جستجو کرنے لگے جہاں سیدی مولہ نے اپنا خزانہ چھپا رکھا تھا سرکاری حکام کو یہ شبہ تھا کہ سیدی مولہ دنیادار انسان ہیں اور کہیں ٹکسال لگا رکھی ہے جس میں چاندی کے سکے ڈھالا کرتے ہیں انہوں نے بھی سیدی مولہ کے شب و روز کا خاموش محاسبہ شروع کر دیا۔ محاسبے سے ایک بات کی تو تصدیق ہو گئی وہ یہ کہ سیدی مولہ نماز جماعت سے نہیں پڑھتے خانقاہ میں کہیں چھپ کر پڑھ لیتے ہوں تو دوسری بات ہے ورنہ کسی نے انہیں نماز پڑھتے یا ریاضت و مجاہدے میں مشغول نہیں دیکھا۔

خانقاہ کے تعمیر ہوتے ہی لنگر جاری ہو گیا اور دونوں وقت ہزاروں آدمیوں کے لئے لذیذ ترین کھانے پکنے لگے۔ زمانے کے ستائے ہوئے پریشان حال یہیں پناہ لیتے اور پیٹ کی آگ بجھا کر اللہ کا شکر ادا کرتے۔ دہلی کے امرا اور حکام اس عجیب و غریب شخص کی زیارت کو حاضر ہونے لگے سیدی مولہ ہر ایک سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے اور جب یہ امرا اور حکام ان سے مل کر واپس جانے لگتے تو سیدی مولہ انہیں ہزار دو ہزار چاندی کے سکے یا اشرفیاں بطورِ انعام عطا فرماتے ان کا یہ طرزِ عمل اور زیادہ چونکا دینے والا تھا۔

سیدی مولہ ایک چادر جسم پر لپیٹے دراز تھے ان کے آس پاس مصیبت زدوں کا ہجوم تھا یہ سب حاجتمند تھے کسی کو اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور اس مد میں روپے درکار

تھے کوئی بوڑھا ہو چکا تھا اور لاولد ہونے کی وجہ سے بے سہارا تھا اور بڑھاپے کا ضعف لیے محنت و مشقت سے رہ کے ہوئے تھا کوئی صاحب اولاد تو تھا لیکن ناکارہ، نالائق اور کام نہ آنے والی اولاد کے ہاتھوں تنگ تھا اور سیدی مولہ سے مدد کا طالب تھا، کسی کی ملازمت چھوٹ چکی تھی یا کاروبار ختم ہو گیا تھا، کوئی سرکاری معتوب تھا اور دانے دانے کو ترس رہا تھا۔ حاجت مندوں اور مصیبت زدوں کا یہ ہجوم ان کے گرد و پیش امداد کا طلب گار تھا۔ سیدی مولہ سبھی سے خوش اخلاقی سے پیش آ رہے تھے۔

کسی سے کہہ دیا "ادھر ہمارے بستر کے پاس جاؤ اور تکیے کے نیچے سے دو ہزار تنکے (روپے) نکال لو۔"

کسی سے کہتے "دیکھو اس ہانڈی میں جو کچھ رکھا ہے نکال لاؤ۔"

تکیے والے نے تکیے کے نیچے سے دو ہزار تنکے حاصل کر لیے اور ہانڈی والے نے ہانڈی کے اندر سے دو سو اشرفیاں نکال لیں۔

ایک ادھیڑ عمر شخص ہجوم کو چیرتا ہوا سیدی مولہ کے قریب پہنچا اور ان کے روبرو کھڑے ہو کر زار و قطار آنسو بہانے لگا۔ سیدی مولہ نے ہنستے ہوئے اُسے دیکھا اور دریافت فرمایا "کیا بات ہے؟ تم رو کیوں رہے ہو؟"

اس شخص کی آنکھیں پرنالا بن گئیں اور داڑھی کے بال اولتی۔ جس سے آنسو کے قطرات ٹپ ٹپ قدموں میں گرنے لگے۔

سیدی مولہ کے دل پر ان آنسوؤں نے کوئی اثر نہ کیا بدستور لاپروائی سے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے اور تم یہ مگرمچھ کے آنسو کیوں بہا رہے ہو؟"

اس شخص نے رقت زدہ آواز میں کہا "افسوس کہ میں آپ کو نہایت ہمدرد اور انسان دوست درویش سمجھتا تھا لیکن آپ جو کچھ مجھ سے فرما رہے ہیں اس سے پتہ چلا کہ آپ نہایت سخت دل اور ظالم انسان ہیں، میں فلک زدہ، زمانے کا مارا، دل فگار انسان ہوں اور آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ سے اپنے درد کا درماں چاہوں گا لیکن آپ نے میرے زخم خوردہ دل سے بہنے والے آنسوؤں کو مگرمچھ کے آنسو کہہ کر میرے دل پر آرا چلا کے رکھ دیا ہے۔"

سیدی مولہ نے ترشی سے کہا "بدلفظی کی کوئی ضرورت نہیں تمہیں جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دو۔"

اُس شخص نے کہا: "حضرت! میں کل تک بادشاہ کی فوج میں اعلا منصب پر فائز تھا لیکن معلوم نہیں کس بات پر بادشاہ کی نظر مجھ سے پھر گئی اور میں بادشاہ کا معتوب قرار پا گیا اب عالم یہ ہے کہ میں بھاگتا اور منہ چھپاتا پھر رہا ہوں اور بادشاہ کے ملازمین مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت گرفتار کر لیا جاؤں اور قتل کے گھاٹ اتار دیا جاؤں اور اگر قتل کے گھاٹ نہ بھی اتارا گیا تو یقینی امر ہے کہ اب میں کہیں ملازمت نہیں پا سکتا۔ ایک لڑکے اور چار جوان جہان لڑکیوں کا ساتھ ہے سدا کی روگی بیوی کا ہے جس کا آئے دن علاج ہوتا رہتا ہے ان گراں مصارف پر بیکاری اور بادشاہ کا عتاب؛ آپ ہی انصاف فرمائیں کہ میں اندر سے کتنا دکھی اور پریشان انسان ہوں۔"

سیّدی مولہ نے غیر متاثر لہجے میں پوچھا۔ "تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ میں معاشی بدحالی اور تباہ کاری سے محفوظ رہوں۔"

"اور کچھ؟"

"اور یہ کہ میں اپنی چاروں لڑکیوں کی فوراً ہی شادی کر دینا چاہتا ہوں ان کے لئے کم از کم دس ہزار اشرفیاں درکار ہیں اگر میں ان چاروں کے بار سے سبک دوشی حاصل کر لوں تو میرا بوجھ بہت زیادہ ہلکا ہو جائے گا اور میں زمانے کی ستم رانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکوں گا۔"

"اور کچھ؟" سیّدی مولہ کا تکیہ کلام معلوم ہو رہا تھا۔

"اور یہ کہ میری بیوی کی بیماری آزاری پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے اس مد میں کم از کم دو ڈھائی ہزار اشرفیاں مزید عطا فرما دیں کہ میں اس کا علاج جاری رکھ سکوں۔"

"اور کچھ؟"

"اور یہ کہ مجھے اپنے روز مرہ کے لئے کم از کم تین چار ہزار اشرفیاں مزید عنایت فرما دیں تاکہ اگر دو چار سال ملازمت نہ بھی ملے تب بھی میں اپنا کام بآسانی چلا سکوں۔"

سیّدی مولہ کے پاس ایک ہی سوال تھا۔ "اور کچھ؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "اور یہ کہ میں کم از کم چھ ہزار اشرفیوں کا مقروض ہو چکا ہوں، چاہتا ہوں آپ قرض کا بوجھ بھی اتروا دیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

سیّدی مولہ نے جواب دیا۔ "جو چاہتے ہو ہو جائے گا، اور کچھ؟"

"سردست اگر یہی ہو جائے تو بندہ پروری ہوگی، آگے کیا عرض کروں؟"

سیدی مولہ نے بے نیازی سے ارشاد فرمایا "جن رقوم کا تم نے ذکر کیا ہے ذرا ان کا میزان تو کرو، کُل کتنی رقم بنتی ہے اور اپنی یہ مجموعی رقم اسی وقت لیتے جاؤ"

یہ شخص کچھ دیر حساب لگاتا رہا پھر بولا "حضرت! یہ کل رقم پچیس ہزار اشرفیاں بنتی ہے آپ خود بھی حساب لگالیں"

سیدی مولہ نے ہنستے ہوئے کہا "ہمیں حساب لگانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کل رقم بائیس ہزار پانچ سو اشرفیاں بنتی ہے لیکن تم ایک حریص اور دغاباز انسان ہو، تم جو بات کرو گے مبالغے اور جھوٹ کی آمیزش کے بغیر نہ کرو گے، بہر حال ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تم پشیمانی اٹھاؤ جاؤ اور جہاں خانقاہ کی بڑی دیگ رکھی ہے اسے ذرا کھسکا کر ایک طرف کر دو، اس کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے تم اس گڑھے میں جو کچھ بھی پاؤ ہمارے پاس لے آؤ"

یہ شخص بھاگم بھاگ دیگ تک پہنچ گیا اور زور لگا کر دھکا دے کر دیگ کو ایک طرف کھسکا دیا، اس کے نیچے ایک گڑھا تھا اور گڑھے میں اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں پڑی ہوئی تھیں اور ہر تھیلی میں پانچ پانچ ہزار اشرفیاں تھیں، یہ ساری کی ساری بالکل نئی چمچماتی ہوئی تھیں اس شخص کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دیگ کے نیچے گڑھے میں اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں کہاں سے آگئیں اور ان میں مطلوبہ تعداد ہی میں اشرفیاں کیوں نکلیں؟

یہ شخص اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر سیدی مولہ کے پاس پہنچ گیا بولا "حضرت! تھیلیاں تو مل گئیں، بڑی نوازش، اس کرم گستری اور غریب پروری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں"

سیدی مولہ نے اُسے ڈانٹ دیا۔ فرمایا "ہم جانتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو لیکن ہمیں جھوٹے سوال کو بھی رد کرتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی اس لیے تم جو کچھ چاہتے تھے اُسے پورا کر دیا گیا پھر پوچھا "کیا یہ سب کچھ جھوٹ نہیں تھا۔ جو داستان تم نے ہمیں سنائی کیا اس میں ذرا سا بھی سچ موجود ہے؟"

یہ شخص تھر تھر کانپنے لگا۔

سیدی مولہ نے نرمی سے کہا "ڈرو مت، تم صرف اس بات کا اقرار کر لو کہ تم نے ہم سے جو کچھ بھی کہا وہ سب جھوٹ ہے، دروغ گوئی ہے افسانہ طرازی ہے داستان نوائی ہے تم

اس شخص کی قوت گویائی جواب دے گئی وہ کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

سیدی مولہ نے کہا: "تم بادشاہ کے جاسوس، مخبر اور سراغ رساں ہو جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ تم یہ معلوم کرو کہ ہم سے مل کر اپنے دکھ درد کی ایک فرضی داستان سنائے اور امداد طلب کرے پھر جب ہم اشرفیوں سے مدد کریں تو یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ یہ رقم کہاں سے دی جا رہی ہے اور ہمارے پاس کہاں سے آتی ہے؟ تم نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ ہم نے تمہیں بیس ہزار اشرفیاں بھی عطا کر دیں۔ اور وہ جگہ بھی دکھا دی جہاں یہ اشرفیاں رکھی تھیں۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں چند اور جگہیں بھی دکھا سکتے ہیں جہاں سے اشرفیاں دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن یہ ساری معلومات تمہارے اور تمہارے بادشاہ کے لئے فضول ہیں، اس سے کہو ہم فقیروں کی ٹوہ لگا کر کیا پائے گا، ہم تو وہ ہیں کہ پتھر پر نظر ڈالیں تو وہ اشرفیوں کی تھیلی بن جائے، اللہ والوں کو کیوں چھیڑتا ہے۔"

یہ شخص سیدی مولہ کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر معافی مانگنے لگا اور اس بات کا اقرار کیا کہ اس کی بابت سیدی مولہ نے جو کچھ بھی کہا ہے درست ہے حرف بہ حرف سچ ہے۔

سیدی مولہ نے اشرفیاں واپس نہیں لیں اور یہ شخص اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر چلا گیا۔



سیدی مولہ کی خانقاہ کا خرچ روز بروز بڑھتا ہی رہا اور آخر کار اتنا بڑھا کہ ہزاروں آدمی شب و روز خانقاہ سے کھانا کھاتے اور دور دور سے آنے والے ادھر ادھر سرائے کا رخ کرنے کے بجائے اس خانقاہ کا رخ کرتے۔ صبح و شام آٹے اور میدے کی ہزاروں بوریاں اور گھی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن، دودھ اور معلوم نہیں کیا کیا خانقاہ میں آتا اور سب کچھ خرچ ہو جاتا۔ لوگوں کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کہاں سے آتا ہے اور کون لاتا ہے؟ اور یہ کہ سیدی مولہ کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟

سیدی مولہ بندگان خدا کی ایک ہی خدمت کرنے کے قائل تھے وہ خدمت تھی معاشی بدحالی کا علاج اور تدارک۔ ان کا قول تھا کہ ساری خرابیوں کی جڑ معاشی بدحالی ہے اس موذی مرض کا علاج کرو تو بہت سارے مرض خود بخود ختم ہو جائیں گے

اس غیر معمولی صرفے کو دیکھتے ہوئے خود سیدی مولہ کی زندگی پر غور کیا جاتا تو وہ نہایت سادہ تھی، جسم ڈھانپنے یا ستر پوشی کے لیے انہیں ایک تہبند اور ایک چادر کی ضرورت رہتی تھی کھانے میں چاول کی روٹی کو پانی اور کبھی کبھی شوربے میں ڈبو کر کھا لیا کرتے تھے۔

فرماں روائے ہند غیاث الدین بلبن کا انتقال ہوا تو سیدی مولہ کے مصارف میں کچھ اور اضافہ ہو گیا کیقباد حکمران ہو گیا۔ سیدی مولہ اپنی روش پر قائم رہے وہ امرا اور سرکاری ملازمین جو ایک فرماں روا کے انتقال اور دوسرے کی آمد پر اس کی لاپروائی اور ناقدری سے بے کار یا بے روزگار ہو گئے تھے ہزاروں کی تعداد میں تھے سیدی مولہ کا لنگر خانہ کھلا ہوا تھا اور اس کے در ہر ایک پر وا تھے۔ ان پریشاں حال اور آشفتہ سر بے کاروں نے سیدی مولہ کی خانقاہ کا رُخ کیا، سیدی مولہ نے خوشی خوشی ہر ایک کو خوش آمدید کہی اور ان کی یہاں تک پذیرائی کی کہ یہ لوگ جب کھا پی کر گھر جانے لگتے تو سیدی مولہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد بھی مرحمت فرماتے۔

کوئی کہتا: "حضرت! خاندان کے دس افراد کی ذمہ داری مجھ تنہا پر عائد ہوتی ہے آپ مستجاب الدعوات ہیں میرے حق میں دُعا فرمائیں۔"

سیدی مولہ ارشاد فرماتے: "تمہیں دُعا سے زیادہ دوا کی ضرورت ہے کیونکہ معاشی بدحالی وہ لعنت ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان خدا تک سے منکر ہو جاتا ہے۔" پھر اس کے بعد حکم دیتے: "سامنے کی طاق میں جو کچھ رکھا ہے خاموشی سے اٹھا لاؤ۔"

وہ شخص طاق سے ایک تھیلی اٹھا لاتا، سیدی مولہ حکم دیتے۔ "دیکھنا تو اس میں کتنی رقم ہے؟"

وہ شخص تھیلی کا منہ کھول کر سیدی مولہ کے روبرو الٹ دیتا اور گنتا تو پتہ چلتا ایک ہزار اشرفیاں ہیں۔ اتنی نئی اور چمک دار گویا ابھی ابھی دارالضرب (ٹکسال) سے نکلی ہیں۔

ایک بوڑھا آدمی کہانپتا ہوا سیدی مولہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ زور زور سے سانسیں لیتا ہوا بولا: "سیدی! میں مرحوم سلطان کا رکاب دار رہ چکا ہوں نئے بادشاہ نے مجھے الگ کر دیا ہے اور عالم یہ ہے کہ میں مرحوم بھائی اور اپنے کنبے کا تنہا کفیل ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ دوبارہ ملازمت کس طرح حاصل کروں، نیا بادشاہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتا۔

میرے حق میں بھی دُعا فرمائیں!"

سیدی مولے نے اُسے حکم دیا: "دیکھو، سامنے کی دیوار کے نیچے جو چند اینٹیں رکھی ہوئی ہیں انہیں اُٹھاؤ اور ان کے نیچے سے جو کچھ بھی تمہیں ملے میرے پاس لے آؤ۔"

اس بوڑھے نے حکم کی تعمیل کر دی اور ذرا سی دیر میں اینٹوں کے نیچے سے تین تھیلیاں اُٹھا لایا۔ سیدی مولے نے ان کی رقم بھی گنوائی یہ تین ہزار اشرفیاں تھیں آپ نے بوڑھے کو حکم دیا: "یہ اشرفیاں لے جاؤ اور ہاں دیکھو نہایت احتیاط سے خرچ کرنا۔"

بوڑھے نے زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اشرفیاں لے کر رخصت ہو گیا۔

ایک شخص بیساکھی کے سہارے آگے بڑھا اور سیدی مولے سے کہا: "حضرت! میری ایک ٹانگ لڑائی کی نذر ہو چکی ہے، اب جبکہ میں کمانے کے لائق نہیں رہا تو بادشاہ نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ اب ذرا آپ ہی انصاف فرمائیں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئیے؟"

سیدی مولے نے سوال کیا: "تمہارا کنبہ کتنے افراد پر مشتمل ہے؟"

لنگڑے نے جواب دیا: "پانچ افراد پر۔"

سیدی مولے نے کہا: "تم ہمارے کسی آدمی کو اپنا گھر دکھا دو، وہ ہر روز پانچ آدمیوں کا کھانا گھر پہنچا دیا کرے گا۔"

لنگڑے نے سیدی مولے کا شکریہ تو ادا نہیں کیا۔ کڑے انداز میں بولا: "واہ حضرت واہ! آپ نے کس طرح فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اور میرے کنبے والوں کو کھانے کے علاوہ کسی اور شے کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔"

سیدی مولے نے ہنس کر کہا: "او جلد باز انسان! تو نے ہماری پوری بات تو سنی ہی نہیں۔" پھر آپ نے حکم دیا: "ہمارے مُصلّے کا داہنا حصہ اٹھا تو ذرا۔"

لنگڑے نے داہنا کونا اٹھایا تو اس کے نیچے نئی نئی اشرفیاں بکھری نظر آئیں۔ وہ گھبرا گیا اور انہیں چھونے کی ہمت تک نہ کر سکا۔

سیدی مولے نے اسے نرمی سے حکم دیا: "یہ تمہاری ہی ہیں سادہ دل نوجوان! ڈرو مت، انہیں اپنے دامن میں بھر لو۔"

لنگڑے نے ساری اشرفیاں دامن میں بھر لیں۔

جب یہ تینوں چلے گئے تو سیدی مولہ نے اپنے مرید خاص کو بلایا اور دریافت کیا "آج خانقاہ میں کتنے ایسے آدمی جمع ہیں جو پہلے غیاث الدین بلبن کے دربار سے وابستہ تھے؟"

مرید چلا گیا اور کافی دیر بعد یہ اطلاع لے کر واپس آیا کہ سیدی مولہ کے اس پاس کئی ہزار افراد ایسے ہیں۔ جو پہلے سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔

"اچھا!" سیدی مولہ کو اچانک بابا فرید کی نصیحت یاد آگئی کہ دہلی پہنچکر ملوک اور امراء کی صحبت اور دوستی سے بچنا کیونکہ فقراء کو ان کی صحبت اور دوستی راس نہیں آتی۔ سیدی مولہ سوچتے سوچتے چونک پڑے اور زیر لب خود سے ارشاد فرمایا "بابا آپ ہی بتائیے یہ ناچیز ان سرکاری آدمیوں سے کس طرح بچ سکتا ہے ان میں گردش زمانے کے ستائے ہوئے امراء بھی ہیں اور سرکاری حکام بھی وہ خدا جو رب العالمین اور جانداروں کا رازق ہے اس نے ان کے رزق کی تقسیم اس ناچیز کے سپرد فرمائی ہے کیا میں اپنے رب کے اس حکم کی خلاف ورزی کر سکتا ہوں؟ ہرگز نہیں"

سیدی مولہ کو ایسا لگا جیسے بابا فرید افسوس سے کہہ رہے ہوں،

"سیدی! ہماری بات نہیں مانو گے تو پچھتاؤ گے"

سیدی مولہ نے گویا انہیں جواب دیا "خدا کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔ یہ ناچیز کیا کر سکتا ہے؟"

آپ نے نظریں اوپر اٹھائیں تو معلوم ہوا، خانقاہ میں چاروں طرف حاجت مندوں کا ہجوم ہو رہا ہے انہوں نے اپنے ملازمین اور خدام کو حکم دیا "انہیں شکم سیری کی حد تک کھانا کھلایا جائے اور اس وقت تک برابر کھلایا جاتا رہے جب تک ان کے معاشی مسئلے کا کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکل آتا"

پھر ایسا ہوا کہ کیقباد کے ہاتھ سے بھی حکومت نکل گئی اور اقتدار کی باگ ڈور جلال الدین خلجی کے ہاتھ میں چلی گئی ایک بار پھر سرکاری عملے میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ہزاروں آدمی بے روزگار ہو گئے اور یہ سب مل ملا کر ہزاروں کی تعداد اختیار کر گئے، ان سب کی ذمے داری بھی سیدی مولہ نے اپنے سر لے لی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سیدی مولہ ہزاروں آدمیوں میں گھرے کھڑے تھے

کہ ایک جوان شانِ بے نیازی سے اپنے گھوڑے کو دُلکی چال سے لے کر خانقاہ کے دروازے تک آ گیا۔ سیدی مولہ نے ایک نگاہ غلط انداز سے اس شخص کو دیکھا تو لوگوں سے سوال کیا "لوگو! یہ کون ہے؟"

کسی نے جواب دیا۔ "سُلطان جلال الدین کا سب سے بڑا بیٹا اختیار الدین خان خاناں۔ اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضور ایک مجم دِل درویش ہیں اور ان کے دروازے ہر ایک شخص پر کھلے ہیں اس لیئے شرف قدم بوسی کی خاطر شہزادے خان خاناں نے بھی حضور کے دربار میں حاضری دی ہے۔"

شہزادہ ایک دم گھوڑے سے کود پڑا۔ لوگوں نے ادب سے راستہ دے دیا شہزادہ دوڑتا ہوا سیدی مولہ کی طرف بڑھا اور جھک کر ان کے پیر پکڑ لیئے اور گڑگڑاتا ہوا بولا۔ "حضرت اِک نظرِ کرم اِدھر بھی، اس مشتاق دید کو مایوس نہ کیجیئے گا۔"

سیّدی مولہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن شہزادہ اپنی آنکھیں ان کے تلوے سے ملنے لگا۔ بولا۔ "بس یہیں اسی جگہ آپ کے قدموں میں صحیح ہوں۔"

سیّدی مولہ نے پوچھا۔ "تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "حضرت کی نظر کرم۔"

سیّدی مولہ نے کہا۔ "شہزادے تم ولی عہد ہو لیکن افسوس کہ تم جلال الدین کے فرمودہ ولی عہد ہو، خدائی فرمودہ نہیں۔"

شہزادے نے حسرت بھری نظروں سے سیدی مولہ کو دیکھا پوچھا۔ "حضور کے ارشادِ گرامی کا مطلب؟"

سیّدی مولہ نے جواب دیا۔ "تمہاری قسمت کی لوح محفوظ میں تمہاری ولی عہدی کا خانہ خالی ہے۔"

شہزادے نے مایوسی سے سوال کیا۔ "میری زندگی کتنی ہے؟"

سیدی مولہ نے لمحے بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے کھول لیں بولے۔

"شہزادے ہم تمہارے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے ہیں وہ تمہارے سوگ میں رو رہا ہے"

شہزادہ خانِ خاناں نے غمگین ہو کر خاموشی اختیار کی لیکن سیدی مولہ کو

گویا بار بار بابا فرید سرزنش کر رہے تھے کہ "سیدی یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ امرا اور سلاطین زادوں سے خدا کے لئے بچو، شر، آفت اور فتنے ان کے دامنوں سے لگ کر خانقاہ میں بھی داخل ہو جائیں گے۔

آپ نے وہی کیا جو فرمان خداوندی تھا امرا اور سلاطین زادوں میں سے ایک بھی خانقاہ سے نہیں نکالا گیا "اگر خدا کی مشیت یہی ہے کہ ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو اسے پورا ہونا چاہیئے" یہ کہہ کر سیدی مولہ نے اطمینان کی سانس لی۔



خانقاہ کے باہر زبردست شور و غل برپا ہوا، ہزاروں آدمیوں کے اژدحام اور ان کے واویلے سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ان کی آہ و فغاں بے ہنگم آوازوں کا مجموعہ تھی جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی سیدی مولہ نے چادر اپنے جسم پر لپیٹ لی اور خانقاہ کے باہر نکل گئے لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی اور زیادہ جوش و خروش کا اظہار کیا۔ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا اور یک بیک آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ ایسا لگا جیسے ہزاروں مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہیں۔

یکایک سید مولہ کی کڑک دار آواز گونجی "تم اپنا ایک نمائندہ یا چند آدمی ہمارے پاس بھیجو جو ہمیں تمہاری پریشانی یا مصیبت سے مطلع کر سکے۔"

مجمع نے یک سوئی سے یہ آواز سنی اور پھر آپس کی چہ میگوئیوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

کچھ دیر بعد پانچ آدمی آہستہ آہستہ سیدی مولہ کی طرف بڑھے جب وہ قریب آ گئے تو سیدی مولہ انہیں اپنے ساتھ لے کر خانقاہ میں داخل ہو گئے اور سوال کیا "کیا تمہیں بادشاہ سے کوئی اذیت پہنچی ہے؟"

وفد کا ایک شخص اپنے چاروں ساتھیوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "سیدی! ان پریشان حال لوگوں کی وکالت سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔"

سیدی مولہ نے اسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کہا "خیر کہو، ہم سمجھتے ہیں۔"
اس شخص نے سیدی مولہ کی بات کا کوئی اثر ہی نہ لیا، کہنے لگا "بندے کو

جلال الدین کاشانی کہتے ہیں، اس خاکسار کو بادشاہ کی طرف سے ایک منصب بھی حاصل ہے میران پریشان حال حضرات سے یوں تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میری دلی ہمدردی اور طبیعت کے ترحم نے مجھے اس پر مجبور کر دیا کہ میں آپ کی خدمت میں ان کی سفارش کروں "

سیدی مولہ نے نرمی سے کہا "تمہید میں وقت مت ضائع کرو، مقصد بیان کرو"

امیر جلال الدین کاشانی نے کہا "ملک الامرا فخر الدین کوتوال سے جناب بھی واقف ہوں گے ان کا انتقال ہو چکا ہے ان کے ہزاروں پروردہ اور ملازمین اب بے کار ہو چکے ہیں اور سردست ان کی روزی کا متبادل کوئی انتظام نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں کا ہر شخص ایک کنبہ، ایک خاندان رکھتا ہے یہ لوگ اپنے معاشی مرض کے علاج کے لیئے یہاں آئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بادشاہ کا خزانہ اور شاہی باورچی خانہ بھی جو ان کے لئے نہیں کر سکتا وہ جناب کی خانقاہ سے ممکن ہے"

سیدی مولہ نے جواب "پھر ان سے کہہ دیا جائے کہ جب تک وہ بے روزگار ہیں اور ان کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہماری خانقاہ سے ان سب کو کھانا اور خرچ کی رقم ملتی رہے گی"

امیر کاشانی نے سیدی مولہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور وفد کے باقی ساتھیوں کو لے کر خانقاہ سے باہر نکل گیا اس دن سے خانقاہ نے کئی ہزار آدمیوں کے کھانے پینے اور روزمرہ اخراجات کی مزید ذمے داری قبول کرلی۔

اسی دن رات کو امیر کاشانی نے دوبارہ حاضری دی اور کہا "حضرت! مجھے آپ کی صحبت میں ایک ناقابل بیان روحانی سکون حاصل ہوتا ہے اگر اجازت ہو تو بندہ روزانہ حاضری کی سعادت حاصل کر لیا کرے"

سیدی مولہ نے جواب دیا "یہ ایک فقیر کی خانقاہ ہے، اس میں حاضری کی اجازت کیا معنی؟ کوئی شاہی محل یا بادشاہ کا دربار تو نہیں کہ تم حاضری کی اجازت طلب کرو"

امیر کاشانی بہت خوش ہوا اور سیدی مولہ کے قدموں میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

اسی رات دو آدمی اور آئے، ایک برناتھن نامی ہندو جو عہد بلبن میں شہر کوتوال رہ چکا تھا دوسرا ہتیا پائک پہلوان۔ یہ بھی ہندو تھا اور بلبن کے

دربار سے وابستہ رہ چکا تھا یہ دونوں بھی اب بے کار تھے اور معاشی بدحالی انہیں ایک مسلمان درویش کی خانقاہ تک لے آئی تھی۔ یہ دونوں دھوتیوں میں منہ چھپائے سیدی مولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ان کی نظریں امیر کاشانی پر پڑیں تو واپس جانے لگے لیکن سیدی مولہ نے انہیں روک لیا اور پوچھا "تم دونوں واپس کیوں جارہے تھے؟"

برنا تھن نے بات بنائی "بابا جی! آپ کے درشن کرنے آگئے تھے دیکھ کر جی خوش ہو گیا، اب واپس جارہے تھے؟"

امیر کاشانی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

ہتیا پائک پہلوان سیدھا سادا آدمی تھا اس کے پاس برنا تھن کو توال جیسی عقل نہیں تھی صاف صاف بتا دیا "مہاتما جی! بلبن بادشاہ ہمارا ان داتا تھا ہم دونوں اس کے سیوک تھے وہ بیکنٹھ سدھارا تو دوسرے بہت سے سیوکوں کی طرح ہم دونوں بھی بے آس و بے سہارا ہو گئے اب ہمارے ان دجل کا کوئی ٹھکانا نہیں، آپ کی دیا کا چرچا چاروں طرف پھیلا ہوا ہے لوگ کہتے ہیں آپ اس یگ کے سب سے بڑے دیالو ہیں آپ کا اُپکار ہماری جیون نیا کو آسانی سے پار لگا دے گا۔"

سیدی مولہ نے جواب دیا "زندگی کی ناؤ کو پار لگانے والا خدا ہے ہم تو اس کے نائب ہیں بہرحال تم دونوں بھی کوئی فکر نہ کرو، اللہ نے چاہا تو تم دونوں کو بھی معاشی پریشانیاں نہیں اٹھانی پڑیں گی۔"

برنا تھن کو واپسی کی جلدی تھی، فوراً اجازت طلب کی "اچھا بابا جی! پھر کسی وقت حاضری دیں گے، اجازت دیجئے۔"

"اجازت!" سیدی مولہ نے ہاتھ اور گردن کے اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔

جب یہ دونوں چلے گئے تو امیر کاشانی نے منہ بنا کے کہا "حضرت! یہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ دونوں ہندو تھے؟"

"خوب اچھی طرح!" سیدی مولہ نے جواب دیا۔

امیر کاشانی نے تعصب کا انداز اختیار کیا، کہا "دونوں کافر ہیں۔ ایک کافر اور مسلمان میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہے آپ اس فاصلے کو کس طرح ختم کر دیں گے؟"

"خلجی امیر!" سیدی مولہ نے بے چینی سے کہا۔ "جب خدا خود ہی قرآن پاک میں یہ فرما رہا ہو کہ وہ رب العالمین ہے تو معاشی مسئلے میں ہم مسلمان اور کافر کی تفریق کیوں کریں اگر خدا سورۃ فاتحہ میں یہ فرماتا کہ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْمُسْلِمِیْنَ تو ہم بھی معاشی مسئلے میں ہندو مسلم کی تفریق پر کاربند ہو جاتے۔"

امیر کاشانی نے لاجواب ہو کر کہا۔ "ظاہر ہے میں آپ سے کس طرح بحث کر سکتا ہوں لیکن اگر اس خانقاہ کے فیوض محض مسلمانوں کے لئے مختص ہو جائیں تو بہت اچھی بات ہو۔"

"ناممکن!" سیدی مولہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ایسا قطعی ناممکن ہے۔"

امیر کاشانی نے پھر اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ خاموشی اختیار کی اور کچھ دیر بعد اُٹھ کر چلا گیا۔



دوسرے دن صبح ہی صبح امیر کاشانی کی عدم موجودگی میں برناتھن اور ہتیا پائیک سیدی مولہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "باباجی! کل رات ہم دونوں اس خلجی امیر کی وجہ سے واپس چلے گئے تھے۔ آپ اس سے ہوشیار رہیں لوگ کہتے ہیں یہ امیر ذرا فسادی ہے شر پھیلاتا رہتا ہے۔"

سیدی مولہ نے جواب دیا۔ "ہاں آدمی تو اچھا نہیں نظر آتا لیکن ہم بھی کیا کریں، خدا نے ہمارے اوپر جس شخص کو مسلط کر دیا ہے اس کا پاس لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

دونوں لاجواب ہو کر چپ ہو رہے۔ تھوڑی دیر بعد سیدی مولہ نے انہیں حکم دیا۔

"جاؤ سامنے پانی کے گھڑوں کے نیچے جو کچھ رکھا ہے اٹھا لو اور اس سے اپنا کام چلاؤ۔"

دونوں گھڑوں کے پاس پہنچے اور ان کے نیچے سے بہت سارے سونے کے سکے نکال کر اپنی اپنی جیبوں میں بھر لیے اور دوبارہ پھر سیدی مولہ کی خدمت میں دو زانو بیٹھ گئے۔

سیدی مولہ نے کہا۔ "اب یہاں وقت برباد کرو، گھر جاؤ اور بیوی بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کرو، وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

دونوں دوبارہ باریابی کی پیشگی اجازت لے کر چلے گئے۔

اب خانقاہ کے لنگر خانے کا خرچ کئی گنا زیادہ ہو چکا تھا اور اشرفیوں اور چاندی کے سکوں کی تقسیم بھی نہایت زور شور سے ہو رہی تھی۔

اب امیر کاشانی کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی اس کے آنے جانے کا کوئی خاص وقت نہیں تھا وہ اپنا زیادہ وقت سیدی مولہ کی خدمت میں گزارنے لگا۔ دوسری طرف برناتھن اور ہیتا پانک کی حاضری اور نشست و برخاست میں بھی اضافہ ہو گیا تھا پہلے تو امیر کاشانی ان دونوں سے جلتا تھا اور درمیان میں کفر اور اسلام کی خلیج حائل کر دی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ خلیج رواداری کے ملبے سے پاٹی جانے لگی اور کچھ ہی دنوں بعد یہ خلیج بالکل پٹ گئی۔ اسی مجلس میں جلال الدّین خلجی کا ولی عہد شہزادہ خانِ خاناں بھی حاضری دیتا رہا، اسے سیدی مولہ نے اپنا فرزند قرار دیا تھا۔ خود سیدی مولہ نے شادی نہیں کی تھی۔

ایک رات عشا کی نماز کے بعد امیر کاشانی نے سیدی مولہ سے کچھ تامل سے کہا۔ "حضرت! یہ خاکسار چند ایسی باتیں کہنی چاہتا ہے جو ممکن ہے بار خاطر ہوں لیکن ان کی افادیت پر ہرگز شبہ نہیں کیا جا سکتا"

سیدی مولہ نے خندہ پیشانی سے جواب دیا "بے تامّل کہہ گزرو، گھبراؤ مت!"

امیر کاشانی نے ہندو مصاحبین کی طرف دیکھا تو چالاک برناتھن نے کہا "بابا جی ہم دونوں مجلس سے اُٹھے جاتے ہیں کاشانی جی جو باتیں کہنا چاہتے ہیں ہمارے پیچھے آسانی سے کہہ لیں گے"

سیدی مولہ نے کہا "نہیں نہیں مجلس سے اُٹھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں، انہیں جو کچھ کہنا ہے ہم سب کے سامنے کہیں گے ورنہ زبان کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو شخص دوسروں کی موجودگی میں کسی کے کان میں بات کرنے کی خواہش کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ عیار اور خطرناک ہے، حق بات کے لئے تخلیے یا کان میں کھسر پھسر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی"

امیر کاشانی بہت شرمندہ ہو گیا۔ کچھ دیر کی ندامت کے بعد آہستہ سے گویا ہوا "حضرت! بات حقیقتہً یوں ہے کہ اس ناچیز نے جناب کو ہزار طرح آزما کے دیکھ لیا ہے آپ میں کسی عظیم مصلح کی روح حلول کر گئی ہے"

دونوں ہندوؤں نے بیک زبان تائید کی "بے شک بے شک، اس میں کیا

شک ہے۔"

امیر کاشانی نے کہا "یہ ناچیز ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو اوصاف اور خصوصیات حضور والا کو عطا فرمائی ہیں ان سے اس دور کا ہر انسان محروم ہے اس رات جب حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ خداوند تعالیٰ رب المسلمین نہیں رب العالمین ہے تو اس خاکسار کی آنکھیں فرط حیرت و انکشاف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ذات الٰہی کی صفات اور اوصاف کا جیسا علم حضور والا کو حاصل ہے کسی اور کے لیے اس کی بابت سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ سلطانی اور بادشاہت ایسے ہی آدمیوں کا حق ہے اس خاکسار کی تو یہ رائے ہے کہ حضور والا اقتدار اور فرمانروائی کے تخت پر متمکن ہونے کی کوشش فرمائیں۔ آپ رحم اور خدا پرست ہیں، مخلوق اور رعایا کے دکھ درد کا جیسا احساس اور خلوص حضور والا رکھتے ہیں، جلال الدین خلجی کے پاس بھی ویسا رحم اور خلوص نہیں ملے گا آپ کو چاہیئے کہ اپنے حامیوں اور فدائیوں کے توسط سے حکومت کا تختہ الٹ دیں اور خود اقتدار سنبھال لیں۔ اگر حضور والا ایسا نہیں کریں گے تو اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کر دیں گے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب بنا کر دنیا میں بھیجا ہے اگر جناب نے اس ملک کو ظالموں کے پنجوں سے نجات نہ دلائی تو کل قیامت میں خدا اور رسول کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

برناتھن سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ جوش اور ولولے سے بولا "فدائی کی خدمت یہ ناچیز انجام دے گا۔"

ہتیاپال نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

برناتھن نے جواب دیا "جب بادشاہ کی سواری گزرے گی تو بادشاہ کی زیارت کرنے والے ہجوم میں، میں شامل ہو جاؤں گا پھر جیسے ہی بادشاہ میرے قریب آئے گا میں پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کا کام تمام کر دوں گا۔"

امیر کاشانی برناتھن کا منصوبہ نہایت غور سے سن رہا تھا پوری تجویز سن کر دریافت کیا "لیکن بادشاہ کے قتل کے بعد تمہارا کیا حشر ہوگا؟"

"مجھے اپنے حشر کی کوئی پروا نہیں" برناتھن نے جواب دیا "کیوں کہ اگر میں اپنے جیون کی بھینٹ دے کر باباجی کو بادشاہ بنا دوں گا تو یہ پورے دیش کے باسیوں کی سیوا ہوگی۔"

ہتیا پانک ابھی تک خاموش تھا۔ اس نے بھی زبان کھولی، بولا" بادشاہ کو مارنے کا جو منصوبہ بھی بنے ضروری ہے کہ اس کے ہر پہلو پر نہایت عقل مندی سے غور کر لیا جائے اور اگر برناتھن جی کے جیون کا کسی طرح بچاؤ ممکن ہو تو اس کا بھی خیال رکھا جائے۔"

"میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب بھی ہے جس سے بادشاہ کو ہلاک کر کے برناتھن کو بچایا جا سکتا ہے۔" امیر کاشانی دماغ پر زور دیتا ہوا بولا۔

سیدی مولا ان کی باتیں نہایت توجہ سے سن رہے تھے اور خود منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال رہے تھے۔

ہتیا پانک نے پوچھا" برناتھن جی کا بچاؤ کس طرح ممکن ہے؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا" حضرت جی کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد غیر معمولی ہے ہزاروں میں پھیلے ہوئے ہیں جس روز بھی برناتھن جی کو اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہو حضرت اپنے دس بارہ ہزار معتقدوں کو بھی اس ہجوم میں شامل فرما دیں اور برناتھن جی جیسے ہی اپنا کام پورا کر چکیں، یہ ہجوم انہیں اپنی حفاظت میں لے لے۔"

برناتھن اور ہتیا پانک اس تجویز پر اچھل پڑے۔ ہتیا پانک نے خوش ہو کر کہا "بھائی ہم بچھڑے پہلوان ہمارے پاس تو بس شریر ہی شریر ہے بدھی تو سرکار دربار کے عہدے داروں ہی کے پاس ہوتی ہے امیر کاشانی کی بدھی کا ہم کیا مقابلہ کریں گے۔"

جب تینوں اس منصوبے پر متفق ہو گئے تو انہوں نے تائید اور منظوری کے لئے سیدی مولا کی طرف دیکھا۔ سیدی نے پوچھا" پھر ہماری تخت نشینی کس طرح عمل میں آئے گی؟"

امیر کاشانی نے فوراً جواب دیا" حضور والا کے جملہ مرید اور معتقد جو اس موقع پر موجود ہوں گے ایک جلوس کی شکل میں اپنے درمیان میں لے کر شاہی محل میں داخل ہوں گے اور وہاں تخت نشینی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔"

برناتھن نے کہا" اگر باباجی ہم سب کی کوششوں سے تاج و تخت حاصل کر لیں گے تو شاید میں ایک بار پھر شہر کوتوال ہو جاؤں۔"

ہتیا پانک نے کہا" اور مجھے درباری پہلوان ہو جانے کا موقع مل جائے گا جس سے دال روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

امیر کاشانی نے خوشی سے منہ کھول دیا، بولا " اور یہ خاکسار اس وقت حضرت جی سے یہ درخواست کرے گا کہ اس ناچیز کو بھی مستقلاً آپ اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمادیں، میرے لیئے یہی سب سے بڑا اعزاز ہوگا "

سیدی مولہ مانی میں پہنچ چکے تھے انہوں نے محسوس کیا بابا فرید انہیں گھور رہے ہیں اور ہونٹوں پر انگلی رکھے اشاروں سے منع فرمارہے ہیں کہ خبردار جو انہیں اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی آپ نے بلند آواز میں ارشاد فرمایا " ہم نے تم سب کی تجویزیں سنیں اور تمہارے وہ احساسات جو مجھ ناچیز سے تعلق رکھتے ہیں ہمارے علم میں آئے لیکن اگر ہم تم سے اتفاق کرتے ہیں تو اس سے بابا فرید کی ناراضگی کا خدشہ رہتا ہے اور انہوں نے ہمیں منع کر رکھا ہے کہ ہم امرا اور حکام کو اپنی صحبت میں نہ آنے دیں، اس سے راہ و رسم نہ بڑھائیں کیونکہ امیری اور فقیری کا کوئی جوڑ نہیں انہوں نے اس ناچیز کو یہاں تک سرزنش فرمائی تھی کہ اگر ہم نے ان کی نصیحت پر عمل نہ کیا تو گویا ہم اپنے لیئے ہلاکت خرید لیں گے "

امیر کاشانی نے کہا " آپ امرا اور حکام کو اپنی خدمت میں آنے دیں یا نہ آنے دیں یہ تو بات ہی دوسری ہے ہم سب تو یہ چاہتے ہیں کہ حضور والا خلیفۃ المسلمین بننا قبول فرمالیں اگر خلافت اور امارت ایسی ہی بری چیز ہے تو پھر خدا نے رسول مقبولؐ کے معززؓ اور مقدس ساتھیوں کو خلافت کا منصب کیوں عطا فرمایا خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین ہونا حقیقتاً آپ ہی جیسے انسان کا حق ہے آپ مانیں یا نہ مانیں یہ کار خیر انجام ضرور دیا جائے گا "

سیدی مولہ نے انکار کیا " جلال الدین خلجی بھی کوئی برا حکمران نہیں ہے اس لیئے اسے ہٹا کر ہمیں بٹھانا مناسب نہیں ہے "

برناتھن نے کہا " اگر وہ برا آدمی نہیں ہے تو پھر اور کون برا ہے اس کے برسر اقتدار آتے ہی ہزاروں عہدے دار بے کار اور بے روزگار ہو گئے ان کا قصور کیا تھا ؟ صرف یہ کہ وہ پچھلے بادشاہ کی ملازمت میں رہ چکے تھے "

ہتیا پائک نے کہا " اگر باباجی پناہ نہ دیتے تو یہ برسوں کا پالا ہوا ہاتھی جیسا شریر جھلنگا چارپائی کی طرح زمین سے لگ چکا ہوتا "

سیدی مولہ اپنی ضد پر قائم رہے اور مغضوب لہجے میں کہا "بہرحال کچھ بھی ہو ہم تمہیں بادشاہ کے قتل کا مشورہ ہرگز نہ دیں گے اور نہ ہی تمہیں اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیں گے، آخر خدا نے ہمیں کیا نہیں دیا، دولت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں، ہزاروں انسان ہماری خانقاہ سے دونوں وقت کا کھانا حاصل کرتے ہیں اسی طرح طرح سینکڑوں کی ہر روز مالی مدد کی جاتی ہے"

امیر کاشانی نے ڈرتے ڈرتے کہا "اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو یہ ناچیز کچھ دریافت کرے؟"

سیدی مولہ نے کہا "پوچھو!"

امیر کاشانی نے کہا "آپ کے پاس اتنا بڑا خزانہ آیا کہاں سے؟ اتنی دولت آپ کے ہاتھ آئی کہاں سے"

سیدی مولہ نے جواب دیا "مولا کا کرم ہے بس اس کے سوا کوئی جواب نہیں"

امیر کاشانی نے خوشامد سے کہا "حضور والا کا سچا ہمدرد اور غم خوار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ناچیز ہے خدا حضور کو ہزاروں سال زندہ و سلامت رکھے، یوں موت زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، اگر حضرت مناسب سمجھیں تو اس ناچیز کو بھی وہ عمل بتادیں جس کے پورا کرنے سے دست غیب حاصل ہو سکتا ہے"

سیدی مولہ نے کہا "ریاضت کرو ریاضت۔ خدا محنت رائیگاں نہیں کرتا، جب دل سے ریاکاری دماغ سے رعونت اور اندر سے خبث باطنی نکل جائیں گے تو تمہاری نظر بھی کیمیا اثر ہو جائے گی"

امیر کاشانی نے بڑی کوشش کی کہ سیدی مولہ دستِ غیب کا عمل بتادیں لیکن انہوں نے نہیں بتایا۔ آخر جب وہ اُن سے رخصت ہونے لگا تو کسی مرید نے سُنا امیر کاشانی یہ کہتا ہوا خانقاہ سے نکلا تھا کہ "ہم تو حضرت کو بادشاہت دینے کو تیار ہیں اور حضرت ہمیں دست غیب کا وظیفہ دینے تک کو تیار نہیں، حضرت جی نے 'نا' کر کے ہمارا دل توڑ دیا ہے جواب شاید کبھی بھی نہ جڑ سکے۔

امیر کاشانی نے ایک رات دیکھا کہ سیدی مولہ نہایت سوز اور جذبے سے چند اشعار پڑھ رہے ہیں۔

در مطبخ عشق جز نکو را نہ کشند   لاغر صفتان و زشت خو را نہ کشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز   مردار بود ہر آنچہ اُو را نہ کشند

(عشق کے باورچی خانے میں نیکوں کے سوا کسی کو بھی نہیں لے جاتے بُری صفتوں اور بُری عادتوں والے نہیں مارے جاتے۔ اگر تو سچا عاشق ہے تو موت سے نہ بھاگ، جس کو نہ ماریں وہ مردار ہے)

امیر کاشانی نے پوچھا "حضرت جی! ان اشعار کے ورد اور گردان کا مطلب؟"

سیدی مولہ نے جواب دیا "چند دنوں بعد مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا، لیکن ہم نے تجھے معاف کیا۔"

امیر کاشانی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔ "یہ ناچیز آپ کی اشاروں کی بات چیت سمجھنے سے قاصر ہے۔"

سیدی مولہ نے جواب دیا "باتیں اشاروں کی نہیں مستقبل کی ہیں۔ وقت معانی و مطالب خود ہی سمجھا دے گا۔"

پھر ذرا افسردگی سے کہا "لیکن تم یہ مت سمجھو کہ دنیا ہی سب کچھ ہے تم ہماری خانقاہ میں کثرت سے آتے جاتے رہے ہو اور ہمارے مقربین میں شمار کیے جاتے ہو یہی وجہ ہے جو ہم تمہیں معاف کر رہے ہیں۔"

امیر کاشانی نے جھنجلا کر سوال کیا "آخر میری خطا کیا ہے جسے آپ معاف فرما رہے ہیں؟"

سیدی مولہ نے کہا "خطا؟ ــ تمہاری خطا؟ ــ تمہاری باتوں میں ہاتھی کی بُو آرہی ہے تمہارے جسم تمہارے لباس سے ہاتھی کی بُو آرہی ہے اور یہی تمہاری خطا ہے کہ تمہارے پاس سے ہاتھی کی بُو آرہی ہے۔"

امیر کاشانی جھنجلا کر چلا گیا۔ وہ سخت برہم تھا کہ یہ درویش آخر اس سے اشاروں میں بات کیوں کرتا ہے؟



کسی مخبر نے بادشاہ کو اس سازش سے مطلع کر دیا اور شرکائے سازش کے نام بھی گنوا دیے۔ بادشاہ نے اسی وقت امیر کاشانی کو طلب کر لیا اور اس سازش کے بارے

میں پوچھ گچھ شروع کردی۔

امیر کاشانی نے کہا "جہاں پناہ نے جو کچھ بھی سنا ہے اس کا ایک ایک لفظ درست ہے اور یہ بھی درست ہے کہ یہ گناہ گار بھی شرکائے سازش میں پیش پیش تھا لیکن اس ناچیز کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ خدانخواستہ حضور کو قتل کرا کے سیدی مولہ کو بادشاہ بنا دیا جائے یہ گناہ گار تو محض اس لیئے ان میں شامل ہوگیا تھا کہ اس سازش سے کما حقہ، واقفیت حاصل کر کے جہاں پناہ کو مطلع کر دے۔"

بادشاہ نے پوچھا "لیکن تو اب تک خاموش کیوں تھا یہ خبر تیرے ذریعے ہم تک کیوں نہیں پہنچی؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا "محض اس لیے کہ یہ ناچیز اس مثل کا قائل نہیں ہے کہ کانا اور بے دوڑی، ناچیز چاہتا تھا کہ جب تک اس سازش کے دن، وقت اور لمحوں تک کا تعین نہ ہو جائے، زبان کھولنا مصلحت کے خلاف ہے اب جبکہ سازش قبل از وقت بے نقاب ہو چکی ہے تو پھر یہی مناسب ہے کہ میں گواہ کی حیثیت سے اس کی تصدیق کر دوں۔"

بادشاہ نے پوچھا "آخر تو کس طرح ہمیں اس سازش سے آگاہ کرتا؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا "جب اس ناچیز کو یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں دن اور فلاں وقت یہ سازش روبہ عمل ہوگی تو میں حضور کو اس سے مطلع کر کے یہ مشورہ دیتا کہ حضور اس دن اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیں اور جب اس فرضی بادشاہ پر قاتلانہ حملہ کیا جاتا تو حضور کے پہلے ہی سے متعینہ سپاہی سازشیوں اور قاتلوں کو گرفتار کر کے حضور کے روبرو پیش کرتے۔ اس طرح حضور کو ان کے خلاف گواہی شہادت کے لیئے آدمی نہیں تلاش کرنے پڑتے لیکن اب؟ جہاں تک اس ناچیز کی سمجھ کا تعلق ہے یہ سمجھتا ہے کہ سیدی مولہ اور اس کے رفقائے کار کے خلاف میرے سوا ایک شہادت بھی نہ مل سکے گی اور شرعاً ایک گواہ کی شہادت ہی کیا، مجھے جھٹلایا بھی جا سکتا ہے۔"

بادشاہ نے افسوس سے کہا "خیر اب تو جو کچھ ہوا اس کا ملال بے سود ہے اب یہ بتاؤ کہ کیا تو اب بھی اس مکار اور دنیا دار فقیر سیدی مولہ کے خلاف لب کشائی کی ہمت رکھتا ہے؟"

"بالکل، حضور جب چاہیں اس کا امتحان لیں۔"

"تو سیدی مولا اس کے ساتھیوں کے سامنے اس سازش کا اقرار کرے گا؟"

"بالکل کروں گا۔ مجھے کس بات کا ڈر اور ایک حقیقت کو جھٹلانا کیا معنی؟"

بادشاہ نے پوچھا: "اس سازش میں کون کون شریک ہے؟"

امیر کاشانی نے جواب دیا: "برناتھن، بلبنی عہد کا شہر کوتوال ہتیا پائک، بلبنی دربار کا پہلوان، ان دونوں کے علاوہ غالباً پچھلی حکومتوں کے بعض امرا، خان زادے اور شاہی خاندان کے افراد بھی شریک ہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "ہم ان سب کی گرفتاری کا فرمان اسی وقت جاری کیے دیتے ہیں اگر تو نے سازش کے عینی اور شریک گواہ کی حیثیت سے بیان نہ دیا تو تیری بھی خیر نہیں۔"

امیر کاشانی نے جھک کر بادشاہ کے قدموں میں زمین کو بوسہ دیا اور کھڑے ہو کر عرض کیا: "اور اگر اس ناچیز نے اس دنیادار حریص فقیر سیدی مولہ کے خلاف گواہی دے دی تو جہاں پناہ انعام کیا عطا فرمائیں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "صلے میں تجھے بدایوں کا قاضی بنا دیا جائے گا۔"

امیر کاشانی نے بادشاہ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

اسی وقت سیدی مولہ، برناتھن اور ہتیا پائک کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ آناً فاناً ان سب کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔ سیدی مولہ کو رسیوں سے جکڑ کر بادشاہ کے روبرو کھڑا کر دیا گیا۔ بادشاہ سے کچھ فاصلے پر سیدی مولہ کے دائیں جانب امیر کاشانی شاہی رعب اور جلال سے مؤدبانہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ شاہی نقیب نے باآواز بلند سیدی مولہ کو ان کا جرم بتایا جس سے سیدی مولہ نے صاف انکار کر دیا۔

بادشاہ نے غصے میں کہا: "او دنیادار مکار درویش تو جھوٹا ہے۔"

سیدی مولہ نے تحمل سے جواب دیا: "ہم جھوٹ نہیں بولتے بادشاہ کو غلط فہمی ہو گئی ہے یا شاہی مخبروں نے بادشاہ کو صحیح خبر نہیں پہنچائی۔"

بادشاہ نے امیر کاشانی کو حکم دیا: "تو سازش کے عینی اور شریک گواہ کی حیثیت سے جو کچھ جانتا ہے صاف صاف بیان کر دے۔"

امیر کاشانی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "یہ ناچیز خدا کو حاضر و ناظر جان کر

عرض کرتا ہے کہ سیدی مولہ پر جو جرم عائد کیا گیا ہے وہ صد فی صد درست ہے سیدی مولہ نے فدائیوں کی مدد سے جہاں پناہ کو قتل اور خود سریر آرائے سلطنت ہونا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اس خاکسار کو ملتان کی ولایت عطا فرمانے کا وعدہ کیا تھا۔

سیدی مولہ نے سختی سے انکار کیا۔ "کاشانی! تو حقیقت حال سے باخبر ہے اور تو ہی جھوٹ بول رہا ہے، خدا سے ڈر، یہ بہت بری بات ہے۔"

امیر کاشانی نے مزید کہا۔ "اس ناچیز نے جو کچھ کہا ہے خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کیا ہے۔"

بادشاہ نے مفتیان دین سے پوچھا۔ "کیا جلال کاشانی کے بیان پر سازشیوں کو سزا دی جا سکتی ہے؟"

درباری مفتی نے جواب دیا۔ "نہیں، جلال کاشانی کی شہادت حتمی اور معتبر نہیں قرار دی جا سکتی۔"

بادشاہ بے بس ہو گیا، اس نے مشورہ طلب کیا۔ "پھر ہمیں اس سلسلے میں کیا قدم اٹھانا چاہیئے؟"

مفتی نے جواب دیا۔ "جب تک سیدی مولہ اور شرکائے سازش پر جرم ثابت نہ ہو جائے ان کے خلاف کوئی تعزیری قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔"

بادشاہ نے حکم دیا۔ "جب تک سیدی مولہ اور ان کے ساتھیوں کی سازش کا جرم ثابت نہ ہو اور کوئی ایک معقول اور مستند طریقہ کار نہ دریافت ہو جس سے جرم کی قطعی تصدیق ہو جائے انہیں قید خانے میں رکھا جائے۔"

سیدی مولہ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ برنا تھن اور ہتیا پائک پہلے ہی قید میں پڑے ہوئے تھے۔

کئی دن کے غور و فکر کے بعد بادشاہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزموں کو آگ کے الاؤ میں سے گزار کر جھوٹ سچ کی تصدیق کرائی جائے۔ جب حکم کی تعمیل میں آگ روشن کی جا چکی تو بادشاہ نے اعلان کیا کہ اس آگ پر سے سیدی مولہ اور ان کے رفقاء کو گزارا جائے اگر وہ اس پر سے صحیح سلامت گزر جائیں گے تو انہیں سچا

مان لیا جائے گا لیکن اگر وہ جل مریں گے تو گویا اس طرح وہ کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔

بادشاہ کے لئے آگ کے الاؤ کے قریب ایک خاص کوشک تعمیر کرائی گئی جس میں بادشاہ نے اپنے امرا، اعزا اور خواتین کے ساتھ قیام کیا ان میں مفتیان دین علما اور مشائخ بھی موجود تھے اس عبرتناک نظارے کو دیکھنے کے لئے ہزاروں شہری بھی وہیں پہنچ گئے۔

سیدی مولہ، برناتھن اور ہتیا پائک شاہی کوشک کے سامنے ڈال دیے گئے۔

بادشاہ نے ایک بار پھر مفتیان دین، علمائے کرام اور مشائخ عظام سے فتویٰ طلب کیا اور پوچھا "کیا ان ملزموں کو ان کے جرم کی تصدیق یا تکذیب کے لئے آگ کے الاؤ پر سے گزارا جانا جائز ہے؟"

تمام علما، مشائخ اور مفتیان دین نے بیک زبان کہا: "آگ کا کام جلانا ہے ملزم حق پر ہوں یا ناحق پر، آگ سے گزریں گے تو جل جائیں گے۔"

بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا: "پھر ان سے ان کے جرم کی تصدیق کس طرح کرائی جائے؟"

علماء نے جواب دیا: "بہر حال یہ طریقہ ناجائز ہے۔"

بادشاہ نے ایک گرز بردار کو حکم دیا: "بلبنی پہلوان ہتیا پائک کو گرز کی ضربات سے ہلاک کر دیا جائے۔"

گرز بردار دیوانہ وار آگے بڑھا اور ہتیا پائک پر گرز کی مسلسل ضربات لگا کر چپ کر دیا، دم توڑتے ہتیا پائک کی خوفناک اور دلدوز چیخوں سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

اس کے بعد بادشاہ نے شاہی فیل بان کو حکم دیا "برناتھن پر سے ہاتھی گزار دیا جائے۔"

فیلبان نے ہاتھی کی گردن میں آنکس اتار دیا۔ ہاتھی چنگھاڑ مار کر تیزی سے برناتھن کی بڑھا اور چشم زدن میں اسے روند کر آگے بڑھ گیا فیلبان نے ہاتھی کو موڑ کر ایک بار پھر برناتھن پر سے گزار دیا۔ یہ عمل کئی بار دہرایا گیا۔ یہاں تک کہ برناتھن کی لاش ہتیا پائک کی لاش سے زیادہ مسخ ہو گئی۔ شہری اور شاہی متعلقین اس دلدوز

منظر کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔

اب سیدی مولہ کی باری تھی۔ بادشاہ نے سیدی مولہ سے سوال جواب شروع کر دیے۔ سیدی مولہ نے بادشاہ کے سوالات کے جوابات نہایت بے باکی اور بے خوفی سے دیے۔ اسی دوران اس عہد کے درباری شیخ ابوبکر طوسی حیدری اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے بادشاہ نے انہیں اپنے قریب بلایا اور شکایتاً کہا "شیخ! آپ ذرا سیدی مولہ کو ملاحظہ فرمائیں آپ خود بھی درویش ہیں اور سیدی مولہ بھی درویش ہے دیکھیے تو سہی اس درویش نے ہمارے خلاف کیسا خطرناک منصوبہ بنایا تھا، اگر منصوبے میں یہ شخص کامیاب ہو جاتا تو آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ ملک میں کیسا فتنہ و فساد برپا ہو جاتا"۔

شیخ طوسی حیدری نے پوچھا "بادشاہ کا اس شکایت سے منشا کیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا "انصاف، صرف انصاف اس شخص کو ہم خود کوئی سزا نہیں دینا چاہتے یہ درویش ہے اسے آپ جیسا درویش ہی کوئی سزا دے سکتا ہے یا جیسا مناسب سمجھیں فیصلہ صادر فرمادیں"۔

ابھی طوسی حیدری نے اپنا فیصلہ سنایا بھی نہ تھا کہ اس کا ایک مرید جیب سے اُسترا اور جوال دوز (بوری سینے کا سُوا) نکال کر سیدی مولہ پر جھپٹا اور اُن پے در پے کئی وار کر کے زخمی کر دیا۔ بندھے ہوئے سیدی مولہ نے بلند آواز میں بادشاہ سے کہا "بادشاہ! ہم اپنی موت سے ہراساں نہیں ہیں اب بھی وقت ہے کہ ہمیں ہماری خانقاہ میں پہنچا کر آنے والی مصیبت سے نجات حاصل کی جائے"۔

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا اور طوسی حیدری کا مرید بدستور اُسترے اور سُوئے کے زخم لگاتا رہا۔ جب سیدی مولہ زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تو آخری بار بادشاہ کو متنبہ کیا "بادشاہ! ہمیں اپنی موت کا کوئی غم نہیں کیونکہ ہمیں تمام ذی حیات کی طرح ایک نہ ایک دن تو موت کا مزہ چکھنا ہی تھا لیکن تجھے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور یہ ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا، تجھے نہیں معلوم کہ درویش کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں"۔

بادشاہ خاموشی سے یہ عمل دیکھ رہا تھا، اس کے قریب ہی شہزادہ ارکلی خان

بیٹھا تھا چونکہ سیدی مولہ نے اس کے بڑے بھائی اختیار الدین خاں خان خاناں کو بیٹا بنالیا تھا اس لئے ارکلی خان سیدی مولہ سے نفرت کرتا تھا اسے شبہ گزرا کہ شاید بادشاہ سیدی مولہ کو معاف کر دے گا اس لئے اس نے فوراً ہی فیلبان کو اشارے سے حکم دیا کہ سیدی مولہ کو ہاتھی سے کچل دیا جائے۔

فیلبان نے ہاتھی کو انکس مار کر سیدی مولہ پر چڑھا دیا اور پلک جھپکتے ہی سیدی مولہ کی روح پرواز کر گئی۔

شہریوں نے آہ و فغاں بلند کی۔ ابھی بادشاہ اور شہری واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ سیاہ آندھی نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور لوگ پاگلوں کی طرح پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنے اور آپس میں متصادم ہونے لگے۔

جب بادشاہ محل میں واپس پہنچا تو پتہ چلا کہ ولی عہد خان خاناں بیمار پڑ چکا ہے شاہی اطبا علاج میں لگ گئے لیکن یہ مرض علاج کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ خان خاناں وفات پاگیا، بادشاہ پر ولی عہد شہزادے کی موت قیامت کی طرح گزر گئی۔

امیر کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔



سیدی مولہ کی خانقاہ سونی ہو گئی، تنور بجھ گئے، ہزاروں متوسلینِ خانقاہ بے آسرا ہو گئے۔ ہزاروں خاندان بھوکوں مرنے لگے اسی سال شہر میں زبردست قحط پڑا اور شہر پر موت کے سائے منڈلانے لگے۔ ہزاروں آدمیوں نے فاقے کی موت پر جمنا میں ڈوب مرنے کی موت کو ترجیح دی۔

اس واقعے کے چند سال بعد جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد علاء الدین اس سے ناراض یا خوف زدہ کر الہ آباد میں رہنے لگا۔ بادشاہ نے اسے منانے اور واپس بلانے کی بہتیری کوشش کر ڈالیں، لیکن علاء الدین واپسی پر رضا مند نہ ہوا۔ علاء الدین نے بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ خود تشریف لائیں اور غلام کو پابجولاں واپس لے جائیں اس کے ساتھ ہی علاء الدین نے اپنے خسر اور چچا بادشاہ کو یہ بھی لکھا کہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے جو سونا اور جواہر جمع ہیں انہیں بھی حاصل کر لیں۔

بادشاہ بعجلت دریائی سفر سے الہ آباد روانہ ہو گیا علاء الدین مانک پور میں اس کا منتظر تھا۔ دریا کی سطح پر اسے جیسے ہی شاہی چتر نظر آیا وہ بادشاہ کے استقبال کو آگے بڑھا یہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی ۔ اس وقت بادشاہ تلاوت کلام پاک میں مشغول تھا علاء الدین نے نہایت ادب سے بادشاہ کا استقبال کیا اور اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر آنسو بہانے لگا ۔

بادشاہ نے پیار سے بھتیجے کے گال پر ایک چپت رسید کر دی اور کہا " ہم نے تجھے کتنے لاڈ اور پیار سے پال پوس کر بڑا کیا ہے اور ہمیشہ تجھے اپنے حقیقی بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھا ، تیرے بچپن کی بو ہمارے لباس میں ابھی تک محفوظ ہے پھر یہ کیا بات کہ تو ہم سے بدظن اور بدگمان ہے "

اس کے بعد بادشاہ نے علاء الدین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلنے کے لئے قدم اٹھائے ۔

علاء الدین نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا ۔ سمانہ نامی علاء الدین کے سپاہی نے بادشاہ پر تلوار کا وار کیا ۔ بادشاہ کی چیخ نکل گئی ، دلدوز آواز میں کہا " اے بدبخت علاء الدین یہ تو نے کیا کیا "

لیکن ایک دوسرے سپاہی نے بادشاہ کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہ دیا ، اس نے بادشاہ کو پچھاڑ دیا اور سینے پر چڑھ کر نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا پھر سر کاٹ کر علاء الدین کی خدمت میں پیش کر دیا ۔

بادشاہ کے تمام ساتھی بھی قتل کر دیے گئے اور علاء الدین نے اسکندر ثانی السلطان الاعظم ، علاء الدنیا والدین محمد شاہ خلجی کے نام اور لقب سے ہندوستان کا اقتدار سنبھالا ۔

ارکلی خان جس نے سیدی مولہ پر ہاتھی چڑھوایا تھا ، جب علاء الدین کے قابو میں آگیا تو اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروا دی گئیں اور زندگی بھر کے لئے قید کر دیا گیا نہ صرف ارکلی خان کو یہ سزا دی گئی بلکہ علاء الدین خلجی نے جلال الدین خلجی کے کسی وارث کو بھی معاف نہیں کیا اور چند ہی دنوں میں بادشاہ کا خاندان نیست و نابود ہو گیا ۔

بابا فرید نے سیدی مولہ کو متنبہ کیا تھا کہ " امراء و حکام کی صحبتیں تمہیں راس نہیں آئیں

گی بلکہ ڈٹے رہو کہ یہ تمہیں ہلاکت کی طرف لے جائیں گی۔

لیکن سیدی مولہ نے اپنی خانقاہ میں لنگر خانہ عام جاری کر کے بلا تخصیص بے سہاروں اور بھوکوں میں رزق کی تقسیم شروع کر دی تھی اس میں عوام بھی آتے تھے اور شاہی ملازمین اور حکام بھی۔ وہ خدا کو رب العالمین سمجھتے تھے، رب المسلمین نہیں اور اپنے اس اعتقاد اور یقین میں اتنے راسخ اور مضبوط تھے کہ دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر خدا کی مشیت یہی ہے کہ میں بابا فرید کی تنبیہ کے مطابق ہلاک کر دیا جاؤں تو مجھے مشیت الٰہی میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔

چنانچہ وہ مشیت الٰہی پر قربان ہو گئے لیکن کچھ عرصے بعد بادشاہ کو بھی اسی طرح اپنی عبرت ناک موت کو خوش آمدید کہنا پڑا۔



حضرت ولایت شاہ رحمۃ اللہ علیہ

مدینہ منورہ سے سید سلیمان بن سید حسن الحسینی نامی ایک بزرگ ہندوستان میں داخل ہوئے اور شمالی ہندوستان میں بارہ بنکی کے ردولی نامی قصبے میں سکونت پذیر ہو گئے حکومت نے انہیں انعام واکرام اور بخشش وعطا سے اتنا نوازا کہ یہ بہت جلد صاحب ثروت اور اہل جائداد ہو گئے۔ یہیں ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔ ان کی آخری اولاد علاء الدین نامی ایک بچہ تھا۔ یہ ابھی پانچ چھ سال ہی کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ علاء الدین کے دوسرے بھائی جوان یا نوجوان تھے وہ چاہتے تو مل جل کر رہتے اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی کفالت میں لے لیتے لیکن ان کے ارادے کچھ اور تھے۔

ماں اپنے جوان بیٹوں کی باہمی سرگوشیوں اور نظروں کے تیور سے کچھ خطرات محسوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے بیٹوں کو حکم دیا: "نماز عشاء کے بعد تم سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں چند نصیحتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

خود غرض اور لالچی بیٹے دلوں میں کھوٹ اور چہروں پر سعادت مندی کے آثار لیئے عشاء کی نماز کے بعد ماں کی خدمت میں حاضر ہو گئے ماں کڑکڑاتی سردی میں کمرے کے دروازے بند کئے لحاف میں دبکی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی گود میں علاؤ الدین تھا بیٹے مسمسی صورت بنائے سامنے کے تخت پر بیٹھ گئے۔

ماں نے انہیں بغور دیکھا اور ان کی قلبی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سب سے بڑے بیٹے نے کھنکار کر سوال کیا: "اماں! آپ نے ہمیں کس لیئے یاد فرمایا ہے؟"

ماں نے نہایت پرسوز آواز میں کہا: "میرے بیٹو! تمہارا باپ مدینہ منورہ سے یہاں آیا تھا۔ تمہارا نسب حسنی الحسینی ہے۔ اس خاندان کی کچھ عظیم الشان روایات ہیں۔ ایکا اور اتحاد، اگر تم واقعات کربلا پر غور کرو گے تو تمہیں بھائی بہنوں اور چچا بھتیجوں وغیرہ کے بے مثل اتحاد اور یگانگت کی ایک ایسی مثال ملے گی جو تمہیں کہیں اور نہیں نظر آئے گی۔"

بڑے بیٹے نے اکتا کر کہا: "اماں! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں اس طولانی تمہید سے تو ہمارے

سروں میں درد ہونے لگا ہے۔"

دوسرے بھائی نے کہا "کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم اپنی خاندانی روایات تک سے واقف نہیں"

ماں نے قطع کلام ہو جانے سے دکھ محسوس کیا لیکن ضبط کر گئیں، بولیں: "میرے بیٹو! تمہارے باپ نے کافی املاک اور نقدی چھوڑی ہے میں چاہتی ہوں کہ تم سب مل جل کر رہو اور اپنے چھوٹے بھائی علاء الدین کی سرپرستی قبول کرو، یہ تمہاری محبت اور خلوص کا بھوکا ہے اور اپنے باپ کی املاک اور نقدی میں برابر کا حصہ دار ہے۔"

بڑے بھائی نے ریاکاری سے جواب دیا "علاء الدین ہم سب کا بھائی نہیں بیٹا ہے آخر آپ ہماری طرف سے بدگمان کیوں ہیں ہم اسے اپنی آنکھ کا تارا بنا کے رکھیں گے، آپ ہرگز فکر مند نہ ہوں۔"

اور یہی کلمات تقریباً ہر بھائی نے باری باری ادا کئے لیکن ماں کو معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئیں۔

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ کچھڑی داڑھی والا چالیس پینتالیس سالہ رسول بخش بچپنے سے اس خاندان کی خدمت کر رہا تھا، وہ علاء الدین کو گود میں لے کر اِدھر اُدھر نکل جاتا اور سیر و تفریح کراتا رہتا۔ ایک دن وہ علاء الدین کو امرودوں کے باغ سے لئے چلا آ رہا تھا کہ راہ میں علاء الدین کا سب سے بڑا بھائی مل گیا۔ اس نے علاء الدین کو محبت سے گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ پھر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور رسول بخش کو ایک طرف لے گیا، کہنے لگا "رسول بخش! کیا تجھے نہیں معلوم کہ امرودوں کے باغ کے آس پاس کہیں ایک بھیڑیا موجود ہے جو آبادی کے کئی بچوں کو اٹھا لے جا چکا ہے۔"

"معلوم ہے" رسول بخش نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "لیکن میں اسے باغ کی طرف اس وقت لے جاتا ہوں جب اس کے آس پاس کے کھیتوں میں کام شروع ہو چکا ہوتا ہے اور باغ کے رکھوالے طوطوں اور دوسرے پرندوں سے باغ کی رکھوالی کر رہے ہوتے ہیں۔"

بڑے بھائی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "اگر تو چاہے تو تجھے دس بیگھ زمین اور دو سو روپے فوراً مل سکتے ہیں۔"

رسول بخش کی طمع سے آنکھیں کھل گئیں، پوچھا "اگر ایسا ہو جائے تو آپ کا یہ غلام شادی کرنے کے لائق ہو جائے گا اور زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتا رہے گا۔"

علاء الدین نے تنہائی کی وجہ سے منہ بنانا شروع کر دیا اور بسورتے ہوئے رسول بخش کو آواز دی۔

بڑا بھائی غصے سے علاء الدین کی طرف بڑھا اور دو طمانچے رسید کر دیے "مرا کیوں

جاتا ہے، باتیں تک نہیں کرنے دیتا تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا رہ، ورنہ مار مار کے بھیتھن نکال دوں گا تیرا۔ میں بے جا محنت کا قائل نہیں ہوں۔"

علاء الدین سہم گیا۔ بڑا بھائی رسول بخش کے پاس واپس گیا بولا "رسول بخش! بس تجھے یہ کرنا ہے کہ تو ایک دن صبح سورج نکلنے سے پہلے علاء الدین کو سیر و تفریح کرانے اس باغ میں لے آ، میں یہاں پہلے سے موجود ہوں گا۔ تو علاؤ الدین کو میرے حوالے کر کے "بھیڑیا بھیڑیا" چیختے، خوف زدہ ہو کر بھاگ جانا اور ہر شخص سے یہی کہنا کہ علاء الدین کو بھیڑیا لے گیا۔"

رسول بخش کو کچھ تامل ہوا۔ بڑا بھائی سمجھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے۔ دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر تو نے میری تجویز پر عمل کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں تجھے دس کے بجائے بیس بیگھہ اور دو سو کے بجائے چار سو روپے دے دوں لیکن اگر تو نے میری بات نہ مانی اور اس کا دوسروں پر اظہار بھی کر دیا۔ تو یہ سمجھ لینا کہ تو قتل کر دیا جائے گا۔"

رسول بخش نے بے بسی سے کہا "صاحب! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میرے بعد علاء الدین کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

بڑے بھائی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا "میں جو کچھ کروں گا اس میں سارے بھائیوں کی مرضی شامل ہے میرے پاس شیر کا پنجہ موجود ہے۔ میں انگلیوں میں شیر کا پنجہ پھنسا کے علاء الدین کا پیٹ اس طرح چاک کروں گا اور اس کی پشت اور چہرے کو کچھ اس طرح نوچ نوچ کر زخمی کر دوں گا کہ بعد میں دیکھنے والے ہرگز یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ علاء الدین کو بھیڑیے نے نہیں ہلاک کیا۔"

رسول بخش نے اپنے خوف کو نہایت ضبط اور احتیاط سے چھپائے رکھا۔ پوچھا "لیکن صاحب! آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

بڑے بھائی نے قدرے ترشی سے کہا "ہر چند تجھے اس قسم کے سوال و جواب کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی چونکہ میں نے تجھے اپنے اعتماد میں لیا ہے اس لئے میں محدود حد تک تیرے چند سوالات کے جوابات ضرور دوں گا۔"

رسول بخش کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں لیکن وہ بڑے ضبط سے سیدھے کھڑے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑے بھائی نے کہا "ہاں تو تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ تو سن لے باپ کے انتقال کے بعد جو جائداد املاک اور زمین ہم سب کے حصے میں آئی ہے اس کے حصے بخرے میں بڑی زحمت پیش آ رہی ہے اگر اس میں سے علاء الدین کا حق نکال دیا جائے تو پھر بھائیوں میں بڑی آسانی سے

ترکہ یا ورثہ تقسیم کیا جا سکتا ہے پھر ہم سب کو یہ شبہ بھی ہے کہ علاء الدین ہماری ماں کا بیٹا نہیں ہے ہمارے باپ نے کوئی خفیہ شادی کر رکھی تھی۔ علاء الدین اس کا بیٹا ہے پھر جب علاء الدین کی ماں کا انتقال ہو گیا تو باپ نے علاء الدین کو میری ماں کے حوالے کر دیا۔ میری شریف النفس ماں نے اپنی سوت کی اولاد کو بالکل اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا شروع کر دیا۔ یہ ہے اصل واقعہ، جس کا ہم بھائیوں اور ماں کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں ہے۔"

رسول بخش کو بڑے بھائی کے اس زبردست جھوٹ پر بڑی حیرت ہوئی وہ بچپن سے اسی گھر میں رہ رہا تھا اسے اس گھر کی ایک ایک بات کا علم تھا یہ جھوٹا واقعہ جس کا بڑے بھائی نے نہایت سنجیدگی سے اظہار کیا تھا اس کے لئے قطعاً ناقابل یقین تھا کیونکہ وہ دائی جس نے علاء الدین کی پیدائش میں خدمت کی تھی بقید حیات تھی اور اب بھی مختلف تیوہاروں اور تقریبوں کے موقعوں پر حاضری دے کر اپنا حق لے جایا کرتی تھی لیکن رسول بخش کے فرار کی کوئی راہ بھی تو نہ تھی۔

بڑے بھائی نے ترش روئی سے پوچھا "تو میری تجویز پر کب عمل کر رہا ہے؟"

رسول بخش نے جواب دیا "ایک ہفتہ بعد، کیونکہ آپ کی تجویز پر عقل مندی سے کام کرنے کیلئے مجھے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے" بڑے بھائی نے کہا۔ آج سہ شنبہ (منگل) ہے اگلے چہار شنبہ (بدھ) تک کا تجھے موقع دیا جا رہا ہے۔ پنج شنبے کو تو علی الصباح علاء الدین کے ساتھ اس باغ میں مجھے ملیگا۔"

رسول بخش نے جواب دیا "بہت بہتر جناب! آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہو گی لیکن یہ بھی تو بتایئے کہ انعام کا روپیہ اور زمین ہمیں کب ملے گی؟"

بڑے بھائی نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "دو سو روپے تم مجھ سے کل ہی لے لینا، بقیہ روپے اور زمین تمہیں کام ہو جانے کے بعد ملے گی۔"

رسول بخش نے خوش ہو کر کہا "پھر تو میں پوری طرح تیار ہوں جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

بڑے بھائی نے اپنی راہ لی اور رسول بخش علاء الدین کو گود میں اٹھا کر گھر چلا گیا۔

بڑے بھائی نے حسب وعدہ دوسرے دن رسول بخش کو دو سو روپے دے دیے۔ روپے پا کر اس کے چہرے پر ایسی تازگی چھا گئی، گویا جوانی واپس آ گئی ہو، تمام بھائی اس کی نگرانی کر رہے تھے کہ کہیں وہ اس منصوبے کو ماں پر نہ ظاہر کر دے لیکن رسول بخش کا بشاش رویہ اور ہر دم مسکراتے

رہنے کا انداز انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ رسول بخش حرص و طمع کے دام میں پھنس چکا ہے
جمعے کو اوّل پہر جبکہ سب بھائی اِدھر اُدھر کام میں مصروف تھے اور نمازِ جمعہ سے پہلے پہلے ضروری کام
نپٹانے میں لگے ہوئے تھے رسول بخش نے بڑے بھائی کے منصوبے کا ذکر ماں کے سامنے کر دیا
اور کہا۔ " اماں ! اب بہتری اسی میں ہے کہ مجھے جو دو سو روپے پیشگی ملے ہیں انہیں لے کر ہم تینوں
یہاں سے چپ چاپ نکل چلیں کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم اب بھی یہاں رہے تو چھوٹے
بھیا علاء الدّین اور میں خود کسی نہ کسی طرح ہلاک ضرور کر دیے جائیں گے "

ماں کانپ گئیں ، لرز کر بولیں " اگر علاء الدّین کے بھائی برادرانِ یوسفؑ بن چکے ہیں تو
ہمیں واقعی مجبوراً یہاں سے چلا جانا پڑے گا ، ہم اپنے علاء الدّین کو یوں ہرگز نہ مرنے دیں گے "

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ لوگ جائیں تو جائیں کہاں ؟ بہت غور و فکر کے بعد ماں نے اتنی
دور چلے جانے کا ارادہ کر لیا جہاں ان کے بڑے بیٹوں کی رسائی بہت مشکل تھی ۔ مدینہ منوّرہ
واپس چلے جانے کا ارادہ ۔۔۔ وہاں ان کا خاندان موجود ہی تھا ۔

پیر کی رات کو جبکہ ان کے سارے بیٹے اپنے اپنے لحافوں میں گھسے گہری نیند کے مزے
لے رہے تھے ۔ ماں نے علاء الدّین کو شال میں لپیٹ کر گود میں لے لیا ۔ رسول بخش نے تیز رفتار
بیل گاڑی کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا تھا ۔ تینوں اس پر سوار ہوئے رسول بخش بیل کو خود ہی
ہانک رہا تھا ۔ یہ تینوں صبح ہوتے ہوتے جنوب مغرب میں اتنی دور جا چکے تھے کہ برادرانِ یوسف
انہیں بآسانی نہیں پا سکتے تھے اور اس صورت میں کہ انہیں ان تینوں کی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا ۔ ان کا
تعاقب کس سمت میں کرتے ۔

یہ تینوں بدقّت تمام سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے جدّے کے لیے روانہ ہو گئے
کنارے کنارے چلنے والا جہاز انہیں جدّے تک لے گیا جدّے سے انہوں نے مکّے کا رُخ کیا ۔ خانہ کعبہ
میں حاضری دے کر ماں نے علاء الدین کے حق میں دُعائیں کیں اور یہاں سے مدینہ منورہ چلی گئیں ۔
وہاں ان کا بہت بڑا کنبہ موجود تھا اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ علاء الدّین دیارِ نبیؐ میں پرورش
پانے لگے ۔

ننھے علاء الدّین کو بھی اصل واقعات کا کسی حد تک علم ہو چکا تھا ۔ دولت ، املاک ،
روپیہ اور جائداد کیسی چیزیں ہیں جس کے لیے لوگ انسان کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں ؟ اکثر تنہائی
میں یہ سوال دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا ۔ یہ رسول اللہؐ کے مزار پر
حاضری دیتے اور ننھے منے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتے کہ " یا رسول اللہؐ ! دولت اور املاک کی محبت

کے ناپاک جذبے سے میرے دل کو محفوظ رکھیئے ، میں آپ سے اس کی پناہ مانگتا ہوں ۔"

دل کی گہرائیوں اور معصوم زبان سے نکلی ہوئی دعائیں بابِ اجابت کو پہنچیں اور علاء الدین کے دل کو دولت اور مال کی حرص و طمع کی آلائش سے محفوظ کر دیا گیا ۔

علاء الدین مدینے کے اساتذہ کی خدمت میں بٹھا دیئے گئے اور تعلیم حاصل کرنے لگے ۔ زندگی سکون سے گزرنے لگی ۔ ماں کو اپنی وہ اولادیں بھی یاد آتیں جن کی شقاوت سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے ہندوستان کو خیر باد کہا تھا وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اُداس ہو جاتیں آنکھیں بھیگ جاتیں دوپٹے کے آنچل سے انہیں پونچھتیں اور زبردستی دنیاداری میں اُلجھ کر سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتیں ۔ ان کی زندگی ایک غمکدہ تھی ۔ ایک ایسا غمکدہ جو موت کی طرح ناقابل رد، اٹل اور لازمی تھا ۔ علاء الدین کے لئے انہوں نے ساری اولادیں چھوڑ دیں اگر وہ چاہتیں تو علاء الدین کو قربان کر کے وہ ساری اولادوں کی قربت حاصل کر سکتی تھیں لیکن مشیت ایزدی ایسا نہیں چاہتی تھی وہ وہی چاہتی تھی جس پر انہوں نے عمل کیا ۔

ابھی درس کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ماں بیمار رہنے لگیں انہیں جو غم اندر ہی اندر کھا رہا تھا اب وہ روح سے جسم میں داخل ہو گیا تھا اور انہیں گھن کی طرح کھوکھلا کرنے لگا ۔ ادھر رسول بخش بھی اللہ کو پیارا ہو گیا ۔ علاء الدین کو اس کا بڑا دکھ ہوا ۔ کچھ عرصے بعد ماں بھی چل بسی ۔ علاء الدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔ اب تک دنیا نے انہیں دکھ ہی دکھ دیئے تھے دنیا سے نفرت میں اور اضافہ ہو گیا ۔ کچھ عرصے مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے مزار اقدس پر آخری بار حاضری دی اور رخصت کی اجازت چاہی ۔

مدینے سے نکل کر یہ طالب علم میں ایک استاد سے دوسرے استاد تک جاتے رہے اور علم کی پیاس بجھا کر اور آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ عرب سے نکل کر ایران میں داخل ہو گئے اور وقت کے بڑے بڑے علماء سے درس لیتے رہے ایران سے ہندوستان پہنچے اور دہلی میں حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دیکر چلہ کشی میں مصروف ہو گئے ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور لوگ انہیں مجذوب کہنے لگے کچھ عرصے بعد حضرت بختیار کاکیؒ نے انہیں عالم رویا میں آگرے جانے کا حکم دیا ۔ یہ تعمیل حکم میں آگرے چلے گئے اور جمنا کے کنارے قیام کیا ، ان کا چرچا ، ان سے پہلے ہی آگرے پہنچ چکا تھا ۔ یہاں لوگ انہیں گھیرنے لگے لیکن یہ ان پر کم ہی توجہ فرماتے خود بازار جاتے ، سودا سلف خریدتے اور واپس آکر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے ۔ اس وقت

جو بھی موجود ہوتا اسے اپنے کھانے میں شریک کر لیتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ کھانے پر بہت سارے لوگ جمع ہونے لگے یہ سب کے لیئے خود ہی کھانا پکاتے اور سبھی کو کھانے میں شریک کر لیتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس مشغلے نے ان کی عبادت و ریاضت میں فتور ڈال دیا۔

ایک دن دوپہر کے کھانے پر تقریباً پچاس آدمی حاضر تھے آپ نے سب کو پکا کر کھلایا اور پانی پلا کر بچ جانے والی روٹیاں ایک کپڑے میں لپیٹ لیں، کٹیا سے باہر نکلے اور کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیوں والا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آواز بھرا گئی گلا رندھ گیا باآواز بلند فرمایا۔ "اے جبرئیل تم کہاں ہو؟ اِدھر آؤ میرے پاس، اے میکائیل! کیا تم تک میری آواز پہنچ رہی ہے؟ اگر پہنچ رہی ہے تو تم بھی میرے قریب آؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے او اسرافیل! کیا تم نے میری آواز سنی؟ سن لی تو اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ تم بھی یہاں آجاؤ تم تینوں مقرب بارگاہ ایزدی ہو، مجھ عاجز و ناتواں کا حالِ زار بارگاہِ ذوالجلال میں عرض کر دو۔ اور کہو کہ یہ ذمہ داری جو مجھے سونپی گئی ہے کسی بہت بڑے ولی اللہ کے سپرد کر دی جائے، یہ عاجز اس بارِ عظیم کے اٹھانے کی خود میں سکت نہیں پاتا۔"

اتنا کہہ کر زار و قطار رونے لگے اور کچھ سکوت کے بعد مزید فرمایا۔ "اس خدمت کی وجہ سے میں عبادت نہیں کر سکتا۔ دن رات لوگوں کے نان و لقمے کے لیئے حیران و پریشان رہتا ہوں، آخر اس غلام کو کب تک خوار رکھا جائے گا؟"

اس کے بعد اٹھ کر وضو فرمایا اور کپڑے میں بندھی ہوئی روٹیاں کھول کر سامنے رکھ لیں انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے ہی ڈھیر لگا لیا اور پھر جو جانور بھی سامنے آیا اسے کھلانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس فیض عام سے طوطے، کوّے، کبوتر اور مینا تک محروم نہ رہے آخر میں چند ٹکڑے باقی بچے وہ خود کھا لیئے۔

یہ ابراہیم لودھی کا عہد تھا۔ اس نے ازراہ عقیدت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور وظیفہ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے ان کے سارے ارادت مندوں اور خادموں کا خرچ چلنے لگا لوگوں نے آپ کو علاء الدین کی نسبت سے محبت میں علاول بلاول کہنا شروع کر دیا ابراہیم لودھی کے بعض امراء جنہیں آپ کی دعاؤں کا فیض نہیں حاصل ہو سکا تھا، شاہ صاحب سے ناراض رہنے لگے۔ وہ جب بھی موقع ملتا ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ پرانی مثل کے مطابق کہ سو پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیاں بھی جلنے لگتی ہیں ابراہیم لودھی بھی چغلخوروں کی باتوں سے متاثر ہوا، پوچھا۔

کیا تم لوگوں کو حضرت علاول بلاول کی بزرگی میں کسی قسم کا شبہ ہے؟"

ایک حاسد امیر نے جواب دیا۔ "جہاں پناہ شبے کی بات کرتے ہیں اس ناچیز کی رائے میں تو وہ پکا دنیادار اور لالچی انسان ہے حضور کی خوش اعتقادی سے فائدے اٹھا رہا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "کیا ہم اس کا وظیفہ بند کر دیں؟"

"نہیں حضور والا!" ایک حاسد امیر نے جواب دیا۔ "حضور والا کی ذات چشمۂ جود و سخا ہے یک لخت پورا وظیفہ بند کر دینا حضور والا کی شانِ کریمی کے خلاف ہے ہاں اس میں تخفیف ضرور کی جا سکتی ہے۔"

بادشاہ نے فی الفور حکم صادر کر دیا "علاول کے وظیفے میں دو تہائی کی کمی کر دی جائے"

جب یہ کل وظیفے کی ایک تہائی رقم لے کر شاہی خدمت گار آپ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو اس کمی کا علم ہوا تو ہنس کر فرمایا "بابا! تو ایسا کہاں کا رازق ہے تو تو درمیان کا واسطہ ہے ہمارا حق مار کے تو بد دیانتی اور خیانت کا مرتکب ہوا، اب یہ خائن زیادہ دن حکومت نہیں کر سکے گا۔ ہم کوئی دوسرا بندوبست کرتے ہیں!" اس کے بعد شاہی خدمتگار سے فرمایا "اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دو ہم نے اس کی مدتِ سلطنت میں دو تہائی کی کمی کر دی اور اس کی جگہ کابل سے دوسرے امانت دار کو طلب کر لیا ہے!"

خدمت گار نے مارے ڈر کے شاہ صاحب کا یہ پیغام بادشاہ تک نہیں پہنچایا۔

کچھ ہی عرصے بعد آگرے میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ کابل سے فرغانہ کا خانہ بدوش فرماں روا ظہیر الدین بابر قسمت آزمائی کی غرض سے ہندوستان کی طرف چل پڑا ہے اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا، آندھی طوفان کی طرح بڑھا چلا آ رہا ہے۔

ابراہیم لودھی اپنی عظیم الشان فوج لے کر پانی پت پہنچ گیا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس مغل قسمت آزما کو پانی پت سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

اسی دوران حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلسلۂ چشت کا ایک گوہر آبدار حاضر ہوا اور نیازمندانہ انداز میں حضرت علاول بلاول کی بزرگی اور عظمت کا اعتراف کر لیا۔ آپ نے اسے نظر بھر کے دیکھا اور فرمایا "سلیم چشتی! ہم نے سیکری کے پہاڑ کو تمہارے لیے سونے کا کر دیا فرماں روایانِ وقت تیرے در پر حاضری دیں گے، ہم تجھے سیکری کی حکومت دیتے ہیں۔"

سلیم چشتی اسی وقت سیکری چلے گئے۔

پانی پت میں ابراہیم لودھی اور بابر کی افواج میں خوفناک مقابلہ ہوا جس میں ابراہیم لودھی نے شکست فاش کھائی اور بابر دہلی سے گزرتا ہوا آگرے میں داخل ہو گیا۔ نئے بادشاہ نے شاہ صاحب کی بڑی عزت کی اور ان کی رضاجوئی اور خوشنودی کو عین خوش قسمتی سمجھنے لگا۔

ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی اور فاتح ظہیر الدین بابر بستر علالت پر دراز موت اور زندگی کی کشاکش میں مبتلا تھا۔ اطبا اور حکما عاجز آ چکے تھے۔ کسی مصاحب نے دبی آواز میں عرض کیا۔ "صاحبان! جمنا کے کنارے ایک کٹیا میں علاء الدین نامی ایک خدا شناس ٹھہرا ہوا ہے، ہم سب کو اس سے مل کر دعا کی درخواست کرنی چاہیئے۔ ممکن ہے خداوند کی دعا سن لے۔"

مصاحب کے مشورے پر عمل کیا گیا اور ایک چھ نفری وفد حضرت علاء الدین کی کٹیا کے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر داخلے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اندر سے تلاوت قرآن پاک کی آواز آ رہی تھی۔

وفد کے سربراہ نے کہا۔ "حضرت شاہ صاحب! چند نیاز مند آپ کی قدم بوسی کی تمنا میں حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔"

اندر سے جواب ملا۔ "واپس جاؤ۔ چھوٹا بادشاہ بڑے بادشاہ سے ملاقات کر کے رہے گا۔"

وفد مایوسی کے یہ کلمات سن کر الٹے قدموں واپس گیا اور ولی عہد ہمایوں کو شاہ علاء الدین کا جواب سنایا۔

ہمایوں نے کہا۔ "آپ لوگ ایک بار پھر اس بزرگ کی خدمت میں واپس جائیں۔ ان اللہ والوں کو اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر یہ چاہیں تو کسی اور کی عمر کم کر کے قریب المرگ شخص کو زندگی بخش سکتے ہیں۔"

ولی عہد کی ہدایت پر وفد پھر شاہ علاء الدین کی کٹیا پہنچ گیا لیکن اب کٹیا خالی تھی وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ شاہی وفد ان کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گیا دور دور ان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وفد ان کی تلاش میں ناکام رہ کر ولی عہد کے پاس پہنچا اور اس کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا۔

ہمایوں نے گرج کر کہا۔ "تم لوگوں نے انہیں اس پاس دل جمعی سے نہیں تلاش کیا، ورنہ وہ ضرور مل جاتے۔"

وفد کے سربراہ نے اپنی رائے دی۔ "حضور والا! خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات

ہوتی تو ہم ہمت ہارنے والے نہیں تھے، ان سے ملنے اور ایک ہی مسئلے پر سوال و جواب کرنے میں ایک ڈر باقی رہتا ہے وہ یہ کہ کہیں ان کی زبان سے کوئی ایسا ویسا لفظ نہ نکل جائے جس سے نصیب دشمنان ملیہ سلطنت ہی ......"

ہمایوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہا: "اچھا خاموش رہو اور اس موضوع پر اب کوئی بات نہ کی جائے۔"

تھوڑی دیر بعد کول (علی گڑھ) سے ایک سوار آگرے میں داخل ہوا۔ وہ بادشاہ کی مزاج پرسی کے لئے آیا تھا اور علاء الدین کے ارادت مندوں میں داخل تھا۔ جب اس کے سامنے علاء الدین کی خدمت میں دوبارہ جانے کا ذکر آیا تو اس نے کہا: "وہ آگرے میں ہیں کہاں؟ انہیں تو میں کول میں حضرت جمال الدین العارفین کے پاس حوض کے کنارے چھوڑے آ رہا ہوں اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں آگرے جا رہا ہوں تو انہوں نے بادشاہ کے لئے یہ پیغام دیا ہے کہ بادشاہ سے کہو اس کا جس شہنشاہ سے ملاقات ہونے والی ہے اس میں وقت کی رد و بدل نہیں ہوتی ہو وقت طے پا گیا ہے اس پر حاضری ضروری ہے۔"

بابر کا انتقال ہو گیا اور ہمایوں نے اقتدار سنبھالا، علاء الدین ابھی تک کول ہی میں تشریف فرما تھے۔ ہمایوں نے ان سے آگرے واپس آنے کی درخواست کی لیکن وہ نہیں آئے۔ آخرکار ہمایوں نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر حضرت شاہ صاحب یوں تشریف نہیں لاتے تو بادشاہ خود حاضر ہوگا اور انہیں اپنے ساتھ واپس لانے کی ہر کوشش کر گزرے گا ہمایوں کی منت و حاجت کام کر گئی اور حضرت علاء الدین آگرے واپس آ گئے۔ لوگوں کا ہجوم انہیں پھر گھیرنے لگا۔

ایک دن ابراہیم لودھی کا وزیر اشرفوں کا طباق لے کر آدھی رات کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا: "حضور! کچھ میرے حق میں بھی دعا ہو جائے۔"

آپ نے یہ نذرانہ قبول نہیں کیا۔ فوراً خفگی سے حکم دیا: "اسے واپس لے جا، میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

سابق وزیر نے کہا: "حضرت! پھر میں کہاں جاؤں؟ آپ خود ہی سوچئے جس نے وزارت کی ہو، وہ نکما اور بیکار پھرے اس کے دل پر کیا بیتتی ہوگی؟"

آپ نے غصہ میں فرمایا: "لوگوں کے رزق پر ڈاکے ڈال اور وظیفہ کی رقموں میں کمی کر

پھر دیکھ خدا تجھے کیسی مکافات میں مبتلا کرتا ہے، تو یہ اشرفیاں واپس لے جا۔"

لودھی وزیر دل برداشتہ ہو کر اشرفیاں واپس لے گیا۔ اس کے چلے جانے کے تقریباً پون گھنٹہ بعد چار آدمی آپ کے پاس پہنچے اور اپنی چمچاتی چھریاں ہوا میں لہرا کر بولے۔ "او پاگل انسان! تو نے اشرفیوں کا طباق کیوں واپس کر دیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "وہ اشرفیاں کب تھیں، آگ تھی انہیں جو بھی چھوئے گا، جل مرے گا۔" پھر پوچھا۔ "تم کون ہو اور کیا لینے آئے ہو؟"

چاروں میں سے سب سے زیادہ وجیہہ اور متحرک شخص نے غصے سے آنکھیں نکال کر جواب دیا۔ "ہم لٹیرے ہیں اور آج ہمیں ہر جگہ ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔"

"اچھا!" آپ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ "اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہ اشرفیوں والا طباق دوبارہ منگا لیں اور اسے ہم ضرورتمندوں میں تقسیم فرما دیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہماری یہ چمچاتی چھریاں ہیں اور آپ ہیں۔ بے رُو رعایت پیٹ میں گھونپ دیں گے۔"

"اچھا ذرا صبح ہونے کا انتظار کرو۔" آپ نے جواب دیا۔ "ہم وہ اشرفیاں دوبارہ منگوا دیں گے۔"

اس رات لودھی وزیر نے خواب میں دیکھا کہ حضرت علاول بلاول فرما رہے ہیں۔ "بیٹے! وہ اشرفیوں والا طباق لے کر فوراً حاضر ہو جاؤ۔"

صبح فجر کے فوراً بعد لودھی وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر حاضر ہو گیا۔ آپ نے تھوڑی دیر بعد یہ اشرفیاں چاروں لٹیروں کے حوالے کر دیں اور ایک بار پھر فرمایا۔ "تم سب خوب اچھی طرح سن لو، ان اشرفیوں میں آگ ہے انہیں جو چھوئے گا جھلس جائے گا۔"

لٹیروں نے شاہ صاحب کی باتیں لاپروائی سے سُنیں اور اشرفیاں لے کر شراب خانے چلے گئے اور وہاں خوب ڈٹ کے شراب پی۔ جب نشے میں دھت مے خانے سے باہر نکلے تو انہیں اچانک اشرفیوں کی تقسیم کا خیال آ گیا ان کے سرغنہ نے کہا۔ "اب ہمیں یہ اشرفیاں بحصّہ مساوی آپس میں تقسیم کر لینی چاہئیں۔"

ایک نے جھومتے ہوئے کہا۔ "بے شک، لیکن اس بات کا بطورِ خاص خیال رہے کہ یہ مال میں نے بتایا تھا۔ اس لئے زیادہ حصے کا بھی میں ہی حقدار ہوں۔"

دوسرے نے اس خیال کی مخالفت کی۔ بولا "تو نہیں زیادہ حصے کا حقدار میں ہوں کیونکہ شاہ صاحب کو چھری دکھانے میں، میں سب سے آگے تھا اور یہ میری چھری ہی کا کرشمہ ہے جو شاہ صاحب نے خوفزدہ ہو کر اشرفیاں دوبارہ منگوا دیں۔"

تیسرے نے ان دونوں کو ڈانٹ دیا۔ کہنے لگا "تم دونوں زیادہ پی گئے ہو اور نشے میں دھت بہک رہے ہو، کیا تمہیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ ہمیشہ حصے بخرے میں کرتا رہا ہوں اور تم سب میری دیانت کے پیش نظر حصے سے کچھ زیادہ ہی دیتے رہے ہو۔"

چوتھا ہنسا اور نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا "میں تمہارا سردار ہوں، کیا نشے میں تم مجھے پہچان بھی نہیں رہے ہو؟ اپنے سردار کے ہوتے ہوئے ایسی بے سروپا اور فضول باتیں کر رہے ہو، سردار کا حصہ ہمیشہ زیادہ ہوا کرتا ہے۔"

سردار کی بات پر تینوں چھریاں کھینچ کر اس پر پل پڑے اور ذرا سی دیر میں اس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اس کے بعد یہ تینوں آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگے اور آخر تینوں ہی زخمی ہو کر سسکنے لگے جب شہر کوتوال موقعۂ واردات پر پہنچا تو ان قریب المرگ میں سے ایک نے اپنا نزاعی بیان دے کر ساری کیفیت شہر کوتوال کے گوش گزار کر دی اور مر گیا۔

کوتوال اشرفیاں لے کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا قصہ سنا کر اشرفیاں پیش کرنے لگا۔ آپ نے جواب دیا "اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ان میں آگ چھپی ہے جو چھوئے گا جل جائے گا۔"

کوتوال نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور گھر چلا آیا۔ کئی دن بعد شہر کوتوال کے گھر پر ڈاکہ پڑا۔ ڈاکوؤں نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور شہر کوتوال کو اس کے پورے کنبے کے ساتھ قتل کر دیا۔

مغل فرماں روا ہمایوں اپنے چند امرا کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ اس وقت آپ شاہ ولایت کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے آپ نے ایک نگاہ غلط انداز ہمایوں پر ڈالی اور حکم دیا۔ "بادشاہ اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔"

ہمایوں نے مطلب نہیں سمجھا حیرت سے پوچھا: "حضرت کیا فرما رہے ہیں؟ کچھ وضاحت سے فرما دیں۔"

آپ نے ترشی سے کہا "یہ میری صاف بات کا بھی مطلب نہیں سمجھتا، میں کہہ رہا ہوں

کہ تو یہاں سے اپنے وطن چلا جا۔ خدا ایک تجھ سے زیادہ لائق انسان کو چند سال حکمرانی کا موقع دینا چاہتا ہے۔"

ہمایوں گھبرا گیا۔ آپ نے ہمایوں کو بالواسطہ خبردار کیا "وہ بادشاہ سے کہہ دو، شیر کو پچھاڑنے والا آرہا ہے وہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔"

اِدھر یہ مکالمے ادا ہو رہے تھے دوسری طرف شیر خان سوری بہار سے مغرب کی طرف چلا آرہا تھا مقابلے پر جانے سے پہلے امراء نے کہا "ایک بار حضرت ولایت شاہ کی بارگاہ میں پھر حاضری دینی چاہیئے اور ان سے اس مقابلے کے لئے واضح حکم حاصل کرنا چاہیئے۔"

بیرم خان کی سرکردگی میں ایک وفد شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا حال سنا کے ان کی رائے طلب کی۔

آپ نے ناراضی سے فرمایا "میں دو مہینے سے یہ کہہ رہا ہوں کہ بادشاہ سے کہو اپنے وطن واپس چلا جائے۔"

بیرم خان نے کہا "لیکن حضور والا! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارا بادشاہ چند لٹیروں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے۔"

آپ نے فرمایا "احمق سردار! جب تو خود ہی کوئی فیصلہ کر چکا ہے تو پھر مجھ سے رائے لینے کیوں آیا؟ جا، جو تیرے جی میں آئے کر میں خاموش رہوں گا۔"

بیرم خان ڈر گیا، بولا "حضرت! یہ غلام تو آپ کا تابعدار ہے بھلا یہ میری مجال کہ آپ کے حکم کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔"

آپ نے کہا "تب پھر ہمارا فیصلہ ہی سچا اور اچھا ہے۔ اپنے بادشاہ سے کہو وہ یہاں سے پہلے ہی چلا جائے اس سے یہ بھی کہو کہ وہ مایوس نہ ہو، ہم اسے دوبارہ بلالیں گے۔"

"کتنے عرصے بعد؟" بیرم خان نے سوال کیا۔

آپ نے ترشی سے کہا "یہ مت پوچھو، جب جی میں آئے گا بلالیں گے۔"

اس کے بعد آپ خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن پاک کو گلے میں لٹکا کر آگرہ سے کہیں اور چلے گئے۔

ہمایوں کو جب آپ کے ارشادات کا علم ہو تو بہت بددل ہوا۔ امراء نے کہا "حضور والا یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب شہر اور حکومت پر کوئی برا وقت پڑنے والا ہوتا ہے تو حضرت

ولایت شاہ ترک سکونت اختیار کرتے ہیں، ان کا آگرے سے چلا جانا اچھی بات نہیں ہے !"

ہمایوں نے منور بیگ نامی ایک امیر کو حکم دیا "تم حضرت ولایت شاہ کے خادموں کو چالیس روپے اور اونٹ دیکر کہو کہ وہ کسی بھی طرح انہیں آگرے واپس لائیں "

ہمایوں یہ حکم دے کر قنوج روانہ ہو گیا کیونکہ شیر خان کی فوجیں وہاں سے آگرے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہی تھیں ۔ لوگ حضرت ولایت شاہ کو تلاش کرتے ہوئے وہیں پہنچ گئے ۔ جہاں وہ قیام فرما تھے، مریدوں نے عاجزی سے عرض کیا "حضرت شاہ صاحب، آگرے میں آپ کی جدائی کے غم میں ملائکہ اور شاہ پریاں بہت ملول ہیں اور رو رو کر بُرا حال کیے لے رہی ہیں ۔ براہ کرم وہاں تشریف لے چلیے "

حضرت ولایت شاہ صوفیا اور صلحا کو ملائکہ کہتے تھے اور پردہ نشین عبادت گزار خواتین کو شاہ پریاں کا خطاب دے رکھا تھا مرید بمشکل انہیں آگرے واپس لائے ۔

آدھی رات گزر چکی تھی، مریدوں نے دیکھا، حضرت ولایت شاہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانے لگے کسی مرید نے دریافت کیا "حضرت یہ روٹیاں کس کے لئے پکا رہے ہیں ؟"

غصے میں جواب دیا ۔ "بادشاہ کے لئے ۔ ہزار مرتبہ کہہ دیا تو اپنے وطن واپس جا لیکن نہیں مانتا ۔ اپنی سی کئے جاتا ہے آخر مجبور ہو کر زادِ راہ تیار کئے دیتا ہوں اب بھی نہیں مانے گا تو بہت پچھتائے گا "

تھوڑی دیر بعد چند گھڑ سوار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پہنچے، گھوڑے سے اتر کر آپ کی خدمت میں دو زانو ہو گئے آپ نے ان میں سے ایک پر نظریں جمائیں اور ترش سے کہا "کیا تمہیں میرا پیام نہیں ملا تھا کہ اب تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ ؟"

نووارد نے جواب دیا "حضرت آپ کا پیام مل تو ضرور گیا تھا لیکن خدا کے آخری فیصلے کے انتظار میں مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا ؟"

آپ نے پوچھا ۔ "پھر کیا ہوا ؟"

نووارد نے جواب دیا "ہمیں شکست فاش ہوئی اور شیر خانی لشکر بہت جلد آگرے میں داخل ہونے والا ہے "

جو روٹیاں پک چکی تھیں حضرت ولایت شاہ نے وہ نووارد کے حوالے کر دیں

اور حکم دیا۔" تو اسی وقت ایران چلا جا اور ان روٹیوں کو زادِ راہ سمجھ۔"

نووارد نے توے پر پڑی ہوئی روٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔" کیا اس میں میرا کوئی حصّہ نہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔" یہ بھی تمہاری ہی ہے لیکن یہ اس وقت ملے گی جب تم ایران سے دوبارہ واپس آؤ گے۔"

مریدوں نے اس نووارد عقیدت مند کو پہچان لیا۔ یہ ہمایوں تھا جو شیر خان سے شکست اٹھا کر حضرت ولایت شاہ کا حکم سننے آیا تھا۔

ہمایوں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔" اس وقت زمین اور آسمان دونوں ہی ہمارے دشمن ہو رہے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم بخیریت تمام ایران پہنچ جائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔" بک بک کیا کرتا ہے، اپنا راستہ لے کیا ہم نے یونہی تجھے زادِ راہ دی ہے۔"

ہمایوں نے اسی وقت آگرے سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔



شیر خان، شیر شاہ ہو گیا، اس نے اپنی عسکری قوت میں بے پناہ اضافہ کیا، مشہور داروغۂ توپ خانہ رومی خان کو حکم دیا گیا کہ توپیں ڈھالی جائیں اور اس حکم سے تیزی سے عمل درآمد ہونے لگا۔ حضرت ولایت شاہ بازار سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے رومی خان آ گیا۔ وہ نیاز مندانہ آپ کے سامنے جھک گیا آپ نے لاپروائی سے اس پر نظر ڈالی۔ رومی خان نے ادب سے عرض کیا۔" حضرت! اگر ذرا سی تکلیف گوارا فرمائیں تو یہ ناچیز آپ کو اپنا کارنامہ دکھلانے کی سعادت حاصل کرے۔"

آپ نے دریافت فرمایا۔" کیسا کارنامہ؟"

رومی خان نے جواب دیا۔" میں بادشاہ کے حکم پر توپیں ڈھلوا رہا ہوں، اب تک جو کام ہو چکا ہے اس کا مشاہدہ کرانا چاہتا ہوں۔"

آپ خاموشی سے رومی خان کے ساتھ ہو لیے۔ رومی خان نے انہیں توپیں ڈھلنے کے کارخانے میں پہنچا دیا۔ وہاں ہر طرف بھٹیاں جل رہی تھیں۔ تانبا گلایا پگھلایا جا رہا تھا بہت سی توپیں تیار کھڑی تھیں کچھ ناقص حالت میں تھیں ایک طرف تانبے کا ذخیرہ تھا جسے توپ میں لگایا جا رہا تھا

تقریباً ایک ہزار مزدور اور کاریگر کام میں لگے ہوئے تھے۔

حضرت ولایت شاہ نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ کر بولے "اللہ اکبر! رومی خان تو آدمی ہے یا موت کا فرشتہ؟ تو انسانوں کی ہلاکت کا سامان اتنے اہتمام سے کر رہا ہے۔ توبہ توبہ" پھر ان توپوں کی طرف عجیب انداز سے اشارہ کیا اور پھر ادھر اُدھر موجود لوگوں سے کہا۔ "دیکھتے کیا ہو آگے بڑھو اور انہیں توڑ پھوڑ کر بیچ کھاؤ۔"

آپ کے ان کلمات کا شیر شاہ سوری کے عہد میں اس طرح عمل ہوا کہ جب پورا شہر افراتفری اور ہنگاموں کا شکار تھا بلوائیوں نے توپ خانے پر حملہ کر دیا۔ انہیں توڑا پھوڑا اور توپوں کے لوہے اور تانبے کو بازار میں بیچ بیچ کر کھانے پینے کا سامان خریدا۔



شیر شاہ کالنجر پر فوج کشی کرنے جا رہا تھا۔ اس نے بابا فرید گنج شکرؒ کے گھرانے کے ایک بزرگ عزیز شیخ کبیرؒ سے درخواست کی "ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے کہ آپ ہماری طرف سے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دیں انہیں ہماری طرف سے کچھ اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کریں اور کہیں کہ ہم کالنجر کی تسخیر کو جا رہے ہیں۔"

شیخ کبیر نے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دی اور اشرفیوں کو کاغذ میں لپیٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دیا۔ آپ نے دریافت فرمایا "اس کاغذ میں کیا ہے؟" شیخ کبیر نے جواب دیا "اشرفیاں حضرت۔ سوری بادشاہ کالنجر جہاد کرنے جا رہا ہے اور وہ آپ سے دعائیہ استمداد کا خواہش مند ہے۔"

آپ نے اشرفیوں کو ٹھوکر مار دی اور ہنس کر فرمایا۔

"سبحان اللہ۔ کیا خوب! آگ لگ رہی ہے آگ۔ اِدھر آ میری آنکھوں سے دیکھ، پتھر اور پہاڑ قہر کی آگ میں جل رہے ہیں اور رہا تیرا بادشاہ، آگ تو اس کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ کالنجر قلعے کی تسخیر کے لئے کب جا رہا ہے وہ تو آگ میں جلنے جا رہا ہے شیخ کبیر! تم وہاں ہرگز نہ جانا۔" پھر اشرفیاں اٹھائیں اور شیخ کبیرؒ کے سر پر ماردیں۔ جلال میں بولے۔ "کیا تم مجھے بابا فرید کی نظر میں شرمندہ کرنا چاہتے ہو، خبردار جو شیر خان کے ساتھ گئے تو اس کے ساتھ ہی تم بھی جل جاؤ گے۔"

شیخ کبیرؒ نے واپس جاکر شیر شاہ کو من وعن سنادیا۔ شیر شاہ کچھ دیر ساکت رہا، کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد کہا "شاہ ولایت تو ایک مجذوب انسان ہیں، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ان کلمات میں کون سا بھید چھپا ہے۔"

جب شیر شاہ فوج لے کر کالنجر چلا گیا تو آپ نے دامن جھاڑتے ہوئے افسوس سے فرمایا "افسوس کہ آگ لگ رہی ہے، افسوس کہ آگ لگ رہی ہے۔"

عین حالت جنگ میں شیر شاہ کے بارودی ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ جھلس کر انتقال کر گیا۔

شیر شاہ کی ناگہانی موت سے ملک میں انتشار پیدا ہو گیا۔ اسلام شاہ جو بعد میں سلیم شاہ سوری کہلایا اپنے بڑے بھائی کی عدم موجودگی میں تخت نشین ہو گیا۔ درباری امرا اس کی مخالفت میں لگ گئے۔ سلیم شاہ بھی ان سے خوف زدہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر دولہ خان سے کہا۔

"اس عالم انتشار اور سراسیمگی میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

دولہ خان نے جواب دیا "حضور ولایت شاہ مجذوب کے پاس تشریف لے چلیں، وہ جو کچھ کہیں گے وہی حضور کا مستقبل ہو گا۔"

اتفاق کی بات کہ جب سلیم شاہ اپنے وزیر کے ساتھ حضرت ولایت شاہ کے پاس پہنچا۔ باغی امرا بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کے لئے وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بادشاہ اور وزیر کو دیکھ کر ایک طرف چھپ گئے۔ بادشاہ حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے دوسرے نذرانوں کے علاوہ پچاس بیڑے بھی لایا تھا۔ یہ بیڑے ایک رومال میں بندھے تھے جب وہ بیڑوں والا رومال حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کر رہا تھا تو دل میں یہ شگون لئے ہوئے تھا کہ اگر حضرت ولایت شاہ اسے ان بیڑوں میں سے چار واپس کر دیں گے تو وہ اس سے یہ شگون لے گا کہ وہ مخالف اور باغی امرا پر غالب آجائے گا۔

حضرت ولایت شاہ تھوڑی دیر پہلے کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے، قرآن پاک کو نہایت ادب سے رحل پر رکھ دیا اور بادشاہ کے بیڑوں میں سے چھیالیس خود لے کر چار اُسے واپس کر دیئے اور فرمایا۔

"انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالعدل۔"

"بلاشبہ ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ (نائب) بنایا ہے پس تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کر۔"

پھر خود سے فرمایا۔ "سبحان اللہ! غریب کو ذرا سا تو ملک ملا ہے اس میں بھی حاسد اور بدخواہ حصہ لگانا چاہتے ہیں۔" پھر دولہ خان کو حکم دیا۔ "دولہ خان! تم چند روز جمعیت خاطر کے ساتھ اپنے بادشاہ کی خدمت میں زیادہ حاضری دو خدا محافظ ہے۔"

دولہ خان نے بادشاہ کے کان میں کہا "حضور! اب ہمیں فوراً چلا جانا چاہیئے کیوں کہ اگر کچھ دیر اور ٹھیرے اور حضرت ولایت شاہ کی زبان سے کچھ اور نکل گیا تو بہت برا ہوگا۔"

اسی وقت ایک مرید نے دولہ خان سے سرگوشی میں کہا۔

"حضور! باغی امرا بھی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے حاضر ہو رہے ہیں آپ ابھی واپس نہ جائیں اور کسی طرح چھپ کر ان کی قسمتوں کا فیصلہ بھی سنتے جائیں۔"

سلیم شاہ سوری اور دولہ خان باہر نکل کر شاہ ولایت کے ایک مرید کی مدد سے ایسی جگہ روپوش ہو گئے جہاں سے باغی سرداروں کی باتیں صاف سنی جا سکتی تھیں۔

جلال خاں نامی باغی سردار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں ادب سے جھک گیا اور اس کے ساتھیوں کے بقول اس نے اپنے دل میں نیت کی کہ اگر شاہ ولایت اسے ہندوستان پر حکمرانی کی خوش خبری سنائیں گے تو وہ پرگنہ آگرہ نذرانے میں آپ کو پیش کر دے گا۔

آپ نے جلال خاں کو دیکھتے ہی منھ پھیر لیا۔ بولے، "جلال خاں! خدا سے شرم کرو! تم نے شیر شاہ کا نمک کھایا ہے اب اس کے بیٹے سے نمک حرامی نہ کرو۔ سلیم شاہ خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر ہوا ہے اس لیئے ہم بھی اس کی طرفداری کریں گے جاؤ اس کے دوست بن جاؤ، ورنہ وہ تمہیں قتل کرا دے یا چھوڑ دے اس پر اُسے پوری قدرت عطا ہوئی ہے۔"

جلال خاں فوراً پیچھے ہٹا اور خواص خان اور سعید خان نامی سردار آگے بڑھے انہیں دیکھتے ہی آپ نے فرمایا۔ "بے وقوفو تمہارے سر تمہارے کاندھوں سے کہاں چلے گئے؟ وہ تو میدان میں لڑھکتے پھر رہے ہیں، جن کا سر کٹ چکا ہو وہ بادشاہ سے جنگ کس طرح کریں گے۔"

باغی سردار اپنے نوشتہ تقدیر پڑھ چکنے کے بعد بھی سلیم شاہ کے مقابلے میں اتر پڑے اور اسے حکم دیا کہ حکومت ہمارے حوالے کر کے گوشہ نشینی یا اطاعت اختیار کر لو۔

سلیم شاہ نے دولہ خان کو ایک بار پھر ولایت شاہ خدمت میں روانہ کیا اور پوچھا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

آپ اس وقت مٹی کی دیوار کھڑی کر رہے تھے دولہ خان کو دیکھتے ہی فرمایا۔ "تو ناحق آیا،

ہم تو پہلے ہی سے اس کا پشتیبان تعمیر کر رہے ہیں، یہ کہہ کر گیلی مٹی دیوار پر کھینچ ماری جو چپک گئی۔ دولت خان سے اس چبوترے کی طرف --- اشارہ کرتے ہوئے کہا "سلیم شاہ کا اقتدار جم چکا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یہ مٹی چپک گئی ہے"

باغی سرداروں سے زوردار معرکہ کارزار گرم ہوا اور ان میں سے بعض سردار شکست کھا کر قتل ہوئے اور بعضوں نے بھاگ کر دور دراز پہاڑیوں میں روپوشی اختیار کی۔



آپ کی زبان سے جو بھی نکلا، ظاہر ہو کر رہا، احکام اشاروں میں صادر ہوتے تھے اور اس کا مفہوم حقیقی اس وقت سمجھ میں آتا تھا جب آپ کا حکم واقعے کی شکل میں ظاہر ہو جاتا تھا

ایک صاحب آپ کے حجرے کے باہر سے اندر کی طرف جھانکنے لگے آپ نے بھی اُسے دیکھ لیا، فرمایا "اندر کیا دیکھتا ہے، اپنے سر پر دیکھ لے"

اس نے گھبرا کر اپنا سر ٹٹولا اور کہنے لگا "سر پر تو کچھ بھی نہیں حضرت شاہ صاحب!"

آپ نے حقارت سے فرمایا "خوب اپنے سر کا کوا تجھے نظر نہیں آتا"

وہ شخص خوش خوش وہاں سے ہٹ آیا اور لوگوں سے فخریہ کہنے لگا "آج تو شاہ صاحب نے میرے لیئے بھی کچھ ارشاد فرمایا"

لوگوں نے پوچھا "شاہ صاحب نے کیا فرمایا؟"

اس نے جواب دیا "آپ نے میرے سر پر کوے کی موجودگی کی بشارت دی ہے"

اور اس بشارت کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ کچھ عرصہ بعد اُسی شخص کو سولی پر چڑھا دیا گیا اور جب وہ مرگیا تو اس کی لٹکی ہوئی لاش کے سر پر کوے بیٹھتے اور کائیں کائیں کر کے شور مچاتے رہے

اسی طرح ایک سیدزادے گڑ اور چنے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان چنوں میں سے چار مٹھیاں سیدزادے کے حوالے کر دیں اور فرمایا "ہم کیا کریں تیری قسمت، یہی چار مٹھیاں تیری قسمت میں ہیں"

سیدزادہ ان کلمات پر غور کرتا گھر پہنچا تو معلوم ہوا، سرکاری دیوان کا ہرکارہ آیا تھا وہ کہتا تھا کہ تنخواہیں تقسیم ہو رہی ہیں حاضر ہو کر اپنی تنخواہ وصول کر لو۔

سیدزادہ چار سال سے پریشان تھا اور اسے تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ سیدزادے نے کہا "میں تو سرکاری ملازمت ہی سے بیزار ہوں مجھے نہیں چاہیئے تنخواہ ونخواہ۔ چار سال سے

تو ملی نہیں اب کیا ملے گی "

دیوان کا آدمی پھر آیا اور سیدزادے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں دیکھا ایک ہجوم اکٹھا ہے اور لوگ اپنی تنخواہیں وصول کر رہے ہیں، انہیں تین تین ماہ کی تنخواہیں دی جا رہی تھیں سید زادے کو دیکھتے ہی دیوان نے منشی کو حکم دیا۔ "ان کا سارا حساب بے باق کر دیا جائے "

منشی نے ناگواری سے کہا "سب کو تین تین ماہ کی تنخواہ دی جا رہی ہے انہیں پورا حساب کس طرح دیا جائے ہاں ان کے ساتھ اتنی رعایت ضرور کر سکتا ہوں کہ بجائے تین ماہ کے چار ماہ کی تنخواہ دے دوں "

دیوان نے کہا "اچھا چار ہی ماہ کی تنخواہ دے دو بقیہ کا حساب کتاب ہوتا رہے گا "

چنانچہ سید زادے کو چار ماہ کی تنخواہ دے دی گئی اور بقیہ کا حساب انہیں زندگی بھر نہ مل سکا۔

یہ عظیم ہستی نوے سال زندہ رہی اور مرجع خاص و عام رہی۔ بڑے بڑے بادشاہ یہاں معمولی آدمیوں کی طرح اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے آیا کرتے تھے اور بڑے بڑے سرکش جب اس چوکھٹ میں داخل ہوتے تو ان کی حیثیت حضرت ولایت شاہ کی نظر میں روباہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔



حضرت شاہ بلاول رحمۃ اللہ علیہ

ہمایوں ہندوستان سے پانچ سال غیر حاضر رہ کر جب دوبارہ واپس آیا تو ایران اور افغانستان کے بہت سے خاندان بھی اس کے ساتھ آئے۔ انہی خاندانوں میں ہرات کا ایک خاندان لاہور کے موضع شیخوپورہ میں مقیم ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد اس خاندان کے سید عثمان نامی ایک شخص کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ گھر والوں نے اس کا نام بلاول رکھ دیا۔

بلاول ابھی چھ سات سال کے تھے کہ محلے کے لڑکوں سے بڑی دوستی ہوگئی۔ یہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ خوب خوب کھیلتے ایسا لگتا تھا گویا پڑھنے لکھنے سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت کی باپ سے زیادہ دادا کو فکر تھی۔ دادا اکثر یہی کہا کرتے کہ بس چند دنوں کی بات ہے اور پھر میں اپنے پوتے کو لاہور بھیج دوں گا۔ پھر یہ وہیں رہے گا اور تعلیم وتربیت حاصل کرے گا۔

ایک روز صبح دادا کے ساتھ ہی بلاول بھی بیدار ہوگئے ان کے ساتھ ہی نماز فجر ادا کی اور پھر باہر جانے لگے دادا نے روکا کہ بلاول کہاں چلا؟ بلاول نے جواب دیا "میں اپنے دوستوں کے پاس جا رہا ہوں تھوڑی دیر کھیلوں کودوں گا اس کے بعد واپس آجاؤں گا"۔

دادا نے کہا "آج اتنی جلدی؟ روز تو ذرا دیر میں گھر سے نکلتا تھا"۔

بلاول نے جواب دیا۔ "ہاں دادا، روز میرے تمام دوست جلدی اٹھ جاتے تھے لیکن آج ایک دوست کی گہری آنکھ لگ گئی ہے اور جب تک میں اسے بیدار نہیں کروں گا نہیں جاگے گا"۔

دادا کے لئے یہ کچھ عجیب سی بات تھی کہ بلاول کا ایک دوست گہری نیند سو گیا ہے اور جب تک بلاول اسے بیدار نہیں کریں گے وہ نہیں جاگے گا انہوں نے سوچا یہ کیا بات ہوئی، جگائیں تو گھر والے جگائیں یہ بلاول اسے جگانے کیوں جائے گا؟ یہ عقدہ زیادہ دیر تک لاینحل نہیں رہا۔

بلاول کے گھر سے اس دوست کا مکان تقریباً آدھے فرلانگ پر تھا۔ چھ سات سالہ بلاول تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک عورت روتی ہوئی دکھائی دی جب

عورت قریب آئی تو بلاول نے ایک نظر میں اسے پہچان لیا، یہ اسی دوست کی ماں تھی جسے بلاول جگانے جا رہے تھے۔

بلاول نے عورت سے پوچھا ” ماں آپ کیوں رو رہی ہیں ؟

عورت نے فرط محبت میں بلاول کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کہا ” بیٹے بلاول! تو میرے بیٹے کا دوست ہے نا؟“

بلاول نے جواب دیا ” ہاں ماں کیا بات ہوئی ؟“

عورت نے کہا ” بیٹے بلاول بات یہ ہوئی کہ تیرا وہ دوست آج فجر سے ذرا پہلے مر گیا۔ میں غم کی ماری اپنے رشتے کنبے والوں کو اس کی اطلاع دینے جا رہی ہوں “

بلاول کو ہنسی آگئی پوچھا ” ماں! کیا آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ واقعی مر گیا ہے؟

ماں نے جواب دیا ” اس میں یقین کی کیا بات ہے سبھی متفق ہیں کہ وہ مر گیا “

بلاول نے کہا ” لیکن مجھے اس کا یقین نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ گہری نیند سو گیا ہے کیا آپ مجھے میرے دوست کے پاس لے چلیں گی ؟“

ماں نے کہا ” جب تو نے اسے دیکھا نہیں تو اس کی نیند اور موت کے بارے میں کوئی بات کس طرح کر سکتا ہے “

بلاول نے جواب دیا ” ماں یہ تو آپ بجا فرما رہی ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ کو میری بات ماننے میں تامّل کیوں ہے ؟“

ماں نے کہا ” تامّل اس لئے ہے کہ میں اپنے بچے کی موت سے اچھی طرح واقف ہوں “

بلاول نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور واپس لے جانے کی کوشش کی۔ ماں نے مزاحمت نہیں کی ” تو مجھے واپس چلنے پر مجبور کر رہا ہے تو میں خود ہی چل چلتی ہوں میرا ہاتھ نہ پکڑ “

بلاول نے ماں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر یہ دونوں روتے ہوئے لڑکے کے گھر روانہ ہو گئے گھر کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا اور فضا میں لوبان کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بلاول سیدھے مرے ہوئے دوست کے پاس پہنچے۔

گھر والوں نے عورت سے پوچھا ” تو واپس کیوں آگئی ؟ اور یہ بلاول کیوں آیا ہے ؟“

عورت نے جواب دیا ” میں تو میت کی خبر دینے جا رہی تھی لیکن یہ بلاول راستے میں مل گیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ میرا دوست کوئی مرا تھوڑی ہے گہری نیند سو گیا ہے، میں اسے جگا دوں گا “

عورت کے شوہر نے بگڑ کر کہا ” اور تو اس بچے کی باتوں میں آگئی ؟“

عورت نے جواب دیا "میں باتوں میں نہیں آگئی بلکہ میں خود نہیں جانتی کہ میں کیوں واپس آگئی بلاول نے مجھ سے کہا کہ ماں واپس چلو، میں اپنے دوست کو بیدار کر لوں گا۔ بس میں واپس آگئی اس کے ساتھ"

شوہر نے زور سے پیر پٹخے بولا "تیرا ستیاناس ہو گھر میں بیٹے کی لاش پڑی ہے اور تو مخول میں وقت گنوا رہی ہے"

بلاول لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور اس کی بند آنکھوں میں کچھ دیکھنے کی کوشش کی، پھر نتھنوں پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ بولے "یہ بھی کمال ہے کوئی اس طرح سانس روک کر سوتا ہے میں تو تیرے ساتھ کھیلنے آیا ہوں اور تو ہے کہ سانس روکے سو رہا ہے میں کہتا ہوں اب وقت نہ ضائع کر اور اٹھ، میں تیرے ساتھ کھیلنے آیا ہوں"

لڑکا بدستور پڑا رہا۔

بلاول کو غصہ آگیا۔ شانہ پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور کہا "تو مٹی مارے پڑا ہے اور تیرے ابا اماں اور دوسرے رشتے دار یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید تو اللہ کو پیارا ہو گیا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ تو سو رہا ہے اب تو اٹھ جا اور اس طرح سو سو کر عمر نہ ضائع کر۔ میں تیرے ساتھ کھیلنے آیا ہوں"

شانہ ہلانے سے لڑکا کنمنایا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلاول کو دیکھتے ہی پوچھا "کیا میں زیادہ دیر تک سوتا رہا ہوں؟"

بلاول نے جواب دیا "ذرا باہر نکل کر دیکھ سورج دو نیزے اوپر چڑھ چکا ہے"

لڑکے نے اپنے آس پاس غمزدہ لوگوں کو جو دیکھا تو پوچھا "یہاں یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟"

بلاول نے جواب دیا "یہ تو خود ان لوگوں سے پوچھ، اس کا میں کیا جواب دوں؟"

لڑکے کے ماں باپ اور دوسرے عزیز رشتے دار لڑکے کے جی اٹھنے سے حیرت زدہ رہ گئے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا؟ آپس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

لڑکے نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا "آؤ باہر چل کر کھیلیں"

بلاول نے جواب دیا "میں تو تیرے پاس کھیلنے ہی کے لئے آیا تھا لیکن تو ذرا دیر کے لئے اپنے ماں باپ کے پاس رک تاکہ یہ تیرے جاگنے کی خوشی منالیں پھر کھیل بھی ہو جائے گا"

لڑکے کے جی اٹھنے کی خوشی میں سارا گھر پاگل ہو رہا تھا ہر شخص باری باری لڑکے کو

گود میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور لڑکا حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے آخر؟

بلاول اپنے گھر واپس چلے گئے اُن کے گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد لڑکا اور اس کے ماں باپ بلاول کے گھر پہنچے اور بلاول کا کارنامہ ان کے گھر والوں کے سامنے بیان کیا۔ سب سے زیادہ دادا کو خوشی ہوئی لیکن تشویش بھی۔ انہوں نے بلاول کو تخلیے میں لے جاکر پوچھا۔

بلاول! یہ میاں بیوی جو کچھ کہتے ہیں کیا یہ سچ ہے؟"

بلاول نے جواب دیا۔" میں سچ جھوٹ سے واقف نہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرا دوست گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بیدار کر دیا۔ اگر یہ بیدار کر دینا کوئی بڑا کارنامہ ہے تو میں نے واقعی ایک کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ ایک معمولی بات تھی۔"

دادا نے پوتے کو سمجھایا" بلاول: اب میں تجھے کیا سمجھاؤں؟ تو نے جو کچھ کیا ہے کیا دیکھ نہیں رہا کہ اس کا پورے شیخوپورے میں کیا چرچا ہے؟ میں تجھ کو سمجھاتا ہوں کہ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے اگر تجھ میں کچھ ہے تو اس کا یوں برملا اظہار نہ کرتا پھر۔"

دادا نے پوتے کو سمجھانے کو سمجھا دیا۔ لیکن بعد میں یہ سوچتے رہے کہ بلاول کو شیخوپورے ہی میں رکھا جائے یا یہاں سے ہٹا دیا جائے۔ موضع کے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور وہ صبح سے شام تک بلاول کے دیدار کو آنے لگے تھے ایک دن دادا نے پوتے کو بیل گاڑی میں بٹھایا اور لاہور روانہ ہو گئے اُن دنوں لاہور میں شیخ فتح محمد لاہوری علمائے عصر میں جیّد مانے جاتے تھے۔ بلاول کو ان کے حوالے کرتے ہوئے دادا نے کہا" حضرت! اس لڑکے کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اسے علوم عقلی و نقلی میں کامل کر دیا جائے گا۔"

شیخ فتح محمد نے پوچھا" اس سے پہلے اس نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

دادا نے جواب دیا" حضرت یہاں آنے سے پہلے اس نے الف ب تک نہیں پڑھا۔ ابتدا حروف شناسی سے کرنا ہو گی۔"

استاد نے کہا" بہتر ہے"

اس کے بعد بلاول کو اپنے سامنے بٹھا کر حروف تہجی کا قاعدہ کھول کر کہا۔

"پڑھو الف، ب"

بلاول نے الف، ب سے شروع کر کے پورا قاعدہ استاد کے بغیر بتائے ہی پڑھ ڈالا۔

استاد حیرت سے قاعدہ سنتے رہے اس کے بعد بلاول کے دادا سے کہا "واہ حضرت آپ تو کہتے تھے بچے کو الف ب سے پڑھانا ہوگا اور اس کی ابتدا حروف شناسی سے کرانا ہوگی۔ لیکن یہ تو پڑھا پڑھایا معلوم ہوتا ہے۔"

دادا نے جواب دیا "حضرت میں نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا میں یہاں بلاول کو لے کر کیوں آیا۔ یہ بھی اتنے ہی اچنبھے کی بات ہے جتنی حیرت کی یہ بات کہ اسے پڑھایا تو کچھ بھی نہیں گیا لیکن پڑھنا جانتا ہے۔"

اس کے بعد دادا نے مردہ لڑکے کو جلا دینے کا پورا واقعہ سنا دیا۔ استاد نے بلاول کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور دادا کے کان میں کہا۔ "آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیے یہ ایک غیر معمولی لڑکا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ مستقبل کا کوئی غیر معمولی انسان ہے۔"

دادا چھوڑ کر چلے گئے۔ استاد نے انہیں پڑھانا شروع کر دیا۔ اور اس وقت استاد پھر حیرت زدہ رہ گئے جب بلاول نے چھ ماہ کے مختصر عرصے میں قرآن پاک کو حفظ کر ڈالا۔

بلاول کا دستور تھا کہ فرصت کا وقت، دریائے راوی کے کنارے گزارتے تھے اسی طرح ایک دن آپ راوی کے کنارے چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ کوئی بزرگ کشتی میں بیٹھے دور ہی سے آپ کو اشارہ کر رہے تھے۔ بلاول اس جگہ رک گئے جہاں کشتی کے رکنے کا امکان تھا کچھ دیر بعد کشتی کنارے سے آلگی اور اس میں سے ایک بزرگ اتر کر آپ کے پاس آئے اور بڑے اشتیاق سے کہا "بلاول تو یہاں ٹہل رہا ہے اور میں تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

بلاول نے جواب دیا "حضرت! میرا تو روزانہ کا معمول ہی یہی ہے کہ مکتب سے فرصت پا کے راوی کے کنارے آجاتا ہوں۔ فرمائیے میرے لائق کوئی کام ؟"

ان بزرگ نے فرمایا "بلاول! میرا نام شاہ شمس الدین قادری ہے۔" اس کے بعد انہوں نے بلاول کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا تو جانتا ہے خدا نے تجھے کیوں پیدا کیا ہے ؟"

بلاول نے جواب دیا "میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ خدا نے آپ کو میرے پاس کیوں بھیجا ہے ؟"

شمس قادری نے تبسم فرمایا۔ بولے "بے شک تو جانتا ہوگا۔

لیکن میرا یہ فرض ہے کہ میں تجھے تیری تلاش کی غرض و غایت سے مطلع کر دوں۔ خدا نے تجھے اپنی ذات کی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے بلاول تو میری صحبت میں رہ اور فیضِ باطن، جو میرے پاس تیری امانت ہے۔ اسے حاصل کر۔"

بلاول نے عقیدت مندی سے جواب دیا "مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ میں ابھی اسی وقت آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

اس کے بعد آپ شاہ شمس الدین قادری کے پاس رہنے لگے انہوں نے بلاول کو اپنے ارادت مندوں میں داخل کر لیا۔ وہ علوم ظاہری اور باطنی حاصل کرنے لگے اور یہ سب اتنی جلدی حاصل کر لیا۔ کہ دوسرے زندگی بھر کی ریاضت اور مشقت سے بھی یہ نہیں پا سکتے تھے شاہ شمس الدین قادری نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرما دیا۔

آپ ہر وقت اپنے پیر و مرشد کے ساتھ رہنے لگے سفر و حضر کہیں بھی ساتھ نہ چھوڑتے تھے۔

ایک دن شاہ شمس الدین قادری انہیں اپنے ساتھ لے کر دریا کے کنارے کنارے کہیں جا رہے تھے کہ دوپہر کا وقت ہو گیا اور دھوپ کی تمازت پریشان کرنے لگی۔ پیر و مرشد نے بلاول سے کہا "بلاول! تیرا کیا خیال ہے؟ اگر میں کچھ دیر کے لئے سفر موقوف کر دوں اور سامنے درخت کے نیچے لیٹ کر ایک نیند لے لوں تو کیسا رہے گا؟"

بلاول نے جواب دیا "کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ جو کچھ فرمائیں میں اس سے اختلاف کروں؟"

شاہ صاحب نے فرمایا "تب پھر میں اس درخت کے نیچے لیٹ جاتا ہوں۔ آ تو بھی میرے پاس بیٹھ جا۔"

شاہ قادری درخت کے نیچے لیٹ گئے اور بلاول اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کے پاؤں دبانے لگے۔ کچھ دیر بعد شاہ قادری کو نیند آ گئی۔ اسی دوران کسی طرف سے ایک جاٹ آیا اور کلہاڑی کو کمر سے باندھ کر درخت پر چڑھنے لگا آپ نے اُسے روکا اور پوچھا "اے بھائی! تو اوپر کیا لینے جا رہا ہے؟"

جاٹ نے اکھڑ لہجے میں پوچھا "تو کون ہوتا ہے مجھ سے یہ سوال کرنے والا؟"

بلاول نے جواب دیا "میں تو اس لئے تجھ سے پوچھ رہا ہوں کہ میرے پیر و مرشد استراحت فرما رہے ہیں کہیں تو ایسی حرکت نہ کرے جس سے ان کے آرام میں خلل ہو اور میں شرمندگی اٹھاؤں۔"

جاٹ نے کھرّے لہجے میں کہا "میں لکڑیاں کاٹنے جا رہا ہوں۔ اگر پیر کو آرام ہی کرنا ہے تو گھر جاکر آرام کرے یہ آرام کرنے کی کونسی جگہ ہے؟"

بلاول نے ناگواری سے منہ بنایا اور کہا "تو ذرا دیر کے لیئے رک جا۔ ابھی اوپر نہ جا۔ میں تجھ سے خدا اور رسول کے نام پر درخواست کرتا ہوں۔"

لیکن جاٹ نہیں مانا۔ وہ اوپر چڑھ گیا اور پھر کمر سے کلہاڑی کھول کر کھٹ کھٹ لکڑیاں کاٹنا شروع کر دیں۔

بلاول نے غصّے میں کہا "او جاٹ کے بچے! میں نے تیری خوشامد کی لیکن تو باز نہیں آیا۔ کیا خیال ہے، کیا میں اپنا غضب دکھاؤں؟"

جاٹ نے اوپر ہی سے کہا "غضب بھی دکھا لے۔ گویا میں تیرے غضب سے ڈر رہا ہوں"

بلاول نے پھر خوشامدانہ انداز میں کہا "اے بھائی خدا کے لئے میری بات مان لے اور نیچے اتر آ۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہے پھر کاٹ لینا لکڑیاں"

جاٹ ہنسنے لگا۔ بولا "میاں! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کبھی تم خوشامد کرتے ہو کبھی غصّہ دکھاتے ہو لیکن مجھ پر ان میں سے کسی کا بھی اثر نہیں ہوگا"

بلاول نیچے سے ڈانٹ کر کہنے لگے "میں نے ابھی اپنا غضب تجھے کہاں دکھایا ہے اگر تو میرا غضب دیکھنا ہی چاہتا ہے تو لے، دیکھ لے"

جاٹ نے نیچے جو دیکھا تو اسے معلوم نہیں کیا دکھائی دیا کہ چیخ مار کر زمین پر آ رہا اور زمین پر گرتے ہی اس کی جان نکل گئی۔

شاہ شمس الدین قادری کی آنکھ کھل چکی تھی انہوں نے پوچھا "بلاول کیا بات ہے؟"

بلاول نے جاٹ کا پورا قصّہ سنا دیا۔ شاہ قادری نے بلاول سے پوچھا "یہ تو نے کیا کیا؟"

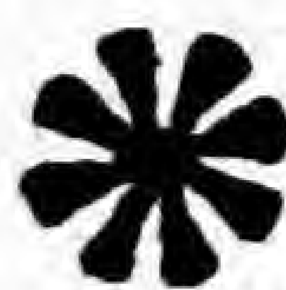
بلاول کہنے لگے "حضرت! میں نے اُسے بہت سمجھایا لیکن یہ باز ہی نہ آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی کھٹ کھٹ سے آپ کی آنکھ نہ کھل جائے"

شاہ قادری نے افسوس سے کہا "بہر حال مجھے بے حد افسوس ہے ہم فقیروں کے لئے اس قدر غضب و جلال کا مظاہرہ کرنا ہرگز روا نہیں ہے"

بلاول نے کہا "اب تو جو ہونا تھا ہو چکا، اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

پیر نے جواب دیا "اب اس کی تلافی یوں کرو کہ میرے ساتھ شاہ ابواسحٰق کے مزار کے ایک حجرے میں بند ہو کر تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو جاؤ اور اس وقت تک اس حجرے میں قید رہو جب تک وہاں سے باہر نکلنے کا حکم نازل جائے۔"

چنانچہ بلاول، شاہ اسحٰق کے مزار کے ایک حجرے میں معتکف ہو گئے اور اپنے شب و روز تلاوت قرآن پاک میں گزارنے لگے۔ اس شغل میں کئی سال گزر گئے مگر باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی۔ آپ نے یہ چند سال تلاوت قرآن ہی میں نہیں بلکہ روزہ نماز اور ذکر میں بھی صرف کیئے۔



شاہ بلاول کی شہرت اور ان کی کرامات کا چرچا دہلی تک پہنچ چکا تھا یہ شاہجہاں کا زمانہ تھا جہانگیر کا مقبرہ لاہور میں تھا اس لیئے شاہجہاں اپنے باپ کے مزار پر پہنچا۔ اس نے قرآن خوانی کے لیئے حافظوں کی فوج بٹھا دی۔ ان دنوں لاہور میں حضرت میاں میر کی ذات بھی مرجع خاص و عام تھی۔ شاہجہاں میاں میر کی خدمت میں پہنچا اور دو ہزار روپے ان کی نذر کرنا چاہے کہ انہیں قبول فرمالیں، لیکن میاں میر نے یہ رقم نہیں لی۔ بولے "افسوس کہ میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔"

شاہجہاں نے پوچھا "آخر قبول کرنے میں تامل کیا ہے؟"

میاں میر نے جواب دیا "یہ میری روایات اور وضع داری کے خلاف ہے۔"

شاہجہاں نے زیادہ خوشامد نہیں کی۔ وہ یہ رقم اپنے ساتھ لیکر شاہ بلاول کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور درخواست کی "حضرت! یہ دو ہزار کی حقیر رقم حاضر خدمت ہے قبول فرما کر شکر گزار فرمایئے۔"

شاہ بلاول نے یہ روپے قبول کر لیئے اور اس میں سے کچھ رقم اسی وقت درویشوں اور مستحقوں میں تقسیم کر دی جو رقم بچ گئی اسے خادم مطبخ کے حوالے کر دیا اور کہا "یہ درویشوں اور مسافروں پر خرچ کی جائے۔"

شاہجہاں یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ آخر عرض کیا "حضرت اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو میں کچھ عرض کروں۔"

شاہ بلاول نے جواب دیا "اجازت ہے۔"

شاہجہاں نے کہا "حضرت پہلے میں یہ دو ہزار روپے لیکر میاں میر کی خدمت میں پہنچا تھا

میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ میرا یہ نذرانہ قبول کرلیں لیکن انہوں نے نہیں قبول کیا اُدھر سے مایوس ہوکر میں آپ کے پاس آیا اور آپ نے بے چون وچرا اسے قبول کرلیا ۔ آخر یہ فرق کیوں ہے آپ دونوں میں ؟"

شاہ بلاول نے جواب دیا " میاں میر فرشتوں جیسی صفات رکھتے ہیں اُن کی توجہ دنیا کی طرف بالکل نہیں ۔ رہا میں ، تو یہاں مسافر اور درویش آرام پاتے ہیں یہاں لنگر خانہ بھی ہے جہاں سے ان کو کھانا ملتا ہے اس لیئے ہمیں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔"

شاہجہاں یہ جواب پاکر دوبارہ میاں میر کی خدمت میں پہنچا اور کہا " حضرت ! آپ نے میرا نذرانہ قبول نہیں کیا لیکن شاہ بلاول نے اسے قبول فرمالیا ۔"

میاں میر نے جواب دیا " شاہ بلاول ، بزرگ ، ولی کامل دریا کی طرح ہیں میں اُن کے سامنے معمولی تالاب کی طرح ہوں ۔ دریا میں اگر کوئی پلید چیز گر جائے تو وہ پلید نہیں ہوتا لیکن اگر یہی پلید چیز تالاب میں پڑ جائے تو تالاب ضرور پلید ہو جاتا ہے ۔"

شاہجہاں دونوں کے جوابات سن کر جب قلعے میں گیا تو سجدے میں گر گیا اور گڑگڑاتے ہوئے کہا ۔ " ربّ العالمین ! میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں کہ میرے زمانے میں ایسے ایسے بزرگ پائے جاتے ہیں جن کا رضائے الہٰی کے سوا کوئی مقصد نہیں ۔"



آپ کا قیام محلہ ابو اسحٰق میں تھا ۔ ایک دن آپ کے پڑوس میں ایک بچہ پیدا ہوا ۔ گھر والوں نے بڑی خوشی منائی لیکن ان کی اس خوشی میں یہ غم بھی شامل تھا کہ اس گھر کی مالی حالت بہت خراب تھی اور ان میں اتنی استطاعت بھی نہیں تھی کہ وہ لڑکے کی پیدائش کی خوشی میں کسی کو کچھ دے دلا سکتے ۔

محلے کے بھانڈوں کو لڑکے کی پیدائش کا علم ہوا تو وہ اپنی مبارکباد دینے پہنچ گئے اور گا گا کر اور دعائیں دے دے کر روپے طلب کرنے لگے ۔ اہل خانہ کے پاس تھا ہی کیا جو بھانڈوں کو دیتا ۔ آپ نے بھانڈوں کی آواز جو سنی تو مٹی کا بدھنا لے کر باہر نکل آئے اور صاحب خانہ کو آواز دی ۔ " اے بھائی ! ذرا باہر آ ۔ اندر کیا کر رہا ہے ؟"

صاحبِ خانہ باہر نکلا تو آپ نے دریافت کیا ۔ " ارے یہ بھانڈوں کو کیوں روک رکھا ہے کچھ دے دلا کر رخصت کر ۔"

صاحبِ خانہ نے شرما کر جواب دیا "حضرت آپ سے کیا پردہ! گھر کا جو حال ہے آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

شاہ بلاول نے کہا "اب کچھ بھی ہو ان بھانڈوں کو تو زرِ مبارک دینا ہی پڑے گا"۔

اس نے کہا "جب میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو میں کچھ دوں گا کہاں سے ؟ "

شاہ بلاول نے بدھنے والا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "اس کا بھی کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی پڑے گا"۔

اس کے بعد آپ نے بدھنے کو دیوار پر دے مارا ___ بدھنا ٹوٹ گیا۔ اور اس کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے ۔ آپ نے اس سے کہا "جا اِن ٹکڑوں کو اٹھا لے اور بھانڈوں کو دینے کے بعد جو کچھ بچ رہے اپنے صرفے میں لا "

اس غریب نے بدھنے کے ٹکڑوں کو سمیٹنا اٹھانا شروع کر دیا اور پہلا ٹکڑا اٹھاتے ہی اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے بدھنے کے سارے ٹکڑے سونا بن چکے تھے اس نے چند ٹکڑے تو بھانڈوں کو دے دیے ، بقیہ کو لے کر آپ کی خدمت میں پہنچا ۔ بولا "حضرت بھانڈوں کو دینے کے بعد بچے ہیں جیسا حکم ہو اس پر عمل کیا جائے "

آپ نے جواب دیا "انہیں تو رکھ لے ۔ یہ تیرے کام آئیں گے "

اس کو پورے کے پورے قبول کرنے میں تامل ہوا ۔ بولا "حضرت یہ اتنے بہت سارے ؟ میں اتنے لے کر کیا کروں گا ؟"

آپ نے جواب دیا "یہ اتنے بہت سارے نہیں ہیں ۔ جب خرچ کرے گا تو پتہ چلے گا کہ زندگی جتنی لمبی ہے یہ سونے کے ٹکڑے اتنے دنوں تک نہیں چل سکیں گے "

اس نے یہ سونے کے ٹکڑے رکھ لئے اور شاہ بلاول کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کرتا رہا ۔



آپ نے معمول کے مطابق فجر کی نماز ادا کی اور چاشت تک مراقبے اور عبادت میں مشغول رہے اس کے بعد آپ نے خادم مطبخ کو آواز دی ۔ وہ حاضر ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا "کیا اہلِ احتیاج موجود ہیں ؟"

خادم مطبخ نے جواب دیا "جی حضرت "

آپ نے حکم دیا "اُن کو کھانا میں خود تقسیم کروں گا"۔

چنانچہ آپ نے ظہر کے وقت تک انہیں کھانا تقسیم کیا اور کسی شخص کو مایوس یا رنجیدہ نہیں کیا ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے ظہر کی نماز با جماعت ادا کی۔ ذرا سا قیلولہ کر کے آپ اپنے مریدوں میں پہنچ گئے اور ان کے ساتھ ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔ جب ادھر سے فارغ ہوئے تو پتہ چلا کہ بیماروں کا ہجوم اپنے اپنے ہاتھوں میں پانی کے کوزے لیئے آپ کی دعاؤں کا منتظر ہے آپ ان بیماروں میں پہنچے۔ ہجوم کا پہلا شخص دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے کھڑا کراہ رہا تھا آپ نے پوچھا "تیری آنکھ کب سے آئی ہوئی ہے؟"

اس نے جواب دیا "حضرت دو دن سے"

آپ نے پوچھا "پھر کل کیوں نہیں آیا تھا؟"

اس نے جواب دیا "کل اتنی تکلیف نہیں تھی"

آپ نے کوئی دعا پڑھی اور آنکھوں پر دم کرتے ہوئے فرمایا "اے شخص! کسی تکلیف کو کبھی کم نہ سمجھنا۔ جا، اللہ شفا دے گا"

وہ مسکراتا ہوا چلا گیا کیونکہ اُسے یوں لگا تھا کہ پھونک لگتے ہی درد کھنچ گیا ہے۔

دوسرے تیسرے اور چوتھے کو بھی، پانی کے کوزوں پر دم کر کے رخصت کر دیا۔

پانچواں آدمی سر پکڑے کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا "تجھے کیا تکلیف ہے؟"

اس نے جواب دیا "حضرت! درد شقیقہ نے تنگ کر رکھا ہے"

آپ نے فرمایا "تو خوش قسمت ہے جو آدھا سری درد میں مبتلا ہے ورنہ دنیا کے بیشتر لوگوں کا پورا سر اغراضِ دنیا اور طمع مال و زر سے درد میں مبتلا رہتا ہے"

اس کے بعد آپ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور کوئی دعا پڑھ کر پھونک ماری۔ اس شخص نے اپنے سر کو ادھر اُدھر جھٹکا اور خوش ہو کر بولا "میرے آدھے سر کا درد چلا گیا! اتنی جلدی حیرت ہے"

آپ نے فرمایا "جا اور اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت اپنے رب کے لئے بھی نکال"

انہی بیماروں میں ایک طبیب بھی تھا۔ آپ نے اُسے پہچان لیا اور پوچھا "اے دوسروں کا علاج کرنے والے! تو کس مرض میں مبتلا ہے؟"

طبیب نے جواب دیا "حضرت! میں وجع مفاصل کا مریض ہوں اور میرا اپنا کوئی

نسخہ مجھ پر کارگر نہیں ہوتا۔"

آپ نے فرمایا "تیری تشخیص میں تو کوئی غلطی نہیں اور نسخے کی دوائیں بھی درست ہوتی ہیں۔"

طبیب نے پوچھا "حضرت! جب میری تشخیص بھی درست ہے اور دوائیں بھی صحیح ہیں تو وہ اثر کیوں نہیں کرتیں۔"

آپ نے جواب دیا "تجھے بیک وقت دو مرض لاحق ہیں ایک تو یہ کہ تو دمہ کا مریض ہے دوسرا مرض بے یقینی کا ہے تجھے اپنے علم اور اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہے اسی عدم اعتمادی میں جب تو دواؤں کے اجزائے ترکیبی کی مقدار لکھتا ہے تو اُن میں غلطی ہو جاتی ہے تو فوری فائدے کے لئے تولے بھر کی جگہ مقدار دوگنی کر دیتا ہے اس طرح دوائیں اپنا صحیح اثر نہیں دکھاتیں اور اس کا ردِّعمل یوں ظاہر ہو سکتا ہے کہ تو کسی دوسرے مرض کا شکار ہو جائے۔"

طبیب نے اعتراف کیا کہ شاہ بلاول درست فرما رہے ہیں۔

آپ نے اس کے کوزے پر دم کیا اور کوئی دعا پڑھ کر اس کے جوڑوں پر پھونکی۔

آخر میں آپ نے اس کے دل والے حصے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور فرمایا "اب جا، انشاءاللہ عدم اعتمادی اور بے یقینی سے نجات پا جائے گا۔"

اس طرح آپ نے ایک بڑے ہجوم کو نپٹا دیا۔

ادھر سے فرصت پا کر آپ نے اپنے دو منشیوں کو بلایا اور ایک نئے ہجوم سے مخاطب ہوئے یہ ان غرض مندوں کا ہجوم تھا جن کی بادشاہ، اُمرا اور شاہی حکام تک رسائی نہیں تھی مگر اپنے اپنے کام کرانا چاہتے تھے۔ آپ نے ہجوم سے مخاطب ہو کر فرمایا "لوگو! میں تم میں سے ہر ایک کی سفارش کروں گا لیکن تم سب کو بھی ایک بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

ہجوم نے سوالیہ نظروں سے آپ کی طرف دیکھا۔

آپ نے فرمایا "تم مجھ سے جو بھی سفارش کرو وہ جائز کاموں کے لئے ہونی چاہیئے کسی ناجائز کام کے لئے نہ تو تم شرمندہ ہونا پسند کرو گے اور نہ میں۔"

لوگوں نے بیک زبان اقرار کیا کہ ہم آپ سے کسی ناجائز معاملے میں سفارش نہیں لیں گے۔

آپ نے ایک حاجت مند سے پوچھا "تجھے کیا مشکل آ گئی ہے؟ تو کس معاملے میں سفارش چاہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "حضرت! میری زمین پر ایک سرکش نے قبضہ کر لیا ہے آپ شہر کوتوال کو لکھ دیجئے کہ وہ میری زمین واپس دلا دے"۔

آپ نے ایک کاغذ پر لکھ دیا "اللہ بس باقی، ہوس"۔

اس شخص نے مایوسی سے پوچھا "بھلا ان چار لفظی اشاروں سے کس طرح کام ہوگا؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس کو کوتوال پاس لے جا۔ چار لفظوں کے نیچے میں نے اپنے دستخط کر دیے ہیں۔ اپنا معاملہ تفصیل سے کوتوال کو سمجھا دینا۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ تیرا کام کس طرح نہیں کرے گا"۔

ایک دوسرا شخص بے چینی سے آپ کی طرف بڑھا اور عرض کیا "حضرت میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور تقریباً ایک سال سے بیکار پھر رہا ہوں۔ میری کہیں ملازمت کرا دیجئے"۔

آپ نے قاضی شہر کو لکھ دیا "اللہ بس باقی، ہوس"۔

اس شخص کو یاد آیا کہ یہی سفارشی کلمات پہلے کو بھی لکھے گئے تھے۔ شاید شاہ صاحب ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں بھلا اس کا کیا اثر ہوگا؟

آپ نے اس کے خدشات کو محسوس کر لیا فرمایا "متردد شخص! اندیشہ نہ کر۔ افسوس کہ میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور اللہ نے چاہا تو یہی فقرے کام کر جائیں گے"۔

یہ شخص بھی چلا گیا۔ اب ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا "حضرت میرا کام کسی معمولی آدمی سے نہیں ہے خاص بادشاہ سے ہے۔ مجھے شاہجہاں کے پاس دہلی یا آگرے جانا پڑے گا"۔ آپ نے فرمایا "تیرا بادشاہ سے کیا کام آپڑا؟"

اس نے جواب دیا "میرے والد گزشتہ ماہ انتقال ہو گیا"۔

"وہ بادشاہ کے ملازم تھے چنانچہ ان کے بعد دستور کے مطابق اُن کی جاگیر اور جائیداد کو حکومت نے لے لیا اب میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ اسے میرے نام پر بحال کر دے اور یہ اتنا بڑا کام ہے کہ بادشاہ کسی معمولی سفارش سے یہ کام نہیں کرے گا"۔

آپ نے اس شخص کو بھی لکھ دیا "اللہ بس باقی ہوس"۔

اس نے سفارشی پُرزہ ہاتھ میں لے کر بے یقینی سے پوچھا "کیا اس سے میرا کام ہو جائے گا؟"

آپ نے جواب دیا "یہ کیوں نہیں! اس فقرے میں جو شاندار اشارہ موجود ہے اس کا صحیح اثر وہی شخص محسوس کرتا ہے جس کے نام میں سفارش لکھا کرتا ہوں، چنانچہ اس بادشاہ پر بھی وہی اثر ہوگا اور بادشاہ جب میرے دستخط دیکھے گا تو کیا مجال جو تیرا کام نہ کرے"

غرضیکہ جتنے لوگ آتے آپ سب کو "اللہ بس باقی ہوس" لکھ دیا کرتے۔ آپ کا یہ نقرہ تیر کی طرح نشانے پر لگتا اور ہر شخص کا کام ہو جاتا۔ کسی نے آپ سے کہا "حضرت! یہ جو آپ تھوک کے بھاؤ سفارشیں فرماتے رہتے ہیں تو آگے چل کر کہیں اس کا یہ اثر نہ ہو کہ آپ کی سفارش ضائع چلی جایا کرے"

آپ نے جواب دیا "میں اس سے ذرا بھی نہیں ڈرتا کہ لوگ میری سفارش پر کام کریں گے یا نہیں۔ میں تو صرف اس لئے سفارش کر دیتا ہوں کہ اس طرح خلق خدا کے کام ہو ہی جاتے ہیں یہی دین ہے یہی مذہب اور یہی انسانیت ہے کہ کام آئیں دنیا میں انسان کے انسان"

لوگ خوشی خوشی آپ سے سفارشیں لے کر چلے گئے۔ ذرا دم لے کر عصر کی نماز پڑھی اور پھر ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز سے پہلے پانی کے گھونٹ سے روزہ افطار کیا، اس کے بعد شام کے کھانے کی تقسیم شروع ہو گئی جب سب کو تقسیم کر چکے تو اپنے لئے جو کی روٹی اور چولائی کا ساگ نکال کر اسی سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ اس کے بعد عشاء کی نماز ادا کی پھر حجرۂ خاص میں چلے گئے وہاں تہجد کی نماز ادا کی اور اس کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے۔



کسی نے مطلع کیا "حضور آپ کا مرید شیخ ابو طالب جو دو ہزاری منصبدار بھی ہے باریابی کا امیدوار ہے۔

آپ نے فرمایا "اُسے حاضر کرو، رُکا کیوں رکھا ہے؟"

شیخ ابو طالب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کر کے ایک طرف ادب سے بیٹھ گیا۔

آپ نے پوچھا "کہو ابو طالب! کیسے آنا ہوا؟"

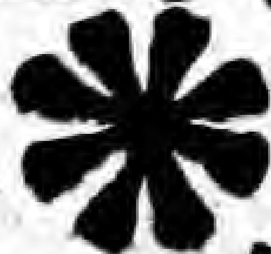
ابو طالب نے عرض کیا "حضرت! کیا عرض کروں۔ اب آپ کے مریدوں کو بھی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑ رہا ہے میرا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے طفیل ہی ہماری مشکلیں آسان کر دیا کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا"

آپ نے دریافت فرمایا۔ "اپنی مشکل بیان کر تاکہ اس کے لئے دُعا کی جائے۔"
ابو طالب نے عرض کیا "حضور، میری جاگیر پر بارش ہی نہیں ہو رہی پورا سال خشکی میں گزرا جا رہا ہے۔"
آپ نے مسکرا کر فرمایا "ابو طالب بس اتنی سی بات!"
ابو طالب نے عرض کیا "حضور آپ کی نظر میں یہ اتنی سی بات ہو گی ورنہ میرے دل سے پوچھیئے۔ بارش نہ ہونے کی فکر دیمک کی طرح قلبی سکون کو چاٹے جا رہی ہے۔"
آپ حجرے سے باہر نکل آئے اور ابو طالب کو بھی اپنے ساتھ لے لیا بولے "اے ابو طالب! تیری جاگیر کدھر ہے؟"
ابو طالب نے جنوب کی طرف اشارہ کیا "حضرت اُدھر۔"
شاہ بلاول نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا "اے ابر! تو کدھر ہے؟ ذرا سامنے آ۔"
ابو طالب نے بھی آسمان کی طرف دیکھا۔ شاہ بلاول کے ارشاد کو ابھی مشکل سے چند ثانیے گزرے ہوں گے کہ مشرق سے ابر کا ایک بہت بڑا ٹکڑا نمودار ہوا۔ وہ ہوا میں تیرتا ہوا بالکل آپ کے سر پر آ کر ٹھہر گیا۔ آپ نے اسے حکم دیا "یہاں کیوں ٹھہر گیا، جا ابو طالب کی جاگیر پر برس جا۔"
ٹھہرا ہوا ابر کا ٹکڑا جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔
آپ نے ابو طالب سے کہا۔ "ابو طالب! جا، اپنی جاگیر کی خبر لے وہاں تیرے پہنچنے سے پہلے ہی بارش شروع ہو چکی ہو گی۔"
ابو طالب اپنی جاگیر پر روانہ ہو گیا جب وہ اپنی جاگیر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا، وہاں جل تھل ایک ہو چکا ہے۔
آپ کی خانقاہ میں لنگر عام جاری تھا صبح و شام کا کھانا لوگوں کو ملتا تھا۔ لنگر خانے کا گودام ہر قسم کے سامان سے بھرا رہتا تھا۔ گھی، کھانڈ، چاول، آٹا، گیہوں، تیل، دالیں نمک، مرچ، مصالحے غرضیکہ ضروریات زندگی کی ساری چیزیں آتی رہتی تھیں۔ خانقاہ سے جن لوگوں کو کھانا ملتا تھا ان میں سے ایک شخص کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے دن کی روشنی میں خانقاہ کے اس حصّے کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا، جہاں اشیائے خورد و نوش کا ذخیرہ رکھا تھا۔
اس نے سوچا اگر وہ اس ذخیرے سے سامان اٹھا لے جائے تو کچھ دن مزے سے گھر میں بیٹھ کر

کھا سکتا ہے یہ سوچکر وہ رات تک خانقاہ میں ہی موجود رہا۔ خانقاہ کے ایک حصّے میں باورچی خانہ تھا اور باورچی کھانے سے ملحق اشیائے خوردنی کا ذخیرہ رکھا تھا۔ یہ چور رات کو لوگوں کی نظروں سے بچ کر اس حصّے میں گھس گیا۔

جب اس کو یہ اندازہ ہو چکا کہ خانقاہ میں سکوت طاری ہو چکا ہے اور شاہ بلاول کے علاوہ سب سو چکے ہوں گے تو وہ سامان کا جائزہ لینے لگا۔ چاولوں کے بوریوں کو ٹٹولا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کے بعد دالوں کو ٹٹولا۔ گھی میں ہاتھ ڈالا تو کئی چلّوؤں ہی پی گیا۔ واپس جانے لگا، غرضیکہ وہ ہر چیز کا جائزہ بڑے اضطراب سے لیتا رہا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا پھر اس نے ان میں سے سامان الگ کرنا شروع کر دیا اور ہوس میں اتنا سامان الگ کر لیا کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا چور نے سوچا۔ اے کاش اس کے ساتھ ایک آدمی اور ہوتا تو مزہ آجاتا۔ ایک آدمی اور ہوتا تو اپنا حصہ ضرور بٹواتا۔ لیکن چور کے پاس اس کا بھی حل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر نکلنے کے بعد اس دوسرے شخص کو ٹھکانے بھی لگا سکتا تھا۔

اس نے سامان اٹھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بدرجہ مجبوری اس نے سامان کچھ کم کر دیا لیکن یہ اب بھی اتنا زیادہ تھا کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا اس نے کچھ اور کم کر دیا اور اب وہ اتنا تھا کہ وہ اسے جیسے تیسے لے جا سکتا تھا۔ اس نے سامان اٹھایا اور آہستہ آہستہ باورچی خانے کی طرف بڑھا کیونکہ باورچی خانے میں ایک ایسا دروازہ بھی موجود تھا جو باہر کھلتا تھا۔ وہ جیسے ہی باورچی خانے میں داخل ہوا اسے وہاں بڑا گہرا اندھیرا محسوس ہوا، حالانکہ جب وہ یہاں آیا تھا تو اُسے ایک دیا ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ آخر کچھ دیر بعد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ باورچی خانے میں دیا ابھی روشن ہے لیکن خود اس کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی ہے۔ اس نے پریشانی میں بار بار دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے سامان کو اندازے سے ایک طرف رکھ دیا اور ٹٹولتا ہوا ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اس وقت اس کی ہر حس جواب دے چکی تھی۔ بینائی، عقل و خرد ہوش و حواس ان میں سے ایک چیز بھی اس کے اختیار میں نہیں رہی تھی۔



صبح، فجر کی نماز پڑھنے کے بعد آپ نے خادم مطبخ کو بلایا اور کہا "رات میرے پاس ایک حاجت مند آیا تھا تم اس وقت موجود نہ تھے"

خادم مطبخ نے عرض کیا "حضور اس وقت تو میں موجود ہوں، وہ حاجت مند کہاں ہے؟"

آپ نے جواب دیا "میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ جا، اشیائے خوردنی کے گودام میں چلا جا اور جتنا سامان درکار ہو اپنے آپ نکال لے۔"

خادم مطبخ نے کہا "تو وہ اپنی ضرورت بھر کا سامان لے گیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، ابھی وہ نہیں لے گیا بدقسمتی نے اس کو دھوکا دیا ہے اور عین اس وقت جبکہ وہ سامان لے کر نکل رہا تھا باورچی خانے میں اچانک اس کی بینائی جاتی رہی اور جب بینائی چھن جائے تو یہ بات کسی کے لئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ بہت بڑا بوجھ اٹھا کر گھر لے جائے۔"

خادم مطبخ نے پوچھا "حضرت! اس وقت وہ ہے کہاں؟"

آپ نے جواب دیا "باورچی خانے ہی کے ایک گوشے میں بیٹھا، تمہارا انتظار کر رہا ہے، وہ بھوکا بھی ہے۔ جاؤ پہلے اسے کھانا کھلاؤ پھر اسے ہمارے پاس لے آؤ۔"

خادم مطبخ باورچی خانے میں پہنچا تو اسے ایک گوشے میں وہ نابینا بیٹھا دکھائی دیا خادم مطبخ نے عاجزی سے کہا "بھائی۔ مجھے معاف کرنا، میں رات کو خانقاہ میں موجود نہیں تھا ورنہ تم کو زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔"

چور نے شرمندگی سے پوچھا "تم ہو کون؟"

خادم مطبخ نے جواب دیا "میں اس مطبخ کا نگران ہوں۔"

چور نے پوچھا "ابھی تم نے کیا کہا تھا؟"

اس نے جواب دیا "ابھی ابھی مجھے شاہ بلاول نے یہ بتایا کہ تم باورچی خانے میں میرا انتظار کر رہے ہو اور یہ کہ تم بہت بھوکے بھی ہو۔ میں تمہارے لیئے جلد از جلد کھانا تیار کر رہا ہوں کھانا کھانے کے بعد میں تمہیں شاہ صاحب کی خدمت میں لے چلوں گا۔"

چور نے جواب دیا "میں کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک میں شاہ بلاول سے چند باتیں نہ کر لوں۔"

خادم مطبخ نے کہا "لیکن میں وہی کروں گا جس کا مجھے شاہ بلاول نے حکم دیا ہے میں کھانا کھلائے بغیر تمہیں ان کے پاس نہیں جانے دوں گا۔ وہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔"

چور نے کہا "تم ضد نہ کرو اور شاہ بلاول سے جا کر کہہ دو کہ وہ شخص اس وقت تک کچھ نہیں کھائے گا جب تک آپ سے چند باتیں نہ کر لے "

خادم مطبخ نے شاہ بلاول کو مطلع کیا کہ وہ شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

آپ نے حکم دیا " اسے فوراً میرے پاس لاؤ "

خادمِ مطبخ اس کو پکڑ کے آپ کے پاس لے آیا۔ اُس نے اندازے سے اپنے دونوں ہاتھ آپ کی طرف بڑھائے۔ آپ نے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس نے آپ کا ہاتھ چوم لیا اور آنسو بہاتے ہوئے عرض کیا " حضرت! کیا میں کچھ عرض کروں، اجازت ہے؟"

شاہ بلاول نے خادم مطبخ کو حکم دیا " ذرا دیر کے لئے تو باہر چلا جا، میں اس شخص سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں "

خادم مطبخ باہر چلا گیا۔ آپ نے چور سے کہا " ہاں اب بتا تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

چور نے قدموں میں گر کر عرض کیا " حضرت! میں آپ کا گناہ گار، خطاکار ہوں۔ میں اشیائے خوردنی چرا لے جانا چاہتا تھا لیکن نابینا ہو گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سزا ضرور دیں تاکہ میرا ضمیر مطمئن ہو جائے "

آپ نے جواب دیا " بھائی میرے! میں تجھے کس جرم کی سزا دوں؟"

چور نے کہا " اشیائے خوردنی کو چرانے کی سزا "

آپ نے کہا " لیکن تو نے وہ چیزیں کہاں چرائیں؟ وہ ساری چیزیں تو میرے ہی باورچی خانے میں رکھی ہیں "

چور نے عرض کیا " لیکن میری نیت تو تھی "

آپ نے جواب دیا " یہ بھی غلط ہے کیونکہ ایک زمانہ جانتا ہے کہ یہاں لوگوں کے لیئے لنگر جاری ہے تو یہاں سے جتنا کچھ بھی لے جاتا اپنے حصے کا لے جاتا۔ تو نے یہ پسند نہیں کیا کہ تو ہر روز میرے لنگر خانے میں قطار لگائے اس لیئے اپنے حصے کا سامان نکال لے جانا چاہا۔ اب میں اس پر حیران ہو رہا ہوں کہ آخر تو میرے سامنے شرمندہ کیوں ہے؟"

چور کی آنکھوں سے آنسو تو پہلے ہی سے جاری تھے اب وہ زور زور سے رونے بھی لگا۔

آپ نے اس کے آنسو پونچھے اور کہا " اک ذرا میری طرف تو دیکھ "

چور نے جواب دیا " حضرت! میں اندھا ہوں آپ کی طرف کس طرح دیکھوں؟"

آپ نے کہا: "تو آنکھیں تو کھول۔ کس نے کہہ دیا ہے تو اندھا ہے تو بینا ہے میری طرف تو دیکھ۔"

چور نے آپ کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا وہ واقعی بینا ہے اس نے فرطِ جوش و عقیدت میں آپ کے پیروں کو بوسہ دیا۔ بولا: "اب میں ان قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟"

آپ نے جواب دیا "میری طرف سے کوئی محاسبہ نہیں۔ تو جہاں جانا چاہے چلا جا اور وہ سامان اپنے ساتھ لیتا جا، جسے تو نے نکال کر باورچی خانے میں رکھ دیا ہے۔"

چور نے تلملا کر عرض کیا "حضرت! میں بہت گنہگار انسان ہوں اب ان قدموں میں رہ کر اپنے گناہوں کو دھونے کی کوشش کروں گا، مجھے ٹھکرائیے نہیں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے۔"

آپ نے خادمِ مطبخ کو بلا کر حکم دیا کہ خانقاہ کے خادم سے کہہ دیا جائے کہ آج سے یہ شخص اسی خانقاہ میں رہے گا لہٰذا اس کو ایک حجرہ دے دیا جائے۔

خادمِ مطبخ نے اُسے اس کے حجرے میں پہنچا دیا اور یہ شخص شب و روز مجاہدے اور ریاضت میں مشغول ہو گیا۔



جب تک آپ زندہ رہے آپ کی ذات سے لوگوں کو فائدے پہنچتے رہے ایسا لگتا تھا گویا آپ کی ذات جود و سخا کا ایک دریا ہے اور اس دریا سے ہر شخص سیراب ہو رہا ہے بادشاہ، اُمرا، وزرا اور دیگر حکام آپ کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انہیں جب بھی "اللہ بس باقی ہوس" کا سفارش نامہ ملا، تو وہ کام فوراً کر دیا آپ کی موجودگی میں لوگوں کو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ اُنکی رسائی دور تک ہے نادار اور لاوارثوں کو آپکی وجہ سے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ بادشاہ تک پہنچ جانا کوئی مشکل مرحلہ نہیں ہے جب بھی چاہیں گے بادشاہ تک پہنچ جائیں گے۔

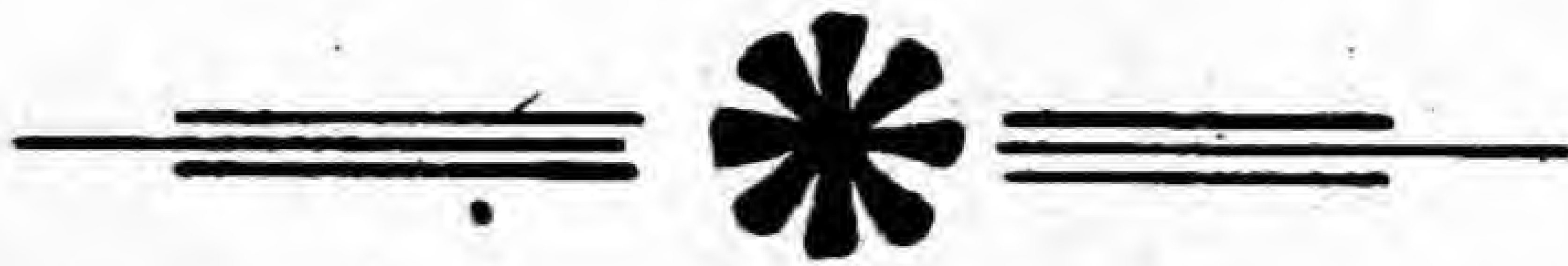
آخر آپ کا لمحۂ آخر آ پہنچا اور ۲۸ شعبان بروز دوشنبہ ۱۰۴۶ھ کو آپ نے سفرِ آخرت اختیار کیا، یہ شاہجہاں کا دور تھا۔ فارسی میں آپ کا قطعۂ تاریخ یوں ہے۔

زدنیا چو در خلدِ معلّٰی | جنابِ شہ بلاول شاہِ شاہاں
بگو مقبولِ حق سرمست تاریخ | دگر کاملِ مہ فضل است اے جاں
۱۰۴۶ھ | ۱۰۴۶ھ

اسی طرح اردو میں قطعۂ تاریخ اس طرح لکھا گیا ہے

شہ بلاول شاہ عالی جاہ تھے | حضرتِ حق سے بلا اُن کو بہشت
اُن کا نورِ معرفت ہے خاتمہ | دوسری تاریخ ہے نیکو سرشت
۱۰۴۶ھ | ۱۰۴۶ھ

باغ راجہ دینا ناتھ کے قریب آپ کا مزار ہے حالانکہ پہلے آپ کا مقبرہ دریائے راوی قریب تھا لیکن جب دریائے راوی مقبرے کے قریب بہنے لگا تو اس خدشے سے کہ کہیں مزار کو نقصان نہ پہنچ جائے آپ کے جسد مبارک کو باغ راجہ دینا ناتھ کے قریب دفن کر دیا گیا۔ اور اب یہ جگہ شاہ بلاول کا بن کہلاتی ہے۔



حضرت شیخ سلیم چشتیؒ

ہندوستان کے نامی حکمران سلطان غیاث الدین کی حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے عقیدت و شیفتگی اتنی بڑھی کہ اس نے اپنی بیٹی زہرہ خاتون کو بابا فرید سے وابستہ کر دیا۔ ان سے شیخ بدرالدین پیدا ہوئے بابا فرید کا سلسلۂ رشد و ہدایت کسی بعید ترین ستارے کی روشنی کی طرح زمانی فاصلے طے کرتا ہوا پندرہویں صدی عیسوی تک آ گیا۔ اس خاندان کے ایک فرد نے اجودھن کی سکونت ترک کی اور لدھیانے میں اقامت اختیار کی۔ لدھیانے میں ابھی ایک نسل بھی نہ گزری تھی کہ شیخ بہاء الدین نامی ایک شخص نے اشارۂ غیبی پر لدھیانے کی سکونت بھی ترک کر دی اور اپنے کنبے کو لے کر دہلی چلا آیا اور سرائے حضرت شیخ علاء الدین زندہ پیرؒ میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اس کا نام شیخ موسیٰ رکھا گیا۔ شیخ موسیٰ کی پیدائش کے کئی سال بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا، اس کا نام شیخ سلیم رکھا گیا یہی بچہ آگے چل کر شیخ سلیم چشتیؒ کہلایا اور اس کا فیضان اتنا عام ہوا کہ بڑے بڑے شاہان وقت اس کے حضور غلاموں کی طرح دست بستہ حاضری دے کر اپنی درخواستیں گزار کرتے تھے آپ کا سنِ ولادت ۸۸۲ھ (۱۴۷۸ء) ہے ان دنوں ہندوستان پر بہلول لودھی حکومت کر رہا تھا۔

شیخ موسیٰ جوان ہو چکے تھے اور شیخ سلیم ابھی نو سال کے تھے کہ شیخ بہاء الدین اور ان کی اہلیہ کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی ذمہ داری اپنی اولاد کی طرح قبول کی اور شب و روز کا بیشتر حصہ اپنے چھوٹے بھائی کی دلجوئی میں گزارنے لگے لیکن اس کے باوجود شیخ موسیٰ نے یہ محسوس کیا کہ ان کا چھوٹا بھائی بہت زیادہ اداس اور فکرمند رہتا ہے۔ جب دیکھئے۔ بیٹھا کچھ نہ کچھ سوچ رہا ہے انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آنکھیں کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر یوں جم جاتیں گویا وہ پتھر کی ہوں پھر کسی بات سے اس نو سالہ معصوم بچے کا دل بھر آتا اور پتھر جیسی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ بڑا

بھائی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ اس کا چھوٹا بھائی والدین کی موت سے حد درجہ سوگوار ہے لیکن وہاں تو بات ہی کچھ اور بھی اس معصوم کا دل تو خشیت الٰہی سے لرزاں و ترساں رہتا تھا۔ اس ننھے سے دل میں تو دیدارِ رسول پاک کے دیکھنے کی تڑپ تھی اور یہی تڑپ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس پر آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلتی تھی۔

شام کے جھٹ پٹے میں، شیخ موسیٰ جب گھر میں داخل ہوئے تو وہاں اپنے چھوٹے بھائی کو نہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ یہ اِدھر اُدھر تلاش کرتے ہوئے جب گنبد نما حجرہ میں داخل ہوئے تو اندھیرے میں اپنے مرحوم والدین کے مزار کے پائنتی کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا طاق میں رکھی ہوئی مومی شمع ہوا کے ایک جھونکے سے جھلملا گئی۔ موسیٰ نے آگے بڑھ کر آہستہ سے کہا: "سلیم! تم یہاں ہو؟"

سلیم نے سر اٹھایا اور کھوئی کھوئی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

بڑے بھائی نے پوچھا: "سلیم! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ننھے سلیم نے جواب دیا: "بھائی صاحب ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اپنی کوئی قیمتی چیز گم کر دی ہے وہ کیا چیز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا، لیکن اس کی کمی کا احساس ستاتا رہتا ہے"

بڑے بھائی کو خیال گزرا کہ سلیم پر مرحوم والدین کی جدائی شاق گزر رہی ہے۔ اس رات وہ سو نہیں سکے، پوری رات اسی فکر میں گزار دی کہ آخر اپنے معصوم، پیارے پیارے بھائی کے غم و اندوہ کا کیا علاج کیا جائے؟

دوسرے دن صبح موسیٰ چشتی نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ دہلی کی سکونت ترک کر رہے ہیں اور آگرے کی طرف چلے جائیں گے اس اعلان پر فوراً ہی عمل درآمد بھی کیا گیا۔ موسیٰ چشتی اپنے چھوٹے بھائی اور سامان کے ساتھ ایک قافلے میں شامل ہو کر آگرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ قافلے کے بیشتر افراد آگرے میں رک گئے لیکن شیخ موسیٰ آگرے سے بائیس میل دور سیکری چلے گئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ سامنے جنوب میں حدِ نظر تک اراولی کا کوہستانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سیکری کبھی سیکروالہ راجپوتوں کی راجدھانی رہ چکا تھا اور اس جگہ کو راجپوتانے کے دروازے کی حیثیت حاصل ہے موسیٰ یہیں رہ گئے انہوں نے یہیں شادی کر لی اور سکون سے زندگی گزارنے لگے۔

سلیم کا وہی حال تھا ان کا گھر میں جی نہ لگتا ویرانوں میں نکل جاتے اور مضطرب

اور بے چین دل کو سکون پہنچانے کی کوشش میں ذکرِ الٰہی کرتے رہتے۔ موسیٰ بھی اپنے چھوٹے بھائی کی حالت سے کچھ بے خبر نہ تھے شادی کے کئی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم تھے پہلے اگر سلیم چھوٹا بھائی تھا تو اب وہ بیٹا محسوس ہونے لگا تھا۔

سلیم اس اضطراب اور اضطرار میں اپنی زندگی کے چودہ سال گزار کر پندرھویں میں داخل ہو گئے۔ موسیٰ جب رات کو سونے لگتے تو ایک بار سلیم کے حجرے میں ضرور جاتے اور وہاں انہیں مصروفِ عبادت دیکھ کر واپس آجاتے یہی حال ان کی بیوی کا تھا وہ بھی اپنے خاموش طبع اور عبادت گزار دیور کو عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ بھاوج کسی ضرورت سے اٹھ کر جب سلیم کے حجرے کی طرف گزریں تو وہاں کچھ غیر معمولی سکوت محسوس کیا۔ انہوں نے ایڑیوں کے بل چل کر حجرے میں جھانک کر دیکھا وہ خالی تھا وہاں کوئی بھی نہ تھا یہ پریشان ہو گئیں۔ اس کے بعد انہیں سارے گھر میں تلاش کر ڈالا لیکن سلیم کہیں بھی نظر نہ آئے انہوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی کبھی سوچتیں، شوہر کو اس سے آگاہ کر دیا جائے پھر سوچتیں سارے دن کا تھکا ماندہ شوہر بہت پریشان ہو جائے گا۔ اس کشمکش میں مشرق میں پو پھٹی اور مسجدوں سے اذان اور مندروں سے گھنٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ موسیٰ بیدار ہو کر وضو کیا اور جب وہ نماز باجماعت کے لیے گھر سے نکلنے لگے تو ان کے ساتھ ہی سلیم بھی نکلے۔ بھاوج نے حیرت سے انہیں دیکھا اور سوچنے لگیں کہ رات والا واقعہ کوئی خواب تھا یا واقعی ایک واقعہ؟

دوسری رات پھر وہی ہوا سلیم اپنے حجرے سے غائب تھے تیسری رات بھی یہی ہوا اور پھر چوتھی رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ فجر کی نماز دونوں بھائی مسجد میں جا کر ادا کرتے۔

بھاوج نے تشویش سے سوچا "اگر سلیم کو عبادت اور ریاضت ہی کرنی ہے تو انہیں اپنے حجرے میں موجود رہنا چاہیئے۔ لیکن نصف رات کے بعد حجرہ خالی ہو جاتا ہے آخر یہ صاحبزادے جاتے کہاں ہیں؟ طرح طرح کے شکوک اور وسوسے دل میں گھر کرتے اور نیک اور پاک باز عورت انہیں ایک جھٹکے میں دل سے نکال پھینکتی اور اپنے وسوسہ ہائے شیطانی پر خجل اور شرمندہ ہو جاتی۔ بالآخر راتہائے سینہ گداز نے اتنا ہلکان کر دیا کہ اپنی تشویش کو شوہر پر ظاہر کر دیا۔ موسیٰ پریشان ہو گئے اور ایک رات انہوں نے اپنے چہیتے کی نگرانی میں رات کی نیند حرام کر ڈالی۔

سلیم نے آہستہ سے اپنے حجرے کا دروازہ بند کیا اور گھر سے باہر نکل گئے رات کی تاریکی

سے موسیٰ نے بھی فائدہ اٹھایا اور ان کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے گھر سے تھوڑی دور، مشرق میں، جہاں پہاڑی کا ایک حصہ نشیب کی شکل اختیار کرکے ذرا مسطح میدان نظر آتا ہے وہاں چند بڑے بڑے تناور درختوں کا جھنڈ پایا جاتا تھا، سلیم اس جھنڈ میں پہنچکر ایک درخت پر چڑھ گئے موسیٰ گھنلوس کھڑے اپنے بھائی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن سلیم نیچے نہ اُترے۔ اراولی کی بلند و بالا چوٹیوں سے درندوں کی خوفناک آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دیتیں اور موسیٰ کانپ جاتے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اسرار کیا ہیں؟

فجر سے دو گھڑی پہلے سلیم درخت سے نیچے اترے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے پریشان اور تھکے ہارے بڑے بھائی نے آگے بڑھ کر سلیم کا راستہ روک لیا اور پوچھا: "سلیم! یہ کیا اسرار ہیں؟ تم یہاں کیا کرتے رہے تھے؟"

چھوٹے بھائی نے مطمئن انداز میں بھائی کو دیکھا اور کہا: "آپ ہمارا پیچھا کرتے رہیں؟"

"ہاں!" موسیٰ نے کہا۔ "تمہاری بھابی تمہاری اس نئی روش سے بہت پریشان ہیں اور میں خود بھی بے حد گھبرا گیا ہوں، آخر تم ہمیں بتاتے کیوں نہیں کہ آتنی رات گئے تم یہاں کیوں آتے ہو اور اس درخت پر چڑھ کر کیا کیا کرتے ہو؟"

سلیم نے کوئی جواب دینے کے بجائے رقت سے کہا: "بھائی صاحب میں حج کے لئے جانا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دیجئے، بہت شکر گزار ہوں گا۔"

موسیٰ نے کہا "یہ ہماری بات کا جواب تو نہ ہوا؟"

سلیم نے کہا: "بھائی صاحب! میرا دل پھٹا جا رہا ہے خشیتِ الٰہی اور حبِ نبوی کا بوجھ ایسا نہیں ہے کہ میں آسانی سے اٹھا سکوں۔ مفارقت کی آگ میرے سارے وجود کو پھونکے دے رہی ہے خدا کیلئے مجھے اجازت مرحمت فرما دیں، اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

موسیٰ نے اپنے بھائی کو سینے سے لگا لیا اور رونے لگے، بولے "میں تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اگر تم اس کا جواب نہیں دے سکتے تو نہ دو لیکن میں تم کو اپنے پاس سے جدا نہیں کر سکتا، سلیم! میں نے تجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے میں تیری جدائی کا صدمہ نہیں برداشت کر سکتا۔"

ماسوا اللہ سے منہ موڑنے والے بھائی نے کہا "آپ کو بیٹا چاہیئے؟"

موسیٰ نے بھائی کو حیرت سے دیکھا کہا: "بیٹا؟ یہ تو اسی دن سے میری سب سے

بڑی آرزو بن گیا ہے جس دن تیری بھابی تیرے گھر میں میری بیوی بن کر آئی تھی!"

پھر سرد آہ بھر کر کہا "شاید خدا کو یہ بات منظور نہیں ہے کہ میں کسی بچے کا باپ کہلاؤں۔ اُس پاک بے نیاز سے اس محرومی کی شکایت بھی تو نہیں کی جا سکتی۔"

سلیم نے کیفیت جذب میں کہا "آپ کو بیٹا ملے گا، عنقریب بہت جلد، لیکن جب آپ باپ بن جائیں۔ تو مجھے حج پر جانے سے نہ روکیے گا، یہ ہم سے ابھی اسی وقت عہد کر لیجیے۔"

موسیٰ نے اپنے نوجوان بھائی کو حالت جذب میں پہلی بار دیکھا تھا۔ انہیں ایسا لگا جیسے وہ کسی مجذوب کی بڑ سُن رہے ہوں۔ بے سروپا، ناقابل یقین بڑ، جس کی کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی، جس کا کوئی انجام نہ ہو۔



نہایت ہوشیاری سے پیچھا کر کے موسیٰ نے سلیم کے درخت پر چڑھنے کا راز معلوم ہی کر لیا۔ نوجوانی کا گرم خون سلیم کو آرام و آسائش پر مائل کرتا رہتا تھا اور حجرے کی پُرسکون اور آرام دہ فضا میں نیند منڈلانے لگتی تھی تو ذکر الٰہی میں خود کو فراموش کر دینے والے اس نوجوان نے اس پر قابو پانے کے لئے یہ انوکھا طریقہ دریافت کیا تھا کہ وہ نصف رات کے بعد کسی درخت پر چڑھ کر، کسی شاخ پر بیٹھ جاتے اور وہاں اللہ اللہ کرتے رہتے، گھڑی گھڑی شیروں کی دہاڑ سے فضا دہل جاتی اور سلیم بآسانی اپنی نیند پر غلبہ پا لیتے۔ موسیٰ کے دل پر اپنے چھوٹے بھائی کے زہد و تقویٰ کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کے ساتھ تعظیم و احترام سے پیش آنے لگے۔

تقریباً دس ماہ بعد موسیٰ صاحب اولاد ہو گئے۔ اب وہ ایک بچے کے باپ تھے انہوں نے فرط شفقت سے بچے کو گود میں لیا اور میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اسی عالم میں سلیم بھی وہیں پہنچ گئے اور بھائی سے کہا "بھائی صاحب! خدا نے آپ کو صاحب اولاد کر دیا۔ مبارک ہو، اب تو میں حج بیت اللہ کے لئے اجازت حاصل کر سکتا ہوں۔"

بڑے بھائی نے کہا "سلیم! مجھے اپنا عہد یاد ہے، اب تم جا سکتے ہو لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ صاحب اولاد ہو جانے سے میرے دل میں تمہاری محبت کم ہو گئی ہے۔"

پھر ذرا رک کر آہستہ سے کہا "بلکہ اس واقعے کے بعد تو میں تمہارا احترام کرنے لگا ہوں، سلیم! تم ولی ہو۔"

سلیم نے اجازت پاتے ہی سرہند کا رُخ کیا۔ کچھ دن وہاں قیام کیا اور شیخ مجدد الدین سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ یہاں سے چل کر ایک آدھ جگہ اور رُکے

اور پھر اجودھن پہنچ گئے۔ یہاں بابا فرید کے دیوان اور صاحب سجادہ شیخ ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقہ حاصل کیا۔ اب نوجوان سلیم چشتی ہو چکے تھے۔ کیونکہ بابا فرید خواجگان چشت میں سے تھے۔ اجودھن میں بابا فرید کے مزار پر جو دوسرے حضرات خرقہ کی امید میں شب و روز عبادت و ریاضت میں لگے ہوئے تھے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ایک اٹھارہ سالہ نوجوان بابا فرید کے مزار پر آیا اور بآسانی خرقہ خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو انہیں صاحب سجادہ سے شکایت پیدا ہو گئی۔

صاحب سجادہ ان کے بگڑے تیوروں کو کئی دن برداشت کرتے رہے آخر ایک دن اُن سے سوال کیا "حضرات! یہ ناچیز کئی دن سے یہ محسوس کر رہا ہے کہ آپ ہم سے کسی بات پر کبیدہ خاطر ہو رہے ہیں، کیا اس کا سبب دریافت کر سکتے ہیں؟"

ایک عمر رسیدہ زاہد نے جواب دیا "آپ نے ہم پر ان نووارد صاحبزادے کو جیسی ترجیح دی ہے کیا اس سے ہمارے دل فگار نہیں ہو رہے ہیں؟ کیا ہمارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی؟"

شیخ ابراہیم نے جواب دیا "حضرات! ہم نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں کیا ہم آپ کو یہ کس طرح باور کرائیں کہ ہمیں بابا فرید کی ہدایت پر ان صاحبزادے کا انتظار تھا۔ بابا ہمیں بار بار خواب میں یہ ہدایات دے رہے تھے کہ سلیم آ رہا ہے ہمارے تبرکات ان کے حوالے کر دینا۔ پھر ہم کس طرح بددیانتی کر سکتے تھے"

لوگوں نے سکوت اختیار کیا۔

سلیم چشتی کچھ عرصہ اجودھن میں قیام فرما رہے اس کے بعد پاپیادہ حج کو روانہ ہو گئے۔

آپ نے کئی حج کئے اور مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے رہے جب بھی رسول مقبولؐ کے مزار اقدس پر حاضری دیتے۔ حال سے بے حال ہو جاتے۔ یہ مدینہ منورہ ہی میں رہ جانا چاہتے تھے لیکن رسول اللہؐ نے انہیں وطن واپس جانے کی ہدایت کی۔ آپ رو رو کر یہ عرض کرتے تھے کہ یا رسول اللہؐ! اپنے اس غلام کو مدینے کا پیوند ہو جانے کا شرف عطا فرمائیے۔

رسول اللہؐ نے خواب میں وطن کو واپسی کا حکم دیتے ہوئے بشارت دی "شیخ الہند وطن واپس جاؤ، تم کو وہیں تمہارے وطن میں جا کے دفن کے لئے مدینے کی زمین مل جائے گی"

بہ حسب ارشادِ نبویؐ وطن واپس آ گئے۔ انہوں نے اپنے گھر بار سے بے تعلقی اختیار کی اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر اقامت گزیں ہو گئے۔ شہر اور شہر والوں سے دور لیکن جنگلی درندوں سے بالکل قریب اتنے قریب کہ وہاں کوئی انسان رہنے کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہاں سنگِ سرخ کے پہاڑ دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور دن کو سورج کی روشنی میں سنگتراشوں کی جمعیتیں پتھر لینے آیا کرتی تھیں۔ ایک دن صبح صبح جب انہوں نے اس خطرناک مقام پر سلیم چشتی کو دیکھا تو ڈرتے ڈرتے عرض کیا "جناب آپ نووارد ہیں اور لاکھ درویش سہی لیکن ایک بات ہماری بھی مانیں۔"

آپ نے پوچھا "وہ کیا؟ کہو، ذرا ہم تو سنیں۔"

سنگتراشوں نے کہا "ہم ان حدود میں برسہا برس سے آ جا رہے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ یہ علاقہ درندوں کا مسکن ہے، ہم یہاں مسلح آتے ہیں لیکن آپ کسی احتیاطی تدبیر کے بغیر ہی فروکش ہو گئے ہیں یہ ایک خطرناک بات ہے۔"

آپ نے بے نیازی سے پوچھا "اور کچھ؟"

ایک ادھیڑ عمر سنگتراش نے جواب دیا "اور یہ کہ آپ یہاں دن میں بشوق رہیں کیونکہ آپ کے آس پاس ہم سبھی موجود رہیں گے لیکن شام کو جب ہم سب یہاں سے جانے لگیں تو ہمارے ساتھ آپ بھی چلے جائیں، کیونکہ یہاں رات کا قیام خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

آپ نے جواب دیا "یہ فقیر تو جہاں بیٹھ گیا، بیٹھ گیا۔ ہم کہاں کے ایسے ہیں کہ اللہ کی مخلوق سے ڈرتے پھریں۔ تمہارے نیک مشورے کا شکریہ!"

سنگتراش یہ سمجھے کہ اس درویش کو شاید کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اپنی عبادت و ریاضت پر گھمنڈ ہے جبھی تو ایسی باتیں کر رہا ہے۔

سنگتراش اس ضدی اور خدا پرست انسان کو پہاڑی پر تنہا چھوڑ کر مغرب سے پہلے پہلے چلے گئے۔

دوسرے دن صبح جب یہ لوگ اُوپر جا رہے تھے تو انہیں یقین تھا کہ وہاں کہیں، کسی جگہ اس ضدی شخص کی لاش ضرور ملے گی جس کا پیٹ کوئی درندہ پھاڑ چکا ہوگا اور دور تک خون ہی خون بہہ رہا ہوگا۔

یہ لوگ نہایت احتیاط سے چوکنے انداز میں جب اوپر پہنچے تو دیکھا سلیم چشتی

نماز میں مشغول ہیں اور ان کے قریب ہی دو شیر بیٹھے چوکسی کر رہے ہیں۔

جب سلیم چشتی نے سلام پھیر کر شیروں کی طرف دیکھا تو وہ دُم ہلانے لگے اس کے بعد انہوں نے دور سے آتے ہوئے سنگتراشوں کی طرف دیکھا اور شیروں کو حکم دیا "تم واپس جاؤ" شیر دُم ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اُس دن پہلی بار سنگتراشوں کو آپ کی بزرگی، عظمت اور مرتبے کا صحیح احساس ہوا۔ وہ سیدھے آپ کے روبرو پہنچے اور قدموں میں گر گئے آپ نے انہیں اٹھایا اور پوچھا "تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟"

لوگوں نے جواب دیا "حضرت! ہمیں اپنے جذبہ شوق کا اظہار کر لینے دیجئے، آپ منع نہ کیجئے"

آپ نے جواب دیا "لیکن ہمارے قدموں میں اپنا سر رکھ کر ہمیں گناہگار تو نہ کیجئے"

اس کے بعد سنگ تراشوں نے آپ کے لیئے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کر دی جو بعد میں "مسجد سنگتراشاں" کہلائی اور آج بھی موجود ہے۔

اسی دوران مضافات کے راجپوتوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور مسلمان ہونے لگے یہ مسلم راجپوت "ملکانے" کے نام سے بہت مشہور ہوئے۔



پانی پت کے تاریخی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر بابر ہندوستان کی قسمت کا مالک ہو چکا تھا۔ ابھی اس نے پوری طرح سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ ہندوستان کی کئی دوسری طاقتیں بابر کے خلاف متحد ہو گئیں۔ ان میں ہندو مسلمان کی کوئی قید نہ تھی۔ اس متحدہ محاذ میواڑ کے سورج بنسی راجا رانا سانگا کو اپنا سپہ سالار اعظم مان لیا۔ سیکری کے جنوب میں، پانچ میل دُور خانوا (کنواہہ) نامی گاؤں کے میدان میں رانا سانگا دولاکھ فوج کے ساتھ خیمہ زن ہو گیا بابر بھی اپنی بیس ہزار فوج لے کر نکلا اور سیکری میں خیمہ زن ہو گیا۔ یہیں کی ایک مسجد میں بابر نے شراب نوشی سے توبہ کی اور جام و سبو، ساغر و مینا توڑ کر ریزہ ریزہ کر دئے۔ اس کے ساتھی فکر لئے ہوئے تھے اور انہیں اپنی فتح مندی پر یقین نہیں تھا یہ معرکہ، معرکۂ بابر و رانا سانگا نہیں تھا بلکہ معرکہ کفر و اسلام تھا کیونکہ رانا سانگا نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو شمالی ہند اور بعد میں پورے ہندوستان سے

مسلمانوں کو نکال باہر کرے گا۔

غضب کا رن پڑا اور شام ہوتے ہوتے زخمی رانا سانگا نے راہ فرار اختیار کی۔ سلیم چشتیؒ کی دعائیں بابر کے حق میں تھیں اور کم نفری فوج کے باوجود بابر نے اپنی بے پناہ شجاعت، عسکری فراست اور سلیم چشتیؒ کی دعاؤں کے طفیل رانا سانگا کو عبرتناک شکست دی۔

پہلے یہ جگہ سیکری تھی، بابر نے فتح مندی کے بعد اس کا نام شکری رکھ دیا اور شکری سے خانوا تک شہیدوں کی ایک بستی قائم ہو گئی جو گنج شہیداں کہلائی۔

چند سال بعد بابر اپنے حصے کا کام ختم کر کے خود کو ہمایوں پر قربان کر گیا۔ ہمایوں برسر اقتدار آیا لیکن چند سالوں کے اندر اندر بہار کے افغان جاگیردار فرید خان نے اسے متواتر شکستیں دے کر ہندوستان سے نکال باہر کیا اور خود شیر شاہ سوری کے نام سے ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔ شیر شاہ کے امیرالامرا خواص خاں نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حاضری دی اور شرف مریدی سے شادکام ہوا کچھ عرصہ بعد شیر شاہ خواص خاں سے بدظن ہو گیا اور اُسے قید خانے میں ڈال دیا۔ خواص خاں کے پسماندگان شیخ سلیم چشتیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور رو دھو کر مدد کے طالب ہوئے۔

آپ نے انہیں تسلی دی اور مستقبل کا فیصلہ سُنا دیا "جو ظلم کرے گا ظلم سہے گا"۔

شیر شاہی سپاہ آپ کی خدمت میں گستاخانہ پہنچی اور درشت لہجے میں سوال جواب شروع کر دیے۔ اس نے پوچھا۔

"تم خواص کے حمایتی ہو؟"

آپ نے جواب دیا "حمایتی صرف خدا ہے ہم تو اس کے اشاروں کے چاکر ہیں"۔

شیر شاہی سردار نے گرج کر سوال کیا "تم ایک ادنیٰ، گوشہ نشین، خواص خاں شاہی معتوب کے پسماندگان سے مل کر سازشیں کرتے ہو؟"

آپ نے جواب دیا "سازشیں دنیا دار کرتے ہیں وہ لوگ جنہیں ملوکیت جیسی گھناؤنی شے نے اپنا اسیر بنا لیا ہو، دام فریب کے بندے ہوتے ہیں۔ تمہارا بادشاہ محسن کش ہے"۔

شیر شاہی سردار نے طنزاً کہا: "ہمارا بادشاہ کیا، شہنشاہ تمہارا بادشاہ بھی ہے"

آپ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا "ہمارا بادشاہ ہمیشہ رہے گا یہ تو تمہارا ہی بادشاہ

ہے جو چند گھڑی کسی شعلے کی طرح روشنی دے کر ہمیشہ کے لیئے غائب ہو جائے گا۔"

سردار نے سخت آواز میں کہا: "بکواس بند کرو۔"

آپ نے ذومعنی جواب دیا: "بکواس بند کردی جائے گی" پھر پوچھا "خواص خاں کا کیا ہوا؟"

شیر شاہی سردار نے جواب دیا: "اسے شاہی حکم پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔"

"بہت برا کیا تمہارے بادشاہ نے" آپ نے افسوس کا اظہار کیا "مرگ ناگہاں تمہارے بادشاہ کی تاک میں ہے۔"

شیر شاہی سردار نے اپنے بادشاہ کا دوسرا حکم سنادیا۔ بولا "باغی خواص خاں کے قتل کے بعد بادشاہ نے تمہارے لیئے یہ حکم صادر کیا ہے کہ تم چونکہ شاہی غدار اور اس کے پسماندگان سے دلی ہمدردی رکھتے ہو اس لیئے تمہیں احتیاطاً گوالیار کے قلعے میں نظر بند کردیا جائے۔ بادشاہ نہیں چاہتے کہ تم ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ۔"

آپ نے جواب دیا "تمہارے بادشاہ کے دل میں جو بھی آئے کر گزرے لیکن ہمارا بادشاہ بہت قوی ہے اس کی گرفت اور دائرۂ گرفت میں پوری کائنات ہے۔"

شیر شاہی سپاہ نے آپ کو سیکری سے اٹھوا کر گوالیار میں نظر بند کردیا۔ جب یہ لوگ شاہی فرمان کی بجا آوری کے بعد آپ کے پاس سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے کہا "تم اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ مظلوموں کی فریادیں عرش اعظم تک پہنچ چکی ہیں اور مالک یوم الآخر نے ظالموں کے خلاف اپنا فیصلہ صادر فرمادیا ہے مرگ ناگہانی تیرے بادشاہ کے تعاقب میں ہے۔"

معلوم نہیں آپ کا یہ پیغام بادشاہ کو پہنچا بھی یا نہیں لیکن کچھ عرصہ بعد ہی جبکہ شیر شاہ کالنجر کے قلعے کی تسخیر میں لگا ہوا تھا بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ اس میں جھلس کر ہلاک ہوگیا اور آپ کے عقیدت مندوں نے گوالیار کی نظر بندی سے آپ کو رہا کر کے سیکری پہنچادیا۔

شیر شاہ کے بعد اس بیٹوں میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ شیر شاہ کا بڑا بیٹا دار الخلافہ سے دور تھا، چھوٹا قریب تھا امرا نے اسی کو اسلام شاہ سوری کا لقب دے کر تخت پر بٹھادیا۔ دونوں بھائیوں کو حضرت سلیم چشتی سے بڑی عقیدت

تھی۔ عادل شاہ اپنے چھوٹے بھائی کو تاج و تخت سے معزول کرنے کی نیّت سے لاؤ لشکر لے کر آگے بڑھا اور اپنے ایک مصاحب خاص کو حضرت سلیم چشتیؒ کی خدمت میں حصُول دُعا کے لئے بھیجا۔ قاضی غیاث الدّین نامی یہ امیر، حضرت سلیم چشتیؒ کے خاص مریدوں میں سے تھا۔ اس نے نہایت ادب سے عرض کیا "حضرت! آپ کا یہ غلام چاہتا ہے کہ اس معرکے میں عادل شاہ سُرخروئی حاصل کرے اور آپ کا یہ بندہ آپ کی دعاؤں سے کسی قابل ہو جائے۔"

حضرت سلیم چشتیؒ نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا پھر پوچھا "تم عادل شاہ کے پاس کب جاؤ گے؟"

قاضی غیاث الدین نے جواب دیا "جب بھی حضور اجازت مرحمت فرمائیں گے چلا جاؤں گا۔"

آپ نے فرمایا "تو اب چلے جاؤ۔"

قاضی غیاث نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "حضرت! یہ ناچیز عادل شاہ کو کس طرح یقین دلائے گا کہ یہ حضور والا سے اس کے حق میں دُعاؤں کی سوغات لے کر واپس آیا ہے۔"

آپ نے دریافت کیا "تم کیا چاہتے ہو؟"

قاضی غیاث نے جواب دیا "آپ اس گناہگار کو ایک گھوڑا مرحمت فرمادیں تاکہ اس پر سوار ہو کر عادل شاہ کی خدمت میں حاضری دے اور پھر اسی گھوڑے کو عادل شاہ کے حوالے کر دے اور اس کی پشت پر وہ بیٹھ کر اپنے حریف کا مقابلہ کرے۔"

آپ نے اپنا عراقی گھوڑا قاضی غیاث کے حوالے کر دیا اور فرمایا "عادل شاہ سے کہنا، اس گھوڑے پر وہ خود تو سواری کر سکتا ہے لیکن کسی اور کو ہرگز نہ دے ورنہ اس کے نتائج اچھے نہ نکلیں گے۔"

قاضی غیاث، اس گھوڑے پر سوار ہو کر عادل شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اور گھوڑے کو عادل شاہ کے حوالے کرتے ہوئے ساری باتوں سے اسے مطلع کر دیا۔

چند گھڑیوں بعد عادل شاہ کے ایک مصاحب خاص نے اس گھوڑے کو بیحد پسند کیا اور کہا "حضور والا! یہ گھوڑا تو بہت خوبصورت لگتا ہے کیا تھوڑی دیر کے لئے

مجھے مرحمت فرمادیں گے ؟"

عادل شاہ کو دینے میں تامل ہوا لیکن یہ سوچکر کہ کہیں یہ مصاحب ناراض ہوکر اپنے سواروں سمیت اس کے چھوٹے بھائی سے نہ جا ملے گھوڑا سواری کی غرض سے اس کے حوالے کر دیا۔ قاضی غیاث کو یہ بات گراں گزری یہ چپ چاپ وہاں سے رخصت ہو کر سیکری چلا گیا اور حضرت سلیم چشتیؒ کو ساری روداد سنادی۔ آپ نے ذرا دیر کے لیئے سکوت اختیار کیا پھر بولے: "افسوس کہ عادل شاہ نے اپنی سلطنت کھو دی۔"

جب دونوں بھائی آمنے سامنے آ ڈٹے تو چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے خوفزدہ ہو کر قلعے میں بیٹھ رہا اس کی فوج کا بیشتر حصہ عادل شاہ سے جا ملا۔ اس نے اس نازک موقع پر ایک خاص ایلچی حضرت سلیم چشتی کی خدمت میں روانہ کیا اور آپ سے طالب دُعا ہوا۔

آپ نے ایلچی سے دریافت فرمایا "اسلام شاہ کیا کر رہا ہے؟"

ایلچی نے جواب دیا "حضرت! وہ اپنے بھائی عادل شاہ سے خوفزدہ ہو کر قلعے میں رُوپوش ہے۔"

آپ نے پوچھا "میدان میں نکل کر مقابلہ کیوں نہیں کرتا؟"

ایلچی نے جواب دیا "فوج کا بیشتر حصہ عادل شاہ سے جا ملا ہے ان حالات میں کس طرح جنگ جیتی جا سکتی ہے؟"

"اچھا!" آپ نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا "پہلے ہم نے عادل شاہ کی مدد کی تھی لیکن وہ اہل ثابت نہ ہوا، جاؤ! اسلام شاہ سے کہہ دو قلعے سے نکل کر میدان میں صف آرا ہو جائے عادل شاہ ہارے گا اور اسلام شاہ کی برگشتہ فوج واپس آجائے گی۔"

ایلچی نے جب یہ پیغام اسلام شاہ کے گوش گزار کیا تو وہ بلا توقف قلعے سے باہر نکلا اور اپنی باقی ماندہ فوج کو صف بستہ کیا اور عادل شاہ سے نبرد آزما ہو گیا۔ ابھی جنگ جاری ہی تھی کہ اسلام شاہ کی فوج واپس آگئی اور اپنے ساتھ عادل شاہ کی فوج کا بیشتر حصہ بھی لیتی آئی۔ عادل شاہ ہراساں و بدحواس شکست اُٹھا کر عظیم آباد کی طرف فرار ہو گیا۔

اسلام شاہ نے نو سال دبدبے سے حکومت کی لیکن اس کے فوت ہوتے ہی اس کا چچازاد بھائی، اسلام شاہ کے بیٹے کو قتل کر کے برسرِ اقتدار آگیا۔ اس شخص نے ہیمول نامی شاطر بنیے کو وزارت کا منصب بخشا اور سارے اختیارات اس کے حوالے کر کے خود رنگ رلیوں میں لگ گیا۔ ہیمول کا دماغ یہاں تک خراب ہوا کہ اس نے اپنے لیئے راجہ بکرماجیت کا خطاب پسند کیا۔ افغانوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ ہمایوں ایران سے واپس آگیا اور سکندر شاہ سوری کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قابض ہوگیا ابھی ہمایوں کو تاج و تخت سنبھالے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ قلعے کی بالائی منزل سے لڑھکتا ہوا نیچے آگیا۔ اس نے مغرب کی اذان سن کر بعجلت نیچے اترنا چاہا تھا لیکن توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا سیڑھی کی آخری نچلی سیڑھیوں تک پہنچ کر دم توڑ دیا ان دنوں نوعمر اکبر اپنے اتالیق اور سپہ سالار بیرم خاں کے ساتھ کلانور پنجاب میں مقیم تھا۔ وہیں اس کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔

ہمایوں کی موت نے سوریوں کے حوصلے بلند کر دیئے اور ہیمول لشکر جرار لے کر دہلی پر حملہ آور ہوا اور چشم زدن میں اسے فتح کر لیا ہیموں نے مسلمانوں کو ستانا شروع کیا اور اس کی شرارتوں سے حضرت سلیم چشتی بھی محفوظ نہ رہے آپ نے ہندوستان کی طوائف الملوکی اور انتشار سے دل برداشتہ ہو کر اپنا ایک آدمی سورت کی بندرگاہ اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ بحری جہاز کا انتظام کرے جس سے وہ اپنے ساتھیوں سمیت حج بیت اللہ کو روانہ ہو جائیں۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو بھی ان کے ساتھ حج کو جانا چاہے آپ اپنے خرچ پر خوشی سے جائیں گے۔

جہاز کا انتظام ہوگیا اور آپ اپنے آخری حج پر روانہ ہوگئے اس بار بھی آپ نے یہی خواہش کی کہ حق کر دیں پیوند خاک ہو جائیں گے۔ مکہ معظمہ سے آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں معتکف ہوگئے اور خاصی مدت اسی حالت میں گزار دی۔

ایک شب خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ آپ سے فرماتے ہیں۔

”سلیم! ہندوستان واپس جاؤ، وہاں کے لوگوں کو فیض پہنچاؤ اور دین کی اشاعت کرو۔“

آپ نے خوشامدانہ درخواست کی "حضور! اس گنہگار کو خاک مدینہ میں مل جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں، اب یہ در چھوڑ کر کہاں جاؤں؟"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تمہیں پہلے ہی یہ بتایا جا چکا ہے کہ تمہیں وہیں مدینے کی زمین عطا کر دی جائے گی"

اب مزید اصرار کا موقع نہ تھا، خوش خوش واپس ہو گئے۔



بیرم خاں، اکبر کے ساتھ جالندھر سے پانی پت کی طرف بڑھا اور ۱۵۵۶ء میں وہ خونریز واقعہ پیش آیا جس میں ہیمو کو شکست فاش دی گئی۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی فوجوں کو لڑا رہا تھا کہ ایک تیر نے اُسے زخمی کر دیا اس نے میدان جنگ سے فرار ہو جانا چاہا لیکن گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔ اکبر شہنشاہ ہند ہو گیا۔

سلیم چشتیؒ مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے راستے میں بڑے بڑے صوفیوں اور بزرگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس سیاحت میں ان کی خواجہ اسماعیل شیروانی اور قطب وقت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملاقات ہوئی اسی دوران رسول اللہ ﷺ نے خواب میں حکم دیا کہ شام میں شیخ ابراہیم عیاضؒ کے پاس جاؤ۔ آپ شیخ ابراہیم عیاضؒ کے پاس پہنچے اور ان کی بیعت کی۔ پھر بغداد چلے گئے اور امام اعظم حضرت ابو حنیفہ کے مزار پر حاضری دی اور یہیں حضرت غوث الاعظمؒ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے حضرت غوث اعظم نے اپنے سجادہ کو خواب میں حکم دیا کہ ہمارا خرقہ خاص اور خلافت نامہ شیخ ہندی سلیم چشتیؒ کو مرحمت کر دو۔

صبح اس حکم کی تعمیل کر دی گئی لیکن بعض مقامی حضرات کو یہ عمل شاق گزرا اور وہ سلیم چشتی کی تاک میں رہنے لگے کہ وہ جیسے ہی اس خرقہ خاص اور خلافت نامے کو لے کر چلیں گے ان سے ان چیزوں کو جبراً چھین لیا جائے گا۔

آپ کچھ عرصہ بعد بغداد سے چل دیے۔ ابھی وہ کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ چند بدوؤں نے انہیں اپنے محاصرے میں لے لیا۔ آپ نے اُن سے دریافت کیا "تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اُنہوں نے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا "حضرت غوث الاعظم کا خرقہ ہمیں واپس کر دو"

اُسی وقت آپ کے جسم پر وہی خرقہ تھا آپ نے بدوؤں کو مسکرا کر دیکھا اور فرمایا! "اگر تمہیں مذکورہ خرقہ میرے پاس سے دستیاب ہو جائے تو ضرور لے لو"

بدوؤں نے کہا! "ہم آپ کے سامان کی تلاشی لیں گے"

آپ نے زیب تن خرقے کو دیکھا اور ہنس کر پوچھا "کیا تمہیں وہ خرقہ میرے پاس نظر نہیں آتا؟"

بدوؤں نے جواب دیا "وہ خرقہ یقیناً تمہارے سامان میں بندھا ہوگا ہم اس میں سے نکال لیں گے"

آپ نے دریافت کیا "کیا تم لوگ اس خرقے کو اچھی طرح پہچانتے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا "خوب پہچانتے ہیں"

آپ نے حکم دیا "اس خرقے کو تم ہمارے سامان سے نکال لو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا"

بدوؤں نے آپ کا سارا سامان اُلٹ پلٹ ڈالا لیکن اس میں سے خرقہ نہ نکلا بدوؤں کو حیرت تھی کہ آخر وہ خرقہ گیا کہاں؟

جب وہ لوگ خرقے کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو آپ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ "ملا خرقہ"

ان لوگوں نے مایوسی سے جواب دیا "نہیں کیا وہ تمہارے پاس واقعی موجود نہیں؟"

آپ نے کہا! "وہ ہمارے پاس ہی ہے لیکن تم اُسے پا نہیں سکتے" اس کے بعد پوچھا "کیا تم اس کی آخری بار زیارت کرنا چاہتے ہو؟"

بدوؤں نے جواب دیا "ہاں بالکل اور ساتھ ہی ہم یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ اُسے آپ سے واپس لیں گے"

آپ نے اپنی داہنی آستین اُن کے رُو برو کر دی، فرمایا "لو دیکھو اور اسے پہچانو"

اُنہوں نے دیکھا خرقۂ مبارک کی آستین ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

بدوؤں نے پوچھا "خرقے کا بقیہ حصّہ کہاں ہے؟"

آپ نے بائیں آستین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "لو اِدھر دیکھو، یہ رہی" اور اب بائیں آستین بھی صاف نظر آنے لگی تھی، پھر اسی طرح گریبان، دامن

اور پھر پورا خرقہ انہیں نظر آنے لگا۔

بدوؤں نے حیرت سے سوال کیا "حضرت! اگر یہ سارے اجزائے خرقہ آپ کے جسم پہ ہی موجود تھے تو یہ ہمیں پہلے کیوں نہ نظر آیا؟"

آپ نے جواب دیا "ہم نے اسے اپنے جسم میں سلب کر لیا تھا۔"

بدوؤں نے آپ کی عظمت اور بزرگی کا اپنے دلوں میں اعتراف کیا اور قدموں میں گر کر مرید ہو جانے کی خواہش کی، آپ نے انہیں اپنا مرید کیا اور بدوؤں نے انہیں کئی دن اپنا مہمان رکھا۔

آپ وہاں سے چل کر ہندوستان آئے اور سیدھے اجودھن پہنچے بابا فریدؒ کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت غوث الاعظمؒ کا خرقہ ہمیں بابا فریدؒ کے مزار پر چھوڑا اور کچھ دن قیام فرما کر سیکری کے لیئے روانہ ہوئے راستے میں بھدالی نامی ایک مقام پر آپ نے قیام فرمایا اور یہاں کی مسجد مخدوم شیخ زین العابدین میں ڈھائی سال معتکف رہے آپکا شہرہ اکبر تک پہنچ چکا تھا اور وہ نہایت بے چینی سے آپ کا منتظر تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ بھدالی میں تشریف فرما ہیں تو اس نے مرواریدسے پُر ایک خوان بطور تحفہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا آپ نے اُسے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ "اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں، اسے طالبانِ دنیا کو بھجوا دو۔"



اکبر کو اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش تھی لیکن یہ خواہش کسی طرح پوری ہی نہ ہوتی تھی۔ مصاحبینِ خاص نے اسے مشورہ دیا کہ آستانۂ خواجہ معین الدین چشتیؒ سلطان الہند میں حاضری دے کر اپنی خواہش کا اظہار کرو، ممکن ہے پوری ہو جائے۔"

۲۸ سالہ شہنشاہ ہند اکبر ایک سو چالیس کوس کا فاصلہ طے کر کے اجمیر پہنچا اور فاتحہ کے بعد دستِ دعا اٹھا کر عرض کیا۔

"اے خواجہ معین الدین! آپ سرچشمۂ ولایت ہند میں ہیں شہنشاہ اکبر عاجزی و انکسار سے یہ درخواست پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہوں، کہ میں اب تک اولادِ نرینہ سے محروم چلا آ رہا ہوں میرے بعد بادشاہت سنبھالنے والا کوئی بھی نہیں۔ اگر مجھے اولادِ نرینہ کی نعمت سے شاد کام کیا گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آگرے سے اجمیر تک کا فاصلہ پاپیادہ طے کروں

گا اور آپ کی نیاز دلواؤں گا۔"

اس دُعا کے بعد رات کو جب یہ مغل فرمانروا سویا تو اس نے خواب میں دیکھا، حضرت خواجہ غریب نواز فرما رہے تھے "اکبر! سیکری جاؤ، وہاں شیخ سلیم چشتی موجود ہیں وہ ہمارے ہی خاندان سے ہیں اور شیخ الہند ہیں، تم ان سے رجوع کرو، وہ تمہاری مراد پوری کر دیں گے۔"

اکبر اجودھن بھی گیا اور بابا فریدؒ کے مزار پر اولادِ نرینہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ "سیکری جاؤ وہاں ہمارے بھائی سلیم چشتیؒ موجود ہیں ان سے تمہارے غمگین دل کو سکون ملے گا۔"

اکبر سیدھا سیکری روانہ ہو گیا۔

حضرت سلیم چشتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں اپنے سامنے ہندوستان کا مغل فرمانروا دست بستہ کھڑا نظر آیا۔

آپ نے بے نیازی سے دریافت کیا "خود کو ظلّ اللہ کہلانے والا ہمارے روبرو دست بستہ کیوں کھڑا ہے؟"

اکبر نے رقّت سے حالِ دل بیان کیا اور پوری روداد سنا کر عرض کیا "اجودھن اور اجمیر کے بزرگوں کی سفارش لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ چاہیں تو میری خواہش پوری فرما دیں، ورنہ دھتکار دیں۔"

آپ نے دریافت کیا "تو اولادِ نرینہ کا طالب ہے؟"

"جی ہاں! خواجہ پیر!" اکبر نے جواب دیا۔ "اور میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنے بیٹے کو آپ کی توجہ اور تربیت میں دے دوں گا۔"

آپ نے تھوڑی دیر کے لئے سر جھکا لیا پھر اسی طرح ارشاد فرمایا "بے منّت بخشنے والا تجھے تین بیٹے دے گا۔"

اکبر نے کہا "میں پہلا بیٹا آپ ہی کے حوالے کر دوں گا۔ اس کی حمایت اور حفاظت آپ ہی کے ذمے ہو گی۔"

آپ نے کہا "مبارک باد! ہم نے بھی اس کو بنا ہم نام کیا۔"

جب اکبر آگرہ سے واپس پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ مریم زمانی امید سے ہے اکبر نے

سیکری میں آپ کے حجرے کے قریب ہی سنگ سرخ سے ایک شاندار محل تعمیر کرایا اور اسی محل میں مریم زمانی کو منتقل کر دیا۔ اس محل کے دو حصے تھے رنگ محل اور بدیع محل۔ بدیع محل آستانہ سلیم چشتیؒ سے ملا ہوا تھا۔ اسی بدیع محل میں جہانگیر پیدا ہوا، یہیں اس کی نال گاڑی گئی اور اس کا نام سلیم رکھا گیا۔

اکبر نے اپنی منت پوری کی اور آگرے سے اجمیر تک سفر پا پیادہ طے کیا، دوران سفر اس نے جہاں بھی پڑاؤ کیا وہاں ایک منارہ تعمیر کرایا۔ یہ منارے ابھی تک موجود ہیں۔ اکبر نے ایک منارہ خاص جے پور میں تعمیر کرا دیا تھا اس کا نام ہرن منارہ رکھا تھا۔

واپسی پر حضرت سلیم چشتیؒ کے لیے ایک مکان اور خانقاہ تعمیر کرائی جس کی تعمیر تاریخ "خانقاہ اکبر" سے نکلتی ہے اور یہیں آپ کی خواہش پر ایک شاندار جامع مسجد بھی تعمیر ہوئی اور شمال مشرق میں ایک شہر آباد کیا گیا جس میں اکبر کے خاص محلات، محلات خواتین و بیگمات دیوان خاص، دیوان عام، حوض، چمن، باغ، دفاتر، اصطبل، عبادت گاہ، دارالنظرہ، نورتنوں کے مکانات، حکما کی قیام گاہیں، فیل خانہ، خزانہ، جملہ لوازمات شاہی سے متعلقہ عمارتیں یہیں پہاڑی پر تعمیر ہوئیں اور یہ سلسلہ آگرے کے دروازے تک چلا گیا ہے۔ یہیں محلات شاہی ہتیاپول نامی دروازہ بھی ہے جس کے دونوں طرف سنگ سرخ کے دو ہاتھی ایستادہ ہیں۔

کڑاکے کی سردیوں میں ملا عبدالقادر بدایونی (معتمد اکبر) آپ سے ملنے سیکری پہنچا اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شمالی ہند کی بتیسی بجا دینے والی سردی کا حضرت سلیم چشتیؒ پر کوئی زور نہ چل رہا تھا، آپ باریک ململ کے کرتے میں ملبوس ملا عبدالقادر سے گفتگو فرما رہے تھے۔



اکبر، شہزادے سلیم اور مقربین خاص کے ساتھ آپ کی خانقاہ میں داخل ہوا اور نیازمندانہ گفتگو کرتا رہا۔ اس نے دوران گفتگو محسوس کیا کہ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں اکبر نے اچانک سوال کیا "حضرت کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کل کتنی عمر عطا فرمائی ہے؟"

آپ تھوڑی دیر کے لئے مراقبے میں چلے گئے پھر سر اٹھا کر فرمایا "وصال محبوب حقیقی کے دن کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے" پھر شہزادے سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "لیکن جس دن یہ شہزادہ ہمیں کوئی کلام سنائے گا وہی ہماری رحلت کا وقت ہو گا"

اکبر نے شہزادے کو حکم دیا "شیخو بابا! تم منظوم کلام حفظ نہیں کرو گے"

پھر اساتذہ اور آتالیق کے نام فرمان جاری ہوا کہ شہزادے کو منظوم کلام نہ یاد کرایا جائے۔

اس فرمان کے نفاذ کو دو سال سات ماہ گزر گئے۔ شہزادے کو ہر قسم کی نظم سے دُور رکھا گیا۔

پھر شہزادے کے دل سے حضرت سلیم چشتیؒ کی بات نکل گئی۔

ایک دن شہزادے نے نہایت عمدہ اور جاذب نظر لباس پہنا اور بن سنور کر جب وہ کنیزوں کے سامنے سے گزرا تو وہ عورت جو شہزادے کو نظر بد سے بچانے کے لیئے رائی نون آثار کرتی تھی اور شہزادے پر سے صدقات اور خیرات نچھاور کیا کرتی تھی۔ شہزادے کو ایک طرف لے گئی اور کہا "صاحب عالم! آپ اس وقت تک یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے جب تک میں آپ کی نظر نہ اُتار لوں"

اس کے بعد اس نے نظر اتاری اور شہزادے سے کہا "شہزادے! ذرا اس شعر کو تو پڑھنا"۔

الٰہی غنچۂ اُمید بکشا ؎ گلے از روضۂ جاوید بنما

شہزادے کو یہ شعر بے حد پسند آیا۔ یہ اُسے رٹتا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ "حضور والا! آج میری ایک خدمتگار عورت نے مجھے ایک بہترین شعر سنایا ہے ذرا آپ بھی سماعت فرمائیں"

اس کے بعد فوراً ہی یہ شعر بھی سنا دیا۔

آپ نے حالت اضطراب میں یہ شعر سنا اور بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شہزادے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ مجرمانہ انداز میں منہ چھپانے لگا۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ اکبر تک نہ پہنچتی۔ وہ پریشان ہو گیا اور شہزادے کو ڈانٹا لیکن اس ڈانٹ سے کیا ہوتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اسی شب آپ بخار میں مبتلا ہو گئے دوسرے دن صبح آپ نے تان سین کو طلب فرمایا اور اس کو گانے کا حکم دیا۔ اس نے آپ کو گانا سنایا۔ گانا سن چکنے کے بعد آپ نے متبسم ہو کر فرمایا "دوستو! وعدۂ وصال آپہنچا۔ اب ہم رخصت ہو جائیں گے"

قریب ہی شہزادہ سلیم بھی موجود تھا جو زار و قطار رو رہا تھا۔

آپ نے شہزادے کو روتے جو دیکھا تو فرمایا "تم کیوں روتے ہو؟ تم نے وہی کیا جس کا مشیت نے حکم دیا" اس کے بعد آپ نے اپنی دستار اتار کر شہزادے کے سر پر رکھ دی اور

فرمایا "سلطان سلیم ہمارا جانشین ہے اور ہم اسے خدا کے حافظ و ناصر کے سپرد کرتے ہیں"
یہ ۲۸ ، ۲۹ رمضان ۹۷۹ھ / ۱۵۷۱ء کی درمیانی شب کی بات ہے کہ آپ رحلت فرما گئے۔
آپ کی وفات سے دُور دُور ایک تہلکہ سا مچ گیا - بادشاہ نہایت غمگین ہوا - نمازِ جنازہ قاضی القضاۃ ، مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سلطانپوری نے پڑھائی - اکبر اپنے جملہ فرزندوں کے ساتھ کندھا دیتا ہوا پیادہ جنازے کے ساتھ چلا - ہندوستان کا عظیم فرمانروا اکبر اپنے کاندھے سے بار بار آپ کے جنازے کا بوجھ اٹھاتا ، جامع مسجد کے صحن تک لے گیا - مسجد کے شمالی گوشے کے وسطِ صحن میں آپ کی قبر کھودی جا رہی تھی - پتھریلی زمین کو جب کھودا گیا تو اس میں سے ریتلی مٹی نکلنی شروع ہوئی - صدر الصدور حاجی الحرمین شیخ عبدالنبی بھی وہیں موجود تھے -
انہوں نے حیرت و استعجاب سے وہ مٹی اٹھالی اور اسے تادیر دیکھتے رہے بادشاہ نے پوچھا "عبدالنبی! اس پہاڑی زمین سے یہ ریگستانی مٹی کیوں نکل رہی ہے ؟"
صدر الصدور نے جواب دیا "قبلۂ عالم ! یہ تو مدینہ منورہ کی مٹی نظر آتی ہے "
جو لوگ حضرت سلیم چشتیؒ سے بہت زیادہ قریب رہے تھے انہیں رسول اللہ کے اس ارشادِ مبارک کا علم تھا جس میں آپ نے حضرت سلیم چشتی سے وعدہ فرمایا تھا کہ "تم ہندوستان واپس جاؤ تم کو وہیں تمہارے وطن میں جائے دفن کیلئے مدینے کی زمین عطا کی جائیگی"
جو لوگ اس ارشادِ مبارک سے آگاہ تھے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں ، صدر الصدور نے رقت سے کہا "ہمیں اس مٹی سے کوئے یار کی بو محسوس ہو رہی ہے " . عقیدت مندوں نے تاریخ کے مادے نکالے -
ایک طرف صدا نے تاریخ بلند ہوئی " زخود فانی بحق باقی " (اپنی ذات سے فنا ہو گئے ذاتِ حق کیساتھ باقی)
کسی دوسرے نے کہا "شیخ ہندی" تیسرے نے کہا "شیخ حکماء"
لیکن یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ اس نامی گرامی شخصیت کو جتنی شہرت حاصل ہوئی ان کا ذکر اولیائے کرام کے مجموعوں میں نہیں ملتا - تاریخیں ان کا ذکر اختصار سے کرتی ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کیلئے بڑی چھان بین کرنی پڑتی ہے لیکن اسی قدر یہ ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے کہ جتنی واضح اور غیر مبہم کرامات آپ سے ظاہر ہوئیں ان کی شہادتیں دنیا کی عظیم شخصیات نے دی ہیں -



حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ

سلطان فیروز شاہ تغلق اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دہلی جا رہا تھا جب یہ لشکر سہرند نامی مقام پر پہنچا تو لوگوں نے یہاں سے بہت جلدی گزر جانا چاہا کیونکہ سہرند کا مطلب تھا شیروں کا مسکن ۔ اس غیر محفوظ اور خطرناک جگہ کون رک سکتا تھا ۔ یہ لشکر سہرند سے ابھی تھوڑی ہی دور پہنچا ہو گا کہ پتہ چلا ۔ لشکر کے ایک بزرگ شیروں کے مسکن ہی میں رہ گئے ہیں بادشاہ نے ایک دستے کو حکم دیا کہ ان بزرگ کو جبراً لایا جائے یہ دستہ شاہی حکم نامہ لے کر جب ان بزرگ کے پاس پہنچا تو انہوں نے نہایت نرمی سے تعمیل حکم سے انکار کر دیا دستے کے افسر نے بزرگ کا احترام کرتے ہوئے کہا " حضرت سلامت! ہم آپ کو ساتھ لیے بغیر کس طرح واپس جا سکتے ہیں شاہی حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہے اس ناگوار فرض کی بجا آوری میں، خدا کے لئے ہماری مدد فرمائیں "

یہ بزرگ اُٹھ کھڑے ہوئے فرمایا " اچھا اگر یہ بات ہے تو ہم ساتھ چلتے ہیں اور بادشاہ سے مل کر پھر واپس آجائیں گے ۔

جب انہیں فیروز شاہ تغلق کے روبرو پیش کیا گیا اور اس نے سہرند میں قیام فرما ہو جانے کا سبب دریافت کیا تو ان بزرگ نے جواب دیا " سلطان! ہمیں سہرند میں القا ہوا ہے کہ اس جگہ ایک ایسا شخص پیدا ہونے والا ہے جو وحید الامت ہو گا اور دین کو حیات نو بخشے گا ہم سہرند سے شیروں کو نکال کر اسے انسانی بستی میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں "

بادشاہ نے مسکرا کر دریافت کیا " کیا آپ تنِ تنہا اس خطرناک جگہ کو آباد کر سکیں گے ؟ "

بزرگ نے جواب دیا " انشاء اللہ "

بادشاہ ان کی ہمت اور عزیمت پر ششدر رہ گیا بولا " آپ ہمارے ساتھ رہیں اور

مطمئن رہیں اگر اللہ کو یہی منظور ہے کہ سہرند آباد ہو اور یہاں اس کا محبوب بندہ پیدا ہو تو اس جگہ کو وہ ہاتے ذریعے انسانی بستی میں تبدیل فرما دے گا۔"

یہ بزرگ بادشاہ کی ہمت افزا گفتگو سے مطمئن ہو کر اس کے ساتھ دہلی چلے گئے ابھی دہلی پہنچے ہوئے انہیں چند ہی دن گزرے تھے کہ بادشاہ کو مطلع کیا گیا "اوچ سے جہاں پناہ کے پیر و مرشد حضرت جلال الدین بخاری تشریف لانے والے ہیں۔"

بادشاہ ان کی پیشوائی کو نکل کھڑا ہوا اور سونی پت سے آگے کنوتک ان کے استقبال کو پہنچ گیا۔ بادشاہ اپنے پیر و مرشد کو دیکھتے ہی ادب سے جھک گیا اور مصافحے کو بڑھے ہوئے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا "حضرت کی تشریف آوری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ کیا یہ گناہگار مقصدِ تشریف آوری سے آگاہ کیا جائے گا؟"

مخدوم جلال الدین بخاریؒ نے دنیاداری اور آداب سلطانی کا خیال کئے بغیر جواب دیا "سلطان۔ اوچ کے آس پاس کے لوگ مالیے کی رقم دہلی پہنچانے میں قباحت اور دشواری محسوس کرتے ہیں۔"

بادشاہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا "پھر جیسا حضور والا حکم دیں اس پر عمل کیا جائے۔"

مخدوم جلال الدین بخاری نے جواب دیا "ہم چاہتے ہیں دہلی اور اوچ کے درمیان ایک نیا شہر بسایا جائے اور شاہی مالیہ اس نئے شہر میں جمع کرایا جائے۔"

بادشاہ کو سہرند کا واقعہ یاد آگیا معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا "حضرت کے حکم کی تعمیل کی جائے گی اور سہرند میں ایک نئی آبادی بسادی جائے گی۔"

چنانچہ بادشاہ نے اسی وقت خواجہ فتح اللہ نامی مقرب خاص کو دو ہزار سوار دیکر حکم دیا "سہرند کی آباد کاری اور قلعے کی تعمیر کا کام فوراً شروع کرادیا جائے۔"

خواجہ فتح اللہ دھاوے مارتے سہرند پہنچے اور آس پاس کی آبادیوں سے مزدور فراہم کر کے جنگل کی صفائی شروع کرادی۔ ان میں بہت سے آدمیوں کو فوجیوں نے بیگار میں پکڑ کر کام سے لگادیا۔ ان سب کے ذمے پہلا کام تھا قلعے کی تعمیر۔ ہزاروں آدمی قلعے کی فصیل صبح سے شام تک تعمیر کرتے اور جب دوسرے دن صبح پھر وہاں پہنچتے تو وہ فصیل منہدم ہو چکی ہوتی۔ دو چار دن تک تو لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ محض اتفاق کا کرشمہ ہے لیکن جب ہفتہ بھر یہی ہوتا رہا تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے خواجہ فتح اللہ نے بادشاہ کو اس نئی افتاد سے مطلع کرتے ہوئے لکھا۔

سہرہوند قلعے کی فصیل اٹھائی جاتی ہے اور رات کو ڈھے جاتی ہے ہم لوگ سخت پریشان ہیں کہ یہ کیا اسرار ہیں اگر یہ عمل یوں ہی جاری رہا تو یہ کام قیامت تک جاری رہے گا اور قلعے کی تعمیر کبھی بھی مکمل نہ ہوسکے گی۔ حضور والا سے التماس ہے کہ وہ اپنے گراں قدر مشورے اور تدبیر عالی سے بندگان خدا کو سرفراز فرمائیں کہ یہ کام اپنے انجام کو پہنچے۔ ورنہ یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔"

بادشاہ نے فتح اللہ کا مراسلہ مخدوم جلال الدین بخاری کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! اس مشکل کا حل ہم گناہگاروں کے بس کا کب ہے، اُسے بھی آپ ہی دُور فرمائیں۔"

مخدوم بخاری نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے ذرا دیر بعد آنکھیں کھولیں اور اپنے خلیفہ اور امام نماز رفیع الدین کو طلب کیا۔ جب یہ آگئے تو انہیں حکم دیا: "رفیع الدین! اپنے بھائی خواجہ فتح اللہ کے پاس سہرند تم جاؤ اور اپنی نگرانی میں قلعے کی تعمیر کا کام انجام دو!"

رفیع الدین بھی اس مشکل سے آگاہ ہوچکے تھے کیونکہ خواجہ فتح اللہ ان کے حقیقی بڑے بھائی تھے اور انہوں نے رفیع الدین کو سب کچھ پہلے ہی سے بتا رکھا تھا۔ رفیع الدین اپنے پیرو مرشد کا حکم پاکر سہرند جانے کی تیاری کرنے لگے روانگی سے پہلے حضرت مخدوم بخاری نے انہیں ایک اینٹ دی اور فرمایا: "بنیاد میں اسے رکھ دینا یہ اینٹ تمہاری مشکلات دور کردے گی اور وہ صاحب بھی سامنے آجائیں گے جو فصیل کی تعمیر میں مزاحم ہورہے ہیں۔"

رفیع الدین اسی وقت سہرند روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر اینٹ قلعے کی بنیاد میں رکھ کر تعمیر کا کام شروع کردیا۔ وہ پہلی رات بڑی بے چینی کی تھی۔ خواجہ فتح اللہ اور امام رفیع الدین کو نتیجے کا بڑی بے چینی سے انتظار رہا۔ دوسرے دن صبح فصیل کی دیوار جوں کی توں کھڑی تھی مزدور کام میں لگ گئے اور فصیل کا کام مکمل کیا جانے لگا رفیع الدین کام کا جائزہ لیتے ہوئے جب اس حصے میں پہنچے جہاں بیگار کے لوگ کام کررہے تھے تو فوراً ٹھٹک گئے انہوں نے دیکھا، ایک شخص انہیں نہایت خشمناک نظروں سے گھور رہا ہے۔ امام رفیع الدین نے اس شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ

لیا - اور کہا "حضرت! آپ یہاں کہاں؟ ادھر میرے پاس آجایئے"
اس شخص نے غصے سے جواب دیا "مخدوم سے کہہ دینا، ہم نے تیرا خیال کیا ہے ورنہ تیری ایک اینٹ کی حیثیت ہی کیا تھی، اسے بھی اکھاڑ پھینکتے"
رفیع الدین نے عاجزی سے کہا "حضرت! آپ اتنے برہم کیوں ہیں، آخر ہم گناہگار مورد عتاب کیوں ہیں؟ کیا آپ اس شہر کی تعمیر سے ناخوش ہیں؟"
ان صاحب نے جواب دیا "یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تیرے بھائی فتح اللہ کے آدمی ہمیں بھی بیگار میں پکڑ لائے، ہم نے یہ بھی سوچا کر چلو بیگار میں کام لیتے ہو تو لیتے رہو کب تک لوگے، آخر عاجز آکر بھاگ کھڑے ہوگئے"
رفیع الدین نے عجز و انکسار سے جواب دیا "یہ لوگوں کی بدنصیبی اور کور چشمی ہے کہ وہ حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر سے واقف نہیں۔ اگر انہیں آپ کی ذات اقدس کا علم ہوتا تو وہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرتے اب آپ انہیں معاف فرمادیں اور قلعے کی تعمیر کا کام مکمل ہوجانے دیں"
بوعلی شاہ قلندر نے فرمایا "رفیع الدین! تو وہ صحیح آدمی ہے جو اس کام پر متعین کیا گیا ہے شاید تجھے نہیں معلوم کہ وہ شخص جس کے لیئے یہ قلعہ بن رہا ہے اور شہر تعمیر ہوگا تیری ہی نسل سے پیدا ہوگا اب ہم خود بھی اس قلعے اور شہر کی تعمیر میں تیرا ہاتھ بٹائیں گے"
اس کے بعد امام رفیع الدین اور بوعلی شاہ قلندر کی نگرانی میں قلعے اور شہر کی تعمیر کا کام شب و روز انجام پانے لگا اور جو پہلے سہرند (شیروں کا مسکن) تھا ایک مدت گزرنے کے بعد سرہند ہوگیا اور پھر ایسا وقت آیا کہ اسے سرہند کہا جانے لگا۔



امام رفیع الدین سرہند میں آباد ہوگئے اور ان کی چھٹی نسل میں شیخ عبدالاحد کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا، جس دن یہ بچہ پیدا ہوا، اسی رات مغل فرماں روا اکبر اعظم نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ شمال سے ایک تیز و تند آندھی اٹھی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اکبر اعظم کو تخت سمیت اپنی گرفت میں لے لیا۔ بادشاہ نے بڑے ہاتھ پیر مارے لیکن بس نہ چلا۔ تند و تیز آندھی نے بادشاہ کو تخت سمیت زمین پر پٹخ دیا اکبر نے بیدار ہوتے ہی معبروں (خواب کی تعبیر بتانے والوں) کو طلب کیا اور

خواب بیان کر کے تعبیر دریافت کی۔ کسی معبر نے ڈرتے ڈرتے تعبیر بیان کی۔

"آج کسی ایسے بچے کی ولادت ظہور میں آئی ہے جو بڑا ہو کر آپ کے آئین سلطنت کو متزلزل کر دے گا۔"

تعبیر تشویش ناک تھی لیکن یہ کام بھی بہت دشوار تھا کہ پورے ہندوستان کے ان بچوں کا پتہ چلایا جاتا جو اس رات (۱۴ شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء شب جمعہ) کو پیدا ہوئے تھے اور اگر ان بچوں کا کسی طرح پتہ بھی چلایا جاتا تو تشویش ناک بچے کی شناخت کس طرح عمل میں آتی۔

عبدالاحد اس بچے کو شاہ کمال کیتھلی کی خدمت میں لے گئے آپ نے بچے کو دیکھتے ہی فرمایا "عبدالاحد! تیرے گھر میں تو عالم باعمل اور عارف کامل پیدا ہوا ہے اس کی ہدایت و ارشاد کا نور بدعت و گمراہی کی تاریکیوں کا خاتمہ کر دے گا۔"

اس کے بعد شاہ کمال نے بچے کے منہ میں اپنی انگلی دے دی۔ بچہ انگلی چوسنے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد شاہ کمال نے اپنی انگلی کھینچ لی اور فرمایا "بابا بس کرو، بس اتنا ہی کافی ہے کچھ ہماری اولاد کے لیے بھی تو چھوڑ دو، تم نے تو ہماری نسبت ہی کھینچ لی۔"

بچے کا نام شیخ احمد رکھا گیا جو بعد میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوا۔

اس بچے کی ابتدائی تعلیم تو عبدالاحد کے ذمے رہی لیکن بعد میں مولانا کمال الدین کشمیری اور شیخ یعقوب کشمیری کا شرف تلمذ حاصل رہا مولانا کمال الدین کشمیری نے معقولات کی چند مشکل کتابیں پڑھائیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنہیں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے شیخ یعقوب کشمیری نے احادیث کا درس دیا۔

شیخ احمد نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ زہد و ورع کا ماحول تھا لیکن اس سے ہٹ کر، دُور دُور تک اکبری عہد کی ساری خرابیاں موجود تھیں اکبر کو علمائے وقت نے انسان کامل قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کو سجدہ کرنا فرض عین قرار پا گیا۔ چہرہ شاہی کو کعبۂ مراد اور قبلہ حاجات کہا جانے لگا دین الٰہی وجود میں آ چکا تھا۔ عربی مہینے موقوف ہو چکے تھے ان کی جگہ اکبری سال جلوس سے دین الٰہی کا نیا سن جاری ہوا تھا۔ زرتشتیوں کی طرح سال میں چودہ عیدیں منائی جانے لگی تھیں۔ مسلمانوں کی عیدیں اپنی رونق کھو بیٹھیں لیکن جمعے کی نماز اور خطبے کا التزام یوں باقی رکھا گیا کہ خطبے میں بادشاہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ نئی تقویم میں سال کو سن الٰہی اور مہینوں کو ماہ الٰہی کا نام دیا گیا۔ سکوں پر تاریخ الف، ثبت کرائی گئی

جس کا مطلب تھا اسلام کے ایک ہزار سال بیت جانے کی وجہ سے یہ مذہب ختم ہو چکا ہے اس کی جگہ دین الٰہی نے لے لی ہے تاریخ اسلام از سر نو ترتیب دی جانے لگی اور اس کا نام تاریخ الٰہی رکھا گیا اکبر نے مؤرخین کو حکم دیا کہ سن ہجری کی بجائے سن رحلت لکھا جائے۔ بادشاہ صبح سے شام تک چار مرتبہ آفتاب کی پرستش کرتا۔ آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھتا۔ یہ وظیفہ دوپہر کے وقت پڑھتا تھا۔ وظیفہ پڑھنے کے دوران بادشاہ اپنے دونوں کانوں کو پکڑ لیتا اور اپنا سر ادھر ادھر ہلا کر کان کی لوپر مکے لگاتا۔ یہ تجدید استغفار کی ایک شکل تھی گاؤ کشی ممنوع قرار پائی۔ سور اور کتے حلال قرار دیے گئے کتوں اور سوروں کو شاہی محل کے نیچے اس غرض سے رکھا جاتا کہ بادشاہ علی الصباح ان کے دیدار کو عبادت تصور کرتا تھا۔ سور کی نسبت ہندوؤں نے بادشاہ کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ سور ان دس مظاہر میں سے ہے جن میں بھگوان نے حلول کیا ہے کتوں کی نسبت بعض مسلمان عارفوں نے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس میں دس ایسی صفات پائی جاتی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو وہ ولی ہو جائے فیضی اپنے دسترخوان پر کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھنے لگا۔ بادشاہ کی کتوں سے عقیدت اور فیضی کی پیروی میں ہندوستان اور عراق کے بعض شعرا فخریہ کتوں کی زبانیں اپنے منہ میں لے کر پیار کیا کرتے تھے۔ غسل جنابت حرام قرار پایا اور دلیل یہ دی گئی کہ بول و براز کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہے پھر اس پاکیزہ اور لطیف مادے کے اخراج پر غسل کیوں واجب قرار دیا جائے جس سے انسان وجود میں آیا اور جس پر انسانی اور حیات حیوانی کے استقرار اور تسلسل کا انحصار ہے سود اور جوا حلال قرار پائے۔ دربار میں قمار خانہ تعمیر ہوا جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر قرض دینے کا حکم دیا گیا کیونکہ اس سے خزانے کی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عربی زبان ممنوع قرار پائی۔ عربی پڑھنا پڑھانا مطعون اور مردود قرار دیا گیا۔ بادشاہ نے عربی کے خاص حروف، ث، ح، ع، ص اور ط، ظ کو بول چال سے نکال دیا چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احمد کو اہمد، حلم کو ہلم، ثواب کو سواب وغیرہ لکھا یا بولا جاتا تو بادشاہ بہت خوش ہوتا۔ السلام علیکم کی جگہ، اللہ اکبر، کہا جاتا کیونکہ اس میں بادشاہ کا نام بھی شامل تھا۔ جواب میں لوگ جل جلالہ کہتے کیونکہ اس میں بھی جلال الدین کا ایک جزو موجود تھا۔ یہ وہ حالات ہیں جن میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے

تھے۔

تعلیم سے فراغت حاصل کر کے آپ اکبر آباد تشریف لے گئے وہاں ان کی بڑی بڑی یگانہ روزگار اور نادرہ صفات شخصیات سے روابط قائم ہوئے ان میں ابوالفضل اور فیضی کا نام بھی شامل ہے یہ دونوں بھائی شیخ احمد کی علمیت اور قابلیت کے بڑے معترف رہے یہاں تک کہ فیضی کو قرآن پاک کی بے نقط تفسیر میں بعض جگہ حروف غیر منقوطہ کا سہارا نہ ملا تو اس نے شیخ احمد سے رجوع کیا اور انہوں نے وہ مشکل حصہ خود مکمل کر دیا۔

بیٹے کو اکبر آباد میں رہتے ہوئے جب ایک مدت ہو گئی تو شیخ عبدالاحد کی شفقت پدری کے لئے ان کی جدائی ناقابل برداشت ہو گئی اور وہ بیٹے کو سرہند واپس لانے کیلئے اکبر آباد پہنچ گئے وہاں کا ایک بڑا حلقہ ان کی بزرگی اور فضیلت کا معتقد اور معترف تھا۔ چنانچہ عبدالاحد کے گرد لوگ پروانہ وار جمع ہونے لگے اور بعض نے ازراہ عقیدت مودبانہ عرض کیا کہ اس ضعف پیری میں بُعد مسافت کی یہ مشقت کیوں اختیار فرمائی،

عبدالاحد نے جواب دیا "کیا کروں شیخ احمد کی محبت یہاں کھینچ لائی ہے"

کچھ دن قیام فرما کر عبدالاحد نے بیٹے کو ساتھ لیا اور سرہند واپس ہوئے۔ راہ میں تھانیسر میں قیام کیا اور وہاں کے حاکم اور رئیس شیخ سلطان کے مہمان ہوئے۔ شیخ سلطان علم و فضیلت میں بلند مقام رکھتے تھے اور انہیں بادشاہ کا قرب بھی حاصل تھا لیکن بادشاہ کے عقائد اور مروجات سے انہیں نفرت تھی اسی لیے دُور دُور رہنے لگے تھے عبدالاحد اور شیخ احمد کی تشریف آوری سے پہلے انہوں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ رسولِ مقبولؐ فرما رہے ہیں۔

"شیخ سلطان! تیری بیٹی اس عہد کی سب سے زیادہ نیک خاتون ہے تو اس کا نکاح میرے فرزند اور نائب شیخ احمد سے کر دے اس میں خود تیرے اور تیری بیٹی کے لیئے بڑی سعادتیں ہیں"

شیخ سلطان شیخ احمد سے واقف بھی نہ تھے۔ پورا دن اسی فکر میں گزار دیا کہ آخر یہ شیخ احمد کون بزرگ ہیں جن کی بابت رسول اللہؐ بیٹی کی شادی کا حکم فرما رہے

ہیں۔ دوسری رات پھر یہی خواب دیکھا اور دوسرا دن بھی اسی فکر میں گزر گیا۔ تیسری رات پھر یہی خواب نظر آیا اور آخر شیخ سلطان نے رسول اللہؐ سے پوچھ لیا ”حضور! یہ گنہگار شیخ احمد سے واقف نہیں ہے براہِ کرم ان سے ملوا دیا جائے اور انہیں پہنچوا دیا جائے“

خواب ہی میں رسول اللہؐ نے شیخ احمد کو ان کے روبرو کھڑا کر دیا اور فرمایا ”لے انہیں پہچان لے، یہ ہے ہمارا فرزند اور نائب شیخ احمد“

شیخ سلطان نے ان کی شکل خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لی چنانچہ جب شیخ احمد اپنے والد کے ساتھ ان کے گھر مہمان ہوئے تو شیخ سلطان نے انہیں پہچان لیا اور بے چین ہو گئے پھر بھی مزید تحقیق اور تفتیش کے پیش نظر کئی دن خاموش رہے اور ان کے روز و شب کے لمحات کا بہ نظر غائر جائزہ لینے لگے کہ وہ کن نیک و بد امور میں گزرتے ہیں اور چند ہی دن میں ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ شیخ احمد وہی ہیں جن کی انہیں بشارت اور ہدایت مل چکی ہے پھر بھی وہ بیٹی والے تھے اپنی طرف سے بات کرنے میں ذرا تامل اور ندامت محسوس ہوئی لیکن رسول اللہؐ کی محبت اور ہدایت شرم و ندامت پر غالب آئی اور سب کچھ عبدالاحد کے سامنے عرض کر دیا باپ نے سر تسلیم خم کر دیا کہا ”کس میں اتنی ہمت ہے کہ رسول اللہؐ کے حکم سے سرتابی اور انحراف کرے میں تیار ہوں“

شادی کا اہتمام ہوا اور شیخ احمد رشتۂ ازدواج سے وابستہ کر دیے گئے اور یہ اپنی بیوی کو لے کر سرہند چلے گئے۔ شادی کے وقت آپ کی تقریباً پچیس ۲۵ سال تھی۔ شادی کے بعد آپ کو اتنا مال میسر آیا کہ صاحب مال بھی ہو گئے۔

شیخ عبدالاحد انہیں فقر و سلوک کا درس دے رہے تھے اور شیخ احمد کے اندر ایک اور ہی انقلاب برپا تھا وہ عہد اکبری کے فتنوں سے نبرد آزما ہونے کے ارادے کر رہے تھے لیکن شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کیونکہ ان کا ہر کام ”ادھر کے اشارے“ کا تابع تھا۔

آپ کو ذہنی سکون حاصل نہ تھا۔ امتِ محمدیہؐ کی بے بسی اور مظلومی پر آپ کا دل کڑھتا رہتا اور اس کا سب سے زیادہ افسوس ناک اور تکلیف دہ یہ پہلو تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہو رہا تھا ہندو جو چاہتے وہی ہو کر رہتا اور ان کا رویہ جارحانہ تھا۔ آپ کے خسر حاجی سلطان تھانیسری بادشاہ کے زیر عتاب آ گئے تھا نیسر

کے ہندوؤں نے ان کے خلاف بادشاہ سے بار بار شکایتیں کی تھیں کہ وہ گاؤ کشی کرتے رہتے ہیں بادشاہ نے انہیں اس جرم میں بھکر جلا وطن کر دیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد خانخاناں کی سفارش پر دوبارہ تھانیسر واپس بلا لیے گئے لیکن بادشاہ کا دل ان سے صاف نہ تھا۔ یہ ساری باتیں شیخ احمد کے آس پاس پیش آ رہی تھیں اور ان کے دل پر ان کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ اسی دوران ایک نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔

بادشاہ لاہور سے واپس آ رہا تھا راہ میں تھانیسر پڑتا تھا چند دنوں کے لئے یہاں بھی قیام کیا۔ حاجی سلطان نے بادل ناخواستہ حاضری دی۔ بادشاہ کو ان سے بڑی شکایتیں تھیں اس نے حاجی سلطان سے کہا: "سلطان! ہم نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ تم ہمارے لئے قرآن لکھو، کیا بات ہے تم نے اب تک اس کی تعمیل کیوں نہیں کی؟"

حاجی سلطان نے دلیرانہ جواب دیا: "تم جبریل کو آسمان سے بلاؤ یا وہ تمہارے لیے قرآن لائے تو میں بھی بادشاہ کے حکم کی تعمیل کروں۔"

خوشامدی مصاحبین نے بادشاہ کو چڑھایا اور حاجی سلطان کے جواب کو گستاخی قرار دیا۔ بادشاہ نے برہمی سے سوال کیا: "اور اس بات کا تیرے پاس کیا جواب ہے کہ تو نے بارہ سال سے سرکاری خزانے میں ایک پیسہ بھی داخل نہیں کیا۔ وہ بارہ سالہ خراج کہاں گیا؟"

حاجی سلطان نے اسی شان بے نیازی اور دلیری سے جواب دیا: "تو مرتد ہو گیا ہے اور مرتد کا مال علماً فقرا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دینا جائز ہے میں نے بارہ سالہ لگان اور ملیے کی رقم فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔"

بادشاہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور وہ جوش و غضب میں کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ حاجی سلطان نے ایک پتھر اٹھا کر تاک کے بادشاہ کے چہرے پر کھینچ مارا۔ اکبر کی شکن آلود پیشانی لہولہان ہو گئی اکبر نے اسی وقت حاجی سلطان کو سولی پر چڑھا دینے کا حکم صادر کر دیا۔ جس پر فوراً عمل درآمد ہوا اور حاجی سلطان کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔

شیخ احمد کے دل پر ایک اور زخم لگا۔ خسرو کی موت کے پچیس دن بعد شیخ عبدالاحد کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ بھی جھیلا اور حج کے ارادے سے دہلی پہنچ گئے وہاں مشہور بزرگ خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہو گئی اور دونوں میں ربط و ارتباط اتنا بڑھا کہ شیخ احمد نے خواجہ باقی باللہ سے خرقۂ خلافت حاصل کر لیا۔ خواجہ باقی باللہ کے اپنے

اس مرید کی بابت کیسے احساسات تھے؟ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے آپ نے اپنے کسی دوست سے شیخ احمد کا اس طرح تعارف کرایا۔

" اہل سرہند سے ایک بزرگ شیخ احمد بڑے عالم فاضل ہیں جو قوت عمل سے بھی متصف ہیں فقیر نے چند روز ان کی صحبت میں نشست و برخاست کر کے بہت سے عجائب روزگار کا مشاہدہ کیا ہے وہ ایک چراغ ہیں جو ایک عالم کو منور کر دیں گے۔"

آپ نے خواجہ باقی باللہ کی زیر تربیت سلوک کی منزلیں طے کیں اور ان کی ایما پر لاہور تشریف لے گئے۔ کشف و کرامات کا ظہور اور نزول شروع ہو چکا تھا۔

دوران سفر آپ اپنے احباب اور عقیدت مندوں کے ساتھ ایک سرائے میں فروکش ہوئے آپ نے قدرے سکوت اور مراقبہ اختیار کیا پھر فرمایا " لوگو! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آج اس سرائے پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے"

حاضرین صحبت نے دریافت کیا " حضرت اس سے مفر اور بچت کی تدبیر بھی ارشاد فرمائیں"

آپ نے ارشاد فرمایا " اس دعائے ماثورہ کا ورد جاری رکھو۔

بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیٔ فی الارض ولا فی السماء

اور اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق"

آپ نے مزید فرمایا " جو اس دعا کا ورد رکھے گا اس مصیبت سے محفوظ رہے گا"

تھوڑی دیر بعد ہی سرائے میں آگ لگ گئی اور یہ اتنی پھیل کر بجھانے کی جتنی کوشش کی گئی آگ بڑھتی چلی گئی اور سرائے کا سب کچھ جل گیا لیکن جن لوگوں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا تھا ان کا سامان حیرت انگیز طور پر محفوظ رہا۔

لاہور کے جس مکان میں آپ قیام فرما تھے ایک دن نماز عشاء کے بعد آپ نے اس مکان کی ایک دیوار کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا۔

" میں گھر کے جملہ افراد کو مطلع کرتا ہوں کہ کوئی شخص بھی اس دالان کے نزدیک نہ آئے اور نہ اس کے نزدیک سوئے"

کسی نے سوال کیا " حضرت! کیوں؟ یہ تو ابھی خاصی مضبوط ہے"

آپ نے جواب دیا " میں نے کشف میں اس دیوار کو گرتا ہوا دیکھ لیا ہے"

کسی شخص نے خوش طبعی کے طور پر کہا "حضرت معلوم نہیں کیا فرما رہے ہیں میں نے تو اس سے زیادہ شکستہ اور کمزور دیواریں دیکھی ہیں یہ تو بہت مضبوط ہے"

ایک خادمہ بھی یہ باتیں سن رہی تھی، اس نے بھی یہی سوچا کہ شیخ صاحب معلوم نہیں کیا فرما رہے ہیں، اچھا خاصا مضبوط دالان اچانک کیوں گرنے لگا وہ اسی دالان میں سو گئی۔ ایک دوسری خادمہ نے بھی اس کی دیکھا دیکھی مگر ڈرتے ڈرتے اس دالان سے ذرا دور سونے کا انتظام کیا اور پڑ رہی۔ نصف شب کے بعد دالان اچانک گر گیا۔ گرنے کی آواز سن کر لوگ بھاگ کر شکستہ دالان کے پہنچے اور اس میں سوئی ہوئی خادمہ کو آوازیں دینا شروع کر دیں لیکن اب وہ اس دنیا میں تھی ہی کب جو جواب دیتی، ہاں دوسرے دالان کے قریب سوئی ہوئی خادمہ کی چیخ پکار البتہ سنائی دے رہی تھی دالان کی اینٹوں نے اس کی ایک ٹانگ زخمی کر دی تھی اور شدت کرب سے چلا رہی تھی۔

آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور غصے میں فرمایا "کیا ہم نے آفتِ ناگہانی سے سب کو عشاء کے وقت آگاہ نہیں کر دیا تھا؟"

لوگوں نے مسکینوں کی طرح تائید میں گردنیں ہلا دیں آپ نے حکم دیا "اس زخمی خادمہ کو نکالا جائے"

خادمہ نکالی گئی اور اس وقت تو لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ خادمہ چوٹ چپیٹ سے بالکل محفوظ تھی اور ٹانگ کا جو حصہ اینٹ سے زخمی ہوا تھا وہاں اب خراش تک نہ تھی۔



دہلی میں خواجہ باقی باللہؒ پیر و مرشد رحلت فرما چکے تھے یہ تیزی سے دہلی چل پڑے۔ سرہند راہ میں پڑتا تھا لیکن آپ وہاں نہیں رکے۔ دہلی میں پیر کے مزار پر حاضری دی اور سرہند واپس تشریف لے گئے۔ خواجہ باقی باللہ کے وصال کے دو سال بعد اکبر اعظم بھی چل بسا اور ہندوستان کے اقتدار کی باگ ڈور جہانگیر کے ہاتھ میں آئی۔ آپ نے اپنے مکاتیب کے ذریعے تجدیدِ اُمت کا کام شروع کر دیا تھا آپ نے اپنے ہزاروں حلقہ بگوشوں کو خطوط لکھ کر تبلیغ و تلقین کا کام شروع کر دیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کی تجدید کا آغاز ۱۲ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ سے ہوتا ہے جبکہ رسول اللہؐ کا سن وفات

۱۱ھ ہے گویا ٹھیک ایک ہزار سال بعد۔ اسی دوران کیتھل سے شاہ سکندر تشریف لائے۔ یہ حضرت شاہ کمال کے پوتے تھے اس وقت حضرت شیخ سرہندی مراقبے میں تھے۔ شاہ سکندر نے اپنا خرقہ ان کے کاندھے پر ڈال دیا حضرت شیخ سرہندی نے آنکھیں کھول دیں اور دریافت فرمایا "یہ کیا ہے؟"

شاہ سکندر نے جواب دیا "رات حضرت شاہ کمال خواب میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ وہ جو خرقہ حضرت عبدالقادر جیلانی کی امانت تھا جو کئی واسطوں سے آپ کے لیئے مجھ تک پہنچا تھا"

حضرت شیخ سرہندی نے وہ جبہ اسی وقت پہن لیا اور اسی حالت میں زنان خانے میں تشریف لے گئے۔

اسی دوران مشہور اور معزز امرا، خان خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں مرتضیٰ خان اور مہابت خان وغیرہ حلقۂ ارادت مندان میں داخل ہو چکے تھے آپ انہیں مکاتیب کے ذریعے اس بات پر آمادہ کرتے رہتے کہ وہ بادشاہ کو خلاف شرع اور مرتدانہ روش سے باز رکھیں لیکن ان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

آپ اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں پاپیادہ ایک جنگل میں تشریف لے گئے۔ گرمی اور گرد و غبار کے زور نے لوگوں کے منہ پھیر دیئے ان میں کچھ تو حالات اور مشکلات پر قانع رہے لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو زبان پر حرف شکایت لائے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ نے اپنے پیر بھائی مولانا یوسف سمرقندی سے ارشاد فرمایا۔

"گرمی شدید ہے اور گرد و غبار الگ، دوستوں کو بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے"

مولانا یوسف نے جواب دیا "آپ کو سارا حال خود معلوم ہے کسی استفسار کی ضرورت ہی کہاں ہے"

آپ نے متبسم ہو کر نیم وا آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور معلوم نہیں چپکے چپکے کیا کچھ کہتے رہے ابھی آپ اسی کیفیت میں تھے کہ اوپر فضا میں ابر کا ایک ٹکڑا نمودار ہو کر ان سب پر سایہ فگن ہو گیا اور شمالی ہوا نہایت اعتدال سے چلنے لگی۔

آپ کے بھائی شیخ مسعود قندھار کے لیئے سامانِ تجارت لے کر قافلے کے ساتھ ہو لیے۔ انہیں گئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ ایک دن علی الصباح آپ نے

لوگوں سے فرمایا "عجیب معاملہ ہے آج میں شیخ مسعود کے احوال کی طرف متوجہ ہوا ہر چند میں نے چشم مکاشفہ سے انہیں تلاش کیا لیکن وہ زمین پر کہیں بھی نظر نہ آئے اس کے بعد میں نے زمین کے اندر تلاش کیا تو قندھار کے باہر ان کی قبر دکھائی دی غالباً انہوں نے آج ہی وفات پائی ہے"

سامعین نے وقت، دن اور تاریخ نوٹ کر لی ایک مدت بعد جب قافلہ واپس آیا تو لوگوں سے وہی کچھ معلوم ہوا جس کا آپ ذکر کر چکے تھے۔ شیخ مسعود کی وفات اسی دن وقت اور تاریخ کو واقع ہوئی تھی۔

آپ سے عجیب و غریب کرامتیں واقع ہو رہی تھیں ایک عالم جو اپنا بیشتر وقت آپ ہی کی صحبت میں گزارا کرتا تھا ایک دن پریشان حال اور اداس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے دریافت فرمایا "یہ آج تم اتنے اداس اور پریشان کیوں ہو؟"

اس نے غمزدہ آواز میں جواب دیا "حضرت! میرا ایک عزیز بہت سخت بیمار ہے اور میں اس کی زندگی چاہتا ہوں اور آپ سے دعا کا خواہش مند ہوں"

آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے پھر آنکھیں کھول دیں اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کچھ آہستہ آہستہ پڑھتے رہے اور پھر باآواز بلند فرمایا "ہم نے اس کے لیے دعائے مغفرت کر دی ہے"

عالم نے المناک نظروں سے آپ کو دیکھا گویا سوال کر رہا ہو "حضرت! یہ کیا بات ہوئی میں نے دعائے درازی عمر کی درخواست کی تھی"

آپ نے ارشاد فرمایا "مشیت ایزدی اور تقدیر الٰہی کو کون بدل سکتا ہے؟"

وہ عالم گھر گیا تو پتہ چلا کہ اس عزیز کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک دن آپ اپنے ارادت مندوں کو مکاتیب لکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان نے باریابی کی اجازت چاہی۔ آپ نے اسے اپنے قریب بلا لیا اور دریافت فرمایا "کہو کیسے آنا ہوا؟"

نوجوان نے جواب دیا "بندے کو جلال الدین حسین کہتے ہیں والد بزرگوار کا نام خواجہ حسام الدین احمد ہے جن سے حضرت بخوبی واقف ہوں گے"

آپ نے فرمایا "خوب اچھی طرح۔ وہ تو خود بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہیں تمہیں ہمارے پاس کیوں بھیجا ہے؟"

نوجوان نے جواب دیا " والدِ بزرگوار نے فرمایا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے ذکر کی تعلیم سے سرفراز فرمائیں "

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا " اچھا تو یہ بات ہے " اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں اور ذرا دیر بعد نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا " نوجوان! کیا بات ہے؟ ہم نے آنکھیں بند کر کے چشم مکاشفہ سے تمہارا دل ملاحظہ کیا۔ وہاں ہم نے ایک عورت کی محبت کا نقش اس طرح جما ہوا دیکھا جس طرح پتھر مٹی میں پیوست ہو جاتا ہے ہمیں سچ سچ بتاؤ کہ بات کیا ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ عورت اور خدا کے نقوش ایک ہی دل میں ایک ہی جگہ موجود رہیں جب تک عورت کی محبت کا نقش دل میں رہے گا خدا کی محبت سے محروم رہو گے "

اب نوجوان کے لئے دل کی بات چھپانا بہت مشکل تھا اس نے نظریں جھکا لیں اور آہستہ آہستہ کہنے لگا " حضرت! میں اپنی پھوپھی کی ایک کنیز پر فریفتہ ہوں، لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی محبت دل سے نکال دوں لیکن ناکام ہو جاتا ہوں، کچھ آپ ہی مدد فرمائیں "

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک نظر نوجوان کے سینے پر ڈالی اور پھر اس کے چہرے کو بغور دیکھا اور نظریں ہٹا لیں۔ نوجوان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل سے کوئی کانٹا کھینچ لیا گیا ہو اس کے بعد اس کے دل میں کبھی کنیز کا خیال تک نہ آیا۔

اس دوران آپ اجمیر تشریف لے گئے وہاں جس مسجد میں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے اس کی جنوبی دیوار بہت کمزور تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اب گری اور جب گری۔ آپ کے مرید ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے اور بار بار درخواست کرتے رہتے تھے کہ آپ اس دیوار سے دور رہیں آپ نے ہنس کر فرمایا " تم لوگ کیوں ڈرتے ہو، جب تک ہم اور ہمارے فقرا یہاں موجود ہیں۔ یہ دیوار نہیں گرے گی "

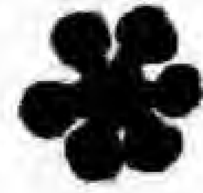
اور واقعی آپ جیسے ہی وہاں سے واپسی کی نیت سے ہٹے دیوار گر گئی۔

اسی دوران ایک صوفی خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے سوالیہ انداز میں صوفی کو دیکھا۔ صوفی نے جواب دیا " حضور والا! میں حج کرنے جا رہا ہوں، اجازت طلب کرنے آیا ہوں امید ہے سفرِ حج کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی "

آپ نے آہستہ سے کہا " اچھا " اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کھول دیں اور فرمایا " میں تمہیں حج کے میدان میں تلاش کرتا رہا لیکن تم نے مجھے وہاں کہیں

بھی نظر نہ آسکے "

صوفی اداس ہوگیا۔ وہ حج پر جانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن وہ ہر سال جانے کا ارادہ کرتا اور یہ ارادہ کسی نہ کسی طرح ٹوٹ جاتا اسی طرح تیس سال گزر گئے اور وہ زندگی کی آخری سانسوں تک حج نہ کرسکا۔



طاعون کی وبا پھیلی - یہ تجدد کا چودھواں سال تھا - اس وبا میں آپ کے تین صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی نے داغِ مفارقت دیا - یہ ایسی مصیبت تھی کہ آدمی اندر سے منتشر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن آپ نے صبر و استقلال سے کام لیا اس سانحے کے دو سال بعد آپ نے اپنے ایک مرید خاص شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو اپنی خلافت سے نوازا اور حکم دیا کہ "اکبر آباد جاؤ اور شاہی لشکر میں تبلیغ و تلقین کا شروع کرو " آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہاں تمہیں بڑی عزت حاصل ہوگی اور لوگ تمہیں بیحد پسند کریں گے " لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ اگر وہاں تمہیں کسی وجہ سے تکلیف پہنچے تو اس کی پرواہ نہ کرنا، مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہنا ہماری اجازت کے بغیر وہاں سے حرکت بھی نہ کرنا۔

شیخ بدیع الدین نے پوچھا "حضرت! اگر کسی وجہ سے میرے پائے ثبات میں لغزش آجائے تو کیا ہوگا؟"

آپ نے ناگواری سے جواب دیا "اگر تم مستقل مزاج نہ رہو گے تو اس سے خود تمہیں بھی تکلیف اٹھانی پڑے گی اور ہمیں بھی تکلیف پہنچے گی "

شیخ بدیع الدین اکبر آباد چلے گئے اور وہاں اپنا کام نہایت ہی تن دہی اور انہماک سے انجام دینے لگے اکبر آباد میں انہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہزاروں لشکری آپ کے مرید ہوگئے اور ہر روز اتنا ہجوم رہنے لگا کہ بڑے بڑے امرا کو شیخ کی زیارت سے محروم رہنا پڑتا۔

سرہند میں حضرت شیخ سرہندی خوش تھے کہ کام حسب دلخواہ انجام پا رہا تھا اور دین کی تجدید ہو رہی تھی لیکن ایک دن آپ نے مراقبے سے سر اٹھا کر اپنے ارادت مندوں سے فرمایا "لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں ابھی تک کس نعمت سے محروم ہوں؟"

کسی نے سوال کیا "حضرت! آپ کس تربیت کا ذکر فرما رہے ہیں وہ کونسی تربیت ہے جس سے آپ جیسی ہستی محروم رہ سکتی ہے"

آپ نے جواب دیا "تم نہیں جانتے، ابھی تک میں تربیت جمالی سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ میری تربیت جلالی کا بھی انتظام کیا جائے اور یہ حق تعالیٰ کا فیصلہ ہے جس کے سامنے میں اپنا سر جھکاتا ہوں"

لوگ سناٹے میں آگئے کہ معلوم نہیں ان ارشادات کا اصل مفہوم کیا ہے؟

آپ نے کسی کے سوال کا انتظار کئے بغیر وضاحت فرمائی "لوگو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھ پر ایک مصیبت نازل ہونے والی ہے اور یہ مصیبت میرے حق میں مدارج قرب کی ترقیات کا سبب بنے گی"

اس وضاحت کے باوجود لوگ آپ کا اصل مفہوم نہ پا سکے۔

دوسری طرف اکبر آباد میں نور جہاں کا بھائی اور سلطنت مغلیہ معزز اور با اثر امیر آصف خاں اور اس جیسے دوسرے امرا بادشاہ کو ورغلا رہے تھے وہ کہہ رہے تھے "جہاں پناہ سرہند کے ایک ملا شیخ زادے نے مجددیت کا دعویٰ کیا ہے یہ شخص علوم عربیہ کا ماہر ہے اس نے اپنے صدہا خلفا مختلف دور دراز ملکوں میں بھیج دیے ہیں اور لاکھوں آدمی اس کے اور اس کے خلفا کے مرید ہو چکے ہیں بعض غیر ممالک کے فرماں روا بھی ان کے مرید ہو چکے ہیں جس سے مغلیہ سلطنت کو خطرات پیدا ہو گئے ہیں"

جہانگیر کو تشویش پیدا ہو گئی۔ امرا نے اس کے چہرے سے سمجھ لیا کہ بات کارگر ہو چکی ہے گرم لوہے پر مزید چوٹ لگائی اور زیادہ خوف زدہ کرنے کے لیے سلسلۂ شکایات جاری رکھا "ہمارے لشکر میں بھی اس کا ایک خلیفہ موجود ہے اور اکثر امرائے سلطانی بھی اس کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں"

جہانگیر نے سوال کیا "مثلاً کون کون؟"

چغل خور امرا میں ایک [redacted] نے جواب دیا "مثلاً خان خاناں، سید صدر جہاں خان جہاں، خان اعظم، مہابت خاں، سکندر خاں، دریا خاں، مرتضیٰ خاں"

جہانگیر نے گھبرا کر مزید نام لینے سے روک دیا "بس بس"

امیر نے کہا "حضور والا! یہ نام ایسے نہیں کہ تساہل سے کام لیا جائے۔

اگر مزید غفلت اختیار کی گئی تو معلوم نہیں کیسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو"۔

اس کے بعد انہوں نے حضرت شیخ سرہندی کے بعض مکاتیب کے وہ حصے پڑھ کر سنائے جن سے قابل اعتراض عقائد مترشح ہوتے تھے۔

جہانگیر پر ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے فوراً ہی خان خاناں کو دکن، خاں جہاں لودھی کو مالوہ، خان اعظم کو گجرات اور مہابت خاں کو کابل کی صوبے داری پر متعین کر دیا۔ اس طرح بادشاہ ان امرا کے اتحاد اور یک جہتی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک حکم جاری کیا اور فوجیوں پر پابندی عاید کر دی کہ وہ شیخ بدیع الدین سے نہیں ملیں گے اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ شیخ صاحب جادوگر ہیں اور اپنے سحر کے زور سے لوگوں کو گمراہ اور متاثر کر رہے ہیں اس غلط تشہیر نے کچھ لوگوں کو شیخ صاحب سے برگشتہ کر دیا لیکن زیادہ لوگ برابر آتے جاتے رہے۔ بادشاہ نے ان آنے جانے والوں کے لئے جاسوس مقرر کر دیے چنانچہ جس کی بابت بھی اسے یہ معلوم ہوتا کہ اس نے شیخ صاحب سے ملاقات کی ہے اس پر شاہی عتاب نازل ہوتا۔ شیخ بدیع الدین بھی زمانے کی بدلی ہوئی ہوا صاف محسوس کر رہے تھے انہوں نے جب یہ یقین کر لیا کہ ان کی خدمت میں حاضری دینے والے مورد عتاب آجاتے ہیں تو خود ہی ملاقات اور باریابی سے منع کرنے لگے۔ ان حالات کی اطلاع انہوں نے شیخ سرہندی کو بالتفصیل دی حضرت شیخ سرہندی نے جواب میں انہیں تسلی دی اور حکم دیا کہ وہ اپنے کام میں لگے رہیں اور ذرا بھی نہ گھبرائیں۔

اس دوران اکبر آباد میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ حضرت شیخ سرہندی کو عنقریب دربار میں بلا کر قتل کر دیا جائے گا افواہوں کے جھکڑ اتنے زور شور سے چلے کہ شیخ بدیع الدین گھبرا گئے اور اکبر آباد سے سہارنپور چلے گئے کچھ دن سہارنپور میں رہے پھر سرہند میں شیخ سرہندی کی خدمت میں حاضری دی، شیخ سرہندی ان پر بہت ناراض ہوئے اور ڈانٹ کر کہا " جب ہم نے تمہیں منع کیا تھا کہ وہاں سے ہماری اجازت کے بغیر حرکت بھی نہ کرنا پھر تم کیوں چلے آئے، تم اس لائق نہیں تھے کہ خلیفہ بنا کے شاہی لشکر میں بھیجے جاتے اب تم اکبر آباد ہرگز نہ جانا"۔

شیخ بدیع الدین کانپ گئے اور چپ چاپ دوبارہ اکبر آباد روانہ ہو گئے ان کا

اکبر آباد میں دوبارہ داخلہ بڑا رنگ لایا، افواہ طرازوں نے بادشاہ کو یہ باور کرادیا کہ شیخ بدیع الدین شیخ سرہندی سے مشورہ کرکے کوئی خطرناک منصوبہ لے کر واپس آئے ہیں اور فوج میں بغاوت اور انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بادشاہ مہابت خان اور خان خاناں وغیرہ کے بارے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں پہنچ کر اپنے عہدے سنبھالے ہوئے ہیں یا بغاوت پر آمادہ ہیں چنانچہ بادشاہ کو جیسے ہی ادھر سے اطمینان ہوا اس نے شیخ احمد سرہندی کے نام فرمان جاری کر دیا کہ وہ اپنے صاحبزادگان اور مریدوں کے ساتھ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوں، کیونکہ بادشاہ ان سے ملنے کا متمنی اور خواہش مند ہے۔

اس کے ساتھ ہی حاکم سرہند کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے شیخ سرہندی کو اکبر آباد روانہ کر دیا جائے۔ اس حکم سے آپ کے متعلقین اور مرید گھبرا گئے آپ نے انہیں سمجھایا کہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔

لوگوں نے تشویش ظاہر کی کہ دربار میں بادشاہ ان سب کے ساتھ معلوم نہیں کیا سلوک کرے۔

آپ نے اپنے صاحبزادگان خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو کسی پہاڑی مقام پر بھیج دیا اور اعزا سے فرمایا "گھبراؤ مت، بادشاہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا یہ تکلیف ایک سال کی ہے اس کے بعد آرام ہی آرام ہے"

آپ نے پانچ مریدوں کو ساتھ لیا اور اکبر آباد روانہ ہو گئے ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ اس عہد کے مشہور عالم علامہ افضل خان اور خواجہ عبدالرحمن مفتی فقہ کی کتابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کی عزت سے پذیرائی کی اور پوچھا "آپ حضرات نے کیوں زحمت فرمائی؟"

خواجہ عبدالرحمن مفتی نے جواب دیا "سنا ہے بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بادشاہ کے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں؟"

آپ نے دریافت کیا " اگر ایسا ہے تو آپ صاحبان اس معاملے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

مفتی نے جواب دیا "ہمیں شہزادے خرم (شاہجہاں) نے آپ کی خدمت

میں بھیجا ہے شہزادے کو آپ سے جتنی عقیدت اور محبت ہے کسی سے چھپی نہیں ہے شہزادے کا خیال ہے کہ دربار میں جو چیز آپ کے حق میں سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوگی وہ سجدہ تعظیمی ہے بادشاہ آپ سے اس رسم کی ادائیگی کا خواہش مند ہوگا اور آپ انکار کریں گے اور اس اختلاف کا جو نتیجہ بھی نکلے گا اس کے تصور ہی سے شہزادہ پریشان ہے؟

آپ نے سوال کیا "شہزادے کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

مفتی نے جواب دیا۔ "ہم فقہ کی کتابوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، شہزادے کا مشورہ ہے کہ آپ زندگی کے تحفظ کی خاطر سجدۂ تعظیمی ادا کریں اس کے بعد شہزادہ آپ کی پوری ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے"

آپ نے نفرت کا اظہار کیا، بولے "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

مفتی نے کہا "فقہ بھی ایسے سجدے کو جائز قرار دیتی ہے جو زندگی کو بچانے کے لئے جابر سلطان کو کیا گیا ہو، ان حالات میں تعظیمی سجدہ حرام نہیں رہتا"

آپ نے جواب دیا "یہ حکم بطور رخصت (مصلحت) ہے جان بچانے کیلئے لیکن بطور عزیمت یہ حکم ہے کہ غیر حق کو ہرگز سجدہ نہ کیا جائے"

مفتی اور علامہ کی ہر ممکنہ کوششوں کے باوجود آپ سجدہ تحیتِ سلاطین پر آمادہ نہ ہوئے۔

آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر امرا کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا اور آپ کا خیمہ اپنے محل کے قریب نصب کرایا۔ اس کے بعد آپ ملاقات کے لئے دربار میں طلب کیے گئے آپ دربار میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آداب شاہی کا کوئی خیال نہ رکھا بادشاہ اس دلیر شخص کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ امرا کا خیال تھا کہ بادشاہ کا عتاب نازل ہونے ہی والا ہے لیکن جب بادشاہ نے حیرت اور سکوت کی روش اختیار کی تو ایک امیر نے بادشاہ سے کہا "حضور! یہی وہ شخص ہے جو خود کو تمام انبیاء سے افضل بتاتا ہے اور اس کا وہ خط بھی ہمارے پاس موجود ہے جس میں یہ خود کو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بلند تر لکھتا ہے"

اس کے بعد وہ خط بادشاہ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ آپ نے یہ خط اپنے

پیر ومرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کو تحریر فرمایا تھا اور اس میں آپ کے روحانی سیر عروج کا ذکر کیا گیا تھا اس میں اپنی اس عجیب و غریب روحانی کیفیت اور سیر کا حال بیان کیا گیا تھا جس میں آپ حضرت عثمان کے مقام سے گزر کر حضرت فاروق کے مقام پہ پہنچے تھے اور پھر یہاں سے اور بلندی پر اٹھ گئے اور حضرت صدیق کے مقام پر پہنچ گئے پھر یہاں سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے مقام پہ پہنچے، یہ ایک روحانی کیفیت کا اظہار تھا خط کی آخری سطور میں آپ نے لکھا تھا " اس کے بعد اسی کیفیت میں اپنے آپ کو لطیف پایا اور ہوا یا بادل کے ٹکڑے کی طرح اطراف میں پھیل گیا ۔"

بادشاہ نے برہمی سے پوچھا " کیا یہ درست ہے کہ تم خود کو حضرت صدیق اکبر سے بلند مرتبہ سمجھتے ہو ؟"

آپ نے جواب دیا " ہرگز نہیں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس گستاخی کا مرتکب ٹھہروں ۔"

بادشاہ نے کہا " پھر آپ کی اس تحریر کا مطلب کیا ہے ؟"

آپ نے جواب دیا " اس میں، میں نے سیر عروج کا حال لکھا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس سے اکثر صوفیا کو گزرنا پڑتا ہے اور انہیں پھر اپنے مرتبے اور حال میں واپس آنا پڑتا ہے " پھر آپ نے اس کی ایک شاندار مثال دی، آپ نے دس ہزاری، پنج ہزاری امرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا " اب اگر ان معزز امرا کی موجودگی میں بادشاہ ان سے کم مرتبہ شخص کو اپنے قریب بلاتا ہے اور اس سے کچھ راز کی باتیں کہہ کر واپس کر دے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان امرا کا مرتبہ گھٹ گیا ہے اور اس کم مرتبہ شخص کا مرتبہ بڑھ گیا ۔"

بادشاہ اس دلیل سے بہت خوش ہوا اور اس کا وہ جذبہ سرد پڑ گیا جو آپ کے خلاف کچھ دیر پہلے موجزن تھا لیکن اسی وقت ایک امیر نے بادشاہ سے عرض کیا " حضور والا! اس شخص کے تکبر اور رعونت کو تو ملاحظہ فرمائیں ۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں اور یہ خود بھی آپ کے اس مرتبے سے خوب واقف ہے لیکن حال یہ ہے کہ سجدۂ تعظیمی تو بہت دور رہا، معمولی احترام و تواضع بھی نہیں بجا لایا ۔"

بادشاہ نے آپ سے ناخوشگوار لہجے میں کہا " شیخ صاحب ! آپ کو آداب شاہی کا تو خیال کرنا ہی پڑے گا، اور بہتری اسی میں ہے کہ اسی وقت تعظیمی سجدے میں جھک جائیں ۔"

آپ نے سختی سے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں، ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا، غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے۔"

جہانگیر نے کہا۔ "اچھا ہم آپ کو اتنی رعایت دینے کو تیار ہیں کہ آپ اپنا سر بس یوں ہی ذرا سا جھکا دیں، ہم اسے سجدہ تعظیمی ہی شمار کر لیں گے۔"

آپ نے اسی سختی سے جواب دیا۔ "یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔"

جہانگیر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے بولا۔ "ہم آپ کو یوں شاید اس پر مجبور نہ کرتے لیکن اب ہماری زبان سے نکل چکا ہے ہم اس کی تعمیل چاہتے ہیں اسے پورا ہونا چاہیئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تیرے حکم کی تعمیل سے زیادہ اللہ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے کیا تجھے یہ معمولی بات بھی نہیں معلوم کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔" پھر آپ نے ذرا زیادہ پرجوش لہجے میں فرمایا۔ "جہانگیر! کیا یہ ایک انسان کی کھلی ہوئی حماقت نہیں ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔"

جہانگیر پر اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا اس نے چند قوی ہیکل امرا کو حکم دیا۔ "ان کا سر جبراً ہمارے سامنے جھکا دیا جائے۔ اس کے بعد انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کر دیا جائے۔"

چند ہیل تن امرا آگے بڑھے اور آپ کے سر اور گدی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آپ نے پوری قوت سے خود کو اکڑا لیا اور گردن اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ سرکشوں نے پوری قوت سے سر جھکا دینے کی کوشش کی لیکن ذرا بھی نہ جھکا سکے۔ اس دن لوگوں نے یہ عجیب و غریب معرکہ برپا دیکھا کہ ایک طرف بادشاہ تھا، اس کا جاہ و جلال تھا، امرا تھے درباری دبدبہ تھا وسیع اختیارات تھے اور اقتدار کلی تھا اور دوسری طرف ایک تنہا شخص تھا جو خودی، خود شناسی اور حق آگاہی کی قوت اور ہتھیار سے وقت کی سب سے بڑی طاغوتی طاقت سے نبرد آزما تھا امرا بزور حضرت شیخ سرہندی کی گردن جھکا دینے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ اس کشمکش میں حضرت شیخ سرہندی کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔

بادشاہ کو کچھ رحم آیا لیکن راج ہٹ کا جذبہ اب بھی سرد نہ ہوا تھا حکم دیا۔ "انہیں اس چھوٹے سے .... دروازے سے گزارا جائے تاکہ یہ جب اس میں سے جھک

کر سامنے آئیں تو اسی کو سجدۂ تعظیمی تصور کر لیا جائے "۔

اس نئے حکم کی تعمیل میں آپ کو اُمراء دوسری طرف لے گئے اور اس چھوٹے سے دروازے سے گزر کر بادشاہ کے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے اس دروازے میں پہلے تو ایک پیر داخل کیا اس کے بعد سر کو پیچھے پشت پر جھکا کر دروازے سے نکل گئے۔

اس سخت رویے کو دیکھ کر امراء نے بادشاہ سے کہا "حضور والا! اس شخص کا تمرد ملاحظہ فرمایا۔ اس تکبر اور سرکشی سے کیا بعید ہے کہ دربار سے نکلتے ہی شورش نہ برپا کر دے اس لیئے بہتری اسی میں ہے اس شخص کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائے اسی وقت اٹھایا جائے ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا "۔

بادشاہ نے انہیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ آپ اسی وقت گوالیار روانہ کر دیئے گئے۔

اگر بات قید و بند ہی تک رہتی تو اتنی بڑی بات نہ ہوتی لیکن شاہی فرمان کے ماتحت حضرت شیخ سرہندی کا سارا سامان اور جائداد کی ضبطی کا کارنامہ بھی انجام پا گیا آپ کے ساتھ ہی پانچوں مرید بھی قید کر دیئے گئے حاکم قلعہ غیر معمولی سختی سے پیش آیا۔ آپ کے ایک مُرید سے ضبط نہ ہو سکا اور غصے میں حاکم قلعہ سے کہا "او ظالم! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ نے ہمیں یہاں قید کر رکھا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے یاد رکھ ہم یہاں حکم الٰہی سے آئے ہیں اگر ہم چاہیں تو اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہیں اور تو ہمیں کسی طرح بھی نہیں روک سکتا "۔

اس نے یہ کہا اور اچھل کر قلعے کی بلند و بالا دیوار پر جا بیٹھا۔ حاکم قلعہ اور پاسبان حیران اور پریشان اسے دیکھنے لگے حضرت شیخ سرہندی نے مُرید کو جھڑک دیا۔ فرمایا یہ کیا مجھ میں اظہار کرامت کی قدرت نہیں ہے جو تم دکھاتے ہو۔ مشیت ایزدی یہ ہے کہ ہم زمانے کے جور و جفا برداشت کریں "۔

پاسبان اور حاکم قلعہ بے حد شرمندہ ہوئے اور معافی کے خواستگار ہوئے۔

آپ نے قلعے میں محبوس قیدیوں میں تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ ہزارہا ہندو مسلمان ہو گئے اور سینکڑوں مسلمانوں نے مریدی اختیار کی۔

آپ کی گرفتاری اور قید سے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ خان خاناں

خان اعظم، خان جہاں لودھی اور دوسرے نامی گرامی امرا نے مہابت خان کو اپنا سردار مان لیا اور اسے اختیار دیا کہ وہ بادشاہ کے خلاف فوجی کاروائی کرے۔ مہابت خان کابل سے فوج لے کر چل پڑا، اس نے خطبے اور سکے سے بادشاہ کا نام نکال دیا، مہابت خان کے ارادے کی خبر حضرت شیخ سرہندی کو بھی ہو گئی انہوں نے مہابت خان کو منع کرا دیا کہ وہ ان کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائے مہابت خان کی فوجی تیاریوں اور ارادوں کی خبر پاکر بادشاہ مقابلے پر چل پڑا۔ دریائے جہلم پر دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور مہابت خان نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ دوسری طرف گوالیار میں یہ کوشش کی گئی کہ حضرت شیخ سرہندی ہندوستان کی حکومت سنبھال لیں لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مہابت خان کو سختی سے ہدایت کی کہ فتنہ و فساد ختم کرو اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔"

مہابت خان نے بادشاہ کو رہا کر دیا اور اس گستاخی کی معافی مانگی۔ جہانگیر نے اسے معاف کر دیا۔ مہابت خان نے کہا "لیکن حضور حضرت شیخ سرہندی کو رہا فرمائیں، میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔"

جہانگیر نے وعدہ کر لیا۔ اسی دوران وہ بہت سخت بیمار ہو گیا اور ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی صاحب فرما رہے ہیں "جہانگیر! تو نے شیخ سرہندی پر بڑا ظلم کیا وہ امام وقت اور مجدد اسلام ہیں اور تیری بیماری کا اصل سبب ہی وہ ہیں انہیں رہا کر کے شفا حاصل کر۔"

جہانگیر نے فوراً رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور حضرت شیخ سرہندی سے درخواست کی کہ رہائی کے بعد بادشاہ سے ملاقات ضرور کریں۔

آپ نہایت عزت و احترام سے رہا کر دیے گئے سرہند پہنچے اور تین دن قیام فرما کر اکبر آباد چلے گئے وہاں شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ شاہی محل میں قیام کا انتظام کیا گیا۔ بادشاہ نے آپ کی مندرجہ ذیل شرائط پوری کر دیں۔

۱۔ سجدہ تعظیمی یک قلم موقوف ہوا۔ ۲۔ گاؤ کشی کا فرمان جاری ہو گیا۔ بازاروں میں کھلے عام گائے کا گوشت فروخت ہونے لگا۔ ۳۔ بادشاہ اور کارکنان مملکت نے اپنے اپنے ہاتھ سے گائے ذبح کی اور کباب تیار کرا کے کھائے

۴ - ملک کے جس جس حصے میں مسجدیں شہید کی گئی تھیں انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کا فرمان صادر ہوا۔ ۵ - دربار عام کے قریب مسجد تعمیر کرائی گئی ۶ - مذہبی تعلیم پھر سے عام کی گئی ۷ - شہروں میں مفتیوں اور قاضیوں کی تقرری عام ہوئی۔ ۸ - خلاف شرع قوانین منسوخ اور شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔

کہتے ہیں جہانگیر اپنی گزشتہ گستاخیوں پر ہمیشہ شرمندہ رہا۔ اس کی افسردگی اور ندامت کے پیش نظر ایک دن حضرت شیخ سرہندی نے جہانگیر سے فرمایا "تم خاطر جمع رکھو میں اس وقت تک بہشت میں نہیں داخل ہوں گا جب تک تمہیں بھی اپنے ساتھ نہ لے لوں"

یہ بھی کہتے ہیں کہ شیخ سرہندی کے اس قول کے پیش نظر بادشاہ اپنی آخری عمر میں کہا کرتا تھا۔ "ہم کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے نجات اور بخشش کی امید کی جاسکے ہاں شیخ سرہندی کا یہ قول ایک ایسی دستاویز ہے جسے میں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے نجات کا طالب ہوں گا"



شہزادے خرم کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر اس کی جگہ نور جہاں کے داماد شہریار کی ولی عہدی کا اعلان کرنے والا ہے تو وہ بدرجۂ مجبوری باپ کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا۔ شہزادے خرم کی فوجی قوت غیر معمولی تھی اس پر ستم یہ ہوا کہ عین جنگ کے دوران چند فوجی دستے شاہی فوج سے نکل کر شہزادے خرم سے جا ملے۔ جہانگیر پریشان ہو گیا اس نے شیخ سرہندی سے دعا کی درخواست کی آپ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا "تم مطمئن رہو تم کامیاب رہو گے"

ابھی بادشاہ کو یہ نوید سنائی ہی تھی کہ شہر کے باکمال بزرگوں نے حضرت شیخ سرہندی کو خفیہ پیغام بھیجا "حضرت ہم پر کشف ہوا ہے کہ اس معرکے میں شہزادہ غالب آئے گا اور باپ مغلوب، آپ کیا فرماتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا "ہم پر کچھ اور ہی کشف ہوا ہے، شہزادے کو شکست ہوگی لیکن بالآخر شہزادہ کامیاب ہوگا"

یہ عجیب و غریب پیش گوئی تھی۔ جنگ ہوئی، بادشاہ فاتح ہوا اور بیٹا مفتوح۔ آپ تنہا بیٹھے تھے کہ شہزادہ خرم چھپتا چھپاتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور

شکایتاً کہا "حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ یہ ناچیز ہمیشہ آپ کے حق میں لڑتا جھگڑتا رہا اور آپ نے میرے حق میں تو دُعا فرمائی نہیں بادشاہ کے حق میں دُعا گو ہو گئے۔"

آپ نے جواب دیا "مت گھبرا شہزادے۔ مجھے حق تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہوا ہے کہ تو عنقریب تخت پر بیٹھے گا اور تیرا لقب شاہجہاں ہو گا۔"

شہزادہ بہت خوش ہوا اور اس نے تبرک کے طور پر آپ کی دستار لے لی جو بعد میں عرصے تک شاہانِ مغلیہ کے خزانے میں محفوظ رہی۔

آپ نے اپنے مکاتیب کے ذریعے وہ کام لیا جو آج اس ترقی یافتہ دور میں پمفلٹ اور ارزاں لٹریچر شائع کر کے لیا جا رہا ہے آپ اس نکتے سے خوب واقف تھے کہ تحریر کا اثر دیرپا ہوتا ہے آپ نے اپنے ایک مکتوب میں بادشاہ کی حیثیت کے بارے میں تحریر فرمایا۔

"دنیا کے ساتھ بادشاہ کا تعلق ایسا ہے جیسا دل کو جسم سے اگر دل اچھا ہے تو بدن بھی اچھا رہے گا اور اگر دل بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جائے گا بالکل اسی طرح دنیا کی بہتری بادشاہ کی بہتری پر منحصر ہے اگر بادشاہ بگڑ جائے تو جہاں کا بگڑ جانا لازم ہے۔"

ہردے رام نامی ایک ہندو نے رام اور رحمان کو ایک ہی قرار دیا تو آپ نے اُسے تحریر فرمایا۔

"ہندو جس رام اور کرشن کی پرستش کرتے ہیں وہ تو ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے رام وسرتھ کا بیٹا تھا، لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند تھا رام جب اپنی سیتا کو نہ بچا سکا تو دوسروں کی کیا مدد کرے گا پس یہ کہنا کہ رام اور رحمان ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ جب تک یہ رام اور کرشن پیدا نہ ہوئے تھے خدا کو رام اور کرشن نہیں کہا جا سکتا تھا ان کی پیدائش کے بعد لوگوں نے ذاتِ احدیت پر رام اور کرشن کا اطلاق کیا۔"

آپ بہت زیادہ کام انجام دے چکے تھے۔ عمر کے تریسٹھویں سال میں داخل ہوئے تو انہیں اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا۔ سردیوں کے دن تھے۔

آپ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے آپ نے حاضرین سے فرمایا "آئندہ جاڑوں میں ہم یہاں نہیں ہوں گے"۔

لوگوں نے پوچھا "پھر کہاں؟ حضرت کہیں اور قیام فرما ہوں گے؟"

آپ نے جواب دیا "نہیں، ایسا بھی نہیں ہوگا"۔

لوگ مختلف مکانوں کے نام لیتے گئے اور آپ نفی میں سر ہلاتے رہے آخر لوگوں نے پوچھا "حضرت آپ بتاتے کیوں نہیں کہ کہاں رونق افروز ہوں گے؟"

آپ نے جواب دیا "ان مکانوں میں سے کسی میں بھی نہیں، انتظار کرو کیا ظاہر ہوتا ہے"۔ پھر فرمایا کہ "لوگو! اب میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ میری اور تمہاری ملاقات قیامت کے دن ہوگی وہاں رسول مقبولؐ دریافت فرمائیں گے کہ شیخ احمد! تو نے کیا خدمت انجام دیں؟ اس وقت تمہیں یہ شہادت دینی ہوگی کہ میں نے رسول مقبولؐ کی اُمت کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔

لوگوں نے بیک آواز کہا "ہم قیامت میں گواہی دیں گے کہ آپ نے اپنے فرائض پوری دیانت داری اور محنت سے انجام دیئے"۔ —— آپ نے سکون کی سانس لی اور آب دیدہ ہو گئے۔

آپ کو سب سے پہلے جس ذات نے مجدد الف ثانی کا لقب دیا۔ اس کا نام ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ہے مُلّا عبدالحکیم نے انہی استاد سے تعلیم حاصل کی تھی جن سے حضرت شیخ سرہندی نے درس لیا تھا۔

زندگی کے آخری دنوں میں صدقات و خیرات میں زیادتی ہوگئی تھی کسی مخلص نے دبے لفظوں میں سوال کیا "حضور والا! یہ عاصی محسوس کر رہا ہے کہ اب اس عالم معاصی اور دنیائے کثیف میں حضرت کا قیام زیادہ دن تک نہیں رہے گا پھر یہ خیرات اور صدقات میں زیادتی کا سبب؟"

آپ نے جواب دیا "آج بلا وا کنت سوں سکھی سب جگ دیوں وار"

"آج دوست سے ملنے کا دن ہے اس آئے میرے دوست! میں اس کی خوشی میں تمام دنیا کو قربان کرتا ہوں"

اور آخر تریسٹھ سال کی عمر میں منگل کے دن ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ (۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء) بوقت اشراق آپ نے وصال فرمایا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت اور کام کی اہمیت بڑھتی چلی گئی اور آج حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو دنیا امام ربانی، محبوب سبحانی اور مجدد الف ثانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

⁂

حضرت شاہ نعمت اللہ ولیؒ

سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر دو بار حملہ کیا اور ناکام واپس گیا۔ پرتھوی راج چوہان دونوں مرتبہ حاوی رہا۔ غوری حیران تھا کہ وہ ناکام کیوں ہو رہا ہے کسی نے مشورہ دیا "حضور والا غزنی کے میر بدالدین صاحب کشف اور مستجاب الدعوات ہیں کیوں نہ ان سے روحانی اعانت حاصل کی جائے"

بات غوری کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میر بدالدین عرف بندگی میاں کے والد بہاء الدین زکریا ملتانی اقالیم گیر شہرت کے مالک ہیں بیٹا بھی روحانی علم ضرور رکھتا ہوگا غوری ہاتھ باندھ کر ان کی خدمت میں کھڑا ہو گیا دل کی رقت کا اثر چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا دست بستہ عرض کیا "حضرت! اسلام کا حق اس ناچیز پر ہی نہیں، آپ پر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں نے پرتھوی راج پر دو بار حملہ کیا لیکن ناکام رہا۔ کیا آپ کے ہوتے ہوئے آپ کا یہ ناچیز اسی طرح شکست و ندامت اٹھاتا رہے گا"

بدرالدین نے بے باکی سے جواب دیا "شہاب الدین تیری فوج میں برائیوں کے سوتے کھلے ہوئے ہیں انہیں بند کر، اس کے بعد فلاح کی آس لگا"

غوری نے عاجزانہ دریافت کیا "خادم حضرت کا اشارہ نہیں سمجھا"

آپ نے لاپرواہی اور حقارت سے جواب دیا "اس میں اشارے کی کونسی بات ہے تیرے لشکر میں ظلم ہی ظلم ہے عدل نام کو بھی نہیں جہاں عدل نہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔ جو زمین شور زدہ ہو اس پر فصل کس طرح تیار ہوگی"

غوری آپ کے قدموں میں جھک گیا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھوں سے لگا کر ہونٹوں پر رکھ کر بوسہ دیا۔ بولا "حضرت بس اتنی سی بات! اچھا آج سے آپ میری فوج میں منصب قضا پر فائز کئے جاتے ہیں"

میر بدرالدین نے پہلے تو منصب قضا قبول کرنے میں تامل سے کام لیا۔ لیکن انہیں بھی تنہائی سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی مجبوراً عہدہ قضا قبول کر لیا اور فوج میں ایسا

سخت انتظام کیا کہ کوئی ۔۔۔ شرع و آئین کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔

غوری نے ہندوستان پر تیسرے حملے کی تیاری کی اور فوج کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کو بھی ہندوستان لیتا گیا اور جب پرتھوی راج سے مقابلہ ہوا تو چوہان کو شکست فاش دیکھنی پڑی۔ دہلی، مسلمانوں کا دارالسلطنت قرار پایا، لیکن بدرالدین نے دہلی سکونت ترک کی۔ عالمِ بالا سے انہیں حکم ملا کہ ہانسی جاؤ اور لوگوں کی گمراہی دور کرو

یہ بحکم ربی ہانسی چلے گئے اور ان کی کئی پشتیں بندگانِ خدا کی خدمت میں مصروف رہیں انہی کی نسل کے حضرت سید مشرف نے ہمایوں کا عہد دیکھا۔ اس خاندان میں منصب قضا موروثی چلا آرہا تھا لیکن سید مشرف نے یہ منصب قبول نہیں کیا۔ رحم دل ہمایوں نے اس خاندان کی عظمت کا خیال کرتے ہوئے جاگیر بخش دی۔ ہمایوں کے بعد اکبر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا تو اپنے مذہبی رجحان کی وجہ سے کئی صوفیوں کی خدمت میں حاضریاں دیں اور اسی سلسلے میں ہانسی بھی آگیا۔ سید مشرف کے گھر پہنچا لیکن یہاں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا۔

بادشاہ کی تشریف آوری کوئی معمولی بات نہ تھی، آبادی کے معزز حضرات ادب و تعظیم بجالائے لیکن سید مشرف کے خاندان کا ایک شخص بادشاہ سے شانِ بے نیازی سے پیش آیا بادشاہ کو یہ بات شاید شاق نہ گزرتی۔ لیکن امرا اور مصاحبینِ خاص نے اس بات کو ہوا دی۔ بادشاہ نے دریافت کیا "یہ کیا یہ لوگ شاہی آداب و رسوم سے واقف نہیں ہیں؟"

کسی چاپلوس نے جواب دیا "جہاں پناہ! ہیں کیوں نہیں، لیکن تصوف اور بزرگی کا ایک خول انہوں نے اپنی شخصیت پر چڑھا رکھا ہے اور حضور کو خود سے بہتر نہیں سمجھتے۔"

بادشاہ نے پوچھا "پھر انہیں اس کی کیا سزا دی جائے؟"

اسی چاپلوس نے مشورہ دیا "حضور والا! یہ سلطنت مغلیہ کے نمک خوار ہیں اور جنت مکانی (ہمایوں) نے انہیں جاگیر بخشی تھی اس ناچیز کی رائے ہے، اگر ان کی جاگیر اور املاک ضبط کرلی جائے تو ان کے دماغ ٹھکانے آجائیں گے۔"

بادشاہ نے حکم دیا "آگے سے بیخ کر یا ۔۔۔ دلایا جائے۔"

اس بات چیت کا سید مشرف کو بھی علم ہوگیا فرمان ہمایونی لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کو دکھا کر فرمان ریزہ ریزہ کرکے ہوا میں اڑا دیا۔ بادشاہ کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا اس نے پوچھا "آپ نے یہ فرمان کیوں چاک کردیا؟ کیا اتنی جاگیر آپ کے خاندان کی کفالت کو ناکافی تھی اگر یہ بات تھی تو آپ کو اس کا ہم سے ذکر کرنا تھا کہ ہم اس میں

کچھ اور اضافہ کر دیتے "

بادشاہ کا خیال تھا کہ سید مشرف کو اُس گفتگو کا علم نہیں ہے جو اس کے اور مصاحبین کے درمیان ہو چکی ہے ۔

سید مشرف نے جواب دیا " بادشاہ کے والد کی عطا کردہ جاگیر ہمارے خاندان کی کفالت کو کافی تھی لیکن یہ بات ہمیں بالکل پسند نہیں کہ بادشاہ جب ہمارے غریب خانے میں تشریف لائیں تو اس کے معاوضے میں ہم سے ادب و تعظیم کی خواہش کریں "

بادشاہ بہت شرمندہ ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا بادشاہ نے بڑی خوشامد کی کہ جاگیر کا فرمان دوبارہ لے لیا جائے ، لیکن یہ تیار نہ ہوئے بادشاہ نادم اور شرمسار آگرے چلا گیا اور سید مشرف کے خاندان نے عسرت اور تنگدستی کی زندگی اختیار کی اور کبھی شاہی مراعات اور نوازشات کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھائی ۔ سید مشرف کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے سید عطا اللہ نے ہانسی کی سکونت ترک کی اور نارنول چلے گئے وہاں حضرت نظام الدین نامی بزرگ بڑی شہرت رکھتے تھے عطاء اللہ ان کی صحبت میں حاضری دینے لگے دونوں حضرات ایک دوسرے کے مراتب سے آگاہ تھے لیکن نظام الدین نارنولوی عطاء اللہ سے کچھ زیادہ مرتبہ رکھتے تھے ۔

یہیں نارنول میں سید عطاء اللہ کی ملاقات راجو خان نامی ترکمان سے ہو گئی یہ شخص ماوراء النہر سے نیا نیا نارنول پہنچا تھا عطاء اللہ سے راجو خان کی اتنی دوستی ہوئی کہ ترکمان کی بیوی عطاء اللہ کو بھائی کہنے لگی اسی دوران عطاء اللہ کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا ۔ یہ اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں مٹھائی لے کر نظام الدین نارنول کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی ۔ " حضرت ! اس نومولود کے حق میں دعائے خیر فرمائیں "

شاہ نظام الدین نے ذرا سی مٹھائی چٹکی سے اٹھا کر زبان پر رکھ لی اور فرمایا " عطاء اللہ میں شادی اور غمی کی چیزیں کبھی نہیں کھاتا ، ہمیشہ پرہیز کرتا ہوں لیکن جس فرزند کی پیدائش تمہارے گھر میں ہوئی ہے یہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے ۔ خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ بہت بلند ہے "

اس کے بعد مٹھائی چباتے ہوئے فرمایا ۔ " میں بھی دعا کرتا ہوں ، تم بھی دعا کرو ، لیکن جو مرتبہ اسے خدا کی طرف سے مل چکا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی "

عطاء اللہ نے بھی شاہ صاحب کی خواہش پر ذرا سی مٹھائی منہ میں رکھ لی ۔

نظام الدین نے پوچھا " اس بچے کا نام کیا رکھو گے ؟"

عطاء اللہ نے جواب دیا " حضرت خود ہی تجویز فرما دیں "

نظام الدین نے کہا: "شاہ نعمت اللہ - یہ اللہ کی نعمت ہے جو تمہارے گھر میں بشکل فرزند وارد ہوئی ہے اس کا نام نعمت اللہ رکھو۔"

چنانچہ اس بچے کا نام نعمت اللہ رکھ دیا گیا - یہ ابھی چند سال ہی کے تھے کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ راجو خان ترکمان کی بیوی نے نعمت اللہ کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے لیا باپ نے قرآن کی تعلیم دینی شروع کر دی اور اس غیر معمولی بچے نے چار سال چار ماہ کی عمر میں قرآن پاک پڑھ ڈالا - اس کے بعد گلستان کا درس شروع ہوا - یہ ابھی پڑھ ہی رہے تھے کہ راجو خان ترکمان نارنول سے جرجرج چلا گیا - چونکہ بچہ راجو خان کی بیوی کی سرپرستی میں تھا اس لیئے بچے کی خاطر عطاء اللہ کو بھی جرجرج جانا پڑا -

جرجرج میں عطاء اللہ ایسے بیمار ہوئے کہ زندگی کی امید جاتی رہی - ایک دن جبکہ راجو خان گھر پر موجود نہ تھا عطاء اللہ کی حالت اتنی غیر ہوئی کہ گھڑی دو گھڑی زندہ رہنے کی امید بھی جاتی رہی - انہوں نے حالت نزع میں راجو خان کی بیوی کو بلایا اور کمزور، تھرتھراتی آواز میں پوچھا "تم مجھے کیا کہتی تھیں؟"

سوگوار خاتون نے افسردگی سے جواب دیا: "بھائی"

عطاء اللہ نے نعمت اللہ کا ہاتھ اس سوگوار خاتون کے ہاتھوں میں دے دیا کہا: "یہ نعمت اللہ تمہارا بھتیجا ہے کیا میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر سفر آخرت اختیار کر سکتا ہوں؟"

خاتون نے جواب دیا "بھائی عطاء اللہ! جب میں نے آپ کو صدق دل سے بھائی کہہ دیا تو آپ کچھ کہیں یا نہ کہیں نعمت اللہ کو میں اپنا بھتیجا ہی سمجھوں گی اور آپ کی موجودگی یا عدم موجودگی میں اپنی اولاد کی طرح رکھوں گی چاہے آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔"

مرنے والے نے اطمینان کی سانس لی اور کچھ دیر ساکت رہ کر پھر زبان کھولی۔

"بہن! ایک بات اور"

منہ بولی بہن ان کی صورت تکنے لگی پوچھا "وہ کیا؟ فرمایئے" عطاء اللہ نے جواب دیا "ایک وصیت ہے اس پر تمہیں پورا پورا عمل کرنا ہے اگر تم نے اس کے پورا کرنے میں کوتاہی یا تامل سے کام لیا تو یہ سمجھ لینا کہ میں قیامت کے دن تمہارا گریبان پکڑ لوں گا۔"

منہ بولی بہن نے گھبرا کر پوچھا "بھائی عطاء اللہ! آپ جو کچھ فرمائیں گے میں اس پر بسر و چشم عمل کروں گی، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

عطاء اللہ نے کہا "جب میں مرجاؤں تو تم میرا منہ سیاہ کر دینا۔ کیونکہ میں سیاہ کار

اس کا مستحق ہوں، منہ سیاہ کر کے میرے پاؤں میں ایک رسی باندھ دینا اور اسی حالت میں چوراہے پر پھنکوا دینا۔ کیونکہ مجھ جیسے برے انسان کا یہی حشر ہونا چاہیئے۔"

ابھی بہن نے جواب میں کچھ کہا بھی نہ تھا کہ عطاء اللہ نے کلمہ شہادت پڑھا اور ملک عدم کی راہ لی۔

بہن سخت کش مکش میں پڑ گئی یہ عبرت ناک وصیت اور اس پر عمل درآمد۔ کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی اور پھر ایک نرم دل خاتون، عورت تو یوں ہی رحم دل ہوتی ہے جب راجو خان ترکمان آگیا تو بیوی نے اسے پوری بات بتادی اور مشورتاً پوچھا "وہ کچھ آپ ہی بتائیں کہ اس وصیت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے؟"

شوہر نے بہت کچھ غور و فکر کے بعد جواب دیا "میری سمجھ میں اس وصیت کو بس ایک ہی طرح پورا کیا جا سکتا ہے"

بیوی نے جلدی سے پوچھا "وہ کس طرح؟ خدا کے لئے جلدی سے بتائیں۔ میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔"

راجو خان نے جواب دیا "عطاء اللہ کو غسل دے کر چہرے پر سیاہ کپڑا لپیٹ دیا جائے اور پاؤں میں ایک چٹ باندھ کر گھری میں تھوڑا کھینچا جائے اس کے بعد چوراہے میں دفن کر دیا جائے۔"

بیوی کا خوشی سے چہرہ کھل گیا۔ اسی وقت شوہر کی تجویز کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔ غسل کے بعد منہ پر سیاہ کپڑا لپیٹا گیا۔ پھر پاؤں میں ایک مضبوط چٹ باندھ کر انہیں ذرا سا کھسکایا گیا۔ اس عمل کے بعد انہیں کفن میں لپیٹ کر بیچ چوراہے پر دفن کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے جب راجو خان ان کے مزار پر چراغ جلانے جاتا تھا تو قبر کی پائنتی رکھا ہوا چراغ خود بخود روشن ہو جایا کرتا تھا۔ راجو خان نے اس راز کو جاننے کی بڑی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

منہ بولی بہن نے نعمت اللہ کو اپنے بچوں کے ساتھ نہایت پیار و محبت سے رکھا اور یہ راجو خان کے بچوں کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ تیرہ برس کی عمر میں اس ترکمان نے انہیں فنِ سپاہ گری میں طاق کر دیا۔ شمشیر بازی، تلوار زنی اور تیر اندازی میں نعمت اللہ کا جواب نہ تھا

ایک دن نعمت اللہ ایک سرکاری عہدے دار دوست محمد خان کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک زمیندار حاضر ہوا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ دوست محمد خان کے ذمے زمینداروں سے مال گزاری وصول کرنے کا کام تھا۔ دوست محمد خان نے زمیندار سے شکایت کی کہ تم مال گزاری نہیں داخل

کر رہے ہے۔ حکومت تمہارے خلاف سخت کاروائی کرنے والی ہے"

زمیندار نے عاجزی سے عرض کیا "جناب! ہمارے ساتھ اپنا آدمی کر دیں۔ ہم مال گزاری کی رقم اس کے حوالے کر دیں گے"

دوست محمد خان نے اپنے عملے کے چند دلیر آدمیوں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں یہ حکم پایا جاتا تھا کہ اس زمیندار کے ساتھ جاؤ اور مال گزاری وصول کر لاؤ۔

لیکن اس کے عملے نے نظریں چرالیں۔ کیونکہ یہ لوگ خوب اچھی طرح واقف تھے کہ زمیندار اپنے علاقے میں لوگوں کو لے جاکر کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے، مار پیٹ کر واپس کر دیتے ہیں۔ نعمت اللہ نے عملے کی بزدلی دیکھ کر عرض کیا "جناب! میرا جی چاہتا ہے ذرا میں بھی سیر و تفریح کر لوں۔ اگر اجازت ہو تو اس زمیندار کے ساتھ میں چلا جاؤں اور مال گزاری کی رقم لے کر واپس آجاؤں"

دوست محمد خان اٹھ کر اندر چلا گیا اور وہاں نعمت اللہ شاہ کو طلب کیا۔ چپکے چپکے سمجھاتا ہوا بولا "میاں صاحبزادے! تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔ کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ زمیندار لوگ سرکاری آدمیوں کو اپنی زمین میں لے جاکر بہت زیادہ خوار اور ذلیل کرتے ہیں۔ تم ابھی نوعمر ہو معلوم نہیں یہ زمیندار تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر اس نے تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچا دیا تو آخر میں تمہیں کہاں سے تلاش کروں گا؟"

نعمت اللہ نے جواب دیا "کیا آپ خدا کی طرف سے انسانی جانوں کے تحفظ کی خدمت لے کر آئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو میں کہیں بھی نہ جاؤں گا یہیں رہوں گا!"

دوست محمد خان نے جواب دیا "صاحبزادے! تم ضرورت سے زیادہ منطقی ہو۔ بھلا ایک فانی انسان دوسرے فانی انسانوں کی جانوں کا تحفظ کس طرح کر سکتا ہے؟

"اگر یہ بات ہے تو مجھے اس شخص کے ساتھ جانے دیجئے جس نے ہمیں جان دی ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا!"

دوست محمد خان اس نوعمر بچے کی بات سے عاجز اور بے بس ہو گیا اور مجبوراً زمیندار کے ساتھ چلے جانے کی اجازت دے دی۔ زمیندار انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنی زمین پر چلا گیا اور اس نے نعمت اللہ کو چارپائی پر بٹھا کر اندر جاتے ہوئے کہا "صاحبزادے! آپ ذرا دم لیں میں ابھی رقم لے کر حاضر کرتا ہوں!"

نعمت اللہ نے تیکھے لہجے میں کہا "جناب والا! میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔ سرکاری واجب الادا رقم وصول کرنے آیا ہوں، آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ ہماری رقم لے کر ہمارے پاس آ جائیں"۔

زمیندار نے کہا "ہم نے تمہاری دعوت کا انتظام کیا ہے پہلے کچھ کھا پی لو۔ اس کے بعد مال گزاری کی رقم بھی تمہارے حوالے کر دی جائے گی"۔

ابھی نعمت اللہ نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ زمیندار اپنی حویلی میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کا طشت لے کر حاضر ہو گیا۔ نعمت اللہ نے پوچھا "رقم لائے ہو؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا "کھانا حاضر ہے، پہلے اسے نوش فرمالیں!"

نعمت اللہ نے غصے میں زمیندار کی پشت پر کئی بیت رسید کر دیئے۔ زمیندار تلملا گیا لیکن اپنی تکلیف کا احساس کئے بغیر اس نے نعمت اللہ سے کہا "بیٹے! تم ہمارے مہمان ہو ہم تمہاری مار بھی برداشت کر لیں گے اور یہی کہے جائیں گے کہ پہلے کچھ نوش فرمالو، اس کے بعد مال گزاری کی رقم دی جائے گی"۔

نعمت اللہ نے سوچا، عجیب ضدی سے واسطہ پڑا ہے۔

بدرجہ مجبوری کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ زخمی زمیندار نے آگے بڑھ کر نعمت اللہ کے ہاتھ دھلائے اور جب یہ کھانا کھانے لگے تو خود سامنے بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگا نعمت اللہ زمیندار کے اخلاق اور رویے سے بے حد متاثر ہوئے، لقمے منہ میں جا رہے تھے دانت انہیں چبانے میں مصروف تھے لیکن نعمت اللہ کے دل اور دماغ کہیں اور ہی تھے وہ سوچ رہے تھے "نعمت اللہ! تو کیسا سرکش بندہ ہے کہ اس نرم دل اور خوش اخلاق زمیندار سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتا۔ ذرا سوچ تو کہ اس کی پشت تیرے تازیانوں کی ضربات سے لہولہان ہو چکی ہے لیکن یہ فرشتہ صفت انسان اس کی پرواہ کئے بغیر پوری رغبت اور پیار سے تجھے کھانا کھلانے میں مشغول ہے۔ کیا یہ دنیا چند روزہ نہیں ہے؟ کیا اس چند روزہ زندگی میں اپنے اس خالق سے بے نیاز اور غافل رہنا جائز ہے جو اس زمیندار سے زیادہ عفو درگزر کرنے والا ہے"۔

کھانے کے بعد نعمت اللہ نے زمیندار سے مال گزاری کی رقم وصول کی اور خاموشی سے دوست محمد خان کے حوالے کر دی۔ دوست محمد خان چپ چپ نوجوان سے پوچھا۔

"نعمت اللہ تم چپ کیوں ہو؟ زمیندار نے تمہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟

نعمت اللہ نے جواب دیا "ہاں اس نے مجھے جس قسم کا اضطراب بخشا ہے اس کا بیان میرے بس کی بات نہیں اس نے مجھ سے میری دنیا چھین لی۔ دوست محمد خان! وہ زمیندار نہیں، تازیانہ عبرت تھا جو میرے غافل اور لاپرواہ دل و دماغ پر شدید ضرب لگا کر ہٹ گیا۔"

دوست محمد خان اس نوجوان کی باتیں نہیں سمجھ سکا۔

انکار اور تردد میں ڈوبا ہوا یہ نوجوان جب رات کو اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا تو اس کا یہ عالم تھا کہ دل پر مایوسی اور مادی دنیا کی بے وقعتی کے گھونسے لگ رہے تھے اور وہ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا بالکل اس طرح چل رہا تھا گویا کوئی شرابی نشے میں دھت بستر پر جا رہا ہو۔ لڑکھڑاتا، گرتا پڑتا ہوش و حواس سے محروم، گم صم بستر پر اوندھے منہ گر کر وہ دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر، جب آنسوؤں کے ذریعے دل کا بوجھ کسی حد تک بہہ گیا۔ تو یہ منفعل نوجوان اٹھا اپنی تلوار، کٹار، ترکش، کمان جسم پر سجائے اور چند اشرفیاں پاس رکھ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے تھوڑی دیر عبادت کی۔ پھر فجر کی نماز ادا کی۔ دریا کے دوسرے کنارے، مشرق سے سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا، چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور نرم اور ملائم صبح کی لذت سے نعمت اللہ کا دل معمور ہو رہا تھا اسی عالم میں راجو خان کا ایک ملازم نمودار ہوا۔ یہ انہیں دیکھتے ہی ان کے پاس بھاگ کر پہنچا اور رو رو کر کہنے لگا "جناب والا۔ آپ کا کیا ہے۔ آپ تو چپ چاپ یہاں تشریف لے آئے، مجھ سے تو پوچھئے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے، چاروں طرف آپ کی تلاش جاری ہے! راجو خان نے ہمیں حکم دیا ہے کہ میں کہیں سے آپ کو تلاش کر کے اس کی خدمت میں حاضر کر دوں۔ براہ کرم آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔"

انہوں نے مایوسی سے جواب دیا "میں جس دنیا کو لات مار چکا ہوں اس میں دوبارہ کس طرح واپس جا سکتا ہوں۔ یہ کام نہ تو مجھے پسند ہے اور نہ ہی میرا خدا پسند کرے گا۔"

ملازم نے جواب دیا "اگر آپ میرے ساتھ واپس نہیں چلیں گے تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہو لوں۔"

"یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"بالکل اسی طرح، جس طرح آپ نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور اس ویرانے میں نکل آئے۔"

آپ کچھ دیر خاموشی سے سوچتے رہے، پھر کہا "اچھا پھر ایسا کرو کہ مجھے دو اشرفیاں

دے دو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ واپس چلتا ہوں۔"

ملازم نے بے بسی سے کہا "اس وقت تو میرے پاس چاندی تک کا سکہ نہیں دو اشرفیاں کہاں سے لاؤں گا"

آپ نے پوچھا "کہیں سے بھی تو دو اشرفیوں کا انتظام کرسکتا ہے؟"

ملازم نے جواب دیا "بالکل کرسکتا ہوں آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔ میں وہیں دو اشرفیاں فراہم کردوں گا۔"

آپ نے مسکرا کر بے نیازی سے جواب دیا "پہلے گھر سے دو اشرفیاں لے آ، اس کے بعد مجھے واپس لے چلنا۔ اشرفیوں کے بغیر تو میں ایک قدم بھی گھر کی طرف نہ اٹھاؤں گا"

ملازم نے کہا "اچھا آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ابھی واپس آتا ہوں"

وہ اشرفیاں لینے گھر گیا۔ اور یہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے ایک جگہ انہوں نے خربوزے والے کے گرد چند آدمی بیٹھے دیکھے انہوں نے اپنے پاس کی رقم خربوزے والے کی حوالے اور اس سے کہا "ان سب کو پیٹ بھر کے خربوزے کھلائیے"

خربوزے والے کو اشرفیاں ملی تھیں۔ اس نے نہایت خوشی سے ان سب کو خربوزے کھلائے پھر آپ نے ان لوگوں سے پوچھا "تم میں سے کون ہے جسے ہتھیاروں کا شوق ہو"

کئی آدمیوں نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ ہمیں ہتھیاروں کا بے حد شوق ہے۔

آپ نے اپنے ہتھیار ان کے حوالے کردیئے اور وہاں سے حیدرآباد دکن چلے گئے وہاں حضرت شیخ محمدؒ کا بڑا شہرہ تھا نعمت اللہ نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور مریدی کا شرف حاصل کیا۔

حضرت شیخ محمدؒ نے ان سے ایک عجیب سوال کیا، پوچھا "میاں صاحبزادے! کیا تم نے ظاہری علوم حاصل کرلیے؟"

آپ نے سچ سچ عرض کردیا کہ "نہیں" "لیکن ابھی پوری طرح نہیں کہہ پائے تھے کہ پیر نے کہا۔ "بعض کمال کے لوگ ہیں علوم ظاہری تو حاصل کئے نہیں اور راہ طلب میں نکل کھڑے ہوئے بھلا ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ علم کے بغیر کبھی بھی کوئی چیز ہاتھ لگی ہے۔ یہاں تک کہ خدا بھی نہیں۔ بے علم نتواں خدا را شناخت!"

نعمت اللہ شرم سے پانی پانی ہو گئے بولے "بہتر ہے حضور والا! میں بعد فراغت تعلیم دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت میں اس قابل ضرور

ہو چکا ہوں گا کہ آپ مجھ پر عنایت کرسکیں "

اس کے بعد نعمت اللہ نے دولت آباد کا رخ کیا۔ جہاں جبریل نامی ایک مشہور عالم رہتا تھا فلسفہ و حکمت کا پیکر، فکر و دانش کا مجسمہ۔ جہاں بڑے بڑے لائق و فائق لوگ علم کی تشنگی بجھانے آیا کرتے تھے جبریل نے نعمت اللہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور شرح ملا جامی سے تدریس شروع کی۔ ہونہار اور ذہین شاگرد بہت جلد فلسفہ اور منطق میں کہیں سے کہیں نکل گیا جبریل کی دل پر شاگرد کی خداداد ذہانت کا سکہ بیٹھ گیا یہاں تک کہ استاد اپنے شاگرد کو استاد کہہ کر مخاطب کرنے لگا جبریل نے ایک دن اپنی خوشی کا یوں اظہار کیا کہ پہلے تو شاگرد کی گشت تھتھپائی پھر کہا۔ "اخوند (استاد)! خدا کی قسم میرا یہ جی چاہتا ہے کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے اسے لقمہ بنا کر تمہارے اندر منتقل کر دوں"

اور ہوا بھی ایسا ہی، غالباً یہ بات استاد خود نہیں کہہ رہا تھا، خدا کہلا رہا تھا۔ کیونکہ ——— — اس کے بعد استاد کے سکھانے پڑھانے کیلئے کچھ بھی نہ رہ گیا تھا شاگرد استاد سے کچھ زیادہ ہی جان گیا تھا۔

جبریل کی بیوی اور نوجوان لڑکی، دونوں ایران میں تھے اس ہونہار شاگرد کے لئے استاد کے دل میں اتنی جگہ پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے شاگرد ہی سے کر دینا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ شاگرد تمام علوم حاصل کر چکا تھا اور اب رخصت ہونے والا تھا اور بیٹی پاس نہ تھی۔ استاد بہر حال استاد تھا اس نے اس مشکل کا حل بھی نکال لیا۔ ایک دن نعمت اللہ سے کہا "نعمت! تم میرے شاگرد ہو اور میں استاد، تم اپنے استاد کے مرتبے سے بخوبی واقف ہو گئے؟"

نعمت اللہ نے سعادت مندانہ عرض کیا "خوب اچھی طرح، کوئی خدمت میرے لائق ہو تو اس کا حکم فرما دیں"

جبریل نے کہا "میری بیوی ایران میں ہے اس کے ساتھ میری بیٹی بھی ہے میں تمہیں اس کا پتہ دیتا ہوں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے آؤ"

نعمت اللہ نے پتہ لیا اور ایران چلے گئے اور چند ماہ کے بعد دونوں کو واپس لے کر واپس آ گئے اسی دوران دولت آباد کے صوبے دار کا نائب انتقال کر گیا۔ اسے اس خالی جگہ کے لئے کسی لائق شخص کی ضرورت تھی۔ اس نے جبریل سے مشورہ کیا تو استاد نے نعمت اللہ کا

نام پیش کر دیا۔ صوبے دار نے کہا " نعمت اللہؒ کو ساتھ لے کر کل آجائیے "

جبرئیل نے وعدہ کر لیا۔ لیکن جب اس کا ذکر نعمت اللہؒ کے سامنے آیا تو انہیں رنج پہنچا۔ ان کا دل پہلے ہی دنیا سے بیزار تھا۔ وہ دنیاداری میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اسی رات رختِ سفر باندھ دیا اور رات کی تاریکی میں حیدر آباد روانہ ہو گئے پیر کی خدمت میں حاضری دی۔ پیر نے اس پڑھے لکھے مرید پر خصوصی توجہ دی اور ذکر اشغال میں کامل کر کے فیروز پور جانے کا حکم دیا۔

جب یہ فیروز پور جا رہے تھے تو پیر نے انہیں ذرا دیر روک کر پوچھا " کیا تم روحانیت میں کامل ہو چکے ہو ؟ "

نعمت اللہ نے جواب دیا " آپ کی موجودگی میں یہ ناچیز اتنا بڑا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے "

پیر اس جواب سے بہت خوش ہوئے کہا " آفرین، تم خود کو کبھی بھی کامل نہ سمجھنا بلکہ یہ سمجھو کہ تمہیں میری طرف سے کاسۂ گدائی عطا کیا گیا ہے، اس میں جہاں کہیں سے بھی اچھی باتیں ملیں، ڈال لینا، خود کو غنی نہ سمجھنا، ہمیشہ تشنگی برقرار رکھنا "

نعمت اللہ فیروز پور پہنچے اور سولہ برس اس کے نواح کے جنگلات میں عبادت و ریاضت کرتے رہے، جذب کا عالم طاری ہوا تو لباس تک کا ہوش نہ رہا۔ سولہ برس تک کپڑے یوں بھی ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ جسم پر لباس نام کا ایک تار تک باقی نہ رہا اور یہ سردی، گرمی اور برسات سے بے نیاز برہنہ جسم لئے ریاضت میں مشغول رہے۔ آخر کے چار برس تو ایسے گزرے کہ جنگل سے قریب ریگستان میں چلے جاتے، سر پر پتوں کی ٹوپی رکھتے اور نچلے نصف جسم کو ریت میں دھنسا دیتے اور تیمم کر کے نماز ادا کرتے، یہ وہ زمانہ تھا جب وہ عالم جذب سے گزر کر سلوک کی منزل میں داخل ہو رہے تھے اس کے بعد آبادی میں جانے کا خیال آیا، جنگل سے باہر نکلے، ایک شخص کو بلا کر ستر پوشی کے لئے کپڑے مانگے، اس نے پھٹا پرانا لباس دیا اور ساتھ ہی سوئی دھاگا بھی دیا کہ خود ہی ٹھیک کر کے پہن لو۔ یہ ان چیتھڑوں میں فیروز پور آبادی میں داخل ہوئے۔ یہاں کچھ دن رہ کر اکبر آباد چلے گئے اکبر آباد سے حیدر آباد گئے اور پیر کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوئے۔ کچھ دن رہ کر خلندیش چلے گئے۔ یہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے کہ ایک کچے مکان سے لڑکیوں کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ لڑکیاں چکی پیس رہی تھیں

اور گیت گا رہی تھیں ان کا گیت نعمت اللہ کو بہت اچھا لگا۔ یہ کھڑے ہو کر سننے لگے پھر اچانک خیال آیا کہ اس طرح کھڑا دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔ یہ آگے بڑھنے کے لیئے قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ اندر سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے انہیں نظر بھر کے دیکھا اور عرض کیا "شاہ صاحب! کہاں سے آنا ہوا؟ تشریف رکھیئے کچھ کھانے پینے کیلئے حاضر کروں؟"

نعمت اللہ نے جواب دیا "لڑکی! ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں جہاں ٹھہر گئے وہی ہمارا ٹھکانا ہو گیا ہم پیاسے ہیں کیا تو ہمیں پانی پلا سکتی ہے؟"

لڑکی بھاگی بھاگی اندر گئی اور واپس آ کر بصد ادب آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا۔ آپ نے پانی پی کر دعا دی "لڑکی! تو خوش رہے خدا تجھے صاحب اولاد کرے"

لڑکی شرما گئی کیونکہ ابھی وہ کنواری تھی۔ شاہ صاحب نے فرمایا "شرما مت۔ خدا تجھے صاحب اولاد بھی کرے گا اور صاحب ثروت بھی"

لڑکی نے انہیں بہت بہت روکنا چاہا لیکن یہ پھر حیدر آباد بیر کی خدمت میں واپس گئے اور کچھ دن رہ کر گجرات چلے گئے، گجرات کے شاہ عالم نامی بزرگ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے حجرے میں ان کے قیام کا بندوبست کیا۔ شیخ شاہ عالم کا لڑکا شیخ جلال ان کا اتنا معتقد ہوا کہ انہی سے طریقہ سلوک کی تربیت حاصل کی۔ شاہ نعمت اللہ گجرات میں ایک عرصے تک مقیم رہے یہاں تک کہ شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔ نعمت اللہ نے شیخ جلال کی محبت اور سکون اور طمانیت کی خاطر گجرات ہی میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ انہی دنوں مغل فرماں روا جہانگیر گجرات پہنچا اور شیخ جلال نے بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ بادشاہ نے پوچھا "کیا شاہ نعمت اللہ واقعی کوئی بڑے مرتبے کے بزرگ ہیں؟"

شیخ جلال کے ساتھ ہی کئی دوسرے مقربین خاص نے بھی یہی جواب دیا "شاہ نعمت اللہ ولی ہیں اور آج ان کے پائے کا بزرگ دور دور نہ ملے گا"

سطوت شاہی تمکنت سے گویا ہوئی "انہیں ہمارے حضور پیش کیا جائے"

شاہ نعمت اللہ کو بادشاہ کی یہ ادا پسند نہ آئی سرد مہری سے جواب دیا "ہم دونوں کی حیثیتوں میں بعد القطبین ہے پھر ہم ایک دوسرے سے کس طرح مل سکتے ہیں"

جب یہ جواب جہانگیر تک پہنچایا گیا تو وہ بہت جز بز ہوا۔ شاہ صاحب کے روحانی مرتبے سے ڈرتا بھی تھا اور کسی نہ کسی طرح ملاقات بھی کرنا چاہتا تھا اس نے مجبوراً یہ منصوبہ بنایا

حضرت شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے پہنچے اور وہیں شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کر لے۔ شاہ صاحب بھی بادشاہ کی منشا سے آگاہ ہو گئے بادشاہ جیسے ہی وہاں پہنچا شاہ نعمت اللہ دوسرے دروازے سے نکل گئے بادشاہ کو شاہ صاحب سے ملاقات ——— نہ ہو سکنے کا بہت ملال ہوا۔ وہ کئی دن تک ملاقات نہ ہو سکنے کے ملال سے افسردہ رہا آخر اپنے درباری امیر خان جہاں سے کہا " خان بابا! ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کریں۔ اس سلسلے میں ہماری دونوں کوششیں ناکامی کی نذر ہو گئیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے "۔

خان جہاں نے گردن جھکا کر ہاتھ باندھ لیئے، آہستہ سے جواب دیا " جہاں پناہ ملول نہ ہوں یہ ناچیز اسی وقت شاہ صاحب کے پاس جاتا ہے اور انہیں کسی بھی طرح بادشاہ سلامت کی ملاقات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے "

خان جہاں شاہ نعمت اللہ کی خدمت میں مؤدبانہ باریاب ہوا اور ادھر اُدھر کی بات چیت کے بعد بادشاہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ بولا " بادشاہ کی دین داری اور فقرا نوازی کا جواب نہیں اور خصوصی طور پر جہاں پناہ آپ کی ذات سے تو کچھ غیر معمولی لگاؤ رکھتے ہیں اور ان کی حسن عقیدت کا یہ حال ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کی حاضری کی قید بھی اڑا دی وہ فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب ہمیں جب بھی چاہیں اپنے غلاموں کی طرح طلب فرمالیں۔ بادشاہ کے اس اشتیاق کو دیکھ کر ناچیز کے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ دونوں کی ملاقات کا اہتمام اور انصرام یہ گنہگار خود اپنے ہاتھوں کرا سکتا ہے اگر اسے اس حقیر کی درخواست سمجھ کر قبول فرمایا جائے تو یہ عین مرید نوازی ہوگی "

شاہ صاحب نہایت انہماک سے خان جہاں کی تقریر سنتے رہے جب موصوف نے ذرا دم لیا تو آپ نے زبان کھولی۔ فرمایا " خان جہاں! ہم تم سے ایک سوال کریں گے اس کے جواب پر اس ملاقات کا انحصار ہے "

خان جہاں نے خوش ہو کر دریافت کیا " بندے کو جھوٹ بولنے کی تو عادت ہی نہیں، جھوٹ سے نفرت ہے "

آپ نے پوچھا " خان جہاں! یہ بتاؤ صحبت اثر کرتی ہے یا نہیں؟
خان جہاں نے جواب دیا " صحبت کا اثر امر مسلمہ ہے "
آپ نے کہا " پھر یہ بتاؤ کہ کہاں ایک بادشاہ اور کہاں ایک فقیر بے نوا۔ اگر اس

کی صحبت نے مجھ پر اثر کیا تو میری گدڑی چھن جائے گی اور اگر میری صحبت نے بادشاہ کو زیر اثر لے لیا تو امور سلطنت میں خرابی پھیلے گی، اور رعیت تباہ و برباد ہو جائے گی اب ایمانداری سے یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کی ملاقات ایک دوسرے کے لئے کتنی مضر اور تکلیف دہ ثابت ہو گی "

خان جہاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ خاموشی اختیار کی۔ کچھ دیر بعد فکر مند لہجے میں سوال کیا "حضرت! یہ تو فرمائیں کہ یہ عاجز بادشاہ کو کیا جواب دے؟"

آپ نے جواب دیا "تم میرے وکیل ہو میری طرف سے بادشاہ سے عرض کر دو کہ وہ مجھے خواہ مخواہ تکلیف نہ دیں، ہم دونوں کی حیثیت دو متوازی لکیروں جیسی ہے جو کبھی بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے "

ایک بار جہانگیر نے اپنے علماء کو حکم دیا کہ قرآن پاک کا ایک ایسا ترجمہ کیا جائے کہ جتنے حرف قرآن پاک میں ہیں اتنی ہی ترجمے میں بھی ہوں۔

علماء کی ایک جماعت سر جوڑ کر بیٹھی اور بدقّت تمام ڈھائی پاروں کا ترجمہ شاہی فرمان کے التزام سے مکمل کیا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے اپنی عاجزی کا اظہار کیا آخر میں دبے لفظوں بادشاہ سے یہ بھی کہا کہ "اگر شاہ نعمت اللہ چاہیں تو یہ کام پورا کر سکتے ہیں "

بادشاہ کے دل میں شاہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکنے کا کانٹا پہلے چبھ چکا تھا مایوسی سے کہا۔ "شاہ صاحب ہم سے ملنا تو گوارا کرتے نہیں، ہمارے کہنے سے ترجمہ کیا کریں گے "

علماء میں سے کسی نے کہا "مقربان شاہی میں سیّد جلال الدّین حضرت شاہ صاحب کے مرید ہیں اور ان کا بے حد خیال کرتے ہیں اگر سیّد جلال ان سے کہیں تو یہ کام ضرور پورا ہو جائے گا "

بادشاہ نے سیّد جلال کو حکماً لکھا کہ یہ کام شاہ نعمت اللہ سے کسی بھی طرح کرایا جائے۔

سید جلال اُداس اور افسردہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اس نئی افتاد کا ذکر کیا۔ شاہ صاحب تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر بولے "اچھا اگر کام پر تمہاری ملازمت شاہی کا انحصار ہے تو میں یہ کام کر دوں گا لیکن تم بادشاہ سے یہ پوچھ لو کہ قرآن میں جہاں جہاں قصّے بیان ہوئے ہیں کیا ان کے نوٹ اور حاشیے کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

جہانگیر نے جواب میں کہلا دیا کہ صرف ترجمہ کیا جائے حواشی کی کوئی ضرورت نہیں اور اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے کہ اصل عبارت اور ترجمے کی عبارت کے حروف برابر ہوں۔

حضرت شاہ صاحب نے اجازت پاتے ہی ترجمے کا کام شروع کر دیا اور دو ماہ میں یہ کام

پایۂ تکمیل کو پہنچا - بادشاہ کے حکم پر علمائے وقت نے حروف شماری کی تو دونوں برابر نکلے ۔
جہانگیر اس کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اشتیاق ملاقات میں اور اضافہ ہو گیا اس ترجمے کا نام ترجمہ جہانگیری رکھا گیا - جب جہانگیر کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آئی تو اس نے غصے میں سید جلال کو ملازمت سے سبکدوش کر کے جاگیر ضبط کر لی اور انہیں یہ حکم دیا کہ " اگر تم شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کرا دو تو تمہیں تمہارے منصب پر پھر بحال کر دیا جائے گا اور جاگیر دوبارہ بخش دی جائے گی "
سید جلال روتے ہوئے گھر پہنچے اور شاہ صاحب کو پوری بپتا سنا دی - آپ نے مکدر ہو کر فرمایا -
" اچھا تم زیادہ ملال نہ کرو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری ملاقات کے بغیر بادشاہ کی عنایت تم پر نہ ہو گی تو تم اس کی ذرا بھی فکر نہ کرو، میں کچھ کر دوں گا - سر دست تم بہت زیادہ تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو - شاید دھوپ میں آنے سے تم کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے ہو تھوڑی دیر آرام کر لو "
اس کے بعد آپ نے ایک خدمت گار کو حکم دیا " جب جلال لیٹ جائے تو تم پنکھا جھلنا "
سید جلال لیٹ گئے اور خدمتگار پنکھا جھلنے لگا - یہاں تک کہ سید جلال پر غنودگی طاری ہوئی اور سو گئے شاہ صاحب نے اٹھ کر قلمدان سنبھالا اور سید جلال کے نام ایک خط لکھا -
" سید جلال! میں تمہاری مشکلات کا غوث الثقلین (دونوں جہان میں مددگار) ہوں تم مطمئن رہو تمہارے تمام کام حسب خواہش ہو جائیں گے مجھ کو ہمیشہ اپنا معین و مددگار سمجھو - اب ہم تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتے ہیں حشر میں ملاقات ہو گی، اس سے پہلے نہیں - فقیر نعمت اللہ "
شاہ صاحب نے یہ رقعہ قلمدان میں رکھا اور سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے -
سید جلال کی ملازمت پھر بحال ہو گئی اور جاگیر کی واگزاشت کا شاہی فرمان بھی جاری ہو گیا انہیں شاہ صاحب کی جدائی کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ کچھ عرصے تک انہیں ادھر ادھر تلاش کرتے رہے اور جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو شاہ صاحب کا رقعہ پڑھنے بیٹھ گئے اور دیر تک روتے رہے
شاہ صاحب گھومتے پھرتے پھر اس گاؤں میں پہنچے جہاں مدتوں پہلے ایک پنہاری نوجوان لڑکی نے انہیں پانی پلا کر دعائیں حاصل کی تھیں - اب وہاں کچے مکان کی جگہ عالیشان محل کھڑا تھا کسی عورت نے شاہ صاحب کو پہچان لیا اور اس لڑکی کو شاہ صاحب کی تشریف آوری سے مطلع کیا - اب وہ لڑکی عورت بن چکی تھی - وہ بدحواس بھاگتی ہوئی شاہ صاحب کے قدموں میں جا گری - اس کے پیروں میں جوتی تک نہ تھی لیکن جسم پر نہایت قیمتی لباس تھا عورت نے رو کر کہا " حضرت! ہمارے غریب خانے پر چلیں میرا شوہر شکار پر گیا ہوا ہے واپسی پر وہ بھی قدم بوسی

کی سعادت حاصل کرے گا۔

آپ نے ہنس کر فرمایا، "نادان لڑکی! بس تجھے دیکھ لیا، دل شاد کیا، اب فقیر زیادہ دیر نہیں ٹھہرے گا"۔

اس عورت نے آپ کے پیر پکڑ لیے۔ بولی "حضور! مجھے جو کچھ بھی ملا ہے آپ کی دعاؤں سے ملا ہے اگر ساتھ نہیں چلتے تو یہاں اتنی دیر تو ٹھہریئے کہ میں گھر ہو کر واپس آجاؤں"۔

آپ نے جواب دیا "ہاں اتنی دیر البتہ ٹھہر سکتے ہیں"۔

عورت بھاگ کر گھر گئی اور وہاں سے سو اشرفیوں کی تھیلی اور اپنے لڑکے کو گود میں لے کر واپس آئی اور لڑکے اور تھیلی کو آپ کے قدموں میں ڈال کر کہنے لگی "حضور! اگر قیام نہیں فرماتے تو اس بچے کے سر پر دست شفقت فرما کر دعا سے سرفراز فرمائیں اور اشرفیوں کی تھیلی حقیر نذرانہ سمجھ کر قبول فرمالیں"

آپ نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور اشرفیوں کی تھیلی بچے کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں نے تیری اشرفیاں قبول کیں اور اب انہیں میں اپنی طرف سے تیرے بچے کی نذر کرتا ہوں؟"

عورت مچل گئی کہ "نہیں ایسا نہیں ہو گا یہ رقم تو آپ کو قبول ہی کرنا پڑے گی"۔

آپ نے عورت کے اصرار پر تھیلی سے ایک اشرفی لے لی اور بقیہ اشرفیاں وہاں کے تکیہ دار کے حوالے کر دیں۔

یہاں سے رخصت ہو کر ایک جنگل سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے شیر آتا دکھائی دیا۔ آپ رک گئے اور شیر سے فرمایا "اے یار عزیز! اگر مشیت خدا یہ ہے کہ تو مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے تو آگے بڑھ اور خدا کی مشیت پوری کر۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میری راہ چھوڑ دے اور اپنی راہ لے"۔

شیر گویا بالکل اس طرح جیسے اپنی عاجزی کا اظہار کر رہا ہو اور جست لگا کر ایک طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے جب تھک گئے اور گرمی نے بہت پریشان کیا تو ایک درخت کے نیچے قیام کیا اور مراقبے میں چلے گئے اسی عالم میں ایک سیاہ سانپ آپ کے پنجوں پر سر رکھ کر سو گیا آپ نے سانپ پر نظر ڈالی اور مراقبے میں دوبارہ چلے گئے۔ سانپ نے کچھ دیر آرام کیا اور اپنی راہ لی۔

آپ چند دنوں کے لئے فیروز پور میں، قیام فرما رہے اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہو گئے ان دنوں ٹانڈے میں دو صاحب کشف بزرگ رہتے تھے ایک تو میر سید احمد اور دوسرے شاہ کرم اللہ شاہ کرم اللہ اپنے مریدوں میں بیٹھے وعظ و تلقین میں مشغول تھے کہ اچانک جھرجھری لی اور

خلاف معمول اٹھ کھڑے ہوئے۔ مریدوں نے دریافت کیا "حضرت! کوئی خاص بات ہے کوئی خاص واقعہ؟"

کرم اللہ شاہ نے کہا "ایک ایسی ذات ہمارے پاس آرہی ہے جو صاحب ولایت ہے اور جس کے سامنے ہم دونوں (میر سید احمد اور کرم اللہ) متغیر ہو جائیں گے"

کسی مرید نے پوچھا "یہ کب تک یہاں آجائیں گے؟"

شاہ کرم اللہ نے جواب دیا "بہت جلد، عنقریب، دو دن کے اندر ہی"

دو دن ابھی گزرے بھی نہ تھے کہ شاہ کرم اللہ اپنے مریدوں کے ساتھ گنگا کے کنارے پہنچ گئے۔ بولے "وہ صاحب بس آنے ہی والے ہیں"

مریدوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور حیرت سے پوچھا "حضرت! وہ بزرگ کہاں ہیں اور کدھر سے آرہے ہیں؟"

شاہ کرم اللہ نے دریائے گنگا کی موجیں چیر کر آتی ہوئی ایک کشتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس کشتی میں، جو سامنے سے آرہی ہے وہ صاحب تشریف لا رہے ہیں، اور ہم سب یہاں ان کے استقبال کو جمع ہوئے ہیں"

جب کشتی کنارے آگئی تو شاہ کرم اللہ آگے بڑھے اور شاہ نعمت اللہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نہایت اعزاز اور تکریم سے اپنی خانقاہ میں لے گئے آپ نے شاہ کرم اللہ سے پوچھا "میر سید احمد کہاں رہیں؟"

شاہ کرم اللہ نے جواب دیا "مالتی پور میں"

آپ نے کہا "میں ان سے ملنا چاہتا ہوں"

شاہ کرم اللہ انہیں لے کر مالتی پور پہنچ گئے۔ میر سید احمد پہلے ہی سے دروازے پر کھڑے ان کے منتظر تھے دیکھتے ہی دوڑ کر آگے بڑھے اور شاہ نعمت اللہ سے بغل گیر ہو گئے شاہ صاحب چند دن ان کے ساتھ رہے، پھر ایک دن جب واپسی کی اجازت چاہی تو سید احمد اُداس ہو گئے اور فرمایا "نعمت اللہ میرا وقت قریب ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ میری نماز جنازہ پڑھا کر واپس جائیں"

آپ نے جواب دیا "سید احمد آپ بے فکر رہیں فقیر نماز جنازہ کے وقت دوبارہ حاضر ہو جائے گا"

اس کے بعد آپ واپس آ گئے اور کہیں اور تشریف لے گئے اسی دوران سید کا انتقال ہو گیا اور انتقال سے پہلے یہ وصیت کر دی کہ میری میت اس وقت تک نہ اٹھے جب تک شاہ نعمت اللہ جنازے کی نماز نہ پڑھ دیں۔

لوگوں نے سید احمد کو غسل دیا اور کفن پہنا کے باہر رکھ دیا اور شاہ نعمت اللہ کا انتظار کرنے لگے اسی وقت ایک طرف سے شاہ نعمت اللہ نمودار ہوئے اور ان کی نماز جنازہ پڑھا کے واپس چلے گئے۔

اسلام خان چشتی صوبے دار جہانگیر نگر (ڈھاکا) نے آپ کے نام بیس گاؤں کا اوقاف کرنا چاہا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔

بنگالے کے ہفت ہزاری نواب خان خاناں اور پنج ہزاری خان اعظم مہابت خان آپ کے بہت معتقد تھے مہابت خان بنگال کا صوبے دار تھا۔ بادشاہ نے اسے اکبر آباد بلالیا اور اس کی جگہ مہابت خان کے بیٹے خانہ زاد خان کو بنگالے کا صوبے دار مقرر کیا۔ مہابت خان نے رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب سے کہا "حضرت! یہ گناہگار اکبر آباد جا رہا ہے اس کی جگہ آپ کا غلام فائز ہو رہا ہے عاجز کی دلی خواہش ہے کہ حضرت اس پر نظر عنایت رکھیں"

آپ نے جواب دیا "میں اسے ایک ماہ پہلے خطرات سے مطلع کر دیا کروں گا ماننا نہ ماننا اس کا اپنا اختیاری فعل ہوگا"

شاہ صاحب نے خانہ زاد خان کے ساتھ ہی سکونت اختیار کی۔ اس صحبت نے اس کی طبیعت ہی بدل کر رکھ دی۔

ایک دن خانہ زاد خان کی ڈیوڑھی پر ایک مکار درویش آیا اور اس نے اندر اطلاع کرائی کہ "صوبے دار سے کہو فیروز پور سے فقیر نعمت آیا ہے!"

اس فقیر نے کہیں سے یہ سن رکھا تھا کہ صوبے دار کو شاہ نعمت اللہ سے بڑی عقیدت ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب صوبے دار بنگالے کے ساتھ ہی تشریف فرما ہیں۔

خانہ زاد خان درویش کی عیاری پر لال بھبوکا ہو گیا اور سپاہیوں کو یہ حکم دینا چاہا کہ مکار درویش کی اچھی طرح مرمت کر کے رخصت کر دو، تاکہ کہیں اور دھوکے بازی کا مرتکب نہ ہو

لیکن حضرت شاہ صاحب نے صوبے دار کو اس حکم کے اجرا سے منع کر دیا۔ فرمایا "بابا! یہ اخلاق محمدی سے بعید ہے خدا جانے بے چارہ کہاں سے اور کس ضرورت سے آیا ہے اور

تمہاری نسبت اچھا حسن ظن رکھ کر یہ حرکت کی ہے اس فقیر کی خواہش ہے کہ تم اس سے بدسلوکی نہ کرو، غریب اگر جھوٹ بول کر اپنا پیٹ پالنا چاہتا ہے تو تمہارا کیا نقصان ہے اس کو اندر بلواؤ اور سلوک کر کے رخصت کردو "

خانہ زاد خان نے درویش کو اندر بلوایا جب وہ سامنے آیا تو شاہ نعمت اللہؒ تعظیماً کھڑے ہو گئے صوبے دار نے بھی آپ کی اتباع کی اور دست بستہ کھڑا ہو گیا اور پوچھا "حضور کی تعریف"

عیار درویش نے جواب دیا "فقیر کو نعمت اللہ کہتے ہیں"

صوبے دار نے ہاتھوں کو بوسہ دے کر دریافت کیا "حضور کا کیسے آنا ہوا ؟"

درویش نے جواب دیا "فقیر نے فیروز پور میں خانقاہ بنوائی ہے اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا"

صوبے دار نے دو سو اشرفیاں درویش کے حوالے کیں اور عزت و احترام سے رخصت کر دیا۔

ایک دن آپ نے خلاف معمول خانہ زاد خان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا، جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

من در ہوایت اے گل خنداں چو عندلیب ؎ اے تو بہ بہار تماشائے دیگراں

اس شعر پر صوبے دار کے کان کھڑے ہوئے اور اسی وقت متصدیوں (منشیوں) کو حکم دیا کہ یہ شعر لکھ لو، اب ہمارا یہاں قیام ناممکن ہے شاید آج ہی کل میں بادشاہ سلامت ہمیں طلب فرمانے والے ہیں

اور بالکل ایسا ہی ہوا، ایک ماہ کے اندر ہی بادشاہ کا فرمان پہنچا جس میں خانہ زاد خان کو اکبر آباد کی حاضری کا فوری حکم دیا گیا تھا۔

یہ عجیب غریب بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اتنے تفصیلی حالات مل جانے کے باوجود ان کے سن وفات اور مزار کا صحیح پتہ نہیں چلتا ان کے پیر و مرشد نے انہیں فیروز پور روانہ کیا تھا ہو سکتا ہے ان کا وصال فیروز پور ہی میں ہوا ہو، واللہ اعلم بالصواب



حضرت حاجی امداد حسین مہاجر مکیؒ

سہارنپور کے قصبے نانوتہ میں ۲ جنوری ۱۸۱۷ء میں ایک بچہ پیدا ہوا باپ نے اس کا نام امداد حسین رکھ دیا۔ ابھی یہ سات سال کے تھے کہ ماں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ نزع کے وقت ماں نے اپنی دوسری اولادوں کے مقابلے میں امداد حسین کو زیادہ اہمیت دی انہوں نے خاندان کے ذمہ دار حضرات کو آبدیدہ نظروں سے دیکھا اور نحیف اور غمزدہ آواز میں وصیت کی "لوگو! میں جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لئے۔ مرنے سے پہلے ایک وصیت کرنا چاہتی ہوں، کیا آپ لوگ میرے بعد اس پر عمل پیرا رہنے کا وعدہ فرمائیں گے؟"

ایک بزرگ عورت روتی ہوئی جاں بہ لب مریضہ کے پاس پہنچی اور وعدہ کیا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری وصیت پر حرف بحرف عمل کیا جائے گا اپنی وصیت سے مجھے آگاہ کردو۔"

مریضہ نے اپنے بیٹے امداد حسین کا ہاتھ اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا اور سوگوار لہجے میں کہا "میرے اس بچے کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔ اس کی غلطیوں اور خطاؤں کو نظر انداز کیا جاتا رہے۔ اسے مار تو مار جھڑکیوں تک سے بچایا جائے۔"

بزرگ عورت نے امداد حسین کو اپنے سینے سے لگالیا اور روتے ہوئے وعدہ کیا "تمہاری وصیت پر پوری طرح عمل کیا جائے گا بہن! تم بے فکر رہو، کس کی مجال ہے کہ تمہارے امداد حسین کو ترچھی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کرے۔"

ماں کا انتقال ہوگیا اور بیٹا اس نازونعم سے پرورش پانے لگا کہ زندگی کے ہر معاملے میں اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ کچھ بھی کرے کوئی اسے ٹوک نہ سکتا تھا یہاں تک کہ بہت سے ایسے کام جن کا اختیار کرنا یا انجام دینا ضروری ہوتا، کوئی زبان تک لاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ بچے کی دل جوئی کے شدید احساس اور پاسِ خاطر کے بے

پناہ خیال نے لوگوں میں ایک طرح کی بے نیازی پیدا کردی اور امداد حسین کو لوگوں کی عدم توجہی اور تغافل کا شکار ہو جانا پڑا۔ لوگوں نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اس میں یہ امکان موجود تھا کہ کہیں کسی جگہ جبر سے کام لینا نہ پڑ جائے جس سے امداد حسین کی دل آزاری ہو اور ان کی معصوم روح کرب میں مبتلا ہو جائے۔ انہیں خود ہی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا اور مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔ سن شعور میں پہنچ کے دہلی گئے اور مولانا نصیر الدین دہلوی کے حلقۂ درس میں بیٹھ گئے مولانا کا تعلق سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے رہ چکا تھا اور یہ اپنی ذات میں بہت ساری خوبیاں رکھتے تھے عالم دین، صوفی اور لائق سیاست دان۔ یہ اپنے طلبہ کو وہی درس دیا کرتے تھے جو تقریباً ایک سو سال پہلے شاہ ولی اللہ دہلویؒ پوری قوم کو دے چکے تھے اور ۱۸۳۱ء تک سید احمد شہیدؒ دیتے رہے تھے۔

نوجوان امداد حسین گہری نیند سوئے ہوئے تھے صبح قریب تھی۔ کاروانِ شب کے آخری مسافر رخصت ہونے کو تھے اس وقت امداد حسین رسول مقبولؐ کے دربار میں حاضر تھے رسول مقبولؐ کے آس پاس ان کے اصحاب موجود تھے امداد حسین پر اتنا رعب طاری تھا کہ پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے گردن جھک گئی اور آنکھوں میں تاب نظارہ باقی نہ رہی۔ اسی عالم میں کسی نے امداد حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور حکم دیا "یہاں کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو، ہوش میں آ"۔

یہ آواز کسی آشنا کی تھی، گردن اُوپر جو اٹھائی تو دیکھا دادا سامنے کھڑے ہیں امداد حسین نے گڑگڑا کے سوال کیا "دادا جان! اس وقت میں اپنے آپ میں نہیں ہوں اور میری ہمت جواب دے گئی ہے"

"تو میرا ہاتھ پکڑ"! دادا نے کہا "میرے ساتھ چل، میں تجھے رسول اللہؐ کے پاس لیے چلتا ہوں، ان سے تیری ملاقات کراتا ہوں، پریشان نہ ہونا"۔

دادا جان نے امداد حسین کی انگلی پکڑی اور رسول اللہؐ کے روبرو پہنچا دیا۔ دادا جان نے امداد حسین کا ہاتھ رسول اللہؐ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "حضور! اسے میں آپ کے حوالے کرتا ہوں آپ جیسا بھی مناسب سمجھیں اس کے لیے....."

رسول اللہؐ نے امداد حسین کا ہاتھ ایک دوسرے شخص کے حوالے کر دیا اور فرمایا "یہ امداد حسین ہے اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے"

امداد حسین نے ان بزرگ کو غور سے دیکھا اور ان کی شکل و صورت حافظے میں محفوظ کرلی۔ جب بیدار ہوئے تو ان پر عجیب حیرت و انتشار کی کیفیت طاری تھی لاکھ حافظے پر زور دے کر پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچانے نہ جاتے۔ اسی حیرت و انتشار میں کچھ دن گزر گئے۔

امداد حسین نے مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصہ مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی سے پڑھا تھا اس پریشانی اور انتشار میں ان کی ملاقات اپنے اُستاد محدث جلال آبادی سے ہوگئی۔ اُستاد نے پریشان اور کھوئے کھوئے چہرے کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ "امداد حسین! تم پریشان کیوں ہو؟ وجہ؟"

امداد حسین نے آبدیدہ نظروں سے استاد کو دیکھا اور رقت زدہ لہجے میں اپنا خواب بیان کر دیا۔ بولے "جب سے یہ خواب دیکھا ہے میں ان بزرگ کی تلاش میں ہوں جن کے ہاتھ میں رسول اللہؐ نے میرا ہاتھ دیا تھا۔"

محدث جلال آبادی مسکرا دیئے، بولے "تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

امداد حسین نے آزردگی سے جواب دیا "جب تک ان بزرگ سے میری ملاقات نہیں ہو جاتی۔ میں خود کو ناقص و نامکمل محسوس کرتا رہوں گا اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کرتا رہوں گا۔"

استاد نے کہا "موضع لوہاری یہاں سے قریب ہی واقع ہے وہاں چلے جاؤ لوہاری میں کسی سے بھی میاں جی نور محمد کا پتہ معلوم کر لینا جا کر ان سے مل لو۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ تمہاری پریشانی اور انتشار کا حتمی علاج کر دیں گے۔"

امداد حسین نے اُستاد کو متشکرانہ نظروں سے دیکھا اور اسی وقت پا پیادہ لوہاری روانہ ہوگئے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے ان کے پیروں میں آبلے پڑ گئے وہ پھوٹنے لگے اور ان سے پانی جاری ہوگیا۔ لوہاری پہنچ کر لوگوں سے میاں جی نور محمد کا پتہ پوچھا تو انہوں نے امداد حسین کو اس مشہور بزرگ کے آستانے پر پہنچا دیا۔ آستانے میں داخل ہوتے ہی کسی نے میاں جی نور محمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ ہیں حضرت میاں جی نور محمد مدظلہ۔"

امداد حسین نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں رسول اللہؐ نے جن کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیا تھا۔ ذرا آگے بڑھے اور انہیں پُر شوق نظروں سے دیکھنے لگے پھر خود رفتگی سے آگے بڑھے اور میاں جی نور محمد کے قدموں میں گر گئے میاں جی نے انہیں قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پوچھا "کیا تمہیں اپنے خواب پر یقین کامل

اور اعتبار و اثق ہے ؟

امداد حسین نے جواب دیا "حضرت! ایک ایسا خواب جس میں رسول مقبولؐ موجود ہوں شک و شبے سے بالا ہوتا ہے میں اپنے خواب پر شک کس طرح کر سکتا ہوں؟ اس کی صداقت پر مجھے پہلے بھی یقین تھا اب بھی یقین ہے "

میاں جی نور محمد نے پوچھا "رسول اللہؐ نے تمہارا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دیا تھا؟"

"آپ کے ہاتھ میں ؟ امداد حسین نے جواب دیا "پہلے خواب کی صداقت پر یقین تو تھا ہی لیکن آپ نے جس طرح میرے خواب کا ذکر کیا ہے اس سے مجھے خود آپ کی ذات بابرکات میں فیوض و کمالات کا بھی یقین ہو گیا ہے ورنہ ایک ایسا خواب جس کا آپ کو کوئی علم نہیں ہونا چاہیئے آپ اس سے واقف ہیں اور میرے بتائے بغیر آپ بتا رہے ہیں - یہ ایک ایسی کرامت ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے "

میاں جی نے کہا "اچھا تم میرے پاس ہی رہو - میں رسول اللہؐ کا ادنیٰ غلام ہوں میں تمہاری مادّی اور روحانی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں "

امداد حسین میاں جی کے ساتھ رہنے لگے اور ایک مدت بعد خرقۂ خلافت حاصل کر لیا اس موقع پر میاں جی نے پوچھا "اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

امداد حسین نے جواب دیا "وہی جو خدا پسند کرتا ہے "

میاں جی نے کہا "جواب واضح ہونا چاہیئے - تسخیر کے طالب ہو یا کیمیا چاہتے ہو؟ جو چاہو طلب کرو ، تمہیں بخش دیا جائے گا "

امداد حسین رونے لگے کہا "میں نے دنیا کے لئے آپ کا دامن نہیں پکڑ رکھا ہے میں خدا کو چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے عظیم خدمات لے، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیض یاب ہو، فائدہ اٹھائے "

میاں جی نے انہیں سینے سے لگا لیا - بولے "میں تمہاری علو ہمتی کی داد دیتا ہوں، جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور خدا تمہیں مایوس نہیں کرے گا جو چاہتے ہو وہی ملے گا "

امداد حسین یہاں سے رخصت ہو کر گھر پہنچے تو اللہ اللہ کرنے لگے - ایک رات پھر خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ انہیں یاد فرما رہے ہیں امداد حسین نے پوچھا "اب اس ناچیز کے لئے کیا حکم ہے ؟"

رسول اللہؐ نے فرمایا "تم ہمارے پاس کیوں نہیں آتے ؟ ہمیں تمہارا انتظار ہے "

جب یہ جاگے تو فوراً سفر کی تیاری کر دی اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے وہاں ان کی ملاقات مولانا شاہ محمد اسحٰق سے ہو گئی یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادے حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے انہوں نے شاہ ولی اللہ کی تحریک چلانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور پورے برصغیر میں ایک ہلچل مچا دی تھی لیکن اپنوں اور غیروں کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں نے انہیں ناکام بنا دیا تھا اسی جدوجہد میں سید احمد شہید ہو گئے تھے شاہ محمد اسحٰق تحریک کی ناکامی کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ وہ یہیں سے برصغیر کی قیادت فرما رہے تھے۔

انہوں نے نوجوان امداد حسین سے دریافت کیا "تمہارا نام کیا ہے؟"

جواب ملا "امداد حسین!"

شاہ اسحٰق نے کہا "نہیں آج سے تم امداد حسین نہیں رہے، امداد اللہ کہلاؤ گے"

انہوں نے جواب دیا "بسر و چشم، مجھے منظور ہے"

شاہ اسحٰق کی صحبت نے تو ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ انہیں یہاں سے جو تعلیمات ملیں وہ نہایت عجیب و غریب اور منفرد تھیں۔

شاہ اسحٰق نے دریافت کیا "برصغیر کی کیا حالت ہے؟"

امداد اللہ نے جواب دیا "بہت بری حالت ہے مغل بادشاہ کی برائے نام حکومت ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام تاجر آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ اب گلی کوچوں اور بازاروں میں شاہی منادیوں آواز لگاتا ہے "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا"۔ فسق و فجور عام ہے ہر طرف بے عملی کا دور دورہ ہے کفار چاق و چوبند ہیں اور مسلمان تغافل اور تفاخر میں مبتلا ہیں"

شاہ اسحٰق نے کہا "تم ہندوستان واپس جاؤ گے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک آگے بڑھاؤ گے"

امداد اللہ نے پوچھا "شاہ ولی اللہ کی تحریک کا نصب العین کیا ہے اور وہ ہندوستان میں کیسا انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے؟"

شاہ اسحٰق نے جواب دیا "ہم تمہیں شاہ صاحب کی تحریک کے نصب العین سے اچھی طرح باخبر کر دیں گے اور یہ تحریک کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے ان تدابیر پر بھی روشنی ڈالیں گے"

امداد اللہ شاہ اسحٰق کے پاس رہنے لگے۔ انہیں یہ خیال بھی ستاتا رہتا تھا کہ رسول اللہ

انہیں طلب فرمایا ہے اور وہاں حاضری دینا ضروری ہے لیکن انہوں نے سوچا کہ پہلے شاہ صاحب کی تحریک اور اس کا نصب العین سمجھ لیا جائے کیونکہ اس تحریک بھی رسول اللہؐ کی منشا اور غایت ہی سے ہوگا۔



شاہ اسحٰق نے ہندوستان کی بربادی اور تباہی کے دو سبب بتلاتے ہوئے کہا۔

"شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی زبوں حالی کے دو بنیادی سبب معلوم کر لیے تھے پہلا سبب یہ ہے کہ ملک میں خاص خاص طبقے اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے کسی خاص امتیاز کی بنا پر مراعاتِ حقوق کے مستحق قرار پائیں۔ یہ لوگ قاری، عالم، شاعر اور وہ سجادہ نشین درویش ہوتے ہیں جو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے پاتے ہیں ان کا مطمعِ نظر ملک اور قوم کی خدمت کرنا نہیں محض دریوزہ گری ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھیک کے نئے نئے ڈھنگ نکالتے ہیں مختلف حیلے بہانوں سے بادشاہ اور امرا سے رقمیں وصول کرنا اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے ان مہذب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے تو دوسرا نازل ہو جاتا ہے یہ لوگ ملکی باشندوں کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک اور قوم پر بارِ گراں بنتے جا رہے ہیں۔

خرابی اور بربادی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری محصول لگائے گئے ہیں اور ان کی وصولیابی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جبر و تشدد اور بھوک اور افلاس میں مبتلا وفادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے اس بغاوت کو دبانے کے لیے غیر معمولی فوجی طاقت کی ضرورت پڑتی ہے اور اس غیر معمولی فوجی قوت کے مصارف بھی رعایا ہی سے جبر و تشدد سے حاصل کئے جاتے ہیں مہذب دریوزہ گروں کی پرورش اور فوجی قوت کے غیر معمولی مصارف نے ملک اور قوم کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے"

امداد اللہ نے ملکی اور قومی تباہی اور بربادی کا یہ دل نشین اور پُر اثر تجزیہ سُنا تو جذباتی ہو گئے، پوچھا۔ "پھر ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کن باتوں پر منحصر ہے؟"

شاہ اسحٰق نے جواب دیا۔ "ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں محصول کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدر ضرورت صرف کیا جائے اور حالات ایسے پیدا کئے جائیں

کہ اندرونی بغاوت کا سامنا کرنا پڑے۔

یہ اتنا بڑا انکشاف تھا کہ اس کے بوجھ نے امداد اللہ کو گم صم کردیا اور وہ اس مختصر تقریر پر گھنٹوں غور کرتے رہے۔ اس وقت پورا ہندوستان اس کے سامنے تھا۔ پورا ہندوستان اور اس کا گھن لگا معاشرہ اپنے طبقات کے ساتھ ایک ایک کرکے ان کے عرصہ خیال سے گزرنے لگا امرا، شعرا، دنیادار سجادہ نشین، خانقاہوں کے مجاور، خود غرض اور زمانہ ساز علماء، یہ سب گدھوں کی طرح ملک اور قوم کے نیم جان جسم سے چمٹے ہوئے نوچنے کھانے میں مصروف دکھائی دیے۔ ملک اور قوم کا نیم جان جسم کاشتکاروں، دستکاروں، تاجروں اور مزدوروں کا تھا امداد اللہ نے سوچا کہ وہ تو ایک ایسی سمت میں جانے والے تھے جہاں دنیا اور اہل دنیا کی نفی ہو جاتی تھی لیکن خدا انہیں دنیا والوں کی طرف لے جا رہا تھا پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنے پیرومرشد حضرت میاں جی نور محمد سے طلب بھی تو یہی چیزیں کی تھیں۔ انہوں نے حضرت میاں جی سے کہا تھا میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے کوئی عظیم کام لے ایسی عظیم خدمات، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیضیاب ہو، فائدہ اٹھائے انہوں نے خیال کیا کہ ان کی خواہش پوری کی جا چکی ہے اور خدا ان سے جس نوع کی خدمات لینا چاہتا ہے وہ وہی ہیں جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو گی اور جن سے خدا کی مخلوق عظیم فائدے اٹھائے گی۔

اب ان کا شاہ اسحٰق کی صحبت میں رہنے اور ان کی تقریریں سننے میں اتنا جی لگنے لگا کہ ہر وقت یہی جی چاہتا ہے کہ شاہ اسحٰق بولتے رہیں اور وہ سنتے رہیں۔

ایک دن شاہ اسحٰق نے کہا "کیا تم واقف ہو کہ رسول اللہؐ اس دنیا میں کیوں تشریف لائے تھے؟"

امداد اللہ نے جواب دیا "واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو غرض و غایت آپ بتائیں گے وہ زیادہ حقیقی اور اعلا و ارفع ہوں گی اس لیئے بہتر یہی ہے کہ آپ میرے جواب کے بجائے خود ہی اس سوال کا مفصل اور مشرح جواب عنایت فرمادیں"

شاہ اسحٰق نے جواب دیا "رسول اللہؐ کی تشریف آوری کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ دنیا عیش و عشرت میں بری طرح مبتلا تھی اور شاہانہ تکلفات کا مرض اقتصادی توازن کو دیمک کی طرح چاٹ چکا تھا ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القا کیا کہ وہ اس کا ایسا علاج کریں کہ مرض بھی ختم ہو جائے اور اس کا زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے چنانچہ

آپ نے ان اسباب و وجوہ پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پاتے تھے پھر آپ نے ان کا علاج کیا اور ایک صالح گروہ پیدا کر دیا۔

امداد اللہ نے بے بسی سے کہا "حضرت! آپ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں معیشت اور اقتصادیات پیش پیش ہیں آپ روحانیات کا ذکر بھی تو فرمائیں"۔

شاہ اسحٰق نے جواب دیا "تباہ حال معیشت اور بری اقتصادی حالت جسم اور روح دونوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اس لیئے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کسی حال میں اور کسی وقت بھی"۔

اس دن شاہ اسحٰق نے انہیں جو تعلیم دی اور تعابیر کے ذریعے جو کچھ بتایا وہ شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے لیا گیا تھا۔ شاہ اسحٰق نے شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"ارباب حکومت کا ٹھاٹھ اور تفاخر (ایک کا دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا مرض) معاشرے کا مزاج بگاڑ دیتا ہے اس کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگتا ہے زمیندار اور جاگیر دار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگتے ہیں اور جنھیں غریب مزدوروں اور دست کاروں پر اختیار ہوتا ہے وہ ان کے استیصال میں لگ جاتے ہیں اور بالآخر ماتحت طبقے اتنے گر جاتے ہیں کہ ان کی زندگی اور معیار زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں اور گھوڑوں کے مانند ہو جاتی ہے زر کشی اور زر اندوزی کے نئے نئے قانون بننے لگتے ہیں انسان کی پیدائش کا حقیقی مقصد انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ حد سے بڑھی ہوئی عیش اور دولت کی ہوس میں مبتلا ہو کر عقل و فکر کی چمک سے محروم ہو جاتا ہے اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں رہتا ہے کہ فکر فردا نام کی کوئی شے اس کے سامنے باقی نہیں رہتی اور اس صورتحال کا لازمی یہ نکلتا ہے کہ ملک اور قوم کی تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور ان چند افراد کا سربراہ بادشاہ ہوتا ہے"۔

امداد اللہ حیرت زدہ اور مبہوت پلک جھپکائے بغیر شاہ اسحٰق کی تقریر سنتے رہے یہ عجیب و غریب علم تھا عجیب انکشافات تھے۔ ان کے دل و دماغ پر افکار کا بوجھ کسی پہاڑ کی طرح گر رہا تھا اور وہ خود کو اس میں دبا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ شاہ اسحٰق کی تقریر جاری

تھی وہ کہہ رہے تھے " اقتصادی عدم توازن اور طبقہ اعلا کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا ۔ یہ طبقہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ ہے جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا ہے اور مختلف طریقوں سے رقمیں وصول کرتا رہتا ہے ان میں خانقاہ نشین اور شعرا بھی شامل ہیں ۔ بھانڈ اور مسخرے بھی انہی میں شمار کئے جا سکتے ہیں فنون لطیفہ کے لوگ بھی انہی میں شامل ہیں فنون لطیفہ اور ادب اور شاعری کے لوگ بادشاہ کو ہمیشہ یہ باور کراتے رہتے ہیں کہ شان خسروانہ کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ بادشاہ ان کی سرپرستی کرتے رہیں ۔"

امداد اللہ نے سہم کر دریافت کیا " حضرت! اور کچھ؟"

شاہ اسحٰق نے کہا " ایسے تمام لوگ جنہیں لازمۂ تمدن مانا جاتا ہے درحقیقت مفت خورے ہیں اپنے فن یا خوش گپیوں سے بادشاہ کو خوش کرنا کوئی مقصد نہیں یہ مٹھی بھر لوگ مزدوروں اور کسانوں پر بار بن گئے ہیں اور اس طرح خدا کی بیشتر مخلوق روز بروز افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر مادی اور روحانی فلاح و بہبود سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور پورے ملک میں تمہیں ایک انسان بھی ایسا نہ ملے گا جسے عاقبت کی فکر ہو امداد اللہ! ذرا اس قوم کا تصور تو کرو جس کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ داری کا بھوت سوار ہو چکا ہو ۔ اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپایوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہو گی جسے دن رات پیٹ کی فکر رہتی ہو اور یہ جہنم ہے کہ بھرنے کا نام ہی نہ لے ۔"

اسی طرح شاہ اسحٰق انہیں ہر روز تعلیم دیتے رہے اور امداد اللہ اسے ذہن و طبیعت میں محفوظ کرتے رہے ۔ جب وہ ان امراضِ مزمنہ کے پیش نظر تحریک اور اس کی کامیابی پر غور کرتے تو دل الجھ جاتا ۔ کام بہت بڑا تھا اور اسے کامیابی سے چلانا نہایت غیر معمولی کام تھا کیونکہ اتنے بہت سارے امراض کا علاج کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا، قوم اور ملک کے جسم میں جو امراض موجود تھے ۔ ان میں بہت تو ایسے تھے جو دو مرضوں یا کئی مرضوں کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوئے تھے اور ان میں ایک مرض کا علاج دوسرے کیلئے زہر تھا ان پیچیدہ امراض کے علاج میں وہی مشکل درپیش تھی جو ایک معالج کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ مالیخولیا اور بخار میں مبتلا کسی مریض کا علاج کرتا ہے

اگر معالج بخار کے فساد سے بچنے کے لئے ترک غذا کا حکم دیتا ہے تو ترک غذا سے مالیخولیا میں شدت پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح مالیخولیا کو زائل کرنے کے لئے اگر مریض کو اچھی اچھی غذائیں کھلانے کا مشورہ دیتا ہے تو بخار سے نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہ اسحٰق کی صحبت اور تقریروں نے امداد اللہ کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی وہ جلد از جلد مدینہ منورہ جانے کے لئے بے چین تھے راستے مخدوش تھے اور راہ میں لُٹ جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ امداد اللہ نے خوف و خطر کو دل سے دور کیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ مدینے میں رسول اللہؐ کے آستانے پر حاضری دی اور جو ذمہ داریاں اور فرائض انہیں سونپے جا رہے تھے اُن سے عہدہ برآ ہونے کی دُعا مانگی۔

اس کے بعد آپ ہندوستان واپس گئے۔ اب ان کے زیر مطالعہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ تھی جس میں وہی تعلیمات بالتفصیل موجود تھیں جو شاہ اسحٰق تقاریر کی شکل میں دے چکے تھے اس کتاب میں فک کل نظام، کی دعوت دی گئی تھی فک کل نظام کا مطلب تھا۔ ہمہ گیر انقلاب۔ سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب اور اس انقلاب کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ فوجی طاقت سے برپا کیا جائے آپ نے جس جگہ قیام کیا تھا وہاں حسن علی شاہ نامی ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے امداد اللہؒ دیکھتے ہی انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور دوسری جگہ چلے گئے امداد اللہ کو یہاں یکسوئی سے بیٹھ کر ایک عظیم الشان منصوبہ بنانا تھا امداد اللہ کی تیز نظریں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ معاشرتی اور سیاسی زندگی کا ہر شعبہ اتنا داغدار تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں کہاں پھایا رکھا جائے امداد اللہ جس جگہ قیام فرماتے تھے ——— حضرت میاں جی نور محمدؒ ملاقات کو پہنچے اور مل کر بہت خوش ہوئے۔ پڑوس میں ایک ایسا خاندان بھی رہتا تھا جو اس جگہ کی ملکیت کا دعویدار تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ یہ جگہ حکومت اسے دے دے۔ میاں جی نور محمدؒ کی بزرگی کا بڑا شہرہ تھا وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی یہ حضرت! آپ خدا سے دُعا کریں کہ یہ جگہ سرکار میرے نام کر دے۔ آپ مستجاب الدّعوات ہیں خدا آپ کی دُعا رد نہیں کرے گا۔

میاں جی نے فرمایا "ہم ایک شرط پر دُعا کرنے کو تیار ہیں"

اس شخص نے کہا "ارشاد میں ہر ممکنہ شرط پوری کرنے کو تیار ہوں"

میاں جی نے کہا "ہمارے امداد کو بیٹھنے کی تکلیف ہے اگر تم بعد قبضہ اس جگہ ایک سہ دری بنوانے کا وعدہ کرو تو ہم تمہارے حق میں دعا کر دیں گے اور اس سہ دری میں امداد اللہ رہیں گے۔"

اس شخص نے وعدہ کر لیا "مجھے منظور ہے آپ دعا فرمائیں۔"

میاں جی نے جاتے جاتے کہا "ہم دعا کرتے ہیں، تم سہ دری کی تعمیر کا بندوبست کرو۔"

کچھ عرصے بعد یہ شخص میاں جی کے پاس پہنچا اور انہیں حکومت کا وہ پروانہ دکھایا جس میں سرسری طور پر یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حکومت نے اس کے حق ملکیت تسلیم کر لیا ہے اس شخص نے خوش ہو کر کہا "یہ سب کچھ آپ کی دعا سے ہوا ہے۔"

میاں جی نے پوچھا "لیکن تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟"

اس شخص نے ذرا منہ بنا کے جواب دیا "جی ہاں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن ایک مشکل پیش آ گئی ہے جس نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے۔"

میاں جی نے پوچھا "کیسی مشکل؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

اس شخص نے جواب دیا "حضرت آپ سے کیا چھپانا، بات دراصل یہ ہے کہ میری مالی حالت کچھ اچھی نہیں ہے اس وقت میں نے آپ سے سہ دری بنانے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب جو اپنی مالی حالت پر غور کرتا ہوں تو خود کو اس کا اہل نہیں پاتا۔"

میاں جی نے بے نیازی سے پوچھا "پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

جواب ملا "میں جزوی وعدہ پورا کر دوں گا یعنی پوری سہ دری کی جگہ نصف تعمیر کرا دوں گا۔"

میاں جی نے لاپروائی سے کہا۔ "اچھا آدھی ہی سہی، جیسی تمہاری مرضی۔"

یہ شخص واپس گیا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ حاضر ہوا، اب اس کے ہاتھ میں حکومت کا ایک اور کاغذ تھا اس نے یہ کاغذ میاں جی کی طرف بڑھا دیا۔ بولا "حضرت غضب ہو گیا، ستم ہو گیا، ذرا اسے ملاحظہ تو فرمایئے۔"

میاں جی نے یہ کاغذ لے لیا اور پڑھنے لگے اس میں حکومت نے اس شخص کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا تھا کہ حکومت نے اس زمین کے مالک کے بارے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تم زندہ رہو گے اس زمین کے مالک رہو گے لیکن مرنے کے بعد اس کا حق ملکیت حکومت کو واپس

چلا جائے گا وہ جسے مناسب سمجھے گی دے دے گی۔"

میاں جی نے پوچھا۔ "تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

اس شخص نے تقریباً روتے ہوئے کہا "حضرت! آدمی جو محنت و مشقت کر کے جائداد بناتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کی اولادیں یا متعلقین اس سے محروم رہیں آپ کو میرے معاملے میں ایک بار اور دعا کرنا پڑے گی۔"

میاں جی جواب دیا "ہم دعا کیا خاک کریں، تو نے تو خود ہی آدھا کر دیا تھا۔ اب یہ شکایت کس بات کی؟

اس شخص کی سمجھ میں معاملہ آگیا بولا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ پوری سہ دری بنا دوں گا، میں قول سے پھر جانے پر نادم ہوں۔"

میاں جی نے کہا "اچھا اب واپس جاؤ اور امداد اللہ کے لئے سہ دری بنوانے کی تیاری کرو۔"

چند دنوں بعد اس شخص کو حکومت کی طرف سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ زمین کی ملکیت موروثی قرار پائی۔ اس نے خوش ہو کے امداد اللہ کے لئے سہ دری تعمیر کرا دی۔



امداد اللہ نے اپنے حصے کی جائداد بھی بھائیوں کو دے دی اور خود عسرت اور تنگ دستی میں گزر کرنے لگے آنے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ان میں نہایت پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے ان پڑھے لکھے لوگوں سے ایک ایسی فہرست تیار ہونے لگی جو ہمہ گیر انقلاب میں ان کے ساتھی بننے والے تھے۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی محمد ضامن اور مولانا رشید احمد گنگوہی سرفہرست تھے ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے موضوع پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں اور ایک شاندار فوجی انقلاب لانے کی تدابیر زیر بحث آتیں۔ آنے والوں میں ایک میر عبدالغنی بھی تھے ان کی آمد و رفت اچانک موقوف ہو گئی۔ امداد اللہ نے کسی سے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے کئی دن سے میر عبدالغنی نظر نہیں آئے۔"

کسی نے جواب دیا "حضرت ان کا نہایت حسین و جمیل لڑکا انتقال کر گیا ہے اس صدمے نے انہیں پاگل کر دیا ہے وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں مخبوط الحواس ہو گئے

ہیں۔ آئیں تو کیونکر آئیں "

آپ نے کہا۔" بھئی انہیں ایک بار ہمارے پاس تو لاؤ، ہم انہیں درست کر دیں گے "

جواب ملا" کوشش کریں گے۔ اگر آگئے تو آگئے ورنہ زبردستی لانا بہت مشکل ہے "

" بہر حال لانے کی کوشش کرو "

انتظار میں کئی دن گزر گئے اور میر عبد الغنی کو نہیں لایا جا سکا۔ ایک دن راہ میں امداد اللہ کی ان سے ملاقات ہو گئی آپ نے مجذوب الحواس میر عبد الغنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ارشاد فرمایا :" عشق بر مردہ نباشد پائیدار "

میر عبد الغنی نے جھرجھری لی اور ہوش میں آگئے۔ بے اختیار سینے سے لگ کر رونے لگے۔

اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ ان کا یہی کام رہ گیا تھا کہ وہ سماجی اور سیاسی احوال کا جائزہ لیتے رہیں۔ اسی دوران شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف نے کچھ اور انکشافات کئے، ایسے انکشافات جن سے دل و دماغ لرز جائیں اور جن کی صداقت ابدی تھی۔ شاہ ولی اللہ اپنی کتاب میں یہ اصرار کر رہے تھے :" زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے لیکن ظاہری نظام کے لحاظ سے مملکت ہے باشندگان ملک کی حیثیت کسی مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے مسافروں جیسی ہے۔

سارے انسان برابر ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ خود کو دوسرے انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔

ملک کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے سربراہ وقف کے متولی کی طرح اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ ملک کے عام باشندے کی طرح زندگی گزار سکے "

شاہ ولی اللہ کی اس کتاب میں اقتصادی اصول بھی موجود تھے یہ بھی اپنی نوعیت اور تعریف کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب تھے ان میں وہ حقائق بیان کئے گئے تھے جو عام فہم تھے اور قبل از وقت تھے جن کے رواج کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے انسانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا جاتا اور جو مستقبل کی قسمت تھے۔ مزدور اور کاشت کار جن کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا ان کے لئے شاہ ولی اللہ نے یہ لکھا تھا۔

" دولت کی اصل بنیاد محنت ہے مزدور اور کاشت کار قوت کاسبہ ہیں جب تک

کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔

مزدور اور کاشتکار اور وہ لوگ جو ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں، ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لئے خطرہ ہے اور اس کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری محصول لگائے قوم کا دشمن ہے اس کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت نہ ادا کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم آتی ہے۔

کام کے اوقات محدود کیے جائیں اور مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیئے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں محصور کر دے، ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ آدمی شادی کر سکے اور بچوں کو تعلیم و تربیت دے سکے، بلا لحاظ مذہب و نسل ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

وہ شلا: نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کی وجہ سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو رہا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے تاکہ عوام کی مصیبت ختم ہو جائے اور ان کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع ملے۔

فوجی تیاریوں کو جہاد کا نام دیا گیا اور طے یہ پایا کہ پہلے مُغل فرماں روا کو حمایت و تائید میں لیا جائے اس کے بعد ملک کی سب سے بڑی قوت انگریز کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اور انہیں ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ ایک فوجی تنظیم قائم کی گئی اور اس تنظیم کا امیر امداد اللہ کو بنا دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن اور مولانا محمد منیر کو فوج، حفاظت، عدل و قانون وغیرہ کے شعبے دیے گئے بعد میں طے پایا کہ مغل تاجدار کو بھی اس تنظیم میں شامل کر لیا جائے۔ بادشاہ کے منہ چڑھے نواب

شبیر علی مراد آبادی کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ اس انقلابی تنظیم کے اغراض و مقاصد سے بادشاہ کو اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ انگریز بھی اس تنظیم سے غافل نہیں تھے اسی دوران رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی کے بھائی عبدالرحیم سہارنپور ہاتھی خریدنے تشریف لے گئے۔ سہارنپور کے انگریز مجسٹریٹ (اسپکی) نے انہیں گرفتار کر لیا اور پھانسی پر لٹکا دیا۔

جنرل بخت خان دہلی میں فوجوں کی قیادت کر رہے تھے اور جنرل بخت خان کی نگرانی مولانا سردار علی کر رہے تھے یہ مولانا بھی اسی تنظیم کے آدمی تھے اسی دوران امداد اللہ بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی پہنچ گئے انہوں نے جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اسے اپنے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا بادشاہ میں اتنا دم ہی نہ تھا کہ وہ ان کی مخالفت کرتا۔ ایک طرف تو وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا دوسری طرف وہ امداد اللہ کی تنظیم کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ بادشاہ میں قوت فیصلہ تھی ہی نہیں۔ جو سامنے آتا وہ اسی کے ساتھ ہو جاتا۔ اس کمزور دل اور مرغ باد نما کی طرح سمتیں بدلنے والے بادشاہ کی تائید سے اس انقلابی تنظیم کو یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی کہ دہلی میں صالح نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی ہے علمائے کرام نے اپنی طرف سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا اور امیر تنظیم امداد اللہ پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ بھی فتوے کی توثیق کر دیں اس مقصد کے لیے ایک مجلس بیٹھی اور معاملات مذکورہ پر بحث آئے اس جلسہ کا ایجنڈا تھا" اعلان جہاد"

اجلاس شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام (جہاد) کا فیصلہ کیا صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی نے مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے شیخ محمد کو مخاطب کرتے ہوئے ادب سے عرض کیا "حضرت! کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین (انگریزوں) پر جہاد کو فرض بلکہ جائز تک نہیں قرار دیتے ہیں؟"

مولانا محمد محدث نے جواب دیا "اس لئے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد موجود نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سرو سامان ہیں"

مولانا قاسم نانوتوی نے کہا "کیا ہمارے پاس اتنا سامان بھی موجود نہیں جتنا کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا"

مولانا محمد محدث نے کہا "اگر آپ کی تمام حجتیں اور دلیلیں مان لی جائیں تو سب سے بڑی

شرط جہاد نصب امام کی ہے وہ شخص کہاں ہے جسے امام بنا کر، اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟

مولانا قاسم، امداد اللہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "نصب امام میں کتنی دیر لگتی ہے مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ ہم میں موجود ہیں انہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے"۔

شریک مجلس اور جنگی امور کے نگراں مولانا ضامن نے کہا "مولانا بس سمجھئے بات سمجھ میں آگئی"۔

اس کے بعد مجلس کے سبھی حضرات، امداد اللہ کی طرف بڑھے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے اس کے بعد سرفروشوں کا قافلہ شاملی (مظفر نگر) کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں کا راجا پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ حاجی امداد اللہ تو امام تھے اور مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار۔ مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی۔ مولانا منیر اور حافظ ضامن میمنہ اور میسرہ کے افسر تھے ان لوگوں کے آس پاس لوگ جمع ہونے لگے اور بہت جلد اتنی طاقت ہو گئی کہ تھانہ بھون کے آس پاس سے انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے اور ان حضرات نے یہاں کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ اسی دوران میں انھیں خبر ملی کہ انگریزی توپ خانہ حرکت میں آچکا ہے انگریزی توپ خانہ جدید اسلحہ سے لیس تھا اس کے برعکس ان حضرات کے پاس تلواریں تھیں توڑے دار بندوقیں تھیں اور بس چھے تھے۔ توپ کسی کے پاس بھی نہ تھی جب انگریزی توپ خانہ ایک باغ کے کنارے سے گزر رہا تھا۔ تو باغ میں چھپی ہوئی جمعیت نے اس پر اچانک حملہ کر دیا اور سراسیمہ اور بدحواس انگریزی توپ خانے والوں کو شکست دے کر سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شاملی پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ یہ مقابلے جاری ہی تھے کہ حافظ ضامن شہید ہو گئے کہتے ہیں انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی میں مشہور بزرگ حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی بھی شریک تھے میں جنگ کے دوران یہ انگریزوں کے مقابلے سے ہٹ گئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف روانہ ہو گئے، کسی نے ان سے سوال کیا "حضرت! آپ کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟

مولانا فضل الرحمٰن نے جواب دیا "انگریزوں سے جنگ کرنے کا فائدہ؟ میں نے ان کی صفوں میں خواجہ خضر کو دیکھا ہے تم لوگ ناکام رہو گے"۔

اسی عالم میں یہ معلوم ہوا کہ دہلی پر انگریز قابض ہو گئے اور مغل بادشاہ گرفتار کر لیا گیا دہلی کے سقوط کے بعد انگریزوں نے قرب و جوار کو سر کرنا شروع کر دیا۔ شاملی، سہارنپور

اور مظفر نگر کی باری بھی آگئی حاجی امداد اللہ کی جماعت نے انگریزوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہے تحریک کے بنیادی ارکان ادھر ادھر روپوش ہو گئے انگریزی حکومت نے ان کے نام وارنٹ جاری کر دیے حاجی امداد اللہ پنجلاسہ (انبالہ) پہنچ گئے یہاں کا رئیس راؤ عبداللہ خان آپ کا بہت معتقد تھا۔ انگریزوں کا وفادار لیکن آپ کا ارادت مند۔ کوئی دوسرا ہوتا تو حاجی امداد اللہ جیسے باغی کو اپنے گھر میں ہرگز پناہ نہ دیتا۔

راؤ عبداللہ خان آپ کو تخلیے میں لے گیا اور آہستہ سے سوال کیا "حضرت! رات کی تاریکی میں یہاں تک آتے ہوئے آپ کو کسی نے دیکھا تو نہیں ؟"

آپ نے جواب دیا "راؤ عبداللہ! تم گھبراتے کیوں ہو؟ ہم تمہارے گھر میں نہیں رہیں گے"
راؤ نے عقیدت سے کہا "پنجلاسہ میری جاگیر ہے اس جاگیر میں میرے ہوتے ہوئے آپ کہیں اور نہیں ٹھہر سکتے"

آپ نے فرمایا "ہم نے یہ کہا ہے کہ تمہارے گھر میں نہیں رہیں گے کیونکہ فرنگی ہمیں ہمارے نقش پا کے سہارے ڈھونڈتے چلے آ رہے ہیں"

راؤ ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا بولا "حضرت میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا"

آپ نے جواب دیا "ہم تمہارے اصطبل کی اس کوٹھری میں رہ لیں گے جس میں تم اپنے مویشیوں کا چارہ وغیرہ رکھا کرتے ہو"

راؤ کو آپ کی بات سے دکھ پہنچا بولا "میں کس طرح گوارا کر سکتا ہوں کہ آپ میری موجودگی د علم اور جاگیرداری میں ایسی بری جگہ اقامت فرمائیں"

آپ نے متبسم ہو کر فرمایا "جو ہم کہتے ہیں اس میں تم دخل مت دو کیونکہ نہیں معلوم ہے کہ ہماری اور تمہاری بہتری اسی میں ہے"

راؤ نے ہر طرح یہ کوشش کی کہ حاجی امداد اللہ اپنی اقامت کے لیے کوئی اور جگہ پسند فرمالیں لیکن یہ نہیں مانے اور مجبوراً آپ کی جائے نماز، لوٹا اور ایک چوکی مویشیوں کے چارے گھاس کی کوٹھری میں پہنچا دی گئی۔



فجر کی نماز سے فارغ ہو کر راؤ عبداللہ خان لوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے حاجی صاحب کی کوٹھری میں پہنچا۔ اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا اور حاجی صاحب نماز اشراق ادا فرما رہے

تھے راؤ عبداللہ خان انہیں نماز میں مشغول دیکھ کر واپس آ گئے۔ یہ ابھی اپنی حویلی کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی سپاہ کی ایک گارڈ آتی دکھائی دی۔ انگریز کلکٹر آگے آگے تھا۔ یہ کلکٹر ہونے کے ساتھ ہی مجسٹریٹ ضلع بھی تھا۔ راؤ عبداللہ خان اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ٹھٹکا اور خطرے کی بو محسوس کرنے لگا۔ پھر یہ سوچ کر کہ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا عاجز اور بے بس انسان کا مشیت ایزدی میں کیا دخل، ہمت کر کے مجسٹریٹ کے استقبال کو آگے بڑھا اور سلام دعا کے بعد نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا: "جناب والا! زہے نصیب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ خوش قسمتی۔ بلند طالعی! آپ نے تشریف لانے اس وقت صبح صبح زحمت فرمائی کا کوئی تو مقصد ہوگا، براہِ کرم اس سے مطلع فرما کر اس ناچیز کو خدمت گزاری کا موقع عطا فرمائیں۔"

مجسٹریٹ راؤ کی خوش اخلاقی سے متاثر ہوا۔ کہاں تو یہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ اچانک چھاپہ مار کر حاجی امداد اللہ کو برآمد کرے گا لیکن راؤ کے اطمینان، اعتماد اور خوش اخلاقی نے اسے متذبذب کر دیا۔ اسے جس مخبر نے خبر دی تھی اس نے یہاں تک بتا دیا تھا کہ حاجی صاحب اصطبل یا اس کے آس پاس موجود کوٹھریوں میں سے کسی ایک میں روپوش ہیں۔ مجسٹریٹ کو یقین تھا کہ وہ حاجی صاحب یہیں کہیں سے برآمد کر لے گا۔ راؤ عبداللہ خان کی خوش اخلاقی کا پُرجوش خوش اخلاقی سے جواب دیا: "راؤ صاحب! ہم نے یہ سن رکھا ہے کہ آپ کے اصطبل میں بڑے اچھے اچھے اور اعلیٰ نسل کے گھوڑے موجود ہیں اور ان میں ایک ایسا گھوڑا ابھی موجود ہے جس کی دور دور تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہم تمہارا اصطبل دیکھنا چاہتے ہیں اور خاص کر وہ گھوڑا بھی، جس کا دور دور شہرہ ہے۔"

راؤ عبداللہ خان سناٹے میں آ گیا لیکن اندر کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "جو کچھ آپ نے سنا ہے ممکن ہے سچ ہی ہو۔ اگر آپ کو ہمارے اصطبل کا کوئی گھوڑا پسند آ گیا تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی اور ہم وہ گھوڑا بخوشی آپ کی نذر کر دیں گے، آئیے ہمارے ساتھ تشریف لائیے اور اصطبل کے گھوڑے ملاحظہ فرمائیے۔"

مجسٹریٹ راؤ عبداللہ خان کے ساتھ اس کے اصطبل میں داخل ہو گیا۔

راؤ عبداللہ خان نے ایک ایک کر کے اصطبل کے تمام گھوڑے دکھا دیے۔ مجسٹریٹ گھوڑوں کے ساتھ ساتھ راؤ کے چہرے کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ وہ راؤ کے چہرے پر خوف

یا تشویش کے آثار دیکھنا چاہتا تھا لیکن راؤ میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ پائی جاتی تھی مجسٹریٹ کو اس مخبر پر غصہ آنے لگا جس نے اُسے یہ جھوٹی خبر دی تھی کہ حاجی امداد اللہ راؤ عبداللہ خان کے اصطبل وغیرہ میں کہیں روپوش ہیں مجسٹریٹ اصطبل کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا اس کوٹھڑی کے دروازے پر بھی پہنچ گیا ۔ جہاں حاجی صاحب واقعی روپوش تھے ۔

مجسٹریٹ نے راؤ سے پوچھا " اور اس میں کیا ہے ؟"

راؤ نے جواب دیا " یہ اصطبل نہیں ہے اس میں گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا رکھا جاتا ہے "

مجسٹریٹ نے پیشانی پر تردد کی شکنیں ڈالیں بولا " گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا ؟ کیا مطلب ؟ کیا مویشی گھاس کے علاوہ بھی کچھ کھاتے ہیں ؟

راؤ نے جواب دیا " جی ہاں، دالیں، کھل، چوکر، کربی، اسی طرح کی اور بہت ساری چیزیں "

مجسٹریٹ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا " ذرا کھلوانا تو، ہم بھی تو دیکھیں کہ مویشی کون کون سی چیزیں اور کھاتے ہیں "

راؤ کا دل دھک دھک کرنے لگا اللہ کا نام لے کر یہ کوٹھڑی بھی کھلوا دی ۔ جب کوٹھڑی کے دونوں پٹ کھل رہے تھے تو راؤ کے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی کوٹھڑی کے دونوں پٹ کھل گئے خالی چوکی، چوکی پر بچھا ہوا مصلےٰ، کنارے لوٹا رکھا تھا اور چوکی کے نیچے کی زمین تر تھی گویا ابھی ابھی وضو کیا گیا تھا یہ تمام چیزیں موجود تھیں لیکن حاجی امداد اللہ کا کہیں پتہ نہ تھا ۔

مجسٹریٹ نے اپنے آدمیوں کی مدد سے کوٹھڑی کا کونا کونا چھان مارا لیکن حاجی امداد اللہ کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا مجسٹریٹ چوکی، مصلے اور لوٹے کی موجودگی کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا ۔ دریافت کیا " راؤ صاحب یہ سامان یہاں کیوں رکھا ہے ؟"

راؤ نے جواب دیا " جناب میں یہاں نماز پڑھتا ہوں "

مجسٹریٹ نے گردن جھکائی اور قدرے منہ ٹیڑھا کیا " آپ اس اصطبل میں مویشیوں کے چارے کی کوٹھڑی میں نماز پڑھتے ہیں ؟ عجیب سی بات ہے حالانکہ ہم نے یہ سُنا ہے کہ مسلمان لوگ مسجد میں نمازیں پڑھتے ہیں "

راؤ نے جواب دیا " آپ نے بھی درست ہی سُن رکھا ہے ہمارے مذہب میں نمازوں کی بابت یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان فرض نمازیں تو مسجد میں ادا کرے لیکن نفلیں چھپا کر کسی چوری کی

جگہ پر پڑھنی چاہییں اور اس حکم خداوندی کی تائید اور تعمیل میں ہم لوگ اشراق اور نفل نمازیں یہیں پڑھ لیا کرتے ہیں۔"

لاجواب مجسٹریٹ مایوس ہو کر باہر نکلا اور اپنی راہ لینے سے پہلے آخری بار کہا "راؤ صاحب ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہارا اتنا وقت برباد کیا ہے اس کا ہمیں ہمیشہ احساس رہے گا۔"

راؤ نے انکسار سے جواب دیا "آپ قطعی افسوس نہ کریں کیونکہ آپ کو کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی تلاش تھی جو بدقسمتی سے ہمارے یہاں نہ نکل سکا لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی مطلوبہ شے نہ پاسکیں۔ آپ مجھے ایک ذرا سا موقع عنایت فرمائیں۔ میں آپ کی خواہش کسی بھی طرح پوری کرادوں گا۔"

مجسٹریٹ نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ راؤ دوبارہ اسی کوٹھری میں داخل ہوا دیکھا حاجی امداد اللہؒ نماز پڑھ رہے ہیں اس کی عقل چکرا گئی۔ وہ کوئی سوال بھی نہ کر سکا اور اسے ان کی کرامت پر محمول کیا۔

حاجی امداد اللہ کی طرف سے مولانا رشید گنگوہی بہت بے چین اور مضطرب تھے انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ حاجی صاحب کہاں روپوش ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں آزادی سے کہیں تلاش بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا وارنٹ گرفتاری بھی کٹ چکا تھا اور وہ بھی انگریزوں کے مطلوب تھے اسی افراتفری میں کسی نے مولانا رشید احمد کو یہ خبر دی کہ حاجی امداد اللہ انبالہ کی جاگیر پنجلاسہ میں راؤ عبداللہ خان کے مہمان ہیں۔ یہ چھپتے چھپاتے پنجلاسہ کے قریب پہنچ گئے اور بدقت تمام ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے یہ بہت روئے اور دریافت کیا۔

"حضرت! اب کیا منصوبہ ہے؟"

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا "مشیت کو ابھی وہ سب منظور نہیں شاید، جو ہم چاہتے ہیں اور وہ یہی کام شاید کسی اور سے لینا چاہتی ہے۔"

مولانا گنگوہی نے سوال کیا "حضرت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا۔

"ہماری باتوں کا جو مطلب ہے وہ بہت صاف ہے ہم مکہ معظمہ جا رہے ہیں اور وہیں سے اپنی تحریک جاری رکھیں گے۔"

مولانا گنگوہی نے پوچھا "میرے لیے کیا حکم ہے؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا: "تم یہیں ہندوستان میں رہو گے۔"

مولانا گنگوہی نے اضطراب سے پوچھا: "میں آپ کی عدم موجودگی میں یہاں کیا کروں گا؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا: "قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسی لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم یہیں رہو اور فرمان خداوندی کا انتظار کرو۔"

مولانا گنگوہی کا دل بھر آیا اور وہ آنسو برسانے لگے حاجی صاحب نے پوچھا: "تم روتے کیوں ہو؟"

مولانا گنگوہی نے جواب دیا: "آپ کی مفارقت کا غم ایسا نہیں ہے کہ آسانی سے جھیل لیا جائے، بہر حال آپ فرماتے ہیں تو ہم یہیں ہندوستان میں رہیں گے اور وہ کام انجام دینے کی کوشش کریں گے لیکن ایک بات طے ہے وہ یہ کہ جلد یا بہ دیر انگریز ہمیں گرفتار کرلے گا اس وقت آپ سے ملاقات کی کیا سبیل ہوگی؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا: "تم واقعی گرفتار کر لیئے جاؤ گے لیکن ہم بھی یہ وعدہ کرتے ہیں کہ جانے سے پہلے تم سے ملیں گے ضرور"

مولانا گنگوہی واپس گئے اور گرفتار کر لیئے گئے۔

حاجی امداد اللہ کو ایک بار پھر انگریزی دوڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی صاحب جس مکان میں قیام فرما تھے پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت حاجی صاحب مکان کے کھلے حصّے میں چارپائی پر دراز تھے۔ یہ مکان ایک زمیندار کا تھا سپاہیوں کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر زمیندار نے نوکروں کو حکم دیا: "تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ لوگ آئے ہیں ان کی مدد کرو اور مکان کے اندر اور باہر ان کی رہنمائی کرو۔" پھر حاجی صاحب کے اوپر لحاف ڈال دیا۔ اور ڈانٹ کر ملازمین کو حکم دیا: "اس بڈھے کو کھیت میں ڈال آؤ، اس نے کھانس کھانس کے اور تھوک تھوک کے سارے گھر کو گندا کر رکھا ہے۔"

ملازمین نے سپاہیوں کی موجودگی میں حاجی صاحب کی چارپائی کو سرہانے اور پائنتی سے پکڑا اور کھیت میں ڈال آئے سپاہیوں نے انہیں گھر کے کونے کونے میں چھان مارا اور بے نیل و مرام واپس گئے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مظفر نگر کی گڑھی پختہ میں بھی پیش آیا تھا اس زمانے میں گڑھی پختہ سہارنپور میں داخل تھی۔ یہاں کے رئیس نے حاجی صاحب کو پناہ دی۔ لیکن مخبروں نے

مجسٹریٹ ضلع کو مطلع کر دیا اور پولیس کپتان گارڈ لے کر رئیس کی حویلی میں داخل ہو گیا۔ اس علاقے کے تھانے دار خواجہ احمد حسین تھے انہیں بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے حلقے میں، اس علاقے کے جس رئیس کی حویلی میں چھاپہ پڑ رہا ہے وہ حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کی کوششوں سے تعلق رکھتا ہے حویلی کے دروازے پر پہنچنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ سب کچھ غالباً حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا ہے لیکن اب معاملہ بہت آگے پہنچ چکا تھا اور تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ذہن کو ایک عجیب و غریب سوجھ گئی۔ انہوں نے حویلی کے دروازے پر ہی سے چلانا شروع کر دیا۔ حویلی کے رئیس کا نام لے لے کر گالیاں دینا شروع کر دیں اور دھونس دیتے ہوئے کہا "کدھر ہے او نمک حرام: ذرا باہر تو نکل، سرکار کے باغیوں کو اپنی حویلی میں پناہ دیتا ہے خدا کی قسم آج دیکھنا ہے کہ تو کس طرح بچتا ہے اس جرم میں اگر تیرا علاقہ ضبط نہ کروا دیا ہو تو خواجہ احمد حسین نہیں، بھنگی کہلانا پسند کروں گا"

رئیس کے کانوں میں یہ آواز جو پڑی تو اس نے فوراً حاجی صاحب کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور چھاپہ بھی ناکام رہا۔



مولانا گنگوہی قید خانے میں اذیتیں جھیل رہے تھے انہیں حاجی صاحب کا انتظار تھا وہ پریشان تھے کہ حاجی صاحب ان سے کس طرح ملاقات کریں گے اگر وہ یہاں حسب وعدہ ملنے آئے بھی تو فوراً گرفتار کر لیئے جائیں گے اور مولانا گنگوہی کو یہ منظور نہ تھا کہ حاجی صاحب گرفتار کر لیئے جائیں۔

ایک دن عصر سے کچھ پہلے مولانا گنگوہی نے نیم غنودگی میں دیکھا کہ حاجی صاحب ان کے سامنے کھڑے ہیں اور کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔

مولانا گنگوہی نے حیرت سے پوچھا "حضرت! یہ آپ یہاں تک کس طرح پہنچ گئے کیا باہر پہرے دار موجود نہیں ہیں؟

حاجی صاحب نے جواب دیا " وہ موجود ہیں لیکن ہم نے تم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے تم سے ملاقات ضرور کریں گے چنانچہ اپنا وعدہ پورا کرنے آ گئے ہیں اب ہم سرزمین حجاز جا رہے ہیں"

مولانا گنگوہی اداس ہو گئے بولے " لیکن پہرے داروں نے آپ کو یہاں تک

کس طرح آئے نے دیا بھی واپس جاتے ہوئے آپ کو گرفتار نہیں کر لیں گے ؟

حاجی صاحب واپس جاتے ہوئے بولے: "ہم جس طرح آئے ہیں اسی طرح واپس بھی چلے جائیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو۔"

مولانا گنگوہی نے پوچھا: "حضرت! میرا کیا انجام ہوگا؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا: "تم فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد حاجی صاحب پاک پٹن چلے گئے کچھ دن وہاں رہے یہاں سے حیدرآباد سندھ میں داخل ہو گئے اور حیدرآباد سندھ سے رخصت ہو کر کراچی میں قیام کیا، کراچی سے مکہ معظمہ چلے گئے۔

اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آپ مناسک حج ادا فرما رہے تھے کہ یکایک اپنے ایک ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کنارے ہو گئے اور افسردگی سے فرمایا: "کچھ اور سُنا تم نے؟ آج تو غضب ہو گیا۔"

ساتھی نے گومگو جواب دیا: "کیا ہوا حضرت! میں نے تو کچھ بھی نہیں سُنا۔"

آپ نے گردن جھکائی اور افسوس سے کہا: "رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ بہت بُرا ہوا۔"

ساتھی نے پوچھا: "کس نے بتایا؟"

آپ نے جواب دیا: "بتائے گا کون، بس ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔"

ساتھی حیرت سے صورت دیکھتا رہ گیا آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا: "بہرحال ہم پھانسی نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں اتنی دور سے جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔"

ساتھی کی سمجھ میں یہ باتیں تو آ ہی گئیں لیکن وہ اس کی تفصیل جاننے کا خواہش مند تھا اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ اُٹھے اور مولوی ولایت حسین اور مولوی مظفر حسین کاندھلوی کو اپنے ساتھ لیا اور شہر سے باہر چل پڑے بارش شروع ہو چکی تھی پانی سے دھل کر سبزہ جوان ہو گیا تھا۔ اپنے دونوں ہمراہیوں کو لے کر آپ سبزے پر بیٹھ گئے اور گردن جھکا کر خاموشی اختیار کی۔ دونوں ساتھی چہرے کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتے رہے۔ پھر سر اٹھایا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، بولے: "چلو اُٹھو واپس چلیں کام ہو گیا۔"

مولوی ولایت نے سوال کیا: "کیسا کام؟ کس کا کام؟ کہاں ہو گیا کام؟"

حاجی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، بولے: "رشید احمد کو اب پھانسی نہیں دی

جائے گی۔ پھانسی کا حکم ٹل گیا "
کچھ دنوں بعد مولانا گنگوہی کی سزائے موت اور اس کی منسوخی کی خبر اسی ترتیب سے موصول ہو گئی۔

مکہ معظمہ میں امیر احمد رامپوری بھی قیام فرما تھے۔ یہ صاحب بھی انگریزوں کو مطلوب تھے گرفتاری کے ڈر سے وطن جانے کا خیال تک دل میں نہ لاتے تھے ایک دن گھر کی یاد آگئی اور یہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے، حاجی صاحب نے صورت دیکھتے ہی کہا "ہندوستان جانا چاہتے ہو؟ جاؤ لیکن گرفتار ہو جاؤ گے"

امیر احمد نے خاموشی اختیار کر لی لیکن ایک دن پھر حاضر ہوئے اور اپنا پرانا جملہ ایک بار پھر دہرایا۔ حاجی صاحب کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں اور آپ نے ترش لہجے میں کہا۔ "کیا تم گرفتار ہونا چاہتے ہو؟ اگر جی گرفتاری پر مائل ہے تو تم اسی وقت ہندوستان چلے جاؤ"

امیر احمد نے جواب دیا "حضرت! کون ہے وہ شخص جو اپنی گرفتاری سے خوش ہوگا"

آپ نے کہا "تو خوش ہوگا، ہمیں معلوم ہے تو خوش ہوگا، جا چلا جا اور دیکھ کر کیا چیز ظاہر ہوتی ہے"

کسی شخص نے امیر احمد سے تخلیے میں کہا "جناب! آپ ہندوستان فوراً روانہ ہو جائیں قبلہ حاجی صاحب جیسا فرما رہے ہیں انشاء اللہ ویسا ہی ظہور پذیر ہوگا"

امیر احمد رامپوری اللہ کا نام لے کر ہندوستان میں داخل ہو گئے دہلی پہنچ کر ایک مسجد میں قیام کیا۔ سکون اور اطمینان کا سبب یہ تھا کہ حضرت مبہم لفظوں میں رہائی کا حکم فرما چکے تھے امیر احمد نے چند دن حجرے میں رہ کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ وانٹ پیش کر دہ جاتا اور یہی کہتا کہ امیر احمد! میں تمہیں دار پر نہ چڑھاؤں تو میرا نام نہیں

امیر احمد نے حقارت سے جواب دیا "کیا تم پاگل ہو؟ کیا اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہے ہو؟"

مجسٹریٹ نے کہا "پاگل ہم نہیں، تم ہو گئے ہو"

اس کے بعد انہیں جیل بھیج دیا گیا اور مقدمات چلنے لگے آخر کار انہیں تمام مقدمات سے بری کر دیا گیا اور یہ اپنے گھر رامپور چلے گئے۔

میرٹھ کی نواحی آبادی کے ایک صاحب حج کے لیئے جا رہے تھے انہیں حاجی امداد اللہ سے غائبانہ اور والہانہ عقیدت تھی ۔ انہوں نے حاجی صاحب کا نام ہی نام سنا تھا، صورت نہیں دیکھی تھی ۔ ان صاحب نے حج پر روانگی سے پہلے حاجی امداد اللہ کے لئے ایک کملی تیار کرائی اور اسے دوسرے سامان کے ساتھ لے کر حج کے لیئے روانہ ہو گئے ۔

جب ان کا جہاز سمندر میں ہچکولے کھاتا جدے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ یہ یکایک طوفان میں پھنس گیا ، مسافروں پر اتنی دہشت اور بدحواسی طاری ہوئی کہ بے معنی شور و غل کرنے لگے عجیب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا انسانی فطرت کا تضاد جہاز پر ہر سو نظر آرہا تھا کچھ خوف سے موت کا استقبال کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے اُس پاس موجود اپنے عزیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور موت اور اپنی ذات کے سوا انہیں کچھ نظر ہی نہ آرہا تھا لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو موت کا استقبال اپنے عزیزوں اور بچوں کے ساتھ خوش دلی سے کرنا چاہتے تھے

حاجی امداد اللہ کا پرستار اور معتقد جہاز کے ایک کونے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگا ۔ مایوسی اور دل شکستگی نے دل کا عجیب حال کر رکھا تھا وہ جہاز سے پہلے ہی دم بہ دم ڈوبتا جا رہا تھا ۔ اسی عالم میں ذرا غفلت سی طاری ہو گئی ۔ اس غفلت میں اس شخص نے دیکھا کہ کوئی صاحب سامنے کھڑے اس سے کہہ رہے ہیں کہ حاجی امداد اللہ کی کملی کہاں ہے؟

اس شخص نے جواب دیا "حضرت! آپ دیکھ نہیں رہے ہے کہ جہاز طوفان میں پھنسا ہوا ہے ذرا دیر بعد ہم سب اور یہ جہاز کملی سمیت سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا"

ان بزرگ نے متبسم ہو کر فرمایا "پریشان مت ہو، اٹھ کر بیٹھ جاؤ ۔ کون کہتا ہے کہ یہ جہاز ڈوب جائے گا ، تھوڑی ہی دیر بعد موافق ہوائیں چلنے والی ہیں اور یہ جہاز طوفان سے بچ نکلے گا"، اس کے بعد کہا " لاؤ وہ کملی تو دے دو مجھے "

یہ شخص گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ کملی ان صاحب کے حوالے کر دے لیکن جب ہوش و حواس ذرا بجا ہوئے تو پتہ چلا کہ سامنے وہ شخص موجود ہی نہیں ہے اس واقعے کو خواب یا رویائے صادقہ کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا تھا اس شخص کو یقین ہو گیا کہ اب جہاز طوفان میں نہیں ڈوبے گا اس شخص نے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر جہاز کے تمام مسافروں کو یہ خوش خبری سنا دی کہ جہاز نہیں ڈوبے گا ۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ شخص موت کے خوف سے پاگل ہو گیا ہے اور جو کچھ بشارت دے رہا ہے دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن دیوانے کی بشارت حرف

بہ حرف سچ نکلی اور جہاز طوفان سے بچ نکلا۔

مکے میں داخل ہوتے ہی یہ شخص تلاش کرتا ہوا حرم کعبہ میں داخل ہوگیا وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے یہ ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک مالکی مصلے کے قریب ایک شخص کو کھڑے دیکھ کر رک گیا یہ شخص کملی لے کر آگے بڑھا اور کملی کو ان کے قدموں میں ڈال کر بولا "حضرت! اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا تو یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ حضرت کا نام نامی اسم گرامی حاجی امداد اللہ ہے"

مخاطب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سوال کیا "تم نے کس طرح پہچانا؟"
اس شخص نے جواب دیا "میں آپ سے جہاز پر ملاقات کر چکا ہوں۔ جہاز کے حلیے اور موجودہ حلیے میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس وقت آپ تہمد زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اس وقت پاجامے میں ملبوس ہیں"

آپ نے اس کا کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی اور نے جواب دیا "طغیانی اور پانی کے لیئے تہمد ہی مناسب لباس تھا۔ مناسب اور موافق ہواؤں کے حوالے کرنے میں حاجی صاحب کو بڑی محنت کرنا پڑی تھی"

یہ کس نے جواب دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک آواز تھی جسے کانوں نے تو سن لیا لیکن آنکھیں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔



پچاس سال کی عمر تک حاجی صاحب مجرد ہی رہے پھر اشارت غیبی سے یہ تنبیہہ ملی کہ ایک عارف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شادی جیسی سنت نبویہ سے محروم رہے آپ نے اس اشارت غیبی پر بی بی خدیجہ بنت شفاعت رام پوری سے نکاح فرمایا۔

آپ چوراسی سال تین ماہ بیس روز زندہ رہے اور ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ بروز شنبہ صبح فجر کی اذان کے وقت اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے اور جنت المعلیٰ (مکہ معظمہ) میں مدفون ہوئے۔

اولیائے کرام کی سوانح نگار ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ

عظمت کے مینار

قیمت -/۱۵۰ روپے

اولیائے کرام جو مینارۂ رُشد ہدایت تھے
ضیاء تسنیم بلگرامی نے انہیں اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے۔

اُن دنوں، جب ہر طرف حرص و طمع، عیش کوشی، خود غرضی اور نفسانفسی کا دَور دَورہ تھا۔ انسان دُنیاداری، جاہ طلبی اور جاہ پرستی میں مبتلا تھا۔ روشنی کے ان میناروں نے انسانیت کو نجاتِ ابدی کی راہ دکھائی۔ دُکھی انسانوں کی راہ نمائی کی اور اُن کے کام آئے۔

عظمتوں کے ان میناروں کے کارنامے

اُن کی منوّر زندگی آج بھی ہماری رہنمائی کررہی ہے۔ وہ ہم میں موجود نہیں لیکن اپنے کام میں موجود..... ہمیں بتارہے ہیں کہ دُنیا سائے کی طرح ہے، اس کے پیچھے بھاگو گے تو یہ آگے ہی آگے رہے گی۔ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا لیکن اگر اس سے بھاگو گے تو یہ تمہارے پیچھے دوڑے گی۔ ایک ایسی چیز، جو سائے کی طرح ہو، اس کے پیچھے بھاگنے سے کیا حاصل؟

اسلام کے
خاموش مبلغوں
کے پُر اثر
واقعات

کہانیوں سے
زیادہ دلچسپ
داستانوں سے زیادہ
اثر انگیز



مصنفہ کی ایک اور کتاب "روشنی کے مینار" بھی دستیاب ہے

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ سعد منشن، بلیمویا اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی